

احکامِ تجارت
اور
لین دین کے مسائل

تالیف:

فضیلۃ الشیخ مولانا عبدالرحمن کیلانی رحمہ اللہ

تحقیق وتخریج

ابوالحسن مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ

مکتبہ السلام

نام کتاب	....	احکام تجارت اور لین دین کے مسائل
زیر سرپرستی	....	ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کیلانی
طبع دوم	....	جولائی 2003ء
کمپوزنگ	....	قاسم گرافکس حبیب پارک منصورہ لاہور
تعداد	....	1100
طابع	....	ڈاکٹر حافظ شفیق الرحمٰن کیلانی
	....	انجینئر حافظ عتیق الرحمٰن کیلانی
زیر اہتمام	....	پروفیسر نجیب الرحمٰن کیلانی فون: 7844157
قیمت	....	-/150 روپے

ناشر:

مکتبۃ السلام

گلی نمبر 20 دارالسلام وسن پورہ لاہور

فون: 7844157-7280943

ڈسٹری بیوٹرز

دارالسلام

کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

DARUSSALAM

36-لوئر مال۔ سیکرٹریٹ سٹاپ لاہور فون: 7240024 - 7232400 فیکس: 7354072

غزنی سٹریٹ 'اردو بازار' لاہور فون: 7120054 فیکس: 7320703

احکامِ تجارت اور لین دین کے مسائل

تالیف:

فضیلۃ الشیخ مولانا عبد الرحمن کیلانی رحمہ اللہ

تحقیق و تخریج

ابو الحسن مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ

مکتبۃ السلام سٹریٹ ۲۰ وسن پورہ لاہور

فہرست مضامین

www.KitaboSunnat.com

عرض ناشر

محترم والد صاحب مولانا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب نے 1995ء میں داعی اجل کو لبیک کہا- ان کی وفات کے بعد بہن بھائیوں کی طرف سے ان کی کتب کی نشرو اشاعت کے کام کو آگے بڑھانے کی میری ذمہ داری لگائی گئی- والد صاحب ان کتب کی تصنیف' تخریج' طباعت' جلد بندی حتی کہ فروخت تک کے تمام کاموں کی خود نگرانی کیا کرتے تھے- جب کہ تدریس القرآن والحدیث کی ذمہ داری اور اپنی ساری اولاد کی تربیت کے حوالے سے جملہ امور کی نگرانی اس پر مستزاد تھی- میں نے اپنی پوری کوشش اس بات پر صرف کی کہ والد صاحب کی یہ تصنیفات جو کہ اپنے موضوع اور منفعت کے لحاظ سے بے مثال باطنی حسن کا شاہکار ہیں ان کو کماحقہ ظاہری حسن سے بھی مزین کیا جائے- اور اس کام کے لیے میں نے اپنی دوسری سب مصروفیات کو چھوڑ کر دن رات محنت کی- آج تیسیر القرآن کی چاروں جلدیں چھپ کر قارئین کے ہاتھوں تک پہنچ گئی ہیں- مترادفات القرآن' آئینہ پرویزیت' خلافت و جمہوریت' شریعت و طریقت' احکام ستر و حجاب' محمد رسول اللہ پیکر صبر و ثبات' اسلام میں مصارف دولت وغیرہ اس کی زندہ مثالیں ہیں- اللہ تعالیٰ نے ان سب کتابوں کو حسن قبول سے نوازا اور قارئین نے بارہا سراہا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ مصنف مرحوم کی حسن نیت کا انعام ہے- اب یہ کتاب ''احکام تجارت اور لین دین کے مسائل'' بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے- یہ کتاب ہر ایک انسان کی ضرورت ہے- اس کی افادی اہمیت کے پیش نظر اس کو عمدہ صورت میں پیش کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے- اس کے حوالہ جات کی تخریج و تحقیق کا ذمہ ابوالحسن مولانا مبشر احمد ربانی صاحب نے اپنی خوشی سے

اٹھایا۔ اور اپنی کثیر مصروفیات سے وقت نکال کر حق ادا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ بعض مقامات پر ربانی صاحب نے تخریج کے بعد اپنا موقف بھی واضح کر دیا ہے۔ تاہم کسی بھی انداز کی کمی بیشی یا غلطی محسوس ہو تو علمائے کرام سے مودبانہ عرض ہے کہ بندہ کو ضرور اطلاع دیں' تا کہ اصلاح کی جا سکے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو تمام لوگوں کے لیے باعث رشد و ہدایت بنائے۔ اور والد صاحب کی اس کاوش کو قبول فرمائے اللہ تعالیٰ اسے ہماری آخرت کے لیے زادِراہ بنائے۔ (آمین)

پروفیسر نجیب الرحمٰن کیلانی
جامع مسجد الایمان۔ شاہ فرید آباد۔ ملتان روڈ۔ لاہور
فون: 7844157

پیش لفظ

میری تصانیف میں سب سے پہلی تصنیف اسلام میں ضابطہ تجارت ہے جس کی وجہ تالیف یہ تھی کہ ہماری تجارت اور ہمارے لین دین میں کئی ایسی باتیں رواج پا گئی ہیں جو شرعاً ناجائز ہیں- لیکن عوام کی اکثریت ان کے ناجائز ہونے سے مطلقاً بے خبر ہے اس کتابچہ میں کسبِ حلال' ناجائز ذرائع آمدنی' تجارت کے مسائل واحکام' تجارت کی جائز اور ناجائز صورتیں اور بعض دوسری قسم کے لین دین کے احکام کو نہایت اختصار سے پیش کیا گیا تھا- فقط قرآنی آیات' احادیث کے متون اور معانی پر اکتفا کرتے ہوئے فقہی اختلاف اور عقلی دلائل سے اجتناب کیا گیا تھا- اور اس کی وجہ بھی میں نے پیش لفظ میں لکھ دی تھی جبکہ یہ موضوع حقیقتاً لمبی چوڑی تفصیل کا محتاج ہے جیسا کہ ملک غلام علی صاحب معاون ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم نے اپنی تقریظ میں اس بات کی طرف توجہ بھی دلائی تھی اور کتاب چھپ جانے کے بعد مجھے چند ایک خطوط بھی موصول ہوئے جن میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ان مباحث کو تفصیل کے ساتھ پیش کرنا ضروری ہے-

کتاب چونکہ کتابت اور پروف ریڈنگ کے مراحل سے گزر چکی تھی- لہٰذا اسے اسی حال میں چھاپ دیا گیا اور اس مختصر کتابچہ کو بھی بفضلہ تعالیٰ پذیرائی ہوئی اور اب تقریباً تین سال گزر رہے ہیں کہ اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا ہے دوسرے ایڈیشن میں تاخیر اس لیے ہوتی رہی کہ میں خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ فی الواقع ان اجمالی مباحث کو تفصیل سے پیش کرنے کی ضرورت ہے- علاوہ ازیں کئی نئے مباحث کو بھی اس میں شامل کرنا ضروری سمجھا گیا- پہلے حوالہ جات بالکل مختصر تھے- مثلاً ایک حدیث کے بعد رواہ البخاری درج

کرنے پر اکتفا کیا گیا تھا- مگر اب ان کے حوالہ جات کا پوری تفصیل کے ساتھ (مثلاً بخاری‘ کتاب...... باب...... اندراج ضروری سمجھا گیا- دریں اثناء اسی موضوع سے متعلق میرے کئی مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے تھے- مثلاً بنک کا سود‘ بچت اور سرمایہ کاری کا اسلامی نظریہ‘ بنکوں کے شراکتی کھاتوں کی حقیقت‘ بلاسود بنکاری کی طرف پیش رفت‘ بیمہ کی شرعی حیثیت اور اس کا متبادل حل‘ مالک اور مزدور کے مسائل‘ مسئلہ مزارعت میں جواز اور عدم جواز کی احادیث میں تطبیق کی صورتیں‘ زکوٰۃ اور ٹیکس میں فرق اور زکوٰۃ کی موجودگی میں دوسرے ٹیکسوں کی شرعی حیثیت وغیرہ وغیرہ- انہیں بھی اس کتاب میں شامل کرنا ضروری سمجھا گیا- گویا حقیقتاً یہ ایک نئی تصنیف تھی- اگرچہ موضوع پہلا ہی تھا اور یہ کام خاصا وقت طلب اور توجہ طلب تھا- اور بعض دوسرے کاموں کی وجہ سے اس میں تاخیر ہوتی گئی-

مترادفات القرآن سے کچھ فراغت نصیب ہوئی- تو پوری توجہ اس کام کی طرف مبذول کی- اس ایڈیشن میں اگرچہ بنیاد پہلے ایڈیشن کو ہی بنایا گیا ہے- تاہم ابواب اب دس کے بجائے پندرہ ہو گئے ہیں اور ضخامت بھی تین گنا ہو گئی ہے- مضامین میں خاصی تبدیلی کی وجہ سے کتاب کا نام بھی تبدیل کرنا پڑا- اب اس کا نام ''احکامِ تجارت اور لین دین کے مسائل'' ہے لہٰذا اگر اسے بالکل الگ تصنیف قرار دیا جائے تو بھی بے جا نہ ہو گا-

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ کتاب کا پہلا ایڈیشن جوں کا توں بھی دوبارہ چھپنا چاہیے- اور اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ ایک ہی موضوع پر ایک مصنف کی دو تصنیفات ہوں- ایک چھوٹی اور ایک بڑی- اور یہ بات اس لحاظ سے درست بھی ہے کہ پہلی کتاب مختصر اور عام فہم ہے- جبکہ دوسری میں کچھ ایسی علمی بحثیں بھی آ گئی ہیں جن سے علماء اور دلچسپی رکھنے والے حضرات تو مستفید ہو سکتے ہیں- لیکن عام لوگ شاید انہیں پوری طرح پڑھنے کی زحمت گوارا نہ کریں- بہر حال بقول شخصے ؎ ہر گلے رنگ بوئے دیگر است کے مصداق ممکن ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن بھی کسی وقت شائع کر دیا جائے کیونکہ یہ موضوع اتنا

اہم ہے کہ اس کی عام لوگوں' دینی مدارس کے طلباء و طالبات اور بالخصوص تاجر حضرات میں جس قدر نشر و اشاعت ہو سکے کم ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو ایسے تاجروں کو درہ سے پیٹا کرتے تھے جو بازار میں کام کرتا اور تجارت اور لین دین کے مسائل و احکام سے واقف نہیں ہوتا تھا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو سب مسلمانوں کے لیے مفید بنائے اور کتاب و سنت کے احکام پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه:

آخر میں ان سب حضرات کا ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں دلچسپی لی اور دامے' درمے' سخنے میرے ساتھ تعاون کیا۔

عبدالرحمٰن کیلانی' لاہور

تقدیم

زمانہ جاہلیت میں لوگ جن گمراہیوں اور ضلالتوں کا شکار تھے ان میں سے ایک حلال و حرام کا بھی معاملہ تھا- اس میں مشرکین عرب اور اہل کتاب دونوں کا طرزعمل یکساں تھا وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا کر گمراہی و ضلالت کے عمیق گڑھے میں جا گرے تھے- اور حلال وحرام کا انتہائی غلط معیار قائم کر چکے تھے- ان کے ہاں قتلِ اولاد' خواتین سے ناروا سلوک' سودخوری اور شراب نوشی وغیرھا بالکل جائز اور درست تھیں- کھیتی و مویشیوں جیسی پاکیزہ چیزیں انہوں نے مختلف طرزِ عمل سے اپنے اوپر حرام کر لی ہوئی تھیں- اس پر تماشا یہ ہے کہ ان اشیاء کی حلت وحرمت کو اللہ کی طرف منسوب کر رکھا تھا جیسا کہ سورۃ الانعام' آیت نمبر ۱۳۸ میں ان کا ذکر کیا گیا ہے-

اسلام نے ان ظلمتوں اور گمراہیوں کا خاتمہ کیا اور ان کی بے راہ روی کی اصلاح کی اور حلال وحرام کے قواعد وضوابط وضع کر کے عدل وانصاف پر مبنی صحیح منہج قائم کیا تا کہ امت گمراہی اور انحراف کی راہ اختیار نہ کرے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے نازل کردہ قوانین کے تحت زندگی بسر کرے- ذیل میں انتہائی اختصار سے ہم چند ایک اہم اشیاء کا ذکر کرتے ہیں تا کہ قاری اصل کتاب کے مطالعہ سے قبل ان اصول وضوابط کو ذہن میں بٹھا کر شرعی نصوص سے کما حقہ فائدہ اٹھا سکے-

(۱) حلت وحرمت اللہ تعالیٰ کا حق ہے:

اسلام نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ اشیاء کی حلت وحرمت کا اختیار اللہ تبارک وتعالیٰ کو ہے جس نے انسان کی راہنمائی کے لیے آسمان سے شریعت کو نازل کیا ہے- مخلوق میں سے یہ حق کسی کو حاصل نہیں کہ وہ اپنی مرضی اور خواہش سے جس کو چاہے حلال بنا دے اور جسے چاہے حرام ٹھہرا دے-

عالم ہو یا درویش' حکمران ہو یا رعایا' کسی کو بھی اللہ کے بندوں پر کسی چیز کو حرام یا حلال بنانے کا حق حاصل نہیں ہے- اگر کوئی شخص خود شرعی قانون وضع کر کے اللہ کی مخلوق پر اسے لاگو

کرے گا اور اللہ کے قانون کو پس پشت ڈال دے گا تو اس کا یہ عمل شرک کے مترادف ہوگا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ﴿ ام لهم شركاءُ شرعوا لهم من الدِّينِ مَالَم يَاذَنْ بِهِ اللّٰهُ ﴾ (شوریٰ:۲۱)

کیا ان کے ایسے شریک ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین کے وہ طریقے مقرر کر دیے جن کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ یہود و نصاریٰ جنہوں نے حلت و حرمت کے اختیارات اپنے علماء اور درویشوں کو سونپ رکھے تھے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ کا ارشاد ہے ﴿اتخذوا اَحبارَهم ورُهبانَهُم ارباباً من دونِ اللّٰهِ وَالمسيحَ ابنَ مَريمَ وَمَا اُمِرُوا اِلَّا لِيَعبُدُوٓا اِلٰهاً واحداً لَا اِلٰهَ اِلَّا هُو سُبحانه عَمَّا يُشرِكُونَ﴾ (توبہ ۳۱)

انہوں نے اللہ کے علاوہ اپنے علماء اور درویشوں کو رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ انہیں صرف ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت کا حکم نہیں دیا گیا وہ اللہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں وہ ان کے شرکیہ عقائد و اعمال سے پاک و مبرا ہے۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں ترمذی شریف' **جامع بیان العلم و فضله لابن عبدالبر وغيرهما** میں مروی ہے کہ عدی بن حاتم جنہوں نے اسلام سے پہلے عیسائیت اختیار کر رکھی تھی جب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ یہی آیت تلاوت کر رہے تھے تو عرض کرنے لگے یا رسول اللہ ﷺ! ہم نے تو ان کی عبادت نہیں کی اور انہیں رب نہیں بنایا آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں؟ انہوں نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنایا تھا اور ان لوگوں نے ان کی پیروی کی تھی۔ کہنے لگے ہاں آپ نے فرمایا یہی ان کی عبادت ہے۔ معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ کی گمراہی یہ بھی تھی کہ انہوں نے حلال و حرام کا اختیار اپنے علماء و درویشوں کو سونپ رکھا تھا۔ جسے قرآن نے ان کی عبادت اور انہیں رب بنانا قرار دیا ہے لہٰذا اس کے سوا کسی کو حلال و حرام کا اختیار نہیں ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم میں سے سورۃ یونس آیت نمبر ۵۹' النحل آیت نمبر ۱۱۶ وغیرھا کا مزید مطالعہ فرمائیں۔

(۲) حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرانا شرکیہ امور سے ہے:

اوپر ذکر کردہ سورۃ توبہ کی آیت سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی کو حلال

یا حرام کرنے کا اختیار سونپنا شرک ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا' اللہ کہتا ہے! (انی خلقتُ عبادی حنفاء وانهم اتتهم الشياطينُ فاجتالَتْهُمْ عن دينهم وحَرَّمَتْ عَلَيْهِمْ مااحللتُ لهم وامرَتْهُم ان يشركوا بي مالم اُنَزِّل به سلطاناً) (مسلم مسند احمد ۴/۱۶۲)

میں نے اپنے بندوں کو دین حنیف پر پیدا کیا ہے ان کے پاس شیطان آ کر انہیں بہکاتے ہیں اور ان کے دین سے دور کرتے ہیں اور جو اشیاء میں نے ان کے لیے حلال کی ہیں انہیں ان پر حرام کرتے ہیں اور انہیں حکم دیتے ہیں کہ میرے ساتھ ایسے لوگوں کو شریک ٹھہرائیں جن کی شراکت کی میں نے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔ اس صحیح حدیث سے بھی واضح ہوتا ہے کہ حلال کو حرام کرنا شرک کے قبیل سے ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو المائدہ: ۱۰۳' ۱۰۴' اعراف: ۳۲' ۳۳' مائدہ' ۸۷' ۸۸۔

(۳) حلال حرام سے بے نیاز کر دیتا ہے:

اللہ تبارک وتعالیٰ کا نازل کردہ دین اسلام کمال درجے کی خوبیوں کا مالک ہے اس نے ہمارے اوپر اگر بعض اشیاء کو حرام قرار دیا ہے تو اس سے بہتر درجے کی حلال اشیاء بطور نعم البدل عطا کی ہیں مثلاً سود کو حرام کیا ہے تو تجارت حلال کی ہے۔ ریشم کا استعمال مردوں پر حرام کیا ہے تو اون اور روئی کی مختلف انواع واقسام پر مشتمل لباسِ فاخرہ عطا کیا ہے۔ زنا ولواطت حرام ہے تو نکاح کو حلال ٹھہرایا ہے منشیات حرام ہیں تو مختلف لذیز مشروبات عطا کیے ہیں جو جسم کو غذائیت اور تازگی پہنچاتے ہیں۔

اگر ہم اسلام کے احکامات کی پیروی کریں تو معلوم ہوگا کہ اگر ہمارے اوپر بعض اشیاء کے استعمال کی پابندی ہے تو دوسری طرف بے شمار نعمتوں کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسان کے لیے تخفیف کا ارادہ رکھتا ہے کیونکہ اسے کمزور پیدا کیا گیا ہے جیسا کہ النساء: ۲۸ میں موجود ہے۔

(۴) جو چیز حرام کا باعث بنے وہ بھی حرام ہے:

جو چیز کسی حرام کا باعث وسبب بنے اسلام نے اس پر بھی پابندی عائد کی ہے اور حرام کے ذرائع کا سد باب کیا ہے۔ مثلاً اسلام نے زنا حرام کیا ہے تو اس کے اسباب وعلل پر بھی پابندی

عائد کردی ہے جیسا کہ مرد وزن کا اختلاط' غیر محرم عورت کے ساتھ خلوت' برہنہ تصاویر' نظر بازی' فحش قسم کا لٹریچر جو نفسانی خواہشات کو ابھار کر زنا کی طرف مائل کرتا ہے۔ وغیرھا

دوسری مثال یہ لے لیں کہ شراب کا پینا جہاں حرام کیا ہے وہاں شراب میں کسی طرح کی معاونت بھی حرام ٹھہرائی ہے۔ جیسے شراب کی غرض سے بعض اشیاء کی کاشت' شراب کی فیکٹریوں میں ملازمت' شراب اٹھا کر لے جانا' شراب کی خرید وفروخت وغیرہ۔

الغرض جو چیز حرام ہے اس کی حرمت کے اسباب پر بھی پابندی عائد کی گئی ہے۔

(۵) حرام کو حلال بنانے کے لیے حیلہ کرنا:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاں ظاہری وسائل جو محرمات کا باعث ہوں حرام کیے ہیں وہاں اس نے ان حیلوں کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ جن کی بنا پر حرام کو حلال کیا جاتا ہے۔ یہود کی حیلہ جوئیوں کا قرآن حکیم میں کئی ایک مقام پر تذکرہ کیا گیا ہے ان پر ہفتہ والے دن شکار منع تھا انہوں نے حیلہ کرکے اس کو حلال بنایا۔ صحیح حدیث میں ہے کہ ان پر چربی حرام کی گئی تھی انہوں نے اس کو پگھلا کر تیل بنایا پھر بیچ کر اس کی قیمت کھالی۔ اور حلال کو حرام یا حرام کو حلال بنانے کے لیے لوگ مختلف حیلوں بہانوں سے کام لیتے ہیں بعض اشیاء کے نام تبدیل کر دیتے ہیں۔ جیسے رشوت کو ہدیہ' تحفہ' سود کا نام پرافٹ و نفع' شراب کا نام وہسکی وغیرہ۔ کسی چیز کا نام بدل دینے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ اور نہ ہی ان کی حرمت اور گناہ میں کوئی فرق پڑتا ہے حدیث میں اس کے متعلق پیشگی انتباہ موجود ہے۔ سنن ابن ماجہ' نسائی' مسند احمد اور سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ میں حدیث ہے کہ (لیستحلنّ طائفةٌ من امتی الْخمر یسمُّونها بغیرِ اِسمِها) میری امت کا ایک گروہ شراب کا نام بدل کر اس کو حلال کرلے گا۔

لہٰذا حرام کو حلال بنانے کے لیے کسی بھی قسم کا حیلہ کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ حیلوں بہانوں سے شرع کے حکم کو بدلنا یہود کا کام تھا۔ کسی مسلم کو یہ زیب نہیں کہ وہ اللہ کے قوانین کو توڑنے کے لیے شیطانی چالیں چل کر حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرائے۔

(۶) نیک نیتی حرام کو حلال نہیں کرسکتی:

یہ بات صحیح اور درست ہے کہ شرعی معاملات میں نیک نیتی کو بڑا دخل ہے جیسا کہ صحیح البخاری وغیرہ میں حدیث ہے (انما الاعمال بالنیات) اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ لیکن

یہ بھی یاد رہے کہ جس کام کے لیے نیک نیت کی جارہی ہے وہ کام بھی شرع کے مطابق ہو- لہٰذا اگر کوئی شخص اس نیت کے ساتھ رشوت' سود' جوا' اور حرام کھیل کھیلے کہ وہ روپیہ کما کر مسجد' مدرسہ وغیرہ تعمیر کرے گا تو نیت کی یہ پاکیزگی اس حرام کو حلال نہیں بنائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور پاک چیز ہی قبول کرتا ہے- جیسا کہ صحیح مسلم و ترمذی میں موجود ہے-

(۷) حرام میں واقع ہونے کے ڈر سے مشتبہات سے بچنا:

اللہ نے حرام و حلال کا معاملہ لوگوں پر مخفی نہیں رکھا بلکہ اسے کھول کر بیان کر دیا ہے ارشادِ باری ہے! ﴿وقد فصّل لکم ماحرّم علیکم﴾ (انعام:۱۱۹) اس نے جو چیزیں تم پر حرام کی ہیں ان کی تفصیل بیان کر دی ہے-

لہٰذا جو چیزیں واضح طور پر حلال ہیں ان کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں اور جو چیزیں واضح طور پر حرام ہیں ان سے اجتناب لازم ہے- البتہ حلال اور حرام کے درمیان بعض چیزیں ایسی ہیں جو مشتبہ ہیں ایسے امور سے اکثر لوگ ناواقف ہوتے ہیں ایسے امور سے بچنے کا نام تورّع ہے اور یہ تورّع سد ذریعہ کا کام دیتا ہے اور انسان کی صحیح نہج پر تربیت کرتا ہے جس نے ان مشتبہ امور کو ترک کیا اس نے اپنی آبرو اور دین کو بچالیا اور جو ان میں واقع ہو گیا تو اس کا حرام میں مبتلا ہونا بعید نہیں جس طرح کوئی آدمی اپنے جانور ممنوعہ چراگاہ کے ارد گرد چراتا ہے تو ان جانوروں کا اس ممنوعہ چراگاہ میں واقع ہونا ممکن ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی بھی چراگاہ ہے جس کے گرد واقع نہیں ہونا چاہیے اور وہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں- (صحیح البخاری- صحیح المسلم وغیرھا)

لہٰذا متقی شخص مشتبہ امور سے بھی اجتناب کرتا ہے تا کہ حرام میں واقع ہونے سے بچا جائے-

(۸) حرام سب کے لیے حرام ہے اور ہر جگہ حرام ہے:

اسلامی شریعت میں جو چیز حرام ہے وہ عام ہے سب کے لیے حرام ہے ایسا نہیں کہ عربی کے لیے حلال ہو اور عجمی کے لیے حرام' کالے کے لیے ممنوع اور گورے کے لیے مباح اور نہ ہی کسی چیز کی حلت بادشاہ' امیر اور کاہن و جادوگر کے لیے مخصوص اور عام آدمی کے لیے حرمت اور جو چیز حرام ہے وہ ہر ملک و شہر میں حرام ہے ایسا نہیں کہ ایک چیز مسلم ممالک میں حرام ہے اور غیر مسلم ممالک میں جا کر مسلمانوں کے لیے حلال ہو جائے - یہودی جنہوں نے اپنی کتب میں

تحریف سے کام لیا تھا وہ اس زعم باطل میں مبتلا تھے کہ سود ایک یہودی پر صرف اس صورت میں حرام ہے جب وہ اپنے یہودی بھائی کو قرض دے کسی غیر یہودی کو سود پر قرض دینے میں کوئی حرج نہیں۔ جیسا کہ قرآن میں موجود ہے اور ''سفر تثنية الاشتراع'' میں بھی مرقوم ہے کہ وہ دوسری ملت والوں کے ساتھ خیانت کرنے میں گناہ نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ آل عمران: ۷۵' میں ہے اللہ تعالیٰ نے عدل وانصاف کا حکم دیا ہے جیسا کہ نساء: ۱۰۵' ۱۰۶ میں ہے اور محمد ﷺ نے اپنی بیٹی فاطمہؓ کے بارے میں فرمایا تھا۔ اگر وہ بھی چوری کرتیں تو ان کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔ (بخاری)

لہٰذا اسلام نے حلال وحرام کے بارے عدل وانصاف کا دامن تھاما ہے بعض لوگ بلاد کفر میں سود اور زنا کو جائز سمجھے بیٹھے ہیں یہ بات بالکل غلط ہے جیسے سود یہاں حرام ہے اسی طرح بلاد کفر میں بھی حرام ہے اس طرح زنا جیسا قبیح وشنیع عمل بھی ہر جگہ حرام ہے۔ خواہ بلادِ کفر ہو یا اسلام۔

(۹) عبادات اصلاً ممنوع اور دیگر اشیاء مباح ہیں:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں ''اقوال وافعال میں بندوں کے تصرف کی دو قسمیں ہیں ایک قسم عبادات کی ہے جن سے دینی حالت درست ہوتی ہے اور دوسری قسم عادات کی ہے جن کی ضرورت دنیوی معاملات میں ہوتی ہے شریعت کے اصولوں کا مطالعہ کرنے سے یہ قاعدہ کلیہ ابھر کر سامنے آتا ہے کہ عبادات جن کو اللہ نے واجب یا مستحب ٹھہرایا ہے ان کی یہ حیثیت شریعت ہی سے ثابت ہوسکتی ہے رہیں عادات تو دنیا کے معاملات میں لوگ ضرورتاً ان کے عادی ہوتے ہیں اور وہ اصلاً غیر ممنوع ہیں۔ اس لیے جن چیزوں کو اللہ نے ممنوع قرار دیا ہے ان کے علاوہ کسی اور چیز کو ممنوع قرار نہیں دیا جاسکتا۔ امر ونہی کا معاملہ درحقیقت قانونِ الٰہی سے متعلق ہے اور عبادات کا معاملہ بھی سراسر اسی کے حکم پر ہے لہٰذا جس بات کا حکم اسکی طرف سے نہیں ملا اس کی ممانعت کا حکم کیسے لگایا جاسکتا ہے۔ اس لیے امام احمد اور دیگر فقہائے اہلحدیث اس بات کے قائل ہیں کہ عبادات اصلاً توقیفی (جن کا علم وحی کے ذریعے ہی سے ہوسکتا ہے) ہیں لہٰذا مشروع وہ ہے جسے اللہ نے مشروع کیا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہم پر صادق آئے گا کہ ﴿ام لهم شركاء شرعوا لهم من الدين مالم يا ذن به الله﴾ (شوریٰ:۲۱)

کیاان کے لیے ایسے شریک ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین کے وہ طریقے مقرر کر

دیے ہیں جن کی اجازت اللہ نے نہیں دی۔ البتہ عادات کا معاملہ اس سے مختلف ہے وہ اصلاً مباح ہیں اس لیے اس قبیل کی صرف ان چیزوں سے روکنا چاہیے جن کو اسلام نے حرام ٹھہرایا ہے بصورت دیگر اللہ کا یہ ارشاد ہم پر صادق آئے گا ﴿قل ارأیتم ما انزل الله لکم من رزق فجعلتم منه حراماً و حلالاً﴾ (یونس:۵۹) کہہ دیجئے تم نے یہ بھی سوچا کہ اللہ نے جو رزق تمہارے لیے نازل فرمایا ہے اس میں سے کسی کو تم نے حرام اور کسی کو حلال ٹھہرایا ہے۔ یہ نہایت ہی اہم اور مفید اصول ہے اور اس اصول کے پیش نظر ہم کہتے ہیں کہ بیع' ہبہ اور اجارہ وغیرہ عادات کے قبیل سے ہیں جن کے لوگ روزمرہ زندگی میں ضرورت مند ہوتے ہیں۔ مثلاً کھانا' پینا' لباس شریعت نے ان عادات کو آدابِ حسنہ سے سنوارا ہے جن عادات میں خرابی تھی ان کو حرام ٹھہرایا اور جو ضرورت کے قبیل سے تھیں ان کو لازم کر دیا اسی طرح جو عادات نامناسب تھیں ان کو ناپسندیدہ ٹھہرایا اور ان باتوں میں مصلحت کا پہلو غالب تھا ان کو مستحب قرار دیا۔ اس حقیقت کے پیش نظر لوگ اپنی مرضی کے مطابق لین دین اور اجرت پر معاملہ کرنے کے لیے آزاد ہیں جب تک کہ شریعت سے کسی چیز کی حرمت ثابت نہ ہو جائے اس کی مثال خورد و نوش کی ہے کہ لوگ محرمات کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی مرضی کے مطابق کھا پی سکتے ہیں۔ اگرچہ بعض چیزیں استحباب اور بعض چیزیں کراہت کے درجے میں ہوتی ہیں لیکن جب تک شریعت پابندی عائد نہ کرے وہ اپنی اصل اطلاقی حالت پر باقی رہتی ہیں۔ (القواعد النورانیہ الفقہیہ ص ۱۱۲' ۱۱۳)

(۱۰) ضرورتیں بقدر ضرورت حرام کو حلال بنا دیتی ہیں:

جب انسان مضطر و لاچار ہو تو بقدر ضرورت اس کے لیے حرام حلال ہو جاتا ہے مثلاً کسی انسان کی بھوک سے جان نکل رہی ہو اور اس کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ نہ ہو تو اس کے لیے حرام اتنا کھانا جائز ہوتا ہے جس سے جان بچ سکتی ہو ضرورت سے زائد لینا حرام ہی ہوگا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ﴿فمنِ اضطُرَّ غیرَ باغٍ وَلاعادٍ فَلا اِثْمَ عَلَیهِ ان الله غفور رحیم﴾ (البقرہ:۱۷۳)

جو شخص مجبور ہو جائے اور وہ اس (حرام) کا خواہش مند اور حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو تو اس پر کچھ گناہ نہیں بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت میں مضطر و مجبور کے لیے غیر باغٍ وَلاعادٍ کی قید جو ذکر کی گئی ہے اس کا

مطلب یہ ہے کہ حالت مجبوری میں حرام سے فائدہ اٹھانے والا حرام شے کی لذت کا طالب نہ ہو اور نہ ہی ضرورت کی حد سے تجاوز کرنے والا ہو۔

انسان کو اگرچہ بعض دفعہ مجبوری کے آگے جھکنا پڑتا ہے لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح مجبوری کے حوالے کر دے اور اپنے نفس کی لگام اسکے ہاتھ میں دے ڈالے۔ اسے ہر صورت میں حلال سے وابستہ رہنا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ جو چیز اضطراری کیفیت میں اس کے لیے حلال کی گئی ہے یہ اس کے خیال میں لگا رہے۔ اسلام نے یہ ایک سہولت دی ہے تو اس سے جتنی سہولت ملتی ہے اس کے مطابق فائدہ حاصل کرے۔ حدود اللہ سے متجاوز نہ ہو۔ مذکورہ بالا قواعد وضوابط ہم نے علامہ یوسف قرضاوی کی کتاب ''اسلام میں حلال وحرام'' سے اخذ کیے ہیں جو الدار السلفیہ بمبئی سے طبع ہوئی ہے۔ عصر حاضر میں حلال وحرام کی تفریق کیے بغیر امت کا بیشتر طبقہ دولت سمیٹنے میں مصروف ہے بہت کم افراد حلال کی روزی کے متلاشی ہے ہیں۔ ان حالات میں کتاب وسنت کی رو سے امت کی اصلاح انتہائی ضروری تھی۔ ہماری جماعت کے انتہائی قابل قدر، ثقہ عالم مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ نے اس عظیم کام کو اپنے ذمہ لیا اور لین دین کے احکام ومسائل کو شرح وبسط کے ساتھ عام فہم انداز میں مرتب کر کے عوام الناس کے سامنے پیش کر دیا۔

مولانا موصوف بے شمار خوبیوں کے حامل فرد تھے جنہوں نے بالخصوص عصری مسائل پر بڑا محققانہ اور فقیہانہ اسلوب اختیار کر کے سینکڑوں مسائل کو صفحہ قرطاس پر منتقل کیا۔

ان کے قلم سے نکلی ہوئی کئی کتب جہاں عوام الناس کی راہنمائی کا سبب بنیں وہاں اہل علم بھی ان سے مستغنی نہیں ہوئے۔ راقم کی احکام ومسائل کے حوالے سے خواہش تھی کہ ایک عمدہ ترین کتاب جو عصرِ حاضر کے مسائل پر بحث کرتی ہو مرتب کی جائے اور اس کے لیے کافی مواد بھی جمع کر لیا تھا انہی ایام میں پتہ چلا کہ مولانا موصوف کی کتاب ''تجارت اور لین دین کے احکام'' دوبارہ طبع ہو رہی ہے اور ان کے قابل قدر واجب الاحترام بیٹے پروفیسر نجیب الرحمان کیلانی اس کی طباعت کا بیڑہ اٹھا رہے ہیں۔ تو ملاقات پر خواہش ظاہر کی کہ اس کتاب میں موجود احادیث کی تخریج بھی ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ بہرکیف یہ ذمہ داری راقم کے حصے میں آ گئی اور کتاب میں موجود تمام احادیث پر صحت وضعف کا حکم لگانے کے ساتھ ساتھ ہر حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے حدیث کی کتاب سے کتاب باب اور حدیث نمبر کا حوالہ دے دیا ہے تاکہ قاری کے پاس جو بھی نسخہ

موجود ہو وہ آسانی کے ساتھ محولہ بالا کتاب اور باب نکال کر حدیث دیکھ سکے- علاوہ ازیں چند ایک روایات کی تخریج نہیں ہو سکی- جن کی تلاش جاری ہے اور جوں ہی کوئی قابل استناد حوالہ ملا اسے ملحق کر دیا جائے گا! ان شاء اللہ

نیز اس کتاب کے آخر میں راقم کا گروی کے متعلق ایک مضمون ضمیمہ کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے- اگر اس کام میں کوئی خوبی ہے تو وہ اللہ کی فضل و رحمت ہے اور اگر کہیں کوئی کمی و کوتاہی ہے تو وہ میری لغزش کا نتیجہ ہے- اللہ تبارک وتعالیٰ کتاب کے مؤلف' مخرج' پرنٹر اور جملہ معاونین کو اپنی رحمت کاملہ میں جگہ عنایت فرمائے اور قیامت والے دن نجات کا ذریعہ بنائے اور رسولِ اکرم ﷺ کی شفاعت نصیب فرمائے- (آمین)

ابوالحسن مبشر احمد ربانی عفا اللہ عنہ

۲۰۰۲/۱۰/۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب:۱

خودغرضی اور ایثار

انسان فطرتاً خودغرض واقع ہوا ہے وہ چاہتا ہے کہ ہر بہتر چیز اسے کسی نہ کسی طرح حاصل ہو جائے خلّاقِ فطرت نے خود اس انسانی جبلت کی طرف اشارہ فرما دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿لَا یَسْــئَمُ الْاِنْسَـانُ مِنْ دُعَـآءِ الْخَیْرِ﴾ (۴۱:۴۹) (انسان بھلائی (مال ودولت) مانگتے کبھی نہیں تھکتا۔)

یہ جبلت اگر اپنی حد کے اندر رہے تو گوارا ہے۔ لیکن جب یہ اپنی حدود سے تجاوز کر جائے تو ہر انسان اپنے ہی فائدہ کی بات سوچنے لگ جائے تو اس سے معاشرہ میں ایک ایسا بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے جو پورے معاشرے کو تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیتا ہے۔ باہمی ہمدردی اخوت اور ایثار جیسی صفات جمیلہ ناپید ہونے لگتی ہیں اور ان کی جگہ جھوٹ بددیانتی، مکروفریب، اور شقاوتِ قلبی جیسے اخلاقِ رذیلہ ابھر آتے ہیں جو آگے چل کر بہت سی برائیوں کو جنم دیتے ہیں۔ ہر شخص اپنے معمولی سے فائدہ کی خاطر دوسرے بھائی کا بھاری نقصان کر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ جب ہر فرد خودغرضی کا مجسمہ بن جائے تو اس سے ہمارے لین دین کے معاملات ہمارے کاروبار اور ہماری تجارت سب کا متاثر ہونا لازمی امر ہے۔

مثل مشہور ہے کہ تمام تنازعات اور جھگڑوں کی بنیاد زر، زن اور زمین یہی تین چیزیں ہیں۔ لیکن اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کی تہہ میں بھی یہی خودغرضی کارفرما ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر خودغرضی اس قدر مذموم چیز ہے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو خود

غرض پیدا ہی کیوں فرمایا؟ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بھی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا یہ اسی جبلت ہی کا کرشمہ ہے کہ آپ اس جہانِ رنگ و بو کو یوں پر بہار اور پرکشش دیکھ رہے ہیں اگر انسان کو بے غرض پیدا کر دیا جاتا تو یہ دنیا بس ایک راہبوں کی بستی بن کر رہ جاتی جس میں نہ متمدن شہر نظر آتے نہ خوبصورت اور بلند و بالا عمارتیں' نہ وسائلِ آمد و رفت میں گوناگوں قسم کی ترقیاں وجود میں آتیں نہ کہیں میلوں تک لہلہاتے ہوئے کھیت اور ثمر بار باغات نظر آتے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا فرمائی جو اپنا فائدہ سوچتی اور اس فائدہ کے حصول کے لیے مختلف طریقوں اور تدبیروں پر غور کرتی ہے۔ اسے دوسرے کے مفادات سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ عقل کی ایسی طرزِ فکر کا نام خودغرضی ہے۔

یہ تھی وہ غرض و غایت جس کے لیے انسان کو خودغرض پیدا کیا گیا۔ رہے اس کے نقصانات تو ایسے مفاسد سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی حدود متعین فرما دیں۔ اور بذریعہ وحی معاشرہ میں رہنے والے ہر انسان کے حقوق کی تعیین فرما دی اور ساتھ ہی اس بات سے بھی آگاہ کر دیا کہ جو شخص ان حدود سے تجاوز کرے گا وہ ظالم ہے وہ مجرم ہے۔ جسے اس دنیا میں بھی اس کے کیے کا بدلہ ملے گا۔ اور اگر یہاں کسی طرح بچ گیا تو اخروی عدل و انصاف سے کسی صورت نہیں بچ سکتا اور اس طرح ایک ایسے پرامن معاشرہ کے لیے بنیادیں فراہم کر دیں۔ جو دنیوی ترقی کی دوڑ میں بھی پوری طرح حصہ لے سکے۔

لیکن جب بھی انسان نے اپنی ذاتی اغراض سے مغلوب ہو کر احکام الٰہیہ سے بے اعتنائی کی روش اختیار کی تو معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہو گیا۔ آج کل ہمارے معاشرہ میں بھی خودغرضی کا جذبہ اپنی حد سے تجاوز کر چکا ہے۔ ہر شخص اپنے معمولی سے مفاد کی خاطر اپنے بھائی کے حلق پر چھری چلانے تک سے دریغ نہیں کرتا۔ کاروبار میں ہر طرح کی بددیانتی اور بدمعاملگی ہو رہی ہے۔ ہر شخص اپنے حقوق سے زیادہ سے زیادہ وصولی کرنے اور دوسرے کا حق دبانے کی فکر میں رہتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوْا﴾ (۳۰:۴۱)	(جنگلوں اور دریاؤں میں لوگوں کے گناہوں کے باعث فساد رونما ہو گیا تاکہ اللہ تعالیٰ ایک کو دوسرے سے سزا دلوا دے۔)

گویا جب بنی نوعِ انسان اپنے مفاد کی خاطر دوسرے پر ظلم کرتے ہیں تو ہر ایک کو اس

عمل کی سزا دوسرے سے ملتی رہتی ہے اور اس طرح ظلم و جور کی ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے کہ ساری مملکت اس کی زد میں آ جاتی ہے۔

خودغرضی کا سدباب

اسلام نے خودغرضی کے مفاسد کے خاتمہ کے لیے اور ایک خوشگوار اور پاکیزہ معاشرہ کے قیام کے لیے تین طرح کے اقدامات فرمائے ہیں۔ باہم تنازعات کے خاتمہ کے لیے یہ بنیاد فراہم کی ہے کہ انسان اپنے حق سے تجاوز نہ کرے بلکہ اپنے حق سے کچھ کم پر ہی اکتفا کرے۔ اس سے اگلا اقدام باہمی ہمدردی اور اخوت کا ہے۔ اور تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ انسان اپنی ضروریات اور اپنے مفادات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اپنے بھائی کے مفادات کا خیال رکھے۔ جسے عرف عام میں ایثار کہا جاتا ہے۔ اب ہم ان تینوں مراحل کا ذرا تفصیل کے ساتھ ذکر کریں گے۔

(۱) اپنے حق سے کم پر اکتفا

اسلام نے ہر شخص کے حقوق سے متعلق کچھ اصول بیان فرما دیئے ہیں۔ مثلاً ہر شخص کا یہ حق ہے کہ اس سے عدل و انصاف ہو۔ چنانچہ لین دین کے سلسلہ میں ارشاد باری ہے۔

﴿وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ﴾ (ترازو کی ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو۔)

(۳۵:۱۷)

اب اگر ایک دکاندار طے شدہ نرخ کے مطابق پوری رقم لے کر خریدار کو پورا پورا تول کر دے دیتا ہے تو عدل و انصاف کا تقاضا پورا ہو گیا۔ اور بائع اور مشتری میں تنازعہ کا امکان ختم ہو گیا۔

اب اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ بائع یا مشتری میں سے کوئی ایک اپنے حق سے کم پر قناعت کر لے۔ ایک دفعہ رسول ﷺ بازار میں تشریف لے گئے۔ ایک تولا کسی جنس کا وزن کر رہا تھا۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا زن وارجح[1]۔ یعنی ''وزن کرتے وقت قدرے جھکتا

[1] ترمذی۔ ابواب البیوع باب ماجاء فی الرجحان فی الوزن (۱۳۰۵)۔ نیز نسائی۔ کتاب البیوع۔ باب الرجحان فی الوزن۔ (۴۶۰۶) ابوداؤد کتاب البیوع والاجارات باب فی الرجحان فی الوزن (۳۳۳۶، ۳۳۳۷)
ابن ماجہ۔ التجارات۔ باب الرجحان فی الوزن (۲۲۲۰۔ ۲۲۲۱)
ابن حبان (۱۴۴۴) المنتقی لابن الجارود (۵۵۹) مستدرک حاکم ۲/۳۰، ۳۱ اس حدیث کو امام ترمذی نے حسن صحیح اور امام ابن حبان، ابن الجارود نے صحیح اور حاکم و ذہبی نے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔

تول-''اب یہ تو ظاہر ہے کہ جھکتا تولنے سے بائع کو کچھ کسر لگے گی اور خریدار کو کچھ فائدہ پہنچے گا اور وہ خوش ہو جائے گا-لیکن یہ بائع جب کسی دوسرے سودے میں خود خریدار بنے گا تو اسی اصول کے مطابق اسے بھی فائدہ پہنچ جائے گا-اس کی کسر کی تلافی بھی ہو جائے گی اور وہ خوش بھی ہو جائے گا-گویا اس اصل کے مطابق معاشرہ کے ہر فرد کو عدل وانصاف کے علاوہ خوشگواری بھی میسر آئے گی اور تنازعات کا امکان بہت حد تک کم ہو جائے گا-کیونکہ یہ مسلمہ امر ہے کہ تنازعات ہمیشہ اس وقت معرض وجود میں آتے ہیں جب فریقین میں سے کوئی ایک یا دونوں دانستہ طور پر اپنے حق سے تجاوز کرنے لگتے ہیں-

اب اس معاملہ کا دوسرا پہلو ملاحظہ فرمایئے-رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ اس وعدہ پر ایک اونٹ ادھار لیا کہ جب صدقہ کے اونٹ آئیں گے تو اونٹ کے بدلے ویسا ہی اونٹ واپس دے دیں گے-جب صدقہ کے اونٹ آئے تو آپ ﷺ نے ابورافع رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اونٹ واپس کیا جائے-ابورافع رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ صدقہ کے جو اونٹ آئے ہیں وہ سب کے سب اس اونٹ سے بہتر اور قیمتی ہیں جو ادھار لیا گیا تھا آپ ﷺ نے فرمایا بہتر ہی ادا کرو-اور ساتھ ہی یہ اصول بیان فرمادیا' کہ

((اِنَّ خِيَارَ النَّاسِ اَحْسَنُهُمْ قَضَآءً [1])) (بہتر آدمی وہ ہے جو ادائیگی کے لحاظ سے بہتر ہو-)

لیتے وقت اپنے حق سے کچھ کم پر قناعت کرنا اور دیتے وقت کچھ زیادہ دینا دراصل ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں-اور یہ ایثار کا پہلا درجہ ہے-جو معاشرہ ان اصولوں کو اپنائے-اس میں تنازعات کی کمی' خوشگوار ماحول کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو برکات نازل ہوتی ہیں-اس کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے ملاحظہ فرمایئے-

بنی اسرائیل میں سے دو آدمیوں نے مل کر کھیتی باڑی شروع کی ایک بوڑھا تھا-دوسرا نوجوان-برابر کی شراکت تھی-جب فصل پک کر تیار ہوگئی تو دونوں نے مل کر غلہ کے برابر حصے کر لیے-شام ہو چلی تھی اور ہر ایک کو اپنا اپنا حصہ سر پر اٹھا کر اپنے اپنے گھر لے جانا تھا-نقل وحمل کا کوئی دوسرا ذریعہ میسر نہ تھا-پہلے جوان آدمی نے اپنے حصہ میں سے گٹھڑی باندھی اور اسے سر پر

[1] بخاری-کتاب الوکالۃ وباب وکالۃ الشاھد والغائب جائزۃ (۲۳۰۵)' مسلم-کتاب المساقات-باب جواز اقتراض الحیوان-(۱۱۸/۱۶۰۰)

اٹھا کر اپنے گھر روانہ ہوا- غلہ کے پاس بوڑھا اکیلا بیٹھا تھا- اسے خیال آیا کہ میں تو زندگی کی بہاریں دیکھ چکا ہوں- مجھے آخر اتنے رزق کی ضرورت بھی کیا ہے؟ یہ جوان آدمی ہے اس کو بے شمار ضرورتیں درپیش ہوں گی- یہ مجھ سے زیادہ حاجتمند ہے- یہ خیال آتے ہی اس نے اپنے حصہ میں سے کچھ غلہ اس نوجوان کے حصہ کی طرف دھکیل دیا-

نوجوان گھر سے واپس آیا تو اب بوڑھے کی غلہ گھر لے جانے کی باری تھی- جب وہ غلہ کی گٹھڑی باندھ کر اپنے گھر روانہ ہوا تو اس نوجوان کو خیال آیا کہ میں تو نوجوان ہوں- خوب محنت کر سکتا ہوں- ساری عمر کھاتا رہوں گا- اس بوڑھے نے کس مشقت سے میرے ساتھ کھیتی باڑی کا کام کیا ہے- میں تو جوان تھا لیکن اس بیچارے کو بہت زیادہ مشقت اٹھانا پڑی ہے- لہٰذا یہ مجھ سے زیادہ کا حقدار ہے- یہ سوچ کر اس نے بھی اپنے حصہ میں سے کچھ غلہ دھکیل کر بوڑھے کے حصہ کی طرف کر دیا-

اس طرح وہ دونوں باری باری رات کے اندھیرے میں اپنا اپنا حصہ اپنے گھروں کو لے جاتے رہے- اور ایک دوسرے کے حصے کی طرف غلہ منتقل کرنے کا سلسلہ بھی یوں ہی چلتا رہا ایک جاتا تو دوسرا اپنے حصے کا کچھ غلہ دوسرے کے حصے کی طرف دھکیل دیتا- بعد میں دوسرا بھی وہی کام کرتا لیکن دونوں میں سے کسی کو بھی ان کی اس باہمی ہمدردی اور اخوت و ایثار کے کام کی خبر نہ ہوئی-

اب کرنا خدا کا یوں ہوا کہ ان کا پروردگار ان دونوں پر مہربان ہو گیا- وہ ساری رات غلہ اپنے گھروں کو لے جاتے رہے لیکن غلہ تھا کہ ختم ہونے کو نہ آتا تھا- وہ خود حیران تھے کہ ان کا غلہ زیادہ تو نہ تھا- جتنا وہ اپنے اپنے گھروں کو لے جا چکے ہیں- بالآخر جب صبح کی روشنی ہوئی اور ہر چیز نمایاں طور پر نظر آنے لگی- تب کہیں جا کر ان کے ڈھیر ختم ہونے کو آئے [1]

سوچنے کی بات ہے کہ رزق میں برکت اور فراوانی کہاں سے آ گئی؟ پھر ایسے واقعات بنی اسرائیل سے مختص نہیں- دور نبویؐ میں بھی ایسے واقعات بکثرت مل جاتے ہیں- بلکہ بعد کے ادوار بھی ایسے واقعات سے خالی نہیں- ان واقعات کو اگر تفصیل اور مستند حوالہ جات سے پیش کیا جائے تو ایک الگ ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے- یہی وہ مقام ہے کہ علت و معلول اور سبب اور مسبب کی سب کڑیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں- اور انسان اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ (٦٥:٣) پر ایمان لانے پر مجبور ہو جاتا ہے-

---

[1] یہ واقعہ مجھے نہیں ملا-

۲-اخوت اور باہمی ہمدردی

تنازعات کے خاتمہ اور خوشگوار معاشرہ کے قیام کے لیے حقوق و فرائض کی تعیین کے بعد دوسرا اقدام معاشرہ کے افراد میں بھائی بندی کے جذبات کو فروغ دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ (۱۰:۴۹) (مومنوں کی جماعت آپس میں بھائی بھائی ہی تو ہے۔)

اور رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

''کوئی شخص اس وقت تک ایماندار نہیں ہوسکتا جب تک اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے آپ کے لیے پسند کرتا ہے۔''[۱]

اور ایک مرتبہ آپ ﷺ نے یوں فرمایا کہ ''مسلمان معاشرہ ایک جسم کی مانند ہے جس کا کوئی ایک عضو اگر درد میں مبتلا ہو تو اس سے سارا جسم درد اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔''[۲]

اور ایک مرتبہ یوں فرمایا ''مسلمان معاشرہ ایک مضبوط عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط کرتا ہے۔''[۳]

مندرجہ بالا تینوں تمثیلیں مسلم معاشرہ میں اخوت اور باہمی ہمدردی کی بہترین صورت پیش کرتی ہیں۔ ایک دنیا دار معاشرہ میں ہر انسان اپنی ہی بھلائی اور فائدہ سوچنے کا خوگر ہوتا ہے یہ جذبہ کس حد تک لوگوں کے اذہان پر مسلط ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ مجھے ایک دفعہ ایک اچھے بھلے عالم دین سے لین دین کا معاملہ پیش آیا۔ تو وہ صاحب فرمانے لگے آپ کو اپنا فائدہ سوچنے کا حق ہے اور مجھے اپنے فائدہ سوچنے کا حق ہے۔ میں نے کہا کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ جہاں آپ اپنا فائدہ سوچیں۔ ساتھ ہی میرا فائدہ بھی سوچیں۔ میرے اس جواب سے وہ کچھ نادم سے ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ کے مندرجہ بالا ارشاد کا مطلب ہی یہ ہے کہ مسلمان اگر اپنے فائدہ کی بات سوچتا ہے تو اپنے دوسرے بھائی کے لیے بھی فائدہ مند بات ہی سوچے۔

تجارت اور دوسرے کاروباری معاملات میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں۔ جن میں

---

[۱] بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب من الایمان ان یحب لاخیه مایحب لنفسه (۱۳)
[۲] مسلم۔ کتاب البر والصلۃ والادب۔ باب تراحم المومنین و تعاطفهم و تعاضدهم ۶۶/۲۵۸۶
[۳] بخاری۔ کتاب المظالم۔ باب نصر المظلوم (۲۴۴۶) نیز کتاب الصلوٰۃ باب تشبیك الاصابع فی المسجد وغیره (٤٨١) مسلم کتاب الاسباب تراحم المومنین و تعاطفهم و تعاضدهم ٦٥/٢٥٨٥)

فریقین کا فائدہ ہوتا ہے۔ مثلاً آجر اور اجیر کا معاملہ یا مضاربت کا معاملہ۔ لیکن کچھ معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن میں ایک کا فائدہ دوسرے کے نقصان پر منتج ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے تمام سودے شریعت نے ممنوع قرار دیئے ہیں۔ اور کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں ایک کا فائدہ اور دوسرے کا نقصان یقینی ہوتا ہے ایسے سودے حرام ہیں اور ایسے معاملات کی واضح تر مثال سود ہے۔

باہمی ہمدردی کا پہلو یہ ہے کہ انسان دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہو۔ اور ان کے کام آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''کوئی شخص جب تک اپنے بھائی کے کام میں لگا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے کام میں لگے ہوتے ہیں۔''[1] اگرچہ ایک دنیادار معاشرہ یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے'

کہ تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

شریعت نے اغنیاء کے اموال میں غرباء و مساکین کا حق مقرر کر کے انسانی ہمدردی اور اخوت کا بہترین سبق دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ یقین دہانی بھی کرادی ہے کہ صدقات سے مال گھٹتا نہیں بلکہ بڑھتا ہے۔ حالانکہ وہ ہمیں گھٹتا نظر آتا ہے۔ یہ مال بڑھتا کیونکر ہے اس کا تفصیلی جواب تو ہم ''سود'' کے باب کے ذیلی عنوان 'بچت اور سرمایہ کاری کا اسلامی نظریہ' میں دیں گے۔ البتہ اجمالی جواب یہ ہے کہ ہماری عقل ان سب وسائل کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے جن کے ذریعہ کسی انسان کو اس کا رزق فراہم ہوتا ہے اور جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے ﴿وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ کہہ کر اشارہ کر دیا ہے۔

اس ضمن میں صحیح مسلم میں ایک واقعہ مذکور ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ایک آدمی جنگل میں جا رہا تھا۔ اس نے بادل سے ایک آواز سنی جیسے کوئی کہہ رہا ہے کہ جا کر فلاں شخص کے باغ کو سیراب کردو۔ وہ بادل ایک طرف چلا۔ پھر وہاں پتھریلی زمین پر برسا۔ ایک نالی نے وہ سب پانی جمع کیا وہ آدمی اس پانی کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ آگے چل کر اس نے دیکھا کہ ایک آدمی اپنے باغ کو سیراب کرنے کے لیے بیلچہ سے اس نالی کو درست کر رہا ہے۔ اس کے درست کرنے کے ساتھ ہی بارش کا یہ پانی وہاں پہنچ گیا۔

یہ شخص اللہ تعالیٰ کی اس قدرت پر بہت متعجب ہوا' اور باغ والے سے پوچھنے لگا۔ اللہ

---

[1] بخاری کتاب الاکراہ باب یمین الرجل لصاحبه۔ (۶۹۵۱) وکتاب المظالم باب لا یظلم المسلم المسلم و لا یسلمه (۲۴۴۲)

کے بندے! تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے وہی نام بتایا جو اس نے بادل سے سنا تھا- اب باغ والے نے اس شخص سے پوچھا: اے اللہ کے بندے تم میرا نام کیوں پوچھتے ہو؟ وہ کہنے لگا کہ میں نے اس بادل سے جس کے پانی سے تو اپنا باغ سیراب کر رہا ہے- یہ آواز سنی تھی کہ جا کر فلاں شخص کے باغ کو سیراب کرو- اس میں تیرا ہی نام لیا گیا تھا- اب تم یہ بتاؤ کہ تمہارا وہ کونسا عمل ہے جس کی وجہ سے اللہ تم پر اتنا مہربان ہے-

باغ والا کہنے لگا- اب جبکہ تم نے یہ بات سن ہی لی ہے تو میں تمہیں بتا دیتا ہوں- اس باغ سے جو پیداوار ہوتی ہے- اس کا ایک تہائی حصہ میں صدقہ کر دیتا ہوں- ایک تہائی میں اور میرے اہل وعیال کھاتے ہیں اور ایک تہائی اس باغ میں لوٹا دیتا ہوں[1] (یعنی اگلی فصل کے خرچ اخراجات پر صرف کرتا ہوں)-

یہ ہیں وہ وسائل جن تک انسانی عقل کی رسائی ناممکن ہے- اب اس کے برعکس ایک دوسرا واقعہ بھی ملاحظہ فرمایئے- جو قرآن کریم سورۂ قلم میں مذکور ہے- اور وہ اس طرح ہے-

کسی شخص کا ایک باغ تھا جو بھرپور فصل دیتا تھا- اس شخص کا زندگی بھر یہ دستور رہا کہ جب بھی پھل کا فصل اٹھاتا تو اس کے تین حصے کرتا- ایک حصہ تو خود اپنے گھر کی ضروریات کے لیے رکھ لیتا' دوسرا حصہ اپنے قریبی رشتہ داروں اور ہمسایوں میں تقسیم کر دیتا اور تیسرا حصہ فقراء اور مساکین میں بانٹ دیتا- اس کی اس سخاوت کی وجہ سے اس کا باغ سب سے بڑھ کر فصل دیتا- کٹائی کے دن فقیر ومساکین موقعہ پر پہنچ جاتے اور اس سے اپنا اپنا حصہ وصول کر لیتے-

جب یہ شخص انتقال کر گیا تو اس کے بیٹوں کو خیال آیا کہ ہمارا باپ تو ساری عمر اس باغ کی فصل کو ادھر ادھر تقسیم کر کے اپنی کمائی کو یوں ہی لٹاتا رہا- اس باغ کی زمین بہت زرخیز ہے جو اردگرد کی زمینوں سے کئی گنا زیادہ فصل دیتی ہے- مگر ہمارے باپ نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا- اور زندگی بھر مفلس ہی رہا- اب کے یہ ریت ختم کر دینی چاہیے- باغ ہمارا ہے اور اس پر ہمارا ہی حق ہے- چنانچہ انہوں نے آپس میں طے یہ کیا کہ جب کٹائی کا موقع آئے تو راتوں رات کر لی جائے- تاکہ نہ غریب مسکین آئیں- نہ ہمیں تنگ کریں اور نہ ہم برے بنیں-

جب کٹائی کا وقت آ گیا- تو وہ راتوں رات خوشی خوشی اچھلتے کودتے اپنے باغ کی طرف روانہ ہوئے- ادھر خدا کا کرنا یوں ہوا- کہ اسی رات سخت آندھی طوفان آیا- جس میں

---

[1] مسلم- کتاب الزہد- باب فضل الانفاق علی المساکین وابن السبیل ۴۵/۲۹۸۴

آگ تھی- آندھی کے ذریعے وہ آگ باغ کے درختوں تک پہنچ گئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں انہیں جلا کر راکھ کر گئی- آن کی آن میں سارا باغ جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا- جب یہ عقل مند بیٹے وہاں پہنچے تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا- انہیں وہاں باغ نام کی کوئی چیز نظر نہ آئی- سوچنے لگے کہ ہم شاید رات کے اندھیرے میں کسی غلط جگہ پر پہنچ گئے ہیں- پھر جب کچھ حواس درست ہوئے تو حقیقت ان پر آشکار ہوگئی- کہ ان کی نیت کا فتور آندھی کا عذاب بن کر ان کے باغ کو بھسم کر گیا- اب وہ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے- ایک کہتا کہ تم ہی نے ترغیب دی تھی دوسرا کہتا یہ مشورہ تو تمہارا تھا- مگر اب پچھتانے سے کچھ بن نہ سکتا تھا- جو کچھ ہونا تھا- وہ ہو چکا تھا-[1]

باپ کو اس کی سخاوت اور دوسروں سے ہمدردی کا صلہ ملتا رہا کہ اس کا باغ سب سے بڑھ کر پھل لاتا تھا- اور جتنا کچھ وہ دوسروں پر خرچ کرتا- اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ اسے مہیا فرما دیتا مگر جب بیٹوں پر بخل اور حرص غالب آئی تو انہیں اس کا ثمر یوں ملا کہ نیت کے فتور نے مجسم طوفان کا روپ دھار کر باغ کو ملیامیٹ کر دیا- اس وقت نہ زمین کی زرخیزی کام آئی اور نہ ان کی کوئی تدبیر-

اس واقعہ سے یہ بات ازخود واضح ہو جاتی ہے کہ دوسروں سے ہمدردی اور اچھے سلوک کی بنا پر اگر اللہ تعالیٰ نادیدنی وسائل کے ذریعے رزق فراہم کر سکتا ہے تو نیت میں فتور آنے پر ایسے ہی نادیدنی وسائل سے دیئے ہوئے رزق کو چھین بھی سکتا ہے-

۳- ایثار

یہ باہمی ہمدردی کا سب سے بلند درجہ ہے- جو خودغرضی کی عین ضد ہے- جس کا معنی یہ ہے کہ انسان اپنی حاجت و ضرورت کو پس پشت ڈال کر اپنے بھائی کی وہی یا ویسی ہی ضرورت پوری کر دے- اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک صفت یہ بھی بیان فرمائی-

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (۹:۵۹)

(وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود فاقہ سے ہوں اور جو شخص اپنے نفس کے لالچ اور بخل سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ فلاح یافتہ ہیں-)

شُحّ دراصل ایسے انسان کو کہتے ہیں جو مال و دولت سمیٹنے پر تو بہت حریص ہو مگر انفاق فی

---

[1] یہ ساری تفصیل تفسیری روایات میں ہے ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ۸/۲۱۳ تا ۲۱۵، تفسیر طبری ۱۲/۱۸۹ تا ۱۹۴ تفسیر فتح القدیر ۵/۲۷۱ تا ۲۷۳

سبیل اللہ یا دوسری جائز ضروریات پر خرچ کرنے کے سلسلہ میں بخیل ہو- بالفاظ دیگر لین دین کے معاملات میں اس کی خود غرضی اپنی حد سے تجاوز کر چکی ہو-

یہ آیت کس موقعہ پر نازل ہوئی - وہ واقعہ مشہور ہے- لہٰذا ہم یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے - علاوہ ازیں اسلامی تاریخ میں ایثار کے اور بھی بہت سے واقعات مل سکتے ہیں- کیونکہ دینی تعلیمات تو ہمیشہ ایک جیسی ہی رہی ہیں- چنانچہ صحیح بخاری اور مسلم میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ

''تم سے پہلے لوگوں میں سے ایک شخص نے کسی سے زمین کا ایک ٹکڑا خریدا- اسے اس قطعہ زمین میں سے ایک ٹھلیا (گھڑا) ملا- جس میں سونا تھا- تو اس نے بائع سے کہا کہ اپنا سونا لے لو- کیونکہ میں نے تم سے صرف زمین خریدی ہے- یہ سونا نہیں خریدا- بائع نے کہا کہ میں نے تو زمین اور اس میں جو کچھ ہے سب تیرے ہاتھ میں فروخت کر دیا ہے- اب وہ اپنا مقدمہ ایک اور شخص (ثالث) کے پاس لے گئے- ثالث نے ان سے پوچھا' کیا تمہاری کوئی اولاد ہے- ایک نے کہا میرا لڑکا ہے دوسرے نے کہا' میری ایک لڑکی ہے- ثالث نے کہا اس لڑکے اور لڑکی کی شادی کر دو- '' اور اس میں سے کچھ صدقہ بھی کرو- [1]

غور فرمایئے اس ایک واقعہ میں ہمارے لیے کتنے اسباق پوشیدہ ہیں- یہ دونوں حضرات کس قدر بے لوث' راست باز' دیانت دار اور ایک دوسرے کا بھلا چاہنے والے انسان تھے مشتری کو ہل وغیرہ چلانے کے دوران سونے سے بھرا گھڑا ہاتھ لگ جاتا ہے- تو اسے یہ خیال نہیں آتا- کہ بس اب تو وارے نیارے ہو گئے- اتنی دولت جو ہاتھ لگ گئی ہے معلوم نہیں میں عمر بھر میں کما سکتا تھا یا نہیں بلکہ اسے خیال آتا ہے تو یہ آتا ہے کہ ممکن ہے کہ بائع یہ گھڑا دفن کر کے بھول گیا ہو- یا بائع کے کسی بزرگ نے یہ دفن کیا ہو اور بائع کو اس کا علم نہ ہو- لہٰذا یہ مال مجھے نہیں لینا چاہیے-

یہ سوچ کر وہ بائع کے پاس چلا گیا اور صورتِ حال سے مطلع کرنے کے بعد کہنے لگا کہ میں نے تو صرف آپ کو زمین کی قیمت ادا کی ہے- اس سونے کی قیمت ادا نہیں کی- لہٰذا یہ مال

[1] بخاری- کتاب احادیث الانبیاء باب "بلاعنوان" (۳۴۷۲)- مسلم' کتاب الاقضیة باب استحباب اصلاح الحاکم بین الخصمین ۲۱/۱۷۲۱

تمہارا ہی ہے بائع بھی اسی جیسا بے لوث انسان نکلا۔ وہ کہنے لگا کہ میں زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب کچھ تیرے ہاتھ فروخت کر کے اس کی قیمت لے چکا۔ اب یہ مال آپ ہی کا ہے میرا نہیں۔ گویا متنازعہ فیہ بات یہ بن گئی کہ اس خداداد خزانہ کا زیادہ حقدار بائع ہے یا مشتری۔

وہ دونوں تنازعہ کے تصفیہ کے لیے ایک ثالث کے پاس جاتے ہیں۔ یہ ثالث بھی انتہائی بے لوث اور خداترس تھا۔ اگر کوئی دنیادار ثالث ہوتا تو ایسی بندر بانٹ دکھاتا کہ سب کچھ خود ہی ہضم کر جانے کی راہیں تلاش کر لیتا اور وہ دونوں منہ دیکھتے رہ جاتے۔

بخاری اور مسلم میں اس ثالث کا نام مذکور نہیں۔ تاہم بعض دوسری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام تھے۔[1] جنہوں نے اس مدفون خزانہ کے کچھ حصہ کے صدقہ کرنے کو بھی فیصلہ کا ایک حصہ قرار دیا۔ اور یہ وہی تعلیم ہے جو ہماری شریعت میں بھی موجود ہے کہ اگر کسی شخص کو کوئی مدفون خزانہ یا کسی اور طرح کی دولت حاصل ہو تو اس میں پانچواں حصہ زکوٰۃ ہے اور بائع اور مشتری دونوں کے متعلق گمان غالب یہی ہے کہ وہ حضرت داؤدؑ کے صحابہ تھے۔

تو یہ ہیں اسلامی تعلیمات مگر آج کے مادہ پرستی کے دور میں ہمیں یہ روحانی غذائیں کیسے ہضم ہوں۔ خودغرضی ہماری گھٹی میں پڑ چکی ہے اور اسی بنیاد پر ہم ہر قسم کے معاملات سوچنے کے عادی بن چکے ہیں۔ لہٰذا ہمارے لین دین، ہمارے کاروبار اور ہماری تجارت میں آپ کو اسلامی تعلیمات سے جگہ جگہ تضاد اور ٹکراؤ نظر آئے گا۔ بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کے ذریعے حاصل ہونے والے رزق کو ہم حلال اور طیب سمجھتے ہیں۔ لیکن شرعی لحاظ سے وہ مذموم اور ناجائز ہیں۔ ایسے ہی معاملات کی وضاحت کے لیے یہ کتاب پیش خدمت ہے۔

---

[1] فتح الباری ۶/ ۵۱۸

باب:۲

بیع مبرور

بیع اور تجارت میں فرق:

شرعی اصطلاح میں بیع کا مفہوم بہت وسیع ہے- ہمارے ہاں تجارت اور خرید وفروخت کے الفاظ بیع کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے- بیع میں ہر وہ معاملہ شامل ہے- جس میں کسی آدمی کا دوسرے سے لین دین کا تعلق ہو- مثلاً ایک مالک کسی مزدور کو کام پر لگاتا ہے- تو یہ بیع ہے ایک مغنیہ عورت گا بجا کر لوگوں سے پیسے وصول کرتی ہے- تو یہ بھی بیع ہے- ایک عالم شرعی مسائل کی غلط تاویل کر کے فتویٰ کے پیسے یا کوئی اور مفاد حاصل کرتا ہے تو یہ بھی بیع ہے اور اس کے لیے قرآن کریم نے ''اشتریٰ'' لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی فروخت کرنا ہے- غرض ہر وہ معاملہ جس کا تعلق دوسرے سے ہو- اور اس سے کچھ رقم وصول ہوتی ہو- یا دوسرا کوئی مفاد حاصل ہوتا ہو- بیع کے ضمن میں آئیں گے- جب کہ تجارت کا لفظ محض دکانداری اور سودے بازی کا مفہوم ادا کرتا ہے-

بیع مبرور کیا ہے؟

اسلام نے بیع کو جائز قرار دیا ہے- اس پر کچھ پابندیاں بھی عائد کردی ہیں- مثلاً حرام اشیاء کی تجارت سے یا ناجائز ذرائع سے مال کمانے سے روک دیا گیا ہے- ایسی شرعی پابندیوں کو ملحوظ رکھ کر جو بیع بھی کی جائے گی- ''وہ بیع مبرور'' ہوگی-

حلال اور پاکیزہ رزق:

خدا تعالیٰ نے اس دنیا میں بنی نوع انسان کے لئے بے شمار وسائلِ رزق مہیا کر دیئے ہیں- اور ان سے استفادہ کرنے کی عام اجازت دے دی گئی ہے- معدودے چند اشیاء بنی نوع انسان کی اپنی ہی بھلائی کی خاطر حرام قرار دی گئی ہیں- بیع کے چند اصول بیان کر دیئے گئے ہیں- ان سے بچ کر انسان جو کمائی بھی کرے گا وہ حلال اور طیب ہوگی- ارشاد باری ہے-

﴿یٰاَیُّھَا النَّاسُ کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلاً طَیِّبًا﴾ (۱۶۸:۲) (اے لوگو! جو زمین میں ہے۔اس میں سے حلال اور پاکیزہ (اشیاء) کھاؤ۔)

اس آیت میں حصولِ رزق اور کھانے کے سلسلہ میں دو شرطیں عاید کی گئی ہیں۔ایک یہ کہ آپ کا رزق حلال ہو حرام نہ ہو۔دوسرے پاکیزہ ہو۔ناپاک اور گندہ نہ ہو۔

حلال کے برعکس لفظ حرام ہے۔اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حلال اور حرام کی پوری پوری وضاحت فرما دی ہے۔قرآن کریم میں تو صرف چند اشیاء ہی مذکور ہیں۔جو حرام قرار دی گئی ہیں مثلاً مردار کا گوشت' خون' خنزیر کا گوشت اور ہر وہ جانور جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے نام پر مشہور کر دیا جائے اور پھر ذبح کیا جائے۔نیز شراب' جوا' سود' چوری' ڈاکہ وغیرہ۔البتہ احادیث میں کافی تفصیل آ گئی ہے۔جو انشاء اللہ آگے بیان کی جائے گی۔بسا اوقات ایسے امور سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔جن کے متعلق قرآن و سنت میں واضح تصریح موجود نہیں ہوتی۔اور شک کی گنجائش ہوتی ہے تو ان کے متعلق بھی شارع علیہ السلام کے واضح احکامات موجود ہیں۔کہ ایسے مشکوک معاملات سے بھی بہر حال پرہیز کرنا چاہیے۔

رزق حلال کے اصول

(۱) رزقِ حلال کے سلسلہ میں سورۃ نساء کی درجِ ذیل آیت میں ایک نہایت جامع اصول بیان فرمادیا ہے۔ارشاد باری ہے۔

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ﴾ (۲۹:۴) (اے ایمان والو! ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ۔الا یہ کہ باہمی رضا مندی سے تمہارا تجارت کا لین دین ہو۔)

یہ باطل طریقے کیا ہیں؟ ان کی تفصیل بھی کتاب و سنت میں مختلف مقامات پر آ گئی ہے۔مثلاً یتیم کا مال کھانا' بیوی کا حق مہر ادا نہ کرنا اور ہضم کر جانا۔چوری' ڈاکہ' رہزنی' غصب' لوٹ کھسوٹ' جیب تراشی' رشوت کے ذریعے دوسروں کا حق دبا جانا یہ سب باطل طریقے ہیں۔البتہ ایک دوسرے کا مال کھانے کا جائز طریقہ یہ ہے کہ تجارت کی صورت میں باہمی لین دین ہو اور اس لین دین پر دونوں فریق رضا مند ہوں اور اس لین دین میں کسی قسم کا داؤ فریب نہ ہو۔

قرآن کریم میں ان علماء کے کسب پر سخت گرفت کی گئی ہے۔جو قرآن کی آیات کو بیچ

کھاتے ہیں- غلط تاویلات کر کے یا حق کو چھپا کر وہ غلط فتوے جاری کرتے- حکومت وقت کی خوشامد اور ہمنوائی کر کے حلال کو حرام کر دیتے اور عام لوگوں کو گمراہ کرنے کا باعث بنتے ہیں اور جو رقم بٹورتے ہیں اور بعض دوسرے مفاد حاصل کرتے ہیں- ان کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں-

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ﴾ (۲:۱۷۴)

(جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نازل شدہ کتاب میں سے کچھ چھپاتے ہیں اور حقیر سی قیمت کے عوض بیچ کھاتے ہیں- وہ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں بھرتے-)

اس اصل کا تعلق صرف علماء سے نہیں بلکہ ہر پیشہ کے لوگ' خواہ وہ پیشہ اپنی اصل کے لحاظ سے جائز ہو اپنی کمائی کو ناجائز طریقوں سے حرام بنا لیتے ہیں- مثال کے طور پر وکالت کا پیشہ ایک جائز پیشہ ہے- بلکہ اگر وکیل حق کی حمایت میں لڑے تو انسانیت کی خدمت بھی ہے- لیکن وکلاء میں سے کثیر طبقہ ایسا ہے- جو یہ خوب جانتے ہیں کہ ان کا موکل مجرم ہے اس کی حمایت میں مقدمہ لڑتے اور اپنی فیس کھری کرتے ہیں اور ناحق کو حق ثابت کر کے دکھانے والے وکیل کو ہی اپنے فن کا ماہر سمجھا جاتا ہے- لہٰذا اس کی فیس بھی عام وکلاء سے بہت زیادہ ہوتی ہے- مثال کے طور پر میں کسی شخصیت کا نام لیے بغیر ایک سچا واقعہ درج کرتا ہوں جس سے بات پوری طرح ذہن نشین ہو جائے گی-

کسی اونچے خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان نے اپنے کسی رقیب خاندان کی لڑکی سے بالجبر زنا کیا- اور لڑکی والوں نے مقدمہ دائر کر دیا- اور نوجوان کے خاندان والوں کو کسی ماہر قانون دان وکیل کی ضرورت پیش آئی- کافی جستجو کے بعد انہیں اپنے مطلب کا ایک وکیل میسر آ گیا- جس سے ایک لاکھ روپیہ میں معاملہ طے ہوا- شرط یہ تھی کہ اگر مجرم بچ جائے تو وکیل کو لاکھ روپیہ مل جائے گا اور اگر نہ بچ سکا تو نہ ملے گا- اور صحیح صورتِ حال سے وکیل صاحب کو مطلع کر دیا گیا-

اب وکیل نے اس زانی نوجوان کو یہ سبق سکھایا کہ جب جج کے سامنے تمہاری پیشی ہو اور وہ تم سے کوئی سوال کرے تو تم نے بولنا نہیں- بلکہ ایسے اونہہ اونہہ کرتے چلے جانا- جیسے بہرے لوگ کرتے ہیں پھر میں جانوں میرا کام-

چنانچہ ایسا ہی ہوا- جج نے ایک سوال کیا- تو اس نے کچھ جواب نہ دیا دوسرے سوال پر

بھی اونہہ اونہہ کرنے اور جج کو دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا پھر تیسرے سوال پر یہی کچھ ہوا- تو وکیل صاحب جج سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے کہ معاملہ دراصل یہ ہوا کہ جب یہ زنا کی واردات ہوئی تو لڑکی اتنے زور سے چیخی تھی کہ اس نوجوان کے کانوں کے پردے پھٹ گئے اور وہ بہرہ ہو گیا ہے-

یہ سن کر لڑکی فوراً بول اٹھی کہ "میں تو نہیں چیخی تھی-"

یہ سنتے ہی وکیل جج سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ لڑکی کا اعتراف لکھ لیجئے کہ وہ چیخی نہیں تھی جب یہ بات تحریر میں آ گئی تو وکیل کہنے لگا کہ جب لڑکی زنا کے وقت چیخی ہی نہیں تو یہ زنا بالجبر کیسے بن سکتا ہے بلکہ یہ کام ان کی باہمی رضامندی سے ہوا تھا-

چنانچہ وکیل صاحب مقدمہ جیت گئے اور اپنی فیس بھی حلال کر لی- لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ فیس حلال تھی- یہ فیس مطلقاً حرام مال ہے جو کہ دیدہ دانستہ ایک مجرم کی اعانت کے صلہ میں حاصل کی گئی ہے- جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں-

﴿وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الاثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (گناہ اور زیادتی کے کاموں پر ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو-) (۵:۳)

یہ ٹھیک ہے کہ قانون میں یہ گنجائش ہے کہ شک کا فائدہ ملزم کو پہنچے- لیکن ان لوگوں کا کمال یہ ہوتا ہے کہ دیدہ دانستہ حقائق میں پہلے شک کی راہیں تلاش کرتے ہیں اور پھر اس کا فائدہ ملزم کو پہنچا کر اپنی کمائی کو حرام بنا لیتے ہیں- اور وکیل حضرات جب تک یہ فن نہ سیکھیں وہ ترقی کر ہی نہیں سکتے اور ہر مقدمہ میں ایک فریق کا وکیل تو بہرحال اسی کوشش میں لگا ہوتا ہے- اس طرح وہ مظلوم پر مزید ظلم کرنے اور معاشرہ میں جرائم کے اضافہ کا سبب بنتے ہیں-

پھر یہ مسئلہ علماء اور وکلاء تک ہی محدود نہیں- بلکہ ہر پیشہ ور اپنے کام کا چور ہوتا ہے- الا یہ کہ اللہ کا خوف اس کے دل میں جاگزین ہو- اور یہ سب لوگ ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے کھانے کے ضمن میں آتے ہیں- جس سے معاشرہ میں فساد اور بگاڑ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے-

گویا باطل طریقے حلال اشیاء کو بھی حرام بنا دیتے ہیں- مرغی بذاتِ خود حلال جانور ہے لیکن چوری یا غصب کی ہوئی مرغی کھانا حرام ہو جائے گا-

(۲) اب رہیں وہ چیزیں جو بذاتہ حرام اور ان کا کھانا ممنوع ہے- ان میں سرفہرست تو خنزیر کا گوشت' غیر اللہ کے لیے مشہور کردہ ذبیحہ اور شراب ہے- لیکن حدیث میں کچھ اور اشیاء بھی ممنوع

قرار دی گئی ہیں- مثلاً کتا' بلی' گھریلو گدھا ہر قسم کے درندے مثلاً چیتا' شیر' ریچھ وغیرہ اور اپنے پنجوں سے شکار کرنے والے پرندے جیسے باز' چیل' شکرا اور گدھ وغیرہ اور ہر وہ چیز جو نشہ آور ہو ایسی سب چیزوں کا استعمال حرام ہے-

(۳) تیسری اصل یہ ہے کہ جو چیز حرام ہے اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے- مثلاً اگر شراب پینا حرام ہے تو مے فروشی بھی حرام ہے- مری ہوئی بکری کا گوشت کھانا حرام ہے تو اس کا گوشت یا چربی بیچنا بھی حرام ہے- اس اصل کی تفصیل اور مستثنیات کا ذکر آگے آ رہا ہے-

(۴) چوتھی اصل یہ ہے کہ سود اپنی جملہ انواع سمیت حرام ہے- لہٰذا جس کمائی میں سود کا شائبہ تک بھی پایا جائے گا- وہ سب کمائی حرام ہو جائے گی- یہ مسئلہ چونکہ خاصا تفصیل طلب ہے- لہٰذا اس کے لیے اس کتاب میں دو ابواب مختص کیے گئے ہیں-

(۵) پانچویں اصل یہ ہے کہ حلال صرف ستھری اور پاکیزہ چیز ہی ہوتی ہے گندی اور ناپاک چیز حلال نہیں ہوتی: ارشاد باری ہے-

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ (۱۷۲:۲) (اے ایمان والو! ہم نے جو تمہیں رزق دیا ہے اس میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ-)

اس آیت کی رو سے گندی' گلی سڑی' باسی اور بدبودار چیزوں کا کھانا ممنوع ہے- جس پانی کا نجاست کی وجہ سے رنگ' ذائقہ یا بو بدل جائے وہ بھی پاک نہیں رہتا- لہٰذا اس کا استعمال بھی ممنوع ہے- بول و براز ظاہری نجاستیں ہیں- کھانے پینے کی جس چیز میں شامل ہو جائیں وہ قابلِ استعمال نہیں رہتیں- الا یہ کہ پانی کثیر مقدار میں ہو اور نجاست کی مقدار نہایت قلیل ہو- یا وہ پانی بہہ رہا ہو جیسے ندی یا دریا کا پانی- ان صورتوں میں پانی پاک ہی رہے گا-

(۶) چھٹی اور سب سے آخری اصل یہ ہے- کہ اگر ان تمام امور کو ملحوظ رکھنے کے باوجود بھی کسی کے پاس مال جمع ہو جائے اور وہ نصابِ زکوٰۃ تک پہنچ جائے تو اس سے زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے- ورنہ وہ مال پاک نہ ہوگا آخری دو ابواب میں زکوٰۃ سے متعلق مسائل درج کر دیئے گئے ہیں- ارشاد باری ہے-

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا﴾ (۱۰۳:۹) (اے رسولؐ! ان مومنوں کے اموال سے زکوٰۃ وصول کیجئے- جس سے انہیں پاک کیجئے اور ان کا تزکیہ فرمایئے-)

اس آیت سے درج ذیل امور کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) اگر چہ اس آیت میں صدقۃ کا لفظ اپنی عمومیت سے استعمال ہوا ہے مگر خذ کا لفظ یہ صراحت کر رہا ہے کہ یہاں صدقہ سے مراد فرضی صدقہ یا زکوٰۃ ہے۔ جسے وصول کرنا ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے اور اگر اسلامی حکومت قائم نہ ہو تو صدقہ کی اس قدر مقدار ہر شخص کو اپنے طور پر ادا کرنا لازم ہے۔

(۲) اس فرضی صدقہ یا زکوٰۃ کے علاوہ بھی کئی طرح کے واجبی اور نفلی صدقات ہیں جیسا کہ دوسری بہت سی آیات و احادیث سے ثابت ہے۔ اغنیاء کے اموال میں یہ صدقات فقراء و مساکین کا حق ہوتا ہے۔

(۳) آیت مذکورہ میں زکوٰۃ ادا کرنے کے دو فائدے بیان کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ زکوٰۃ ادا کرنے سے باقی مال پاک ہو جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ بخل اور خود غرضی جیسی باطنی امراض سے تزکیہ نفس ہو جاتا ہے۔

یہ ہیں وہ اصول جو حلال اور پاکیزہ رزق کے حصول کے لیے ضروری ہیں۔ لہٰذا ہمارے لیے لازم ہے کہ صرف حلال اور پاکیزہ رزق کو ہی اپنے جسم کا حصہ بنائیں۔ اور ہر اس چیز سے پرہیز کریں جس میں حرام ہونے کا شائبہ تک بھی موجود ہو۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ موجودہ دور میں حلال اور حرام کی تمیز بالکل مٹ چکی ہے۔ ہوسِ زر نے ہر آدمی کو کچھ اس طرح اندھا کر دیا ہے۔ کہ وہ جائز یا ناجائز ہر طریقہ سے دولت سمیٹنے کی فکر میں لگا ہوا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہ نہ مکر و فریب سے چوکتا ہے۔ نہ جھوٹ اور بد دیانتی سے۔ حتیٰ کہ سود جیسی حرام چیز کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ یہی وہ دور ہے جس کے متعلق حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا۔

((یَاْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یُبَالِی الْمَرْءُ مَا اَخَذَ مِنْهُ اَمِنَ الْحَلَالِ اَمْ مِنَ الْحَرَامِ))[1]

(لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا۔ کہ آدمی اس بات کی پرواہ نہیں کرے گا۔ کہ جو مال اس کے ہاتھ آیا ہے وہ حلال ہے یا حرام ہے۔)

کسب حلال کی اہمیت:

لہٰذا کسب حرام سے پرہیز لازم اور اپنی تمام تر توجہ کسب حلال کی طرف دینا واجب ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔

[1] بخاری۔ کتاب البیوع۔ باب مالم یبال من حیث کسب المال۔ (۲۰۵۹) وباب قول اللہ عزوجل یاایھا الذین امنوالاتا کلوا الربا (۲۰۸۳)

((طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ[1])) (اللہ کے مقررہ فرائض (ایمان' نماز' زکوٰۃ' روزہ' حج) کے بعد سب سے مقدم حلال کمائی کا طلب کرنا فرض ہے۔)

بہترین کمائی کونسی ہے؟

ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

((مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَاماً قَطُّ خَيْرًا مِّنْ أَنْ يَّأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ وَأَنَّ النَّبِيَّ دَاوٗدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ۔[2])) (کسی شخص کے لیے بہترین کھانا جو وہ کھاتا ہے۔ وہ ہے جو اس نے اپنے ہاتھ سے کمایا ہو۔ اور بے شک اللہ کے نبی حضرت داؤدؑ اپنے ہاتھوں کی کمائی کھاتے تھے۔)

ہاتھ کی کمائی سے مراد دست کاری ہے۔ داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے زرہیں بناتے اور بازار میں فروخت کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کونسا کسب سب سے پاکیزہ ہے فرمایا۔

((عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهٖ وَكُلُّ بَيْعٍ مَّبْرُوْرٍ[3])) (جو کام آدمی اپنے ہاتھ سے کرے۔ اور وہ تجارت جو شرع میں صحیح ہو۔)

''بیع مبرور'' ہی اس کتاب کا موضوع ہے۔ لہٰذا اس کے مطالعہ کے بعد آپ کو از خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ کہ بیع مبرور کیا ہے اور حلال و حرام میں تمیز کر کے آپ کیونکر حرام کمائی سے بچ سکتے ہیں؟

کسب حرام سے متعلق ارشاداتِ نبوی ﷺ

(۱) حرام خور کی دعا قبول نہیں ہوتی:

ایسا آدمی خواہ کتنی عاجزی سے اپنے رب کو پکارے خدا تعالیٰ اس کی دعا نہیں سنتے۔

---

[1] شعب الایمان بیہقی (۸۷۴۱) طبرانی ۳/۵۹/۲ امام حاکم فرماتے ہیں یہ روایت سفیان ثوری سے بیان کرنے میں عباد بن کثیر متفرد ہے اور مجھے یہ بات محمد بن یحییٰ سے پہنچی ہے کہ انہوں نے کہا اس حدیث کی روایت کے علاوہ میں یحییٰ بن یحییٰ کے لیے کوئی چیز ناپسند نہیں کرتا (شعب الایمان ۶/۴۲۰) اس کی سند میں عباد بن کثیر الرملی الفلسطینی ضعیف راوی ہے۔ (تقریب مع تحریر ۲/۱۸۰ تہذیب ۳/۷۰) اور سفیان ثوری مدلس راوی ہیں۔ [2] بخاری۔ کتاب البیوع۔ باب کسب الرجل و عمله بیده (۲۰۷۲)

[3] مسند احمد ۴/۱۴۱ طبع قدیم طبرانی کبیر (۴۴۱۱) حاکم ۲/۱۰ یہ اپنے شواہد کی بنا پر حسن ہے۔

((۱- وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَعَالٰی یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنَاکُمْ ثُمَّ ذَکَرَ الرَّجُلَ یُطِیْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ یَمُدُّ یَدَیْهِ اِلَی السَّمَآءِ یَارَبِّ وَمَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهٗ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهٗ حَرَامٌ وَغُذِیَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لِذَالِکَ۔[۱]))

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ- اللہ تعالیٰ نے فرمایا- اے ایمان والو- جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے- اس میں سے حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ- پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا- جو لمبے سفر سے آیا ہے- پراگندہ مو اور غبار آلود ہے- اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہتا ہے- اے میرے رب' اے میرے رب- جبکہ اس کا کھانا حرام' اس کا پینا حرام اس کا لباس حرام اور حرام ہی سے پروان چڑھا- تو ایسے شخص کی دعا کیونکر قبول ہو؟)

(۲) حرام خور جہنمی ہے:

((عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ وَکُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ کَانَتِ النَّارُ اَوْلٰی بِهٖ۔[۲]))

(حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ گوشت جو مال حرام سے پروان چڑھے- وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا- اور جو بھی گوشت حرام سے پروان چڑھا اس کے لیے آگ (جہنم) ہی لائق تر ہے-)

(۳) حرام خور کا صدقہ بھی قبول نہیں ہوتا:

((عَنْ عَبْدِاللّٰه بِنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَایَکْسِبُ عَبْدٌ مَالَ حَرَامٍ فَیَتَصَدَّقَ مِنْهُ فَیُقْبَلَ مِنْهُ وَلَا یُنْفِقُ مِنْهُ فَیُبَارَکُ لَهٗ فِیْهِ۔[۳]))

(حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں- فرمایا" جو شخص مال حرام کمائے پھر اس سے صدقہ کرے تو وہ صدقہ قبول نہیں ہوتا اور اگر اس سے خرچ کرے تو اس میں برکت نہیں ہوتی-)

۱۔ صحیح مسلم کتاب الزکوۃ باب قبول الصدقة من الکسب الطیب و تربیتها ۶۵/۱۰۱۵

۲۔ مسند احمد ۳/۳۲۱ دارمی کتاب الرقاق باب فی اکل السحت (۲۷۷۶) شعب الایمان بیہقی باب فی المطاعم و المشارب (۵۷۶۱) عبدالرزاق (۲۰۷۱۹) مسند عبد بن حمید (۱۱۳۸) ابن حبان (۴۵۱۴) حاکم ۴/۴۲۲ مسند ابویعلی (۱۹۹۹) مسند بزار (۱۶۰۹) کشف الاستار- یہ حدیث مسلم کی شرط پر صحیح ہے-

۳۔ مسند احمد ۱/۳۸۷ شرح السنة ۸/۱۰ (۲۰۳۰) اس کی سند صباح بن محمد کی وجہ سے ضعیف ہے-

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

((لَایَقْبَلُ اللّٰهُ اِلَّا الطَّیِّبَ [1])) (اللہ صرف پاکیزہ کمائی کے سوا صدقہ قبول نہیں کرتا۔)

مشتبہ کمائی سے متعلق ارشاداتِ نبوی ﷺ:

(۱) حضرت لقمان بن بشیر کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یوں کہتے سنا کہ:

((اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ وَبَیْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا یَعْلَمُهَا کَثِیْرٌ مِنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَی الْمُشْتَبِهَاتِ اسْتَبْرَءَ لِدِیْنِهٖ وَعِرْضِهٖ وَمَنْ وَقَعَ فِی الشُّبُهَاتِ کَرَاعٍ یَرْعٰی حَوْلَ الْحِمٰی یُوْشِکُ اَنْ یُّوَاقِعَهٗ اَلَا وَاِنَّ لِکُلِّ مَلِکٍ حِمًی اَلَا اِنَّ حِمَی اللّٰهِ فِیْ اَرْضِهٖ مَحَارِمُهٗ۔ [2]))

(حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے اب جو شخص ان مشتبہ چیزوں سے بچا رہا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچا لیا اور جو ان چیزوں میں پڑ گیا تو اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو کسی کی رکھ کے گرد اپنے جانوروں کو چرا رہا ہے۔ قریب ہے کہ وہ رکھ میں جا گھسیں۔ سن لو! ہر بادشاہ کی ایک رکھ ہوتی ہے سن لو اللہ کی رکھ اس کی زمین میں اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔)

(۲) عطیہ سعدی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

((لَایَبْلُغُ الْعَبْدُ اَنْ یَّکُوْنَ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ حَتّٰی یَدَعَ مَالَا بَاسَ بِهٖ حَذَرًا لِمَا بِهٖ بَاسٌ۔ [3]))

(کوئی بندہ اس وقت تک متقی نہیں بن سکتا یہاں تک کہ وہ قباحت والی چیزوں سے بچنے کی خاطر ان چیزوں کو بھی چھوڑ دے جن میں کوئی قباحت نہیں۔)

((عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِیٍّ قَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ دَعْ مَایُرِیْبُکَ اِلٰی مَالَا

(حضرت حسن بن علی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بات یاد رکھی ہے کہ جو چیز تجھ کو شک میں ڈالتی ہے اسے چھوڑ کر وہ چیز

[1] مسلم۔ کتاب الزکوۃ باب قبول الصدقة من الکسب الطیب ۶۵/۱۰۱۵

[2] بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب فضل من استبراء لدینہ (۵۲) مسلم کتاب المساقات باب اخذ الحلال و ترک الشبہات۔ (۱۵۹۹/۱۰۷)

[3] ترمذی کتاب صفة القیامة (۲۴۵۱) ابن ماجہ کتاب الزہد باب الورع و التقوی (۴۲۱۵) یہ حدیث صحیح ہے۔

یُرِیْبُکَ۔ [1])) اختیار کرکہ جو شک میں نہیں ڈالتی۔)

تجارت اور اس کی فضیلت:

تجارت ایک باعزت اور باوقار پیشہ ہے۔ اس پیشہ کی فضیلت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔ کہ حضور اکرم ﷺ خود نبوت سے قبل بارہ سال تک تجارت کرتے رہے۔ بعض جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی شغل رہا۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد مسلمانوں نے اس میدان میں خوب ترقی بھی کی۔ اور اس میں نیک نامی بھی پیدا کی۔

تجارت کا پیشہ اگر اسلامی حدود کے اندر رہ کر اختیار کیا جائے تو دنیا میں فراوانی رزق کے علاوہ اخروی زندگی میں بھی بلندئ درجات پر فائز کردیتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔

((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَاءِ [2])) (راست باز اور امانت دار تاجر (روز قیامت) نبیوں صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔)

غلط کار تاجر:

ایک راست گفتار اور دیانت دار تاجر کا درجہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ کتنا بلند ہے۔ مگر سوال یہ ہے کتنے لوگ ہیں' جو کاروبار میں جھوٹ' داؤ فریب سے اجتناب کرتے ہیں۔ اب یہ بھی دیکھئے جو لوگ ان باتوں کا خیال نہیں رکھتے۔ ان کا کیا حشر ہوگا۔

((عَنْ عُبَیْدِبْنِ رِفَاعَةَ عَنْ اَبِیْهِ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ التُّجَارُ یُحْشَرُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقٰی وَبَرَّ وَ صَدَقَ۔ [3])) (عبید بن رفاعہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں تاجر لوگ قیامت کے دن گنہگار کی حیثیت سے اکٹھے کیے جائیں گے۔ مگر جو شخص ہر گناہ سے بچتا رہا۔ اور نیکی اور صدقہ وخیرات کرتا رہا۔)

ایک دفعہ یوں فرمایا۔

---

[1] مسند احمد ۱/۲۰۰ ترمذی کتاب صفۃ القیامۃ (۲۵۱۸) نسائی کتاب الاشربہ باب علی ترک الشبهات (۵۷۱۱) دارمی کتاب البیوع باب دع مایریبك الی مالا یریبك (۲۵۳۲) یہ حدیث صحیح ہے۔

[2] ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فی التجار (۱۲۰۹) دار قطنی کتاب البیوع۔ اس کی سند میں ابوحمزہ میمون ضعیف راوی ہے۔

[3] ترمذی ابواب البیوع باب ماجاء فی التجار (۱۲۱۰) ابن ماجہ کتاب التجارات باب التوقی فی التجارۃ (۲۱۴۶) دارمی کتاب البیوع باب فی التجار (۲۵۳۸) یہ حدیث حسن ہے۔

((یَامَعْشَرَ التُّجَارِ اِنَّ الْبَیْعَ تَحْفُرُهُ اللَّغْوُ وَ الْحَلْفُ فَشُوبُوْهُ بِالصَّدَقَةِ[1]))

(اے گروہ تاجران! سودا بازی میں بہت سی بیہودہ باتیں اور جھوٹی قسمیں شامل ہو جاتی ہیں۔ پس تم خرید و فروخت کے ساتھ صدقہ بھی ملا لیا کرو۔)

---

۱ ابوداؤد کتاب البیوع باب فی التجارة یخالطها الحلف و اللغو (۳۳۲۶) ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فی التجار نسائی کتاب الایمان والنذور باب فی الحلف و الکذب (۳۷۹۷) ابن ماجہ کتاب التجارات باب التوقی فی التجارة (۲۱۴۵) یہ حدیث صحیح ہے۔

باب: ۳

چند ناجائز ذرائع آمدنی

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ شریعت نے جن اشیاء کو حرام قرار دیا ہے ان کی تجارت بھی حرام ہے اور اس سلسلہ میں جتنے لوگ بھی متعلق ہوں گے سب کی کمائی ناجائز قرار پائے گی۔

حرام کاروبار میں سرفہرست ''سود'' کا نمبر ہے۔ لیکن چونکہ اس کا بیان بہت تفصیل طلب ہے۔ اس لیے اس کا بیان آئندہ چل کر آئے گا۔ سود کے بعد شراب کا نمبر ہے۔

شراب تمام اہل عرب کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس کی کشید' تجارت اور استعمال سرِ عام ہوتا تھا۔ جسے بتدریج حرام قرار دیا گیا۔ ارشاد باری ہے۔

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔﴾ (۵:۹۰)

(اے ایمان والو! شراب' جوا' بت اور فال نکالنے کے تیر سب شیطانی عمل کی وجہ سے ناپاک ہیں۔ پس اس سے اجتناب کرو۔ تاکہ تم فلاح پاسکو۔)

آیت بالا میں چار چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں۔ ان چاروں اشیاء میں ملوث تمام افراد گناہ میں برابر کے شریک ہوں گے۔ ان میں سرفہرست شراب ہے۔ شراب کے متعلق حضور اکرم کا ارشاد ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ مے فروشی

ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

((عَنْ اَنَسٍ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِی الْخَمْرِ عَشَرَةً عَاصِرَهَا وَ مُعْتَصِرَهَا وَشَارِبَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُوْلَةَ اِلَیْهِ

(حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شراب کے سلسلہ میں دس لوگوں پر لعنت فرمائی۔ (۱) شراب نچوڑنے والا (۲) نچڑوانے والا (۳) پینے والا (۴) اٹھانے والا

وَسَاقِيهَا وَ بَائِعَهَا وَاٰكِلَ ثَمَنِهَا وَالْمُشْتَرِى لَهَا الْمُشْتَرَاةَ لَه[1]))

(۵) جس کے پاس لے جائی جائے (۶) پلانے والا (۷) بیچنے والا (۸) اس کی قیمت کھانے والا (۹) اس کو خریدنے والا اور (۱۰) جس کے لیے خریدی گئی-)

شراب پینا حرام اور قابلِ تعزیر جرم ہے- لیکن شراب پینے والا ہی مجرم نہیں- بلکہ اس کے کاروبار سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق رکھنے والا ہر شخص گنہ گار اور ملعون ہے- اور اس کی کمائی بہر صورت حرام ہے- کیونکہ شراب ایک ایسی لعنت ہے جس کے مضر اثرات پورے معاشرہ کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں-

شراب عموماً انگور' گنا' کھجور' گڑ' گندم' جو اور پانی کی ایک خاص ترکیب کی آمیزش سے تیار کی جاتی ہے- حالانکہ یہ سب اشیاء بذات خود حلال ہیں- لیکن جب ایک خاص ترکیب سے ان میں سُکر پیدا ہو جاتا ہے- تو یہ حرام ہو جاتا ہے- لہٰذا یہی حلال چیزیں جب شراب کے حصول کے مقصد کے لیے فروخت کی جائیں گی تو ایسی سودا بازی بھی حرام ہو گی- ارشاد نبوی ہے-

حلال چیز حرام کاروبار کے لیے بیچنا:

((عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ حَبَسَ الْعِنَبَ اَيَّامَ الْقِطَافِ حَتّٰى يَبِيْعَهُ من يهودى او نصرانى اوممَّنْ يَتَّخِذُهُ خَمْرًا فَقَدْ تَقَحَّمَ النَّارَ عَلٰى بَصِيْرَةٍ-[2]))

(حضرت عبداللہ بن بریدہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص انگور اترنے کے زمانے میں انگور سٹاک کر کے رکھے کہ اسے کسی یہودی یا عیسائی یا شراب بنانے والوں کے ہاتھ فروخت کرے- تو اس نے دیکھتے جانتے بوجھتے آگ میں جانے کی کوشش کی-)

---

[1] ترمذی کتاب البیوع باب النهى ان يتخذ الخمر خلا (۱۲۹۵) ابن ماجہ کتاب الاشربۃ باب لعنة الخمر على عشرة اوجه (۳۳۸۱) اسکی سند شبیب بن بشر کی وجہ سے ضعیف ہے- لیکن شواہد کی وجہ سے حسن ہے اس کا ایک شاہد ابن عمرؓ سے ابن ماجہ (۳۳۸۰) ابوداؤد (۳۶۷۴) مسند احمد ۲/ ۲۵-۷۱ المسند الجامع ۱۰/ ۵۴۷' ۵۴۸ میں بسند مروی ہے- اور عبداللہ بن عباسؓ سے مسند احمد' ابن حبان اور حاکم میں بسند صحیح موجود ہے- (تحفۃ الاحوذی ۴/ ۵۸۹)

[2] طبرانی اوسط (۵۳۵۲) ۶/ ۱۷۱ تحقیق محمود طحان مجمع الزوائد کتاب البیوع باب فيمن باع العنب من العصاة (۶۴۱۵) اس کی سند کو اگرچہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بلوغ المرام کتاب البیوع میں حسن قرار دیا ہے لیکن علامہ ہیثمی فرماتے ہیں-

اس حدیث میں ایسے آدمی کو دوزخی کہا گیا ہے- کہ جو (زیادہ رقم وصول کرنے کی خاطر) اپنے انگور موسم پر فروخت نہیں کرتا- اور اس کے بجائے شراب کشید کرنے والوں کو مہیا کرتا ہے- گویا حلال چیز ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا جو اس کو حرام میں تبدیل کر دے- شرعاً ناجائز ہے-

اسی طرح وہ شخص جوے فروشی کے لیے یا کسی دوسرے حرام کاروبار کے لیے دکان کرایہ پر دیتا ہے یا انہیں جگہ مہیا کرتا ہے- وہ بھی برابر کا مجرم ہے اور تعاون علی الاثم والعدوان کے ضمن میں آتا ہے-

اسی اصل کے مطابق ہر وہ بیع ناجائز ہے جو کسی حرام یا غلط مقصد کے لیے کی جائے- چنانچہ عمرانؓ بن حصین کہتے ہیں کہ

((نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ السَّلَاحِ فِي الْفِتْنَةِ-[1]))
(بیہقی ۵/ ۳۲۷ بحوالہ فقہ السنہ ج-۲ص ۱۴۷)

(رسول اللہ ﷺ نے فتنہ میں (جنگ وجدال کے ایام میں) اسلحہ کی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے-)

شراب سے متعلق دیگر مسائل

مے نوشی اور مے فروشی کے سلسلہ میں درج ذیل امور قابلِ ذکر ہیں-

(۱) چونکہ شراب کی حرمت کی علت نشہ اور متوالا پن ہے- لہٰذا جو چیز بھی نشہ آور ہو وہ حرام

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ''رواہ الطبرانی فی الاوسط وفیہ عبدالکریم بن عبدالکریم قال ابوحاتم حدیثہ یدل علی الکذب ''اسے طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے اور اس کی سند میں عبدالکریم بن عبدالکریم ہے امام ابو حاتم نے کہا ہے اس کی روایت جھوٹ پر دلالت کرتی ہے- (الجرح والتعدیل ۶/ ۶۲ العلل المتناہیہ ۲/ ۱۸۸)

نوٹ: طبرانی اوسط کے نسخہ میں عبدالکریم بن ابی عبدالکریم ہے-

اسی طرح اس کی سند میں الحسن بن مسلم التاجر بھی مجروح ہے امام ذہبی فرماتے ہیں یہ شراب کے بارے موضوع روایت لایا ہے (میزان ۵۲۳۱) ابن حبان فرماتے ہیں اس روایت کی کوئی اصل نہیں (کتاب المجروحین ۱/ ۲۳۶ العلل المتناہیہ ۲/ ۱۸۸)

امام ابوحاتم فرماتے ہیں ''ہذا حدیث کذب باطل'' یہ روایت جھوٹ و باطل ہے- (علل الحدیث ۱/ ۳۸۹)

نوٹ: اس مسئلہ کے بارے شراب وغیرہ کی حرمت والی عام احادیث دلالت کرتی ہیں-

[1] امام بیہقی فرماتے ہیں ''رفعہ وھم والموقوف اصح'' یہ روایت مرفوعاً راوی کا وہم ہے اور موقوف ہونا زیادہ صحیح ہے-

ہوگی- اس سلسلہ میں واضح ارشاد نبوی ہے کہ کُلُّ مُسْکِرٍ حَرَامٌ [1] یعنی ہر نشہ آور چیز حرام ہے- اس لحاظ سے افیون' بھنگ' چرس' ہیروئن وغیرہ وغیرہ سب منشی اشیاء حرام ہیں- لہٰذا ان کی خرید و فروخت بھی حرام ہے-

(۲) بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ قلیل مقدار میں شراب پیتے ہیں- جس سے انہیں قطعاً نشہ نہیں ہوتا- اور اس طرح وہ شراب کے استعمال کے جواز کی راہ ڈھونڈتے ہیں- ایسے لوگوں کے بارے میں واضح ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ جس چیز کی کثیر مقدار حرام ہو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہوتی ہے- [2]

(۳) رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آیا شراب بطور دوا استعمال ہو سکتی ہے- آپ ﷺ نے فرمایا کہ شراب تو خود بیماری ہے یہ کیا شفا دے گی؟ [3]

(۴) جن اشیاء سے شراب تیار ہوتی ہے- تو پہلے درجہ میں وہ سرکہ بنتا ہے اور بعد میں شراب بنتی ہے اور شراب کو پھر سے سرکہ میں تبدیل کرنا بھی ممکن ہوتا ہے- آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آیا ہم شراب کا سرکہ بنا کر استعمال کر سکتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں [4]- ایسا مت کرو گویا جو چیز

---

[1] ترمذی کتاب الأشربہ باب ماجاء کل مسکر حرام (۱۸۶۴) نسائی کتاب الأشربہ باب تحریم کل شراب اسکر (۵۶۰۳) ابن ماجہ کتاب الأشربہ باب کل مسکر حرام (۳۳۹۰) المسند الجامع ۱۰/۵۴۴' ۵۴۵ یہ روایت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے اور اس کی سند محمد بن عمرو بن علقمہ کی وجہ سے حسن ہے اور مسند طیالسی (۱۹۱۶) میں محمد بن حمزہ الأسلمی المدنی نے اس کی مطابقت کر رکھی ہے- ابن ماجہ میں الفاظ یوں ہیں کے کل مسکر خمرو کل خمر حرام- ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر خمر حرام ہے- اسی مفہوم کی احادیث عبداللہ بن مسعود' انس' ابی سعید' ابی موسیٰ' الأشج العصری' زیلم' میمونہ' قیس بن سعد' نعمان بن بشیر' ابن عباس' معاویہ' وائل بن حجر' قرۃ المزنی' عبداللہ بن مغفل' ام سلمہ' بریدہ' ابی ہریرۃ اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں دیکھیں ترمذی مع تحفۃ الاحوذی ۵/۶۱۹ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت-

[2] ترمذی کتاب الأشربۃ باب ماجاء ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام (۱۸۶۵) ابوداؤد کتاب الأشربۃ باب النھی عن المسکر (۳۶۸۱) ابن ماجہ کتاب الأشربہ باب ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام (۳۳۹۳) ابن الجارود (۸۶۰) المسند الجامع ۴/۲۶۵) یہ داؤد بن بکر بن ابی الفرات کی وجہ سے حسن ہے اس حدیث کے کئی ایک شواہد بھی ہیں ترمذی مع تحفۃ الاحوذی ۵/۶۲۱' ۶۲۲

[3] ترمذی کتاب الطب باب ماجاء فی کراھیۃ التداوی باب لمسکر (۲۰۴۶) ابوداؤد کتاب الطب باب فی الادویۃ المکروھۃ (۳۸۷۳) ابن ماجہ کتاب الطب باب النھی ان یتداوی بالخمر (۳۵۰۰) المسند الجامع ۷/۵۳۸) صحیح مسلم وغیرہ میں حدیث علقمہ بن وائل بن حجر عن ابیہ کے طریق سے بھی مروی ہے دیکھیں المسند الجامع ۱۵/۶۹۶

[4] مسلم کتاب الاشربہ- باب تحریم تخلیل الخمر- (۱۹۸۳) ترمذی کتاب البیوع باب النھی ان یتخذ الخمر خلاً (۱۲۹۴) مسند احمد ۳/۱۱۹' ۱۸۰

ایک دفعہ حرام کی صورت اختیار کر چکی ہے وہ اب حلال نہیں ہو سکتی۔

(۵) جب مدینہ میں شراب کی حرمت کا اعلان ہوا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہ صرف شراب ہی مدینہ کی گلیوں میں بہائی بلکہ جن برتنوں میں شراب تیار ہوتی اور جن برتنوں میں پی جاتی تھی وہ بھی سب توڑ ڈالے تھے[1]۔ قبیلہ ربیعہ کا ایک وفد مدینہ آیا تو آپ ﷺ نے ان لوگوں کو حکم دیا کہ فلاں فلاں برتن (آپ ﷺ نے ایسے برتنوں کا نام لیا جن میں اس زمانہ میں شراب تیار کی جاتی تھی) کسی دوسرے استعمال میں بھی نہ لائے جائیں[2]۔ اور ان میں نبیذ بھی نہ بنایا جائے۔

آپ ﷺ کا یہ حکم سدِ ذریعہ کے طور پر تھا۔ لہٰذا جام وسبو قسم کے برتنوں کے استعمال سے بھی پرہیز لازم ہے۔

(۶) آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو زنا، حریر، شراب اور آلات موسیقی کے کوئی اور نام رکھ کر انہیں جائز قرار دے لیں گے۔[3]

ایلو پیتھک کے بعد دوسرے نمبر پر ہومیو پیتھک طریقہ علاج رائج ہے۔ جس کی تقریباً سب ادویات الکوحل سے تیار ہوتی ہیں۔ ان ادویہ میں روحِ رواں الکوحل ہی ہوتی ہے۔ اس کی بھی یہی صورت ہے۔

البتہ ایسی چیزیں جن کا استعمال جزوی طور پر حرام ہو۔ جیسے ریشمی کپڑا یا سونے چاندی کے زیور عورتوں کے لیے حلال اور مردوں کے لیے حرام ہیں۔ ایسی چیزوں کی خرید وفروخت پر کوئی پابندی نہیں چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ریشمی جوڑا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھیجا تو دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے پہنے ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ نے دیکھ کر فرمایا میں نے اس لیے نہیں بھیجا تھا۔ کہ تم اسے پہنو اس کو تو وہ پہنتا ہے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ میں نے تو اس لیے بھیجا تھا کہ اسے بیچ کر فائدہ اٹھاؤ۔[4]

---

1. مسند احمد ۳/ ۴۴۷، ۵/ ۴۴۴ عن سوید بن مقرن اسکی سند صحیح ہے۔
2. صحیح البخاری کتاب الایمان باب اداء الخمس من الایمان (۵۳) صحیح مسلم کتاب الایمان باب الامر بالایمان باللہ تعالیٰ و رسولہ ﷺ و شرائع الدین (۲۴/ ۱۷)
3. صحیح البخاری کتاب الأشربہ باب ماجاء فیمن یستحل الخمر و یسمیہ بغیر اسمہ (۵۵۹۰) بیہقی کتاب الشہادات باب ماجاء فی ذم الملاھی من المعازف و المزامیر و نحو ھا ۱۰/ ۲۲۱ طبرانی کبیر ۳/ ۳۱۹
4. صحیح البخاری کتاب البیوع باب التجارة فیما یکرہ لبسہ للرجال و النساء (۲۱۰۴) و کتاب الجمعة باب یلبس احسن مایجد (۸۸۶)

اور مسلم کی حدیث میں یہ وضاحت موجود ہے کہ یہ جوڑا آپ کو تحفہ بھیجا گیا تھا۔ اور جب آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اس سے فائدہ اٹھاؤ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ جوڑا دو ہزار درہم میں فروخت کیا تھا۔[1]

۲۔میسر یا قمار بازی

مندرجہ بالا آیت میں خمر وشراب کے بعد دوسرے نمبر پر میسر کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ میسر کا ترجمہ قمار بازی یا جوئے بازی کیا جاتا ہے۔ جو میسر کی ایک عام قسم ہے۔ دراصل میسر ہر اس کثیر مال و دولت کو کہتے ہیں۔ جو مفت میں یا آسانی سے ہاتھ آ جائے۔ جوئے کی عام قسم جو معروف ہے۔ وہ شرعاً ممنوع ہونے کے ساتھ قانوناً ممنوع اور قمار بازی ایک قابل تعزیر جرم ہے۔ لہٰذا جواری حضرات کو معاشرہ کا معزز طبقہ شمار نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان میں جوئے خانے موجود ضرور ہیں لیکن وہ پولیس کی ملی بھگت سے عموماً رات کو یہ دھندا کرتے ہیں اور بعض دفعہ رپورٹ ہو جانے پر چھاپے مارے جاتے ہیں۔

میسر کی نئی اقسام

(۱) لاٹری:

موجودہ دور میں قمار بازی کی بے شمار قسمیں معرض وجود میں آ چکی ہیں ان میں سب سے عام قسم لاٹری ہے۔ جسے نہ معاشرہ معیوب سمجھتا ہے نہ قانون کی نظروں میں یہ کوئی جرم ہے۔ لہٰذا لاٹری باز علی الاعلان اس کی اشتہار بازی کرتے ہیں۔ ان کا اعلانچی ہر وقت لاؤڈ سپیکر منہ کے سامنے رکھ کر یہ اعلان کرتا نظر آئے گا۔ کہ ''فلاں تاریخ کو دس بجے فلاں مقام پر قرعہ اندازی ہوگی۔ پہلا انعام ایک لاکھ۔ دوسرا انعام پچاس ہزار' تیسرا انعام پچیس ہزار' آپ بھی اپنی قسمت آزمایئے۔ شاید یہ انعام آپ ہی کی قسمت میں ہو۔ ٹکٹ صرف دو روپے' دو روپے...... جلدی کیجئے ورنہ یہ موقع ہاتھ میں نہ آئے گا۔'' وغیرہ وغیرہ۔

اب یہ تو واضح بات ہے کہ کوئی شخص ایسا کاروبار نہیں کرتا جس میں اسے کچھ پلے سے ڈالنا پڑے۔ آپ ہی کا جمع شدہ پیسہ وہ کچھ آپ کو واپس کر دیتے ہیں۔ باقی خود رکھ لیتے ہیں۔ اگر

---

[1] مسلم۔کتاب اللباس والزینۃ۔باب تحریم لبس الحریر وغیر ذلک للرجال (۲۰۷۰/۱۶)

مقررہ تاریخ پر رقم جمع شدہ رقم میں انہیں فائدہ نظر نہ آئے تو تاریخ بڑھا دیتے ہیں- یا قرعہ اندازی میں ایسا چکر چلائیں گے کہ انعامات اپنے ہی کسی آدمی کے نام نکل آئے- یہ کاروبار بھی میسر کی تعریف میں آتا ہے- کیونکہ ایک کثیر رقم آسانی سے ہاتھ آجاتی ہے-

(۲) معمہ بازی:

یہ پڑھے لکھے لوگوں کا میسر ہے اور یہ دھندا اخبار در سائل کے مالکان سرانجام دیتے ہیں- مثلاً جنگ پزل نمبر ۵ وغیرہ اس کا طریق کار بھی معروف ہے جسے ہر پڑھا لکھا شخص تو کم از کم ضرور جانتا ہے- فرق صرف یہ ہے کہ اس میں قرعہ اندازی کے بجائے پہلا انعام صحیح حل والوں کے لیے ہوتا ہے خواہ وہ ایک ہو یا زیادہ ہوں- اگر زیادہ ہوں تو ان میں برابر بانٹ دیا جاتا ہے- دوسرا انعام ایک غلطی والے کے لیے اور تیسرا دو غلطیوں والوں کے لیے- اخبارات ورسائل کے مالکان لوگوں کو معمہ بازی کی چاٹ لگا کر خوب دولت بٹورتے ہیں- جس کا کچھ انعامات کی شکل میں لوگوں کو واپس کیا جاتا ہے- میسر کی اس قسم کو معیوب تو کجا' مستحسن سمجھا جاتا ہے- کیونکہ یہ پڑھے لکھے لوگوں کا کھیل ہے اور اس میں کچھ ذہنی کاوش بھی ہوتی ہے-

(۳) ریفل ٹکٹ:

یہ بھی لاٹری ہی کی ایک قسم ہے- جو بے نظیر کے وزارتِ عظمیٰ کے دور میں حکومتی سطح پر ہوئی- علماء نے اس سکیم کے خلاف بھرپور احتجاج بھی کیا- جو بے سود ثابت ہوا- اس اسکیم کے ذریعے بے نظیر کے سسرال زرداری خاندان نے خوب ہاتھ رنگے-

(۴) ریس کورس:

یہ ''ہائی جینٹری'' کی قمار بازی ہے- جس میں بڑے بڑے نواب اور سیٹھ یا اعلیٰ افسر قسم کے لوگ حصہ لیتے ہیں- یہ لوگ صرف گھڑ دوڑ میں مسابقت کے لیے گھوڑوں کی تربیت کرتے ہیں- بڑے بڑے شہروں میں گھوڑ دوڑ کے میدان بنے ہوتے ہیں جہاں یہ دھندا کیا جاتا ہے- اس کاروبار میں بھی عموماً پرانے گھاگ اور ان کے گھوڑے ہی جیتتے اور انعامات کی رقوم حاصل کرتے ہیں نووارد حضرات بھی اور گھوڑے بھی خواہ کتنے تیز رفتار ہوں عموماً مات کھا جاتے ہیں- یہ دھندا چونکہ ہے ہی بڑے بڑوں کا لہٰذا اسے بُرا کہنے کی جسارت کون کرسکتا ہے؟

ان کے علاوہ کچھ دھندے ایسے ہیں جو سود اور میسر کی مرکب شکلیں ہیں۔ جیسے بیمہ پالیسی اور انعامی بانڈ وغیرہ۔ ایسے دھندوں کو حکومت کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ بلکہ وہ حکومت کی اپنی سرپرستی میں چل رہے ہیں۔ لہٰذا ایسے دھندوں کو عام لوگ کیسے ''ناجائز'' تصور کر سکتے ہیں۔ ایسے دھندوں کا مسئلہ چونکہ تفصیل طلب ہے۔ اور ان کا تعلق میسر سے زیادہ سود سے ہے۔ لہٰذا ہم انہیں الگ باب میں ذکر کر رہے ہیں۔ جو سود کے بعد آئے گا۔

ممکن ہے یہاں میسر کی کئی صورتوں کا ذکر رہ گیا ہو یا آنے والے زمانہ میں معرضِ وجود میں آئیں۔ لہٰذا ان کے متعلق یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ جب بلا محنت یا تھوڑی سی محنت پر بہت سا مال ہاتھ لگ رہا ہو تو ایسا دھندا میسر ہی کی تعریف میں آئے گا۔

۳۔ بت فروشی اور مصوری

مندرجہ بالا آیت میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ ان میں تیسرا نمبر ''انصاب'' کا ہے انصاب دراصل ان نصب شدہ مجسموں کو کہتے ہیں۔ جن کی دور جاہلیت میں عبادت کی جاتی اور انہیں عزت و تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بت پرستی چونکہ شرک کی سب سے بڑی اور واضح قسم ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے زندگی بھر شرک ہی کے خلاف جہاد کیا تھا۔ لہٰذا آپ کو ایک گونہ یہ اطمینان تھا کہ میری امت بت پرستی میں مبتلا نہ ہوگی۔ چنانچہ امت مسلمہ بالعموم بت گری۔ بت پرستی اور بت فروشی سے بچی رہی ہے۔ وہ اپنے صالحین کے بت نہ گھڑتی ہے' نہ پوجتی ہے اور نہ بیچتی ہے۔ جیسا کہ نوح علیہ السلام کی قوم نے اپنے صالحین' ود' سواع' یغوث' یعوق اور نسر کے بت بنا کر ان کی پوجا شروع کر دی تھی۔ اور ان کی خرید و فروخت بھی کرتے تھے۔ نہ ہی مسلمان ہندوؤں کی طرح مختلف جانوروں کے بغرضِ عبادت و تعظیم مجسمے بناتے اور ان کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔

بت گری اور مصوری میں قدرِ مشترک:

البتہ مسلمانوں میں بت گری کی بجائے مصوری رواج پا گئی ہے۔ یہ تصویر گری خواہ ہاتھوں کی محنت ہو یا کیمرہ کی مدد لی گئی ہو۔ دورِ جاہلیت کے لوگ اپنے صالحین یا دیوی دیوتاؤں کے بت بناتے تھے۔ جبکہ مسلمان اپنے فرمانرواؤں' ہر دلعزیز سیاسی لیڈروں اور قابلِ تعظیم حضرات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو بھی ان تصویروں سے وہی عقیدت ہوتی ہے جو اس دور کے

مشرکوں کو اپنے بزرگوں کے مجسموں سے ہوتی تھی-عزت وتکریم کے جذبات میں بھی کچھ فرق نہیں ہوتا-وہ لوگ ان مجسموں کو کسی خاص مقام پر نصب کرتے اور ان کے چھوٹے چھوٹے سائز گھروں میں رکھتے تھے-مسلمان بھی ان تصویروں کو اپنے گھروں اور دفتروں میں آویزاں کر کے انہیں کی طرح مزین کرتے اور ان سے عقیدت رکھتے ہیں-اور یہ بات تو واضح ہے کہ تصویر کشی صرف اسکی کی جاتی ہے-جس سے انسان کو عقیدت ہو یا وہ دوسروں سے تعظیم کرانا چاہتا ہو-

مثلاً ایرانی شیعہ جو بزعم خویش اسلامی انقلاب کے داعی ہیں-اپنے امام خمینی کی تصویر کو اسی کی ہدایات کے مطابق سینے سے چمٹائے گلے لگائے بیت اللہ شریف میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں-رسول اللہ ﷺ نے جس کعبہ کو بتوں اور تصویروں سے پاک کیا تھا-اسی گھر کو یہ لوگ کاغذی بتوں سے آلودہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں-

پھر کہیں آپ شیخ عبدالقادر جیلانی کی تصویر دیکھیں گے جو کشتی کے نیچے ہاتھ دے کر اسے ساحل پر لگا رہے ہیں-ان کی مشکل کشائی کو ظاہر کرنے والا یہ کاغذی بت اب دکانوں پر بکتا ہے اور گھروں میں آویزاں کیا جاتا ہے-

اور کہیں آپ کو کسی ننگ دھڑنگ بزرگ کی تصویر دکھائی دے گی-جو صرف ایک لنگوٹی پہنے جانوروں میں گھرے ہوئے ہیں-اور کسی تصویر میں کسی بزرگ کو شیر پر سوار دکھایا جارہا ہے پھر ان کے ساتھ ان کے مزاروں کی تصاویر بھی بنی ہوئی ہیں-

گویا جاہلی دور کے لوگ جیسی عقیدت پتھر کے مجسموں سے رکھتے تھے-ویسی ہی عقیدت آج کا مسلمان کاغذی بتوں سے رکھتا ہے-بت گری اور مصوری میں اسی مشابہت کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے مصور کو ملعون قرار دیا ہے-[1]

اس بات کی وضاحت اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ ایک دفعہ ایک آدمی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا-

((اِنِّی اِنْسَانٌ وَاِنَّمَا مَعِیْشَتِیْ مِنْ صَنْعَةِ یَدِیْ وَاِنِّیْ اَصْنَعُ هٰذِهِ التَّصَاوِیْرَ-)) (میں ایسا آدمی ہوں جو اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کھاتا ہوں اور تصویریں بنایا کرتا ہوں-)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہنے لگے میں تم سے وہی کچھ بیان کروں گا-جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے-آپ ﷺ فرماتے تھے-کہ جو شخص تصویریں بناتا ہے-قیامت کے

---

[1] بخاری-کتاب البیوع-باب موکل الربوا (۲۰۸۶) و باب ثمن الکلب (۲۲۳۸)

دن اللہ اس سے کہے گا۔ کہ اب اس میں جان بھی ڈال۔ اور یہ کام وہ کبھی نہ کر سکے گا۔ یہ سن کر اس کا منہ فق اور رنگ زرد ہو گیا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابن عباس کہنے لگے اگر کوئی اور کام نہیں جانتا تو درختوں یا ان چیزوں کی تصویریں بنایا کر جو جاندار نہیں ہیں[1]

کپڑوں کی تصاویر:

کپڑوں پر منقش اور بنی ہوئی تصویروں کے متعلق دو قسم کی روایات بخاری میں آتی ہیں اگر وہ پردہ وغیرہ کی صورت میں ہوں تو بالاتفاق ناجائز ہیں۔ اور اگر تو شک یا تکیہ بنا لیا جائے یعنی وہ روندی جا سکتی ہوں تو پھر کچھ قباحت نہیں۔ تاہم راجح بات یہی ہے کہ تصاویر والا کپڑا ممنوع ہے۔ کیوں کہ ایسے گھروں میں جہاں تصویریں ہوں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔[2]

بچوں کے کھلونے:

رہے بچے کے کھلونے تو اس معاملہ میں اتنی سختی نہیں ہے بخاری میں ہی یہ روایت موجود ہے کہ حضرت عائشہ بچپنے میں گڑیوں سے کھیلا کرتی تھیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان سے تعرض نہیں فرمایا۔[3]

فوٹو گرافی

رہا کیمرہ سے فوٹو اتارنے کا مسئلہ۔ تو اس کے متعلق بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ تصویر نہیں بلکہ عکس ہے۔ لہٰذا اس میں کچھ قباحت نہیں۔ بعض علماء اس مسئلہ میں شدت کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس مسئلہ کی چار صورتیں ہیں۔

(۱) سیاسی لیڈروں، بزرگوں ہر دلعزیز شخصیتوں اور فرمانرواؤں کی تصاویر۔ جن میں احترام کا پہلو بھی ہوتا ہے اور ان کی خرید و فروخت بھی ہوتی ہے۔ یہ قطعاً ممنوع ہے۔

(۲) اضطراری صورت جیسے سکوں اور نوٹوں پر کسی فرمانروا کی تصویر یا پاسپورٹ یا شناختی کارڈ کی تصویر وغیرہ جو فی زمانہ اضطرار اور مجبوری کی شکل اختیار کر چکی ہیں اور ایسی صورتوں میں انسان کے اپنے اختیارات کو کچھ دخل نہ ہو۔ یہ صورت مباح یا جائز ہوگی۔ کیونکہ فقہ کا عام

---

[1] بخاری کتاب البیوع۔ باب بیع التصاویر التی لیس فیھا روح۔ (۲۲۲۵)
[2] بخاری کتاب اللباس۔ باب التصاویر۔ (۵۹۴۹) و کتاب بدء الخلق (۳۲۲۵)
[3] بخاری کتاب الادب۔ باب الانبساط الی الناس (۶۱۳۰)

اصول ہے الضرورات تبیح المحظورات یعنی مجبوریاں ممنوعات کو مباح بنا دیتی ہیں۔

(۳) تیسری درمیانی صورت ہے جس میں انسان کے اختیار کو عمل دخل ہوتا ہے۔ تاہم ان میں نہ عزت واحترام کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اور نہ ان کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔ جیسے انسان کا اپنی یا اپنے دوست احباب کی فوٹو کھچوانا اور بطور یادداشت اپنے پاس سنبھالے رکھنا۔ تقویٰ کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اس سے بھی پرہیز کرے۔

(۴) اور چوتھی صورت یہ ہے کہ انسان یہ آرزو رکھتا ہو۔ کہ مضمون کے ساتھ اس کی تصویر بھی اخبار ورسائل اور اشتہارات میں چھپے اور یہ ایسا مرض ہے کہ عوام تو کجا بڑے بڑے علماء بھی اس میں گرفتار ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ صورت بھی ناجائز ہے۔ کیونکہ اس سے مقصود شہرت اور نمود نمائش ہوتی ہے۔ الیکشن کے دوران اشتہارات میں نمائندوں کی تصاویر بھی اس ضمن میں آتی ہیں۔ بلکہ یہ سارا دھندا ہی شرعاً ناجائز ہے[1]

۴۔ پیش گوئی کرنے والے

مندرجہ آیت میں خمر، میسر انصاب کے بعد چوتھا نمبر ازلام کا ہے۔ ازلام زلم کی جمع ہے۔ یعنی فال کے تیر جن کے ذریعہ معلوم کیا جاتا ہے کہ آئندہ کے حالات فال لینے والے کے حق میں مفید ہیں یا مضر۔

انسان طبعاً اپنے متعلق آئندہ کے حالات جاننے پر حریص واقع ہوا ہے۔ غیب جاننے سے متعلق کیا اغراض وابستہ ہو سکتی ہیں؟ اس کی وضاحت بھی خود قرآن کریم نے کر دی۔ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہیں کہ آپ لوگوں سے کہہ دیجئے:

﴿لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْءُ﴾ (۷:۱۸۸) (اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو میں بہت سے فائدے جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف بھی نہ پہنچتی۔)

(۱) غیب کے حالات اللہ کے رسول بھی نہیں جانتے اور یہ کہ جس قدر غیب کی باتیں اللہ چاہتا کسی رسول کو بذریعہ وحی بتا دیتا ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت سے ثابت ہے۔

(۲) اور دوسرے یہ کہ غیب کے حالات جاننے کے دو فائدے ہیں ایک یہ کہ انسان اپنے

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب ''خلافت و جمہوریت''

لیے فائدے جمع کرسکتا ہے- اور دوسرے یہ کہ وہ نقصانات سے بچ سکتا ہے یا ان سے بچنے کی تدابیر اختیار کرسکتا ہے-

علم غیب سے متعلقہ علوم

(۱) فال گیری:

گویا جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت ہی ایسی اغراض ہیں- جن کے لیے انسان ہر طرح کے جرائم کرتا اور جائز و ناجائز ذرائع اختیار کرتا ہے- حتی کہ شرک بھی اسی لیے کرتا ہے- فال کے تیروں سے فال نکالنا بھی ایسا ہی ایک ذریعہ ہے جسے قرآن نے رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ کہہ کر حرام قرار دے دیا-

(۲) علم نجوم:

اس ذریعہ کے علاوہ غیب کے حالات معلوم کرنے کے لیے عرب میں مزید دو طریقے مروج تھے- ایک یہ تھا کہ لوگ ستاروں کی گردش سے آئندہ کے حالات معلوم کرتے اور انسانی زندگی پر ان کی گردش کے اثرات کو تسلیم کرتے تھے اور یہ ایسا پرانا طریقہ تھا- جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے بھی پہلے سے چلا آ رہا تھا- چنانچہ ۶ھ میں (صلح حدیبیہ کے سال) آپ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر چودہ سو صحابہ سمیت پڑاؤ ڈالا- تو ایک رات بارش ہوئی- تو آپ ﷺ نے صبح کی نماز کے بعد صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا- کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ جس نے یہ سمجھا کہ بارش اللہ کے فضل اور اس کی مہربانی سے ہوئی ہے وہ مجھ پر ایمان رکھتا ہے اور ستاروں کا منکر ہے اور جس نے یوں کہا کہ فلاں ستارے کے فلاں برج اور فلاں نچھتر میں داخل ہونے سے بارش ہوئی اس کا ایمان ستاروں پر ہے اور اس نے میرے ساتھ کفر کیا-[۱]

اور اسی کا نام نجوم پرستی ہے- جس میں اہلِ بابل گرفتار تھے اور حضرت ابراہیمؑ نے اس قسم کے شرک کے خلاف بھی مسلسل جہاد فرمایا تھا-

(۳) کہانت:

عرب میں تیسرا مروج طریقہ کہانت تھا- کاہن حضرات لوگوں کو غیب کی خبریں بتایا

[۱] بخاری کتاب المغازی- باب غزوۃ الحدیبیۃ (۴۱۴۷) و کتاب الأذن باب یستقبل الامام الناس اذا سلم (۸۴۶)

کرتے تھے اور معاشرہ کے معتبر اور معزز افراد شمار ہوتے تھے- اس غرض کے لیے بڑے بڑے لوگ دور دور سے ان کے آستانوں پر آتے اور گرانقدر نذرانے پیش کرتے تھے- اور حد یہ ہے کہ بعض کاہنوں سے بعض اہم مقدمات کے فیصلے بھی کرائے جاتے تھے- ایسا عقیدہ چونکہ اللہ پر توکل اور ایمان کے منافی ہے- لہٰذا اس پیشہ اور اس سے حاصل ہونے والی کمائی کو رسول اللہ ﷺ نے حرام قرار دیا[1]- چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا-

((۱- مَنْ اَتٰی عَرَّافاً فَسَاَلَهٗ عَنْ شَيْئٍ لَمْ يُقْبَلْ لَهٗ صَلٰوةُ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً- [2]))

(یعنی جو کوئی غیب کی خبریں بتانے والے کے پاس جائے اور اس سے پوچھے- اس کی چالیس دن تک نماز قبول نہیں ہوتی-)

((۲- مَنْ اَتٰی کَاهِناً فَصَدَّقه بما يَقُوْلُ فَقَدْ کَفَرَ بِمَآ اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ ﷺ- [3]))

(یعنی جو کوئی کسی کاہن کے پاس جا کر دریافت کرے اور پھر اس کی تصدیق کرے تو اس نے اس سے کفر کیا جو محمد ﷺ پر نازل ہوا-)

۳- حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا-

((اَلْمُنَجِّمُ کَاهِنٌ وَالْکَاهِنُ سَاحِرٌ وَالسَّاحِرُ کَافِرٌ- [4]))

(نجومی کاہن ہے اور کاہن ساحر (جادوگر) کی ہے اور ساحر کافر ہے-)

---

[1] بخاری کتاب البیوع- باب ثمن الکلب (۲۲۳۷) وکتاب الاجارة باب کسب البغی و الاماء (۲۲۸۲)

[2] مسلم- باب السلام باب تحریم الکهانة و اتیان الکهان (۲۲۳۰) شرح السنة ۲/ ۱۲۸ بیهقی ۸/۱۳۸ حلية الأولياء ۱۰/۴۰۷)-

[3] ابوداؤد کتاب الطب باب فی الکاهن (۳۹۰۴) ابوداؤد میں ''کفر'' کی جگہ ''بری مما'' کے الفاظ ہیں ترمذی کتاب الطهارة باب فی کراهية اتيان الحائض (۱۳۵) ابن ماجہ کتاب الطهارة باب النهی عن اتيان الحائض (۶۳۹) المسند الجامع ۱۶/۵۶۳ اس کی سند حکیم الاثرم کی وجہ سے ضعیف قرار دی گئی ہے یہ شواہد کی وجہ سے حسن ہے اس کا ایک شاہد عبداللہ بن مسعود سے- طبرانی کبیر' طبرانی اوسط' مسند بزار اور مسند ابویعلیٰ وغیرہ میں موجود ہے- مجمع الزوائد کتاب الطب باب فیمن اتی کاهنا او عرافا (۸۴۸۹'۸۴۹۰)

[4] مشکوٰۃ کتاب الطب والرقی باب الکهانة الفصل الثالث '(۴۶۰۴) رواہ رزین شیخ البانی فرماتے ہیں ''لم اقف علی اسناده وهو بهذا السياق غريب لم يورده' السيوطی حتی ولا فی ''الجامع الکبير' و کانه الحديث المتقدم الاان فيه کلمات زائدة عليه کانها مدرجه'' (تخریج مشکوٰۃ ۴/۲۹۶'۲۹۷) میں اس کی سند پر واقف نہیں ہوا اور یہ حدیث اس سیاق سے غریب ہے اسے سیوطی نے جامع کبیر میں بھی روایت نہیں کیا گویا کہ یہ پہلے گزر جانے والی حدیث ہے مگر اس میں کچھ کلمات اس سے زائد ہیں گویا کہ وہ مدرج ہیں اس سے پہلے گزر جانے والی جس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے-

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک غلام تھا جو روزانہ خراج کی ایک مقررہ رقم ادا کرتا تھا۔ ایک دن وہ غلام کوئی کھانے کی چیز (مٹھائی وغیرہ) لایا۔ جس میں سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی کچھ کھالی۔ وہ غلام آپ سے کہنے لگا۔ "پتا ہے یہ کیا چیز ہے اور کیسی ہے؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے بتاؤ تو!" اس نے کہا میں زمانہ جاہلیت میں کہانت کیا کرتا تھا۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتا بھی نہ تھا اور دھوکہ سے کام چلاتا تھا سو کسی نے آج اجرت کے طور پر مجھے یہ چیز دی ہے اور وہی آپ نے کھائی ہے۔ یہ سن کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے منہ میں انگلی ڈال کر قے کر دی اور اور پیٹ میں جو کچھ تھا سب نکال دیا۔[1]

مذکورہ حدیث میں کاہن کی کمائی کی حرمت واضح کی گئی ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خود کہانت کا کاروبار نہیں کرتے تھے۔ مگر جب حقیقت حال واضح ہوئی تو طبیعت نے ایسا ایک لقمہ بھی جسم کے اندر رکھنا گوارا نہ کیا۔

اس آیت اور ان احادیث سے واضح ہوتا ہے۔ کہ جو پیشے بھی غیب کی خبر دینے سے تعلق رکھتے ہیں خواہ علم نجوم ہو یا جوتش، کہانت ہو یا رمل و جفر سے متعلق ہوں حرام ہیں اور ان سے حاصل شدہ کمائی بھی حرام ہے۔

ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ کاہنوں کی کچھ باتیں تو سچی بھی نکل آتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بات یہ ہوتی ہے کہ کاہن اپنے شیطانوں (رجال الغیب) سے بات سنتے ہیں اور شیطان فرشتوں سے اڑا لیتا ہے۔ جو اپنے ولی یعنی دوست کے کان میں پھونک دیتا ہے۔ تو یہ لوگ اس میں کئی جھوٹ ملا لیتے ہیں۔[2]

مطلب یہ ہے کہ اگر ان کی کوئی بات سچی نکل بھی آئے تو یہ اس کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتی نہ ہی ایسے لوگوں کی کمائی حلال ہو سکتی ہے۔

غیب کا علم اگر درست طور پر کسی کو معلوم ہو تو وہ اپنے لیے بہت فوائد جمع کر سکتا ہے۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) "من اقتبس علما من النجوم اقتبس شعبة من السحر زاد ما زاد" مشکوۃ (۴۵۹۸) جس نے علم نجوم حاصل کیا اس نے جادو کا ایک حصہ حاصل کیا وہ جتنا زیادہ علم نجوم سیکھے گا اتنا زیادہ جادو میں مبتلا ہوگا۔"

اس حدیث کو امام احمد ۱/۳۱۱ ابوداؤد (کتاب الطب باب فی النجوم (۳۹۰۸) اور ابن ماجہ (کتاب الادب باب تعلم النجوم (۳۷۲۶)) نے روایت کیا ہے اس کی سند جید ہے سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ (۷۹۳)

[1] صحیح البخاری کتاب مناقب الانصار باب ایام الجاھلیۃ (۳۸۴۲)

[2] بخاری کتاب الطب۔ باب الکھانۃ۔ (۵۷۶۲) و کتاب بدء الخلق باب ذکر الملائکۃ صلوت اللہ علیھم (۳۲۱۰)

مثلاً اگر کسی کو اشیاء کے نرخوں کا اتار چڑھاؤ کا ہی صحیح علم ہو تو وہ قلیل عرصہ میں امیر کبیر بن سکتا ہے۔ حالانکہ مشاہدہ یہ ہے کہ اس قسم کے لوگ عموماً مفلوک الحال ہی ہوتے ہیں۔ اور یہی ایسے علوم کے غیر یقینی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

۵۔ فحاشی کے کاروبار

فحاشی کی سب سے واضح قسم زنا ہے۔ لہٰذا اس ذریعہ سے حاصل شدہ رزق حرام ہوگا۔

ارشاد باری ہے۔

﴿وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (۲۴:۳۳)

(اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاکدامن رہنا چاہیں تو دنیوی فائدہ حاصل کرنے کی خاطر انہیں بدکاری پر مجبور نہ کیا کرو۔)

قحبہ گری:

اس دور میں بھی حریص قسم کے لوگ اپنی لونڈیوں کو اس کام پر مجبور کرتے تھے اور آج کے دور میں بھی چکلوں کے سرپرست اکثر پٹھان یا ایسے لوگ ہوتے ہیں جنہیں دنیوی حرص نے اندھا کر رکھا ہو۔ اس دور میں لونڈیاں مجبور تھیں۔ اب لونڈی غلام کا تو مسئلہ ہی نہیں رہا اس کے بدل اغوا کا مسئلہ بن چکا ہے اور شکل قریباً قریباً ویسی ہی بن گئی ہے۔ بہر حال عورت خواہ غلام ہو' اغوا شدہ ہو' یا آزاد اور با اختیار عصمت فروشی سے حاصل کردہ کمائی خالصتاً حرام ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرما دیا ہے[1]

اسلام نے زنا کو حرام قرار دیا تو اس کے محرکات پر پابندی لگا کر انہیں ممنوع قرار دیا ہے ان محرکات میں سب سے بڑا محرک عورت اور مرد کا آزادانہ اختلاط ہے۔ پھر اگر کوئی عورت اپنی سریلی سرتان سے گا کر غیر مردوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی ہو۔ تو اس سے فحاشی کو جو فروغ حاصل ہوگا۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ جاہلی دور میں جس طرح حریص لوگ اپنی لونڈیوں سے پیشہ کرواتے تھے۔ اسی طرح انہیں گانا بجانا سکھانے کا بھی اہتمام کرتے تھے تاکہ ان سے زیادہ آمدنی حاصل ہو۔ نیز خرید و فروخت کے وقت اس قسم کی لونڈیوں کی قیمت بھی بڑھ جاتی تھی۔ آپ ﷺ نے ایسی

---

[1] بخاری کتاب البیوع۔ باب ثمن الکلب (۲۲۳۸) کتاب الطلاق باب مهر البغی و النکاح الفاسد (۵۳۴۷) (۵۳۴۸) و کتاب الاجارۃ باب کسب البغی و الاماء (۲۲۸۲' ۲۲۸۳)

باتوں سے بھی واضح طور پر منع فرما دیا۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

((لَا تَبِیعُوا الْقَیْنَاتِ وَلَا تَشْتَرُوهُنَّ وَلَا تُعَلِّمُوهُنَّ وَثَمَنُهُنَّ حَرَامٌ[1])) (گانا بجانا کرنے والی عورتوں کو نہ بیچو، نہ خریدو، نہ انہیں یہ کام سکھاؤ اور ان کی اجرت حرام ہے۔)

اور یہ بات صرف عورتوں تک ہی محدود نہیں مرد کی سریلی آواز بھی عورت کے لیے وہی کشش رکھتی ہے جو عورت کی مرد کے لیے رکھتی ہے۔ اسی لیے اسلام نے غنا اور موسیقی کو ناجائز قرار دیا ہے۔ قرآن میں اس کے لیے ''لہوالحدیث'' کا لفظ استعمال ہوا ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ قرآن میں لہوالحدیث گانا اور موسیقی کے لیے آیا ہے[2]۔ نیز آپ فرمایا کرتے کہ'' گانا بجانا انسان کے دل میں یوں نفاق پیدا کرتا ہے جیسے پانی سے گھاس اور سبزہ اگ آتا ہے''۔[3]

---

1 ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فی کراهية بيع المغنيات (۱۲۸۲) مسند احمد ۳۶/۵۰۳ رقم (۲۲۱۶۹) مسند حمیدی ۲/۴۵ ابن ماجۃ کتاب التجارات باب مالا یحل بیعہ (۲۱۶۸) اس کی سند عبیداللہ بن زحر الافریقی اور علی بن یزید کی وجہ سے ضعیف ہے۔ اس مفہوم کی ایک اور حدیث عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے طبرانی میں مروی ہے جس میں الفاظ یوں ہیں۔''ثمن القينة سحت و غناء ها حرام و النظر اليها حرام و ثمنها مثل ثمن الكلب و ثمن الكلب سحت و من نبت لحمه على السحت فالنار اولى به '' گلوکارہ کی کمائی حرام ہے اور اس کا گانا حرام ہے۔ اس کی طرف دیکھنا حرام ہے۔ اس کی کمائی کتے کی قیمت کی طرح ہے۔ اور کتے کی قیمت حرام ہے۔ جس کا گوشت حرام پر پروان چڑھا آگ اس کے زیادہ لائق ہے۔ (مجمع الزوائد ۴/۹۱) لیکن اس کی سند میں یزید بن عبدالملک النوفلی متروک ہے۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مسند ابی یعلی (۵۲۷) میں گانا بجانے والی عورتوں کی بیع کی ممانعت پر حدیث مروی ہے لیکن اس کی سند الحارث بن نبھان، علی بن زید اور الحارث الاعور کی وجہ سے سخت ضعیف ہے۔

2 فتاویٰ رئیس العام سعودی عرب عبدالعزیز بن باز ج ۱ ص ۲۲۳۔ تفسیر طبری ۲۱/۶۲ حاکم ۲/۴۱۱ بیہقی ۱۰/۲۲۳ شعب الایمان ۴/۲۷۸ اس کی سند صحیح ہے۔

3 احمد بحوالہ مشکوۃ کتاب الحدود باب بيان الخمر و وعيد شاربها۔ فصل ثالث۔ یہ روایت ابن ابی الدنیا نے ''ذم الملاھی'' اور ابوالحسین بن المنادی نے ''احکام الملاھی'' میں ذکر کی ہے جیسا کہ اغاثۃ اللھفان ۱/۲۴۸ میں ہے امام بیہقی نے السنن الکبریٰ ۱۰/۲۲۳ میں ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعا بیان کی ہے اور ابوداؤد (۴۹۲۷) میں مشبہ بہ کے بغیر بیان ہوئی ہے اس روایت کو امام ابن حزم نے المحلی ۹/۵۷ امداد بن طاہر نے السماع ص ۸۷،۸۸ میں اور ابن القیم نے اغاثۃ اللھفان میں سلام بن مسکین کے شیخ کی جہالت کی وجہ سے ضعیف کہا ہے۔ طرح بیہقی ۱۰/۲۲۳ میں ابی الدنیا کے طریق سے اسے موقوف بھی بیان کیا ہے۔ یہ سند محمد بن عبدالرحمان بن یزید اور ابن مسعودؓ کے درمیان انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہے۔ نیز اس کی سند میں سعید بن کعب المرادی کے حالات نامعلوم ہیں۔ اسی طرح ابن ابی الدنیا نے لیث عن طلحہ بن مصرف بن عبداللہ کے طریق سے بھی اسے بیان کیا ہے۔ یہ سند بھی منقطع ہے۔ طلحہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہیں پایا اور لیث بن ابی سلیم ضعیف ہے۔ اس کی ایک اور سند ابن ابی الدنیا کے طریق سے شعب الایمان بیہقی ۴/۲۷۸ میں بطریق الحکم عن حماد عن ابراھیم قال قال عبداللہ موجود ہے۔ لیکن یہ بھی منقطع ہے ابراہیم نخعی نے عبداللہ بن مسعودؓ کو نہیں پایا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ روایت مرفوع اور موقوف دونوں طرح ہی ثابت نہیں۔ یہ روایت جابرؓ سے شعب الایمان بیہقی ۴/۲۷۹ میں

سازومضراب:

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللهَ تَعَالَى بَعَثَنِي رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِينَ وَ اَمَرَنِي رَبِّي عَزَّوَجَلَّ بِمَحْقِ الْمَعَازِفِ وَالْمَزَامِيرِ وَالْاَوْثَانِ وَالصُّلُبِ وَاَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ [1]))

اللہ تعالیٰ نے مجھے جہاں والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے اور میرے پروردگار عزوجل نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں باجوں گاجوں، ساز ومضراب بتوں، صلیبوں اور امرِ جاہلیت کو ختم کردوں۔

افسوس کا مقام ہے کہ شریعت نے تو ساز ومضراب کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ چیز فنونِ لطیفہ میں شمار ہوتی ہے۔ ہمارے کالجوں میں فنونِ لطیفہ کے نام پر موسیقی، رقص، مجسمہ سازی اور مصوری کی تعلیم دی جارہی ہے اور انہیں Fine Arts کا نام دیا گیا ہے جن باتوں سے شریعت نے منع کیا تھا وہی باتیں ہماری فائن آرٹس کہلاتی ہیں۔ ہمارے آرٹس کالج جو انہی مضامین کی تعلیم کے لیے مخصوص ہیں۔ پوری قوم کو فحاشی کے گڑھے میں دھکیل رہے ہیں۔ غالباً اسی لیے اکبرالہ آبادی نے کہا تھا

؎ یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
اے کاش کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

(بقیہ پچھلا صفحہ) مروی ہے لیکن اس کی سند پر تین خرابیاں ہیں جن کی بنا پر یہ صحیح نہیں۔ (۱) محمد بن صالح الاشج ضعیف راوی ہے۔ اسے ابن حبان نے کتاب الثقات ۹/ ۱۴۸ میں ذکر کر کے کہا ہے ''یخطی'' یہ غلطیاں کرتا ہے۔ (۲) عبداللہ بن عبدالعزیز بن ابی رواد کی ابراہیم بن طہمان سے روایات منکر ہیں اور غیر ثقہ سے یہ روایت اس کی ابراہیم بن طہمان سے ہے۔ (ظعفا للعقیلی ۲/ ۲۷۹ میزان ۲/ ۴۵۵) (۳) ابوالزبیر مدلس ہے اسکی تصریح بالسماع نہیں ہے اور یہ روایت اس نے بیان کی ہے مدلس کی عن والی روایت ضعیف ہے۔ اسی طرح یہ روایت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً الکامل الابن عدی ۴/ ۱۵۹۰ اور العلل المتناہیہ الابن الجوزی ۲/ ۳۰۰ میں عبدالرحمن بن عبداللہ العمری از ابیہ از سعید بن ابی سعید از ابی ہریرہ مروی ہے اور عبدالرحمن کے طریق سے دیلمی نے ''الفردوس'' ۲/ ۸۵ میں بھی ذکر کی ہے ۱۰ اسے ابن عدی نے عبدالرحمٰن العمری کی منکر روایات میں شمار کیا ہے اور نسائی و دارقطنی نے اسے متروک قرار دیا ہے اور یحییٰ نے کہا ''لیس بشیٔ'' یہ کچھ نہیں ہے۔ انسؓ سے دیلمی نے ''الفردوس'' ۲/ ۳۲۲ میں روایت کیا ہے۔
اس کی سند میں احمد بن عبدالرحمن بن الجارود اور مسلمہ بن علی دونوں ساقط ہیں اول الذکر کو خطیب وغیرہ نے کذاب اور ثانی الذکر کے متروک ہونے پر اتفاق ہے۔ اس طرح اس کی سند میں عمر مولی غفرۃ کی انسؓ سے ملاقات ثابت نہیں۔ لہٰذا اس روایت کی کوئی مرفوع یا موقوف صحیح سند موجود نہیں۔ واللہ اعلم گانے بجانے کی حرکت کے لیے سورۃ لقمان کی آیت اور عبداللہ بن مسعودؓ کی تفسیر ہی کافی ہے اس بات کی تفصیل کے لیے راقم کی کتاب ''ٹی-وی معاشرے کا کینسر'' ملاحظہ ہو۔

[1] مسند احمد ۳۶/ ۵۵۱ (۲۲۲۱۸) اتحاف الخیرۃ (۵۱۰۷) مسند طیالسی (۷۸۰۳) طبرانی (۲۸۰۳) یہ سند انتہائی کمزور ہے اس میں فرج بن فضالۃ اور علی بن یزید الالہانی ضعیف راوی ہیں۔

فحاشی پھیلانے والے دوسرے ذرائع

اور ہمارا کردار یہ ہے کہ ہم ایسے کالجوں میں اپنی بچیوں اور بچوں کو بھیج کر فحاشی کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں کالج کے علاوہ ہمارے کئی اور ادارے بھی فحاشی پھیلانے والے دوسرے ذرائع کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ مثلاً

(۱) ریڈیو پر مرد اور عورتیں ساز و مضراب کے ساتھ گانے گاتے ہیں۔ جسے پوری قوم سنتی ہے۔

(۲) ٹیلی ویژن پر مرد اور عورت کے آزادانہ اختلاط کا بھی مظاہرہ ہوتا ہے۔

(۳) ہمارے اخبارات و رسائل میں عورتوں کی دلکش تصاویر محض اس لیے چھاپی جاتی ہیں کہ ان کی فروخت زیادہ ہو۔

(۴) سینما گھر تو فحاشی کے اڈے تھے ہی اب ویڈیو کیسٹ کے ذریعے یہ وبا ہر گھر پہنچ چکی ہے۔

(۵) فحش لٹریچر کی اشاعت عام ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ لٹریچر جتنا زیادہ فحش ہوگا۔ اسی قدر زیادہ فروخت ہوگا۔

(۶) سرمایہ دار حضرات اپنی اشتہار بازی کو کامیاب بنانے کے لیے کسی عورت کی دلکش تصویر کو اس کا ذریعہ بناتے ہیں اور دکانوں پر مردوں کی بجائے عورتوں کو سیل مین رکھا جاتا ہے۔

(۷) سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں عورتوں کو ملازم رکھ کر آزادانہ اختلاط کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔

(۸) بین الاقوامی ثقافتی وفود خود حکومتیں دوسرے ملکوں میں بھیجتی ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ رقص و سرود اور راگ رنگ کے بارے میں اس ملک کا ذوق کیسا ہے؟

(۹) بین الاقوامی سطح پر حسن کے عالمی مقابلے میں عموماً عورتیں حصہ لیتی ہیں اور ٹیسٹ کرنے والے مرد حضرات ہوتے ہیں جو ان کے ایک ایک عضو کا مشاہدہ و معائنہ کرنے کے بعد اپنے عدل و انصاف کی رائے پیش کرتے ہیں۔

(۱۰) آج کل دنیا بھر میں بے فائدہ قسم کے کھیل رائج ہو چکے ہیں۔ مثلاً ہاکی' کرکٹ' فٹ بال وغیرہ۔ جن میں وقت اور دولت دونوں کا ضیاع ہے۔ ایسے کھیلوں کو حکومتوں کی سرپرستی حاصل ہونے کی وجہ سے پوری قوم اب ان کی رسیا بن چکی ہے۔ حتیٰ کہ سرکاری دفتروں کے اہل کار دفتری کام چھوڑ کر ریڈیو کان سے لگائے میچوں کی خبریں سننے میں مصروف ہوتے ہیں اور ستم یہ ہے کہ اب

عورتوں نے بھی ایسے کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا ہے- جس نے فحاشی کو اور بھی فروغ بخشا ہے-

غور فرمایئے کہاں اللہ اور رسول ﷺ کی پاکیزہ تعلیمات اور کہاں یہ خرافات اور بے حیائیاں- پھر ستم یہ ہوا کہ اقدار ہی بدل گئیں- پہلے کنجر لوگ معاشرہ کا خسیس طبقہ شمار ہوتے تھے- آج وہ ایک معزز طبقہ بن گئے ہیں- اب انہیں کنجر کے بجائے اداکار اور فلم سٹار کا نام دیا گیا ہے- جسم اور لباس کی وضع میں پوری قوم ان کے پیچھے لگ گئی ہے فیشن کے موجد یہ لوگ ہیں اور تابع پوری قوم ہے- حکومتوں سے یہ حضرات گرانقدر انعامات وصول کر رہے ہیں- یہی حال کھلاڑیوں کا ہے- پوری قوم کی سربلندی اور نگوں ساری انہیں کی فتح و شکست کی مرہونِ منت بن کر رہ گئی ہے- یہی لوگ قوم کے ہیرو اور حکومت کے لاڈلے ہیں- ایسا کیوں ہوا؟ ہمارے خیال میں اس کی وجہ محض یہ ہے کہ مسلمان شریعت مطہرہ کو چھوڑ کر سپر پاورز کے محض ذہنی غلام بن کر رہ گئے ہیں- ایسی غلامی جس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا کہ

تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتے ہیں قوموں کے ضمیر

ماحصل یہ ہے کہ جو کام بھی فحاشی کو فروغ دینے والا ہو- بدکاری کی راہ کھولنے والا ہو یا آزادانہ اختلاط مرد و زن کی طرف لے جاتا ہو تو ایسا دھندا اور اس سے حاصل شدہ کمائی ناجائز ہے-

٦- حرام اور مردار جانوروں کی بیع

سور، شکاری کتے اور بلی کی بیع:

سور کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اور اس کا گوشت کھانا بھی حرام اور اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے- اسی طرح کتا بھی حرام اور اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے-[1]

صحیح احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ شکاری کتا اور رکھوالی کے لیے کتا رکھنے کی اجازت ہے- یہ رکھوالی خواہ ریوڑ کی ہو یا کھیتی یا گھر اور محلے کی ہو-[2]

اختلاف اس بات میں ہے کہ آیا شکاری یا رکھوالی کے کتے کی خرید و فروخت جائز ہے یا

---

[1] بخاری- کتاب البیوع- باب ثمن الکلب (۲۲۳۷، ۲۲۳۸)

[2] بخاری- کتاب الذبائح- باب من اقتنی کلباً لیس بکلب صید او ماشیۃ- بخاری کتاب البیوع باب

نہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے شکاری یا رکھوالی کے کتے کی اجازت دینے کے باوجود اس کی خرید و فروخت سے علی الاطلاق منع فرمایا ہے اور یہی کچھ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اس کے مقابلہ میں خرید و فروخت کی اجازت کے بارے جو روایات ملتی ہیں وہ ضعیف' منکر اور شاذ ہیں یعنی بے کار ہیں۔ جن سے کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہو سکتا[1]۔ علی ہذا القیاس بلی کی خرید و فروخت سے بھی منع فرمایا گیا ہے[2]۔

بظاہر یہ بات بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ شکاری کتے یا رکھوالی کے کتے کے رکھنے کی تو اجازت ہو مگر اس کی خرید و فروخت ممنوع ہو اور جس روایت میں اس کی اجازت ہے وہ مجروح ہے اس سے جو کچھ میں سمجھا وہ یہ ہے کہ شریعت کو ایسے کاروبار کا فروغ قطعاً گوارا نہیں۔ ایک وقت تھا۔ جب صحابہ کو کتوں کے قتل عام کا حکم دیا گیا تھا۔ پھر جب کتوں کی تعداد میں خاصی کمی واقع ہوگئی۔ تو یہ حکم منسوخ ہو گیا[3]۔ ایسی صحیح روایات بھی موجود ہیں کہ شکاری یا رکھوالی کے کتے کے علاوہ اگر کوئی کتا رکھے تو اس کا روزانہ دو قیراط اور بعض روایات کے مطابق ایک قیراط کم ہوتا رہتا ہے اور بعض روایات کے مطابق جس گھر میں کتا ہو وہاں فرشتے داخل نہیں ہوتے ان سب روایات سے واضح ہے کہ کتوں کی افزائش شریعت کو منظور نہیں ہے۔

بعض روایات میں کتے کی قیمت سے منع کیا گیا ہے۔ اور بعض میں اسے بری کمائی اور

(**بقیہ پچھلا صفحہ کا**) من اقتنی کلبالیس بکلب صیداو ماشیة (۵۴۸۰ تا ۵۴۸۲) عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالی عنہ و کتاب الحرث والمزارعۃ باب اقتناء الکلب للحرث (۲۳۲۲) عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالی عنہ و سفیان بن ابی زھیر رضی اللہ تعالی عنہ (۲۳۲۳) صحیح حدیث سے صرف شکاری' مویشی اور کھیتی کے لیے کتا رکھنا ثابت ہے۔ گھر کی رکھوالی کے لیے کتا رکھنے کی اجازت میں کوئی صحیح حدیث موجود نہیں۔ بلکہ صحیح حدیث میں ہے کہ جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آنے کا وعدہ کیا پھر آنے میں تاخیر کر دی۔ رسول اللہ ﷺ گھر سے نکلے تو جبریل دروازے پر کھڑے تھے۔ آپ نے فرمایا میں تمہارے وعدے کا انتظار کر رہا تھا تو اس نے کہا گھر میں کتا ہے ہم ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا اور تصویر ہو۔ عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کی چارپائی کے نیچے کتا کا پلا تھا۔ مسند احمد ۴۲/۳۶ (۲۵۱۰۰) وغیرہ۔

[1] التعلیقات السلفیہ علی النسائی۔ نیز ترمذی ابواب البیوع باب کراھیة ثمن الکلب السنور اور کتاب البیوع باب ثمن الکلب۔

[2] مسلم۔ کتاب المساقات۔ باب تحریم ثمن الکلب - ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فی کراھیة ثمن الکلب و السنور (۱۲۷۹) ابوداؤد کتاب البیوع باب فی ثمن السنور (۳۴۷۹) ابن ماجۃ کتاب التجارات بباب النھی عن ثمن الکلب (۲۱۶۱) نسائی کتاب البیوع (۴۲۹۰) مسند احمد ۲۳/۲۰ (۱۴۶۰۲) صحیح مسلم (۱۵۶۹)

[3] صحیح مسلم کتاب المساقاۃ۔ باب الامر بقتل الکلاب و بیان نسخه

بعض میں خبیث کمائی کہا گیا ہے[1]- لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اس کی خرید وفروخت سے پرہیز کی جائے فقہاء کا بھی اس بارے میں اختلاف ہے- امام احناف شکاری کتے یا رکھوالے کتے کی خرید وفروخت کو درست قرار دیتے ہیں بلکہ ان کے ہاں دوسرے شکاری جانوروں یعنی چیتا وغیرہ اور شکاری پرندوں کی بیع بھی جائز ہے اس طرح اس بلی کی بھی جو چوہے ختم کرنے یا کسی دوسری غرض سے رکھی یا پالی گئی ہو- ان کی دلیل یہ ہے کہ جس چیز سے انتفاع جائز ہے- اس کی خرید وفروخت بھی جائز ہے- وہ یہ کہتے ہیں کہ جن احادیث میں کتے یا بلی کی خرید وفروخت کی ممانعت آئی ہے تو اس سے مراد عام کتے ہیں- جن سے شکاری یا رکھوالی کے کتے مستثنیٰ ہیں-

اس کے برعکس امام مالکؒ شکاری کتے یا رکھوالے کتے یا بلی کی بیع کو ایک روایت کے مطابق ناجائز اور دوسری کے مطابق مکروہ قرار دیتے ہیں-

پھر اس بات میں یہ اختلاف آگے چلتا ہے کہ شکاری یا رکھوالے کتے یا بلی کو اگر کوئی مار دے یا اس کے ہاتھوں مر جائے تو کیا مارنے والوں پر اس کی قیمت کا تاوان پڑے گا؟ تو جو لوگ اس کی بیع کے ہی قائل نہیں ان کے ہاں اس کا کچھ تاوان نہیں- کیونکہ اس کی کچھ قیمت ہی نہیں- البتہ احناف جو بیع کے قائل ہیں- ان کے ہاں مارنے والے کو تاوان ادا کرنا پڑے گا-

(فقہ السنہ ج ۳ ص ۱۳۱)

خون کی بیع:

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے خون کو حرام قرار دیا- تو اس کی خرید وفروخت بھی حرام ہے[2]-

اب سوال یہ ہے کہ بلڈ بنک تو کاروبار ہی یہی کرتے ہیں تو کیا یہ سب کچھ ناجائز ہے اور اس سے بھی پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا انتقال خون بذاتہ جائز ہے یا نہیں؟ قیمت اور خرید وفروخت کی بات تو بعد میں ہوگی- شرعی لحاظ سے انتقال خون سے بعض بہت دور رس نتائج پیدا ہوتے ہیں- جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں- اسی لیے متقی حضرات انتقال خون کو جائز قرار نہیں دیتے-

لیکن اکثر علماء اس کو اضطرار کی بنا پر جائز قرار دیتے ہیں- اور یہ تو واضح بات ہے کہ انتقالِ خون کی ضرورت ہی اس وقت پیش آتی ہے جب کسی کی زندگی خطرہ میں ہو- اس صورت میں انتقالِ خون بھی جائز ہوگا اور اس کی خرید وفروخت بھی-

---

[1] مسلم- کتاب المساقات والمزارعت- باب امر بقتل الکلاب- صحیح مسلم کتاب المساقاۃ باب تحریم ثمن الکلب (۱۵۶۷، ۱۵۶۸، ۱۵۶۹)

[2] بخاری- کتاب البیوع- باب موکل الربوا (۲۰۸۶) باب ثمن الکلب (۲۲۳۸)

مردار کی چربی اور بعض دوسری اشیاء کی بیع:

اب تک ایسی چیزوں کی حرمت کی بحث چل رہی تھی جو بذاتہ حرام ہیں- لیکن حلال جانور بھی اگر ذبح نہ کیا گیا ہو اور مر جائے تو اس کا گوشت کھانا تو حرام ہے جیسا کہ کتاب وسنت سے واضح ہے- البتہ اس کی بعض دوسری اشیاء ایسی ہیں جن میں سے بعض سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا اور بعض سے اٹھایا جاسکتا ہے-

رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے دن مکہ میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے شراب' مردار' خنزیر اور بتوں کی خرید وفروخت حرام کردی ہے- تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ بتایئے کہ مردار کی چربی کے متعلق کیا حکم ہے اس سے تو کشتیاں ملی جاتی ہیں- چمڑے تر کیے جاتے ہیں اور چراغ جلانے کے کام بھی آتی ہے؟

گویا صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسے تین مصارف کا ذکر کیا جو کھانے کے علاوہ تھے- بالفاظِ دیگر ان کا سوال یہ تھا کہ چربی کھانا تو حرام ہے؟ کیا اسے کسی دوسرے مصرف میں بھی لایا جاسکتا ہے- اور اس غرض سے بیچا یا خریدا جاسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **لَا هُوَ حَرَامٌ** (نہیں بلکہ وہ حرام ہے) اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا- ''اللہ یہود پر لعنت کرے جب ان پر جانوروں کی چربی حرام ہوئی تو انہوں نے اس کو پگھلایا پھر بیچ کر اس کی قیمت کھالی-''[1]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مردار کی چربی سے یہ تینوں قسم کے انتفاع حرام ہیں یا ایسی چربی کی بیع حرام ہے؟ بالفاظ دیگر آپ ﷺ کے الفاظ **لَا هُوَ حَرَامٌ** میں **هُوَ** کی ضمیر انتفاع کی طرف راجع ہے یا بیع کی طرف؟

اس مسئلہ پر راجح بات یہی ہے کہ یہاں ضمیر بیع کی طرف راجع ہے- کیونکہ آپ نے یہودیوں کے اس چربی بیچنے اور اس کی قیمت کھانے کے عمل پر لعنت فرمائی ہے- رہا انتفاع کا مسئلہ تو وہ جائز ہے- اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ایسے روغن کے متعلق پوچھا گیا- جس میں چوہیا گرگئی ہو تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ایسے روغن

---

[1] صحیح البخاری کتاب البیوع باب لایذاب شم المیتة ولا یباع ودکه (٢٢٢٣'٢٢٢٤) وباب بیع المیتة والأصنام (٢٢٣٦) صحیح مسلم کتاب المساقاة باب تحریم بیع الخمر والمیتة والخنزیر والأصنام (١٥٨١)

سے چراغ روشن کرلیا کرو چمڑے تر کرلیا کرو۔[1]

گویا ایسی چیزوں کا کھانا بھی حرام ہے اور ان کی بیع بھی حرام ہے۔ البتہ انسان خود انہیں کھانے کے علاوہ کسی دوسرے مصرف میں لاسکتا ہے اور اس کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے قربانی کے جانور کی کھال اس کھال کو بیچ کر یا کھال ہی کو صدقہ کردینا چاہیے۔ اس کی قیمت قربانی کرنے والا خود نہیں کھاسکتا۔ تاہم اس کھال کو اپنے ذاتی مصرف میں لاسکتا ہے۔

یہاں پھر احناف نے اختلاف کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ جس چیز سے انتفاع درست ہے اس کی بیع بھی جائز ہے۔ دلیل یہ ہے کہ گوبر سے زمین میں کھاد ڈالنے کا کام لیا جاتا ہے اور گوبر وغیرہ نجس چیزیں ہیں۔ لیکن ان کی بیع کے جواز میں کسی کو اختلاف نہیں۔

حالانکہ ان دونوں مذکورہ صورتوں میں بڑا واضح فرق ہے۔ گوبر وغیرہ کھانے کی چیز ہے ہی نہیں جبکہ چربی یا روغن کھانے کی چیزیں ہیں۔ جب وہ فروخت ہو کر دوسرے ہاتھ یا ہاتھوں میں چلی جائیں گی تو خریدار کو کیا معلوم کہ چربی مردار کی ہے یا ذبیحہ کی یا جو روغن خریدا گیا ہے۔ اس میں چوہیا گرنے کی وجہ سے اس کا کھانا حرام ہے؟ لہٰذا وہ لوگ بلا تامل اسے کھانے کے استعمال میں لاسکتے ہیں۔

لہٰذا اگر ہم مردار کی چربی کی بیع کو جائز تسلیم کرلیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر رسول اللہ ﷺ نے یہود کے کس فعل پر لعنت فرمائی تھی۔ کیا اس لعنت کے بعد بھی جواز کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟

البتہ مردار کی کھال سے استفادہ کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اسے رنگ لیا جائے۔ کیونکہ اس کے متعلق یہ صراحت موجود ہے کہ دباغت چمڑے کو پاک کردیتی ہے۔[2]

جانور حلال ہو یا حرام، مردار ہو یا ذبیحہ۔ اس کی ہڈی کی بیع جائز ہے۔ ایک طویل حدیث کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ثوبانؓ سے فرمایا۔

((اِشْتَرِ لِفَاطِمَةَ قَلَادَةً مِنْ عَصَبٍ (فاطمہ کے لیے منکوں کا ایک ہار اور ہاتھی

---

[1] بیہقی بسند صحیح بحوالہ فقہ السنۃ۔ ج ۳، ص ۱۳۱۔ بیہقی ۹/۳۵۴ سید سابق نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ فقہ السنۃ ۳/ ۱۱۵

[2] نسائی کتاب العقیقۃ باب جلود المیتۃ۔ نسائی کتاب الفرع والعتیرۃ (۴۲۴۹ تا ۴۲۵۲) عن عائشۃ رضی اللہ عنہا ابن ماجۃ کتاب اللباس باب لبس جلود المیتۃ اذا دبغت (۳۶۰۹) حمیدی (۴۸۶) احمد ۴/ ۲۵۴ (۲۴۳۵) ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے یہ روایت کئی طرق سے مروی ہے اور صحیح ہے۔

وَسوَارَينِ مِنْ عَاجٍ –[1])) (ہاتھی دانت کے دو کنگن خرید لاؤ-)

خود رسول اللہ ﷺ کی ایک کنگھی ہاتھی دانت کی تھی-[2]

خنزیر زندہ بھی مردار کا حکم رکھتا ہے- وہ زندہ ہو یا مردہ دونوں صورتوں میں اس کی کسی بھی چیز سے انتفاع حرام اور ناجائز ہے- کیونکہ یہ نجس عین ہے-

۷- متفرقات

زائد پانی اور گھاس کی فروخت:

چند باتیں ایسی ہیں جنہیں محض انسانی ہمدردی کے منافی سمجھتے ہوئے ان سے کمائی کرنے سے روکا گیا ہے- مثلاً ضرورت سے زائد پانی فروخت کرنے اور ضرورت سے زائد گھاس کی فروخت جس پر انسان نے کچھ محنت بھی صرف نہ کی ہو- بلکہ ضرورت سے زائد پانی کو محض اس خیال سے روکنا بھی ممنوع ہے کہ اس سے دوسرے کی زمین میں گھاس پیدا ہوگی اور وہ فائدہ اٹھائے گا[3]- بلکہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے یوں فرمایا-

((اَلنَّاسُ شُرَكَآءُ فِيْ ثَلٰثَةٍ اَلْكَلَاءُ وَ الْمَاءُ وَالنَّارُ –[4])) (تین چیزوں میں سب لوگ شریک ہیں- گھاس، پانی اور آگ-)

نہروں، دریاؤں، چشموں اور بارش کا پانی سب لوگوں کی مشترکہ ملکیت ہوتی ہے اور ان سے ہر شخص یکساں فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا ہے- مگر جب کوئی شخص پانی کے حصول پر محنت کرے اور اسے اپنے ہاں محفوظ کر لے تو وہ اس محنت کا معاوضہ پانی بیچنے کی صورت میں لے سکتا ہے اور

---

[1] ابوداؤد باب فی الانتفاع- مسند احمد ۳۷/۴۶/۶ (۲۲۳۶۳) ابوداؤد کتاب الترجل باب ماجاء فی الانتفاع بالعاج (۴۲۱۳) طبرانی (۱۴۰۳) بیہقی ۲۶/۱ شعب الایمان (۵۶۵۹) الکامل ابن عدی ۶۰۶/۲ اس کی سند حمید شامی اور سلیمان المنبھی کی جہالت کی وجہ سے ضعیف ہے-

[2] بیہقی- نصب الروایۃ، ص ۱۱۹- اخلاق النبی لابی الشیخ صفحہ ۱۷۱-

[3] بخاری کتاب المساقات- باب لا یمنع فضل الماء- بخاری کتاب المساقاۃ باب من قال: ان صاحب الماء احق بالماء (۲۳۵۳، ۲۳۵۴)

[4] ابوداؤد- کتاب البیوع- باب فی منع الماء- (۳۴۷۷) ابوداؤد کے الفاظ یوں ہیں۔ ''المسلمون شرکاء فی ثلاث فی الکلاء والماء والنار''
بیہقی ۱۵۰/۶ اس کی سند صحیح ہے اور اس کے کئی ایک شواہد ہیں۔ جن میں سے ایک شاہد عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ابن ماجۃ کتاب الرھون باب المسلمون شرکاء فی ثلاث (۲۴۷۲) طبرانی کبیر ۱۱۱۰۵/۱۱) المسند الجامع ۲۲۹/۹ ارواء الغلیل (۱۵۵۲) اس کی سند میں عبداللہ بن خراش الشیبانی ضعیف ہے-

اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے جنگل کی لکڑیاں سب کی مشترکہ ملکیت ہوتی ہیں۔ اب جو شخص بھی جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کر کے لے آئے گا۔ وہ اس کی ملکیت ہوں گی۔ اور وہ انہیں فروخت کر سکتا ہے۔

اس کی سند میں بقیہ اور قتادہ مدلس ہیں اور روایت معنعن ہے۔

اس طرح اگر کوئی شخص محنت کر کے کنواں کھودتا ہے' یا ٹیوب ویل لگاتا ہے۔ تو اسے پانی فروخت کرنے کا حق ہوتا ہے۔ اس کی مثال مدینہ کا بئر رومہ ہے۔ جو کسی یہودی کی ملکیت تھا۔ اور مسلمان قیمتاً پانی حاصل کرتے تھے۔ تا آنکہ حضرت عثمانؓ نے اسے خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔[1]

آج کل شہروں میں میونسپل کمیٹیاں لوگوں کو صاف ستھرا پانی مہیا کرتی ہیں۔ جس کے عوض انہیں پانی کا بل ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ صورت بالکل درست اور جائز ہے۔

البتہ کسی مجبور اور مسافر کو کسی صورت میں پانی قیمتاً نہ دینا چاہیے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تین قسم کے آدمیوں سے اللہ قیامت کے دن کلام تک نہ کرے گا۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے جس کے پاس فاضل پانی موجود ہو اور مسافر کو بھی پینے کو نہ دے۔ (فقہ السنہ ج ۳ ص ۱۵۱)

نر سے جفتی کرانے کی اجرت:

اسی طرح آپ ﷺ نے نر سے جفتی کروانے کی اجرت لینے سے منع فرمایا[2]۔ کسی اچھی نسل کے نر سے جفتی کروانا بذات خود کوئی مذموم فعل نہیں۔ ایسی نسل کشی جائز ہے لیکن اس کام پر اجرت وصول کرنا اور اسے پیشہ بنا لینا حرام ہے۔ البتہ اگر پہلے اجرت طے نہ کی جائے یا مقررہ فیس نہ ہو۔ لیکن بعد میں مادہ جانور کا مالک بطور عطیہ کچھ دے دے تو یہ جائز ہے[3]۔

---

[1] بخاری کتاب الاجارات۔ باب عسب الفحل۔ ترمذی کتاب المناقب باب فی مناقب عثمان (۳۷) دار قطنی کتاب الاحباس باب وقف المساجد والسقایات ۴/۱۹۶

[2] بخاری کتاب کتاب الاجارات۔ باب عسب الفحل (۲۲۸۴)۔ ۲۲

[3] ترمذی۔ ابواب البیوع۔ باب ماجاء فی کراھیة عسب الفحل (۱۲۷۴) نسائی کتاب البیوع باب بیع خراب الجمل (۴۶۷۶) یہ حدیث صحیح ہے۔

باب: ۴

ذخیرہ اندوزی' کنٹرول سٹہ بازی اور بلیک مارکیٹنگ

۱- ذخیرہ اندوزی

زمیندار اور تاجر لوگ اپنی ہوسِ زر پوری کرنے کے لیے بسا اوقات زمین سے حاصل شدہ یا خرید کردہ جنس کی فروخت بند کر دیتے ہیں- اس انتظار میں کہ جب بھاؤ گراں سے گراں ہو جائے تو اس وقت فروخت کر کے زیادہ سے زیادہ نفع کمائیں- اسی کا نام ذخیرہ اندوزی ہے- اور شرعی اصطلاح میں اسے ''احتکار'' کہا جاتا ہے- اور یہ احتکار حرام ہے- ذخیرہ اندوزوں نے اسے ''آزاد تجارت'' کا معصوم سا نام دے کر حلال وطیب بنانے کی کوشش کی ہے- مگر درحقیقت یہ غریب عوام کا استحصال ہے-

ذخیرہ اندوزی کا ملکی معیشت پر اثر:

ذخیرہ اندوزی ملکی معیشت پر یوں اثر انداز ہوتی ہے کہ بہت سی جنس بازار میں جانے سے رک جاتی ہے- جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جنس کا بھاؤ تیز ہونا شروع ہو جاتا ہے- جس کا بار غریب عوام پر پڑتا ہے جب کہ زمیندار اور تاجر اپنی اس محفوظ کردہ جنس کی بدولت بہت زیادہ فائدہ اٹھا جاتے ہیں-

ذخیرہ اندوزی اور بنک کا کردار:

بعض دفعہ تاجر لوگ بنک سے مزید قرضہ حاصل کرنے کے لیے اپنی جنس بنک کی تحویل میں دے دیتے ہیں- جسے عرفِ عام میں (Pledge) کہا جاتا ہے- اس زرضمانت کے عوض بنک قرض دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے- یہ کاروبار اب اتنا عام ہو گیا ہے- کہ منڈی کا ہر تاجر اسی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے کہ اپنی جنس بنک کے پاس رکھ کر زیادہ سے زیادہ سودی قرضہ حاصل کر سکے-

سرمایہ دار بنک کی ملی بھگت سے غریب عوام پر گرانی کی دوہری لعنت مسلط ہو جاتی ہے موجودہ گرانی کا ایک بڑا سبب یہی ہے۔ اس کاروبار میں بنک اس لحاظ سے فائدہ میں رہتا ہے۔ کہ وہ زیادہ سے زیادہ رقم سودی کاروبار پر لگا سکتا ہے۔ جب کہ زرِ ضمانت اس کے پاس پہلے سے ہی موجود ہوتا ہے۔ اور سرمایہ دار اس بات سے فائدہ اٹھاتا ہے کہ اس کی محفوظ جنس کا بھاؤ بڑھ جاتا ہے۔ اور آئندہ کے لیے وہ مزید رقم لے کر کاروبار وسیع کرتا اور نفع کماتا ہے۔ ذخیرہ اندوزی کے یہ تباہ کن اثرات حکومت کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ اور اب تو حکومت مجبوراً ایسا قانون بنانے پر غور کر رہی ہے۔ جس سے (Pledging) کے کاروبار کو قانوناً بند کر دیا جائے۔

ذخیرہ اندوزی سے متعلق ارشاداتِ نبوی ﷺ

ذخیرہ اندوز ملعون ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

((۱۔اَلْجَالِبُ مَرْزُوْقٌ وَالْمُحْتَكِرُ مَلْعُوْنٌ۔[۱])) (بازار میں سودا لانے والے کو رزق ملتا ہے اور ذخیرہ اندو ملعون ہے۔)

ذخیرہ اندوز گنہ گار ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

((۲۔لَا يَحْتَكِرُ اِلَّا خَاطِئٌ[۲])) (ذخیرہ اندوزی صرف گنہ گار ہی کرتا ہے۔)

زیادہ نفع کمانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے فروختنی مال کو جلد از جلد فروخت کر کے اسی رقم سے نیا مال خرید کر پھر فروخت کرتے جائیں اور ایک سال میں کئی بار یہ چکر چلتا رہے۔ یہ صورت شرعی نقطہ نظر سے پسندیدہ اور ملکی معیشت کے لیے بھی بہت مفید ہے۔ دوسری صورت ذخیرہ اندوزی ہے۔ جو مذموم بھی ہے اور ملکی معیشت کے لیے تباہ کن اثرات کی حامل بھی۔ اسی لیے حضور ﷺ نے ذخیرہ اندوز پر لعنت فرمائی ہے۔

((۳۔عَنْ مُعَاذٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ بِئْسَ الْعَبْدُ الْمُحْتَكِرُ اِنْ اَرْخَصَ اللّٰهُ الْاَسْعَارَ حَزِنَ وَاِنْ اَغْلَاهَا (حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ آپ ﷺ فرماتے تھے ذخیرہ اندوز بہت برا آدمی ہے

---

۱ ابن ماجہ کتاب التجارات باب الحکرۃ والجلب (۲۱۵۳) دارمی کتاب البیوع باب فی النھی عن الاحتکار (۲۵۴۷) شعب الایمان بیہقی ۷/۵۲۵ مستدرک ۲/۱۱ مسند عبد بن حمید (۳۳) المسند الجامع ۱۳/۵۶۳ (۱۰۵۳۵) اس کی سند میں علی بن سالم اور علی بن زید بن جدعان ضعیف راوی ہے۔

۲ صحیح مسلم کتاب المساقاۃ والمزارعۃ باب تحریم الاحتکار فی الاقوات (۱۲۰۵/۱۳۰)

فَرِحَ[1]-))

اگر اللہ تعالیٰ بھاؤ ارزاں کر دے تو اسے غم لگ جاتا ہے اور اگر تیز ہو جائے تو وہ خوش ہوتا ہے-)

((۴- عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنِ احْتَكَرَ طَعَامَ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا يُرِيْدُ بِهِ الْغَلَا فَقَدْ بَرِئَ مِنَ اللّٰهِ وَبَرِئَ اللّٰهُ مِنْهُ[2]-))

(حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا- جو کوئی چالیس روز کی اجناس و اشیاءِ خورد و نوش کو مہنگا ہونے کے ارادہ پر روک رکھے بیشک وہ اللہ سے بیزار ہے- اور اللہ اس سے بیزار ہے-)

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "ہمارے بازار میں کوئی شخص احتکار نہ کرے جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زائد روپیہ ہے- وہ غلہ خرید کر ہمارے ملک میں احتکار نہ کریں اور جو شخص ہمارے ملک میں غلہ لائے وہ عمر رضی اللہ عنہ کا مہمان ہے[3]-"

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس لیے فرمایا کہ غلہ لانے والے خوش ہو کر زیادہ سے زیادہ غلہ لائیں اور ملک میں ارزانی ہو-

ذخیرہ اندوزی کا دائرہ:

ذخیرہ اندوزی کے متعلق مندرجہ ذیل امور ذہن نشین کرنا ضروری ہے-

(۱) ذخیراندوزی کا تعلق صرف اجناسِ خوردنی سے ہوتا ہے- خواہ یہ انسانوں کی خوراک ہو یا حیوانوں کی- جیسا کہ صحیح مسلم کی مندرجہ ذیل حدیث لَا يَحْتَكِرُ اِلَّا خَاطِئٌ (گنہگار ہی احتکار

[1] الکامل اور ابن عدی ۲/۵۳۰ اور ابن عدی کے طریق سے امام بیہقی نے شعب الایمان ۷/۵۲۵ (۱۱۲۱۵) میں ذکر کی ہے۔ اس کی سند میں بقیہ مدلس ہے اور اس کے بیٹے عطیہ کے بارے میں ابن حبان کتاب الثقات میں لکھتے ہیں۔ یہ خطا کرتا ہے اس کی روایات میں غرابت ہے۔ اس کی روایت پر اس وقت اعتبار کیا جائے گا جب یہ اپنے باپ سے تدلیس والی روایات کے علاوہ بیان کرے اور یہ تدلیس والی روایات میں سے ہے۔ اسی طرح اس روایت کو طبرانی نے ۲۰/۹۵ بھی بیان کیا ہے لیکن اس کی سند میں سلیمان بن سلمہ الخبائری متروک راوی ہے۔ (مجمع الزوائد ۴/۱۰۱) شیخ البانی نے اسے غایۃ المرام (۳۲۶) میں ضعیف قرار دیا ہے۔

[2] مسند احمد ۸/۴۸۱ (۴۸۸۰) مستدرک حاکم ۲/۱۱، ۱۲ ابو یعلی (۵۷۴۶) الکامل ۱/۳۹۹ حلیۃ الاولیاء ۶/۱۰۱ کشف الاستار (۱۳۱۱) العلل لابن ابی حاتم (۱۱۷۴) اس کی سند ابو بشر الاملوکی کی جہالت کی وجہ سے ضعیف ہے۔ امام ابو حاتم رازی نے اس روایت کو منکر قرار دیا ہے۔

[3] موطا- کتاب البیوع- باب الحکرۃ و التربص

کرتا ہے) کے راوی سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ نے معمر رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث بیان کی تو لوگوں نے سعید بن المسیب سے کہا کہ تم تو خود احتکار کرتے ہو- انہوں نے جواب دیا کہ معمر جنہوں نے یہ حدیث روایت کی وہ بھی احتکار کرتے تھے[1]- (یعنی تیل کا ذخیرہ کرتے تھے)

گویا تیل اجناس خوردنی سے نہ تھا- جبکہ امام مسلم نے جس باب کے تحت یہ حدیث درج فرمائی ہے اس کا عنون ہی یہ قائم کیا ہے کہ تحریم الاحتکار فی الاقوات (یعنی انسان اور حیوان کی خوراک میں احتکار حرام ہے) اگر کوئی تاجر کوئلہ لکڑی یا گلقند کا سٹاک کرتا ہے تو یہ احتکار نہیں-

(۲) احتکار کا تعلق ایسی اجناس خوردنی سے ہے جن کا تعلق موسم سے ہوتا ہے- مثلاً گندم چاول- چنے وغیرہ موسم میں ارزاں ہوتے اور بعد میں مہنگے ہو جاتے ہیں-

(۳) جب کسی غلہ کا موسم ہو وہ اس وقت عام ہوتا ہے- زمینداروں کے پاس بھی عام ہوتا ہے اور زائد غلہ منڈیوں میں پہنچ جاتا ہے- اور عوام الناس کو بھی نارمل ریٹ پر غلہ دستیاب ہوتا ہے ایسے حالات میں اگر کوئی تاجر غلہ سٹاک کر لے تو وہ احتکار نہیں ہوگا- بشرطیکہ لوگوں کی ضرورت کے وقت اس وقت کے نرخ کے مطابق فروخت کر دیتا ہو- احتکار صرف اس صورت میں ہوتا ہے- جبکہ چیز کا بھاؤ چڑھ رہا ہو- اور تاجر یا اجارہ دار یہ سوچے کہ جب تک نرخ فلاں حد تک نہ پہنچ جائے گا میں اپنی جنس مارکیٹ میں نہیں لاؤں گا-

ایسی صورت میں حاکم وقت کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ جبراً غلہ موجودہ نرخ میں بکوا دے یا خود خرید کر عوام کو مہیا کرے[2]-

آج کل حکومتیں اس قسم کے احتکار کا پہلے سے بندوبست کر رکھتی ہیں- وہ موسم پر اہم اجناس خوردنی خود خرید لیتی ہیں- ضرورت کے مطابق خود سٹاک کر لیتی ہیں اور باقی بیرون ملک فروخت کر دیتی ہیں-

(۴) آجکل یار لوگوں نے احتکار کی نئی راہیں اختیار کر لی ہیں- مثلاً حکومت نے کوئی جنس زائد سمجھ کر ایکسپورٹ کر دی- لیکن بعد میں قلت واقع ہوگئی- حکومت کے پاس اب یہی چارہ کار ہوتا ہے کہ وہ وہی جنس اب کسی دوسرے ملک سے امپورٹ کرے- اس وقفہ کے دوران تاجر لوگ احتکار کے ذریعہ خوب ہاتھ رنگتے ہیں- جیسا کہ پچھلے سال پیاز کا نرخ ۲۰ روپے کلو تک پہنچ گیا تھا-

---

[1] مسلم کتاب المساقات والمزارعۃ- باب تحریم الاحتکار فی الاقوات- (۱۶۰۵)

[2] مسلم حاشیہ زیر حدیث مندرجہ بالا-

اور دوسری صورت یہ ہے کہ چالاک تاجر حکومت کے سالانہ بجٹ کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ اور کسی نہ کسی ذریعہ سے وہ یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ کونسی چیز کے نرخ بڑھنے والے ہیں۔ خواہ ان چیزوں کا تعلق اجناس خوردنی سے ہو یا دوسری ضروریات زندگی سے مثلاً چینی، سیمنٹ، وغیرہ۔ ایسے تاجران چیزوں کی فروخت روک لیتے ہیں۔ بلکہ درپردہ ادھر ادھر سے اکٹھی کر کے سٹاک کر لیتے ہیں۔ اس طرح وہ چند ہی دنوں میں کافی دولت سمیٹ لیتے ہیں اور عوام کا استحصال کرتے ہیں۔

ذخیرہ اندوز دراصل عوام کی معاشی ابتری اور اقتصادی بدحالی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی غرض سے اجناس کا ذخیرہ کرتا ہے۔ آخر جب اشیائے خوردونوش کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔ اور عوام گرانی کے ہاتھوں فاقہ کشی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تو وہ ان کی نازک حالت پر رحم کرنے کی بجائے ان کی مجبوری میں ان کا زیادہ سے زیادہ استحصال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احتکار اتنا بڑا ظلم ہے کہ اگر بعد میں ذخیرہ کی ہوئی جنس صدقہ بھی کر دی جائے تو بھی اس گناہ کا کفارہ نہیں بن سکتی۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

((مَنِ احْتَكَرَ طَعَامًا اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا ثُمَّ تَصَدَّقَ بِهٖ لَمْ يَكُنْ لَهٗ كَفَّارَةً[1]))

(جو شخص غلہ کو چالیس دن تک بند رکھے پھر اسے صدقہ کر دے تو بھی اس کا کفارہ ادا نہیں ہو سکتا۔)

باقی ایسی اشیاء جن کا تعلق خوردونوش سے نہیں مثلاً عمارتی سامان کپڑا وغیرہ تو ان میں بھی ذخیرہ اندوزی سے بچنا ہی بہتر ہے۔

۲۔ کنٹرول

احتکار کے علاوہ ایک اور چیز بھی بازار سے اشیائے ضرورت کے غائب اور نتیجتاً گراں ہونے کا سبب بنتی ہے۔ وہ کنٹرول ہے۔ جس چیز پر حکومت کنٹرول کر لیتی ہے۔ وہ ضرورت کے

---

[1] اسے صاحب مشکوۃ نے رزین کے حوالے سے ابوامامہ کی حدیث سے تخریج کیا ہے۔ (۲۸۹۸) یہ روایت ابوامامہ کے حوالے سے تو نہیں ملی البتہ مسند فردوس دیلمی میں بطریق محمد بن مروان السدی عن یحیی بن سعید التیمی عن ابیہ عن علی رضی اللہ تعالی عنہ مرفوعا مروی ہے اور یہ روایت موضوع ہے۔ اس کی سند میں محمد بن مروان کذاب راوی ہے۔ (سلسلہ ضعیفہ ۸۵۹)

مطابق عوام کو مہیا نہیں کر سکتی۔ (ورنہ اس کے کنٹرول کرنے کا جواز ہی نہیں) نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی بلیک مارکیٹ بہت زیادہ چڑھ جاتی ہے۔ کوئی چیز کسی وقت بھی درحقیقت بازار سے ناپید نہیں ہوتی۔ بلکہ خفیہ طور پر مہنگے داموں فروخت ہونے لگتی ہے۔ لہٰذا کنٹرول کے مضر اثرات اس کے نفع بخش اثرات سے بڑھ جاتے ہیں۔ عہد نبوی ﷺ میں ایک دفعہ غلہ کے بھاؤ چڑھنے لگے۔ یہ صورتِ حال آپ ﷺ کے سامنے رکھ کر آپ ﷺ سے کنٹرول کی استدعا کی گئی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔

((اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ القابضُ الباسِطُ الرَّازِقُ وَاِنِّیْ لَاَرْجُوْا اَنْ اَلْقٰی رَبِّیْ وَلَیْسَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ بِمُظْلِمَةٍ بِدَمٍ وَّلَا مَالٍ۔ [1]))

(بلا شبہ اللہ تعالیٰ ہی نرخ مقرر کرنیوالا رزق کا تنگ کرنے اور فراخ کرنے والا۔ اور روزی دینے والا ہے اور امید کرتا ہوں کہ میں اپنے رب سے اس حال میں ملوں کہ مجھ پر کسی کا کوئی خونی یا مالی حق نہ ہو۔)

حدیث بالا کا آخری حصہ قابلِ توجہ ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ "میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے رب کو اس حال میں ملوں کہ مجھ پر کسی کا کچھ خونی یا مالی حق نہ ہو۔" معلوم ہوا کہ اشیاء پر کنٹرول کرنا بائع پر یا مشتری پر کسی نہ کسی پر ظلم ضرور ہے۔ جس کی ذمہ داری آپ قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

کنٹرول عموماً دو طرح کا ہوتا ہے ایک یہ ہے کہ حکومت اعلان کر دیتی ہے کہ فلاں چیز اتنی قیمت سے زیادہ پر فروخت نہیں کی جاسکتی اور دکانداروں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ان اشیاء کے نرخ اپنے دکانوں پر آویزاں کریں۔ تاکہ ہر خریدار نہیں دیکھ سکے۔ پھر گاہے گاہے حکومت کی طرف سے چھاپے بھی پڑتے ہیں۔

اس قسم کے کنٹرول کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دکاندار کنٹرول ریٹ پر صرف گندی، ناخالص اور ملاوٹ والی اشیاء فروخت کرنا شروع کر دیتے ہیں اور کوئی خریدار خالص اور ستھری چیز کا طلبگار ہو تو اس سے الگ نرخ طے کر لیا جاتا ہے۔ یہ بھاؤ اگرچہ درپردہ ہوتا ہے تاہم خریداروں اور

---

[1] ابوداؤد کتاب الاجارۃ باب فی التسعیر (۳۴۵۱) ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فی التسعیر (۱۳۱۴) ابن ماجہ کتاب التجارات باب من کرہ ان یسعر (۲۲۰۰) ابن حبان (۴۹۳۵) بیہقی ۶/۲۹) الاسماء والصفات ۱/۱۱۹ مسند ابی یعلی (۲۷۷۴) المسند الجامع ۲/۴۴ مسند احمد ۲۱/۴۴۵ (۱۴۰۵۷) الاحادیث المختارہ (۱۶۳۱) اس کی سند صحیح ہے۔

دکانداروں میں معروف ہو جاتا ہے۔ البتہ سرکاری ملازم (محاسب) کے بارے میں دکاندار مجبور ہو جاتا ہے کہ اسے مقررہ نرخ پر صحیح چیز دے۔

ایسے کنٹرول کے بارے میں دکانداروں کا دوسرا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ وہ کنٹرول کرنے والے عملہ سے مل کر یعنی رشوت دے کر ان سے نرخ ہی ایسے منظور کروا لیتے ہیں۔ جو دکانداروں کے حسب منشاء ہوں یا اس سے بھی بڑھ کر ہوں۔ جیسا کہ بسا اوقات آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی چیز پر مقرر نرخ جو درج ہوتا ہے۔ دکاندار اس سے سستے داموں اسے فروخت کر رہا ہوتا ہے۔ سبزی فروشوں کی دکانوں پر عموماً اسی قسم کے نرخوں کی لسٹ آویزاں ہوتی ہے۔

کنٹرول کی دوسری قسم یہ ہوتی ہے کہ حکومت جس چیز پر کنٹرول کرتی ہے۔ مختلف مقامات پر اور جا بجا اس کے ڈپو مقرر کر دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ ان ڈپوؤں سے وہ چیز مقررہ نرخ پر دستیاب ہو سکے اور حکومت کے منظور شدہ کارڈوں پر مل سکے۔ یہ طریق کار بھی کئی طرح کی بددیانتیوں کو جنم دیتا اور فروغ بخشتا ہے۔ سب سے زیادہ بددیانتی خود ڈپو ہولڈر کرتے ہیں۔ وہ کسی صاحب حق کو ٹرخا دیتے اور کسی دوسرے کو بطور رشوت زیادہ دے کر نوازتے ہیں۔ ان کا تول ہمیشہ کم ہی نکلتا ہے۔ اور اگر کوئی اعتراض کر بیٹھے تو ان کے پاس کئی طرح کے جواب ہوتے ہیں۔ پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی وجہ سے اپنا کوٹہ وصول نہیں کر پاتے۔ اس طرح ڈپو ہولڈروں کے پاس اس چیز کی کافی مقدار بچ جاتی ہے جسے وہ بلیک مارکیٹ میں فروخت کر کے اپنے ہاتھ رنگتے ہیں۔ اس طرح چور بازاری کا ایک نیا بازار قائم ہو جاتا ہے۔

کنٹرول کے نقصانات:

بہرحال کنٹرول میں مندرجہ ذیل قباحتیں موجود ہیں۔

(۱) قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق سودا بازی میں بائع اور مشتری کی رضامندی ضروری شرط ہے۔ جو یہاں پوری نہیں ہوتی۔ خریدار چیز لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسے جس بھاؤ پر بھی ملے۔

(۲) کنٹرول شدہ اشیاء بقدر ضرورت ڈپو سے دستیاب نہیں ہوتیں اور کھلے بازار سے غائب ہو جاتی ہیں۔

(۳) پھر بلیک کا ایک نیا بازار کھل جاتا ہے۔ جس کے منہ مانگے دام مشتری ادا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

(۴) کنٹرول شدہ اشیاء میں ملاوٹ شروع ہو جاتی ہے یا ناقص چیز مہیا کی جاتی ہے۔

(۵) بہت سی اخلاقی بیماریاں کاروباری دنیا میں راہ پا جاتی ہیں۔ لہٰذا کنٹرول ہماری شرع کے مزاج کے منافی ہے۔

چور بازاری اشیاء کے کنٹرول کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ اسلام میں چونکہ کنٹرول ناجائز ہے لہٰذا اسلامی معاشرہ میں چور بازاری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور بلیک مارکیٹنگ کا وجود یکسر ناپید ہو جاتا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں چونکہ تجارت بالکل آزاد ہے۔ اس لیے ہر چیز کھلے بندوں کھلے بازار میں فروخت ہو گی۔

کنٹرول کی رخصت:

لیکن جب اشیائے خوردنی میں گرانی خود تاجر حضرات کی پیدا کردہ ہو جیسے ذخیرہ اندوزی اجارہ داری اور سٹہ بازی سے اشیائے ضرورت کی رسد میں مصنوعی طور پر قلت پیدا کر دی جاتی ہے تو ایسی صورت میں حکومت کو کنٹرول کرنے کا حق حاصل ہے اور یہی جمہور علماء کی رائے ہے۔ حکومت کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ گرانی پیدا کرنیوالے حضرات سے زبردستی اشیاء ضرورت حاصل کر کے عوام کو کنٹرول ریٹ پر مہیا کرے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جب کنٹرول کرنے سے انکار کیا تھا تو اس کے اسباب قدرتی تھے۔ باہر سے غلہ نہیں پہنچ سکا تھا۔ زر پرستوں کے پیدا کردہ نہ تھے۔

۳۔ سٹہ بازی

ایک اور لعنت جس سے مصنوعی گرانی پیدا کر کے لوگوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ سٹہ بازی ہے آج کل تجارتی حلقوں میں سٹہ بازی بکثرت رواج پکڑ چکی ہے۔ سٹہ باز عموماً بڑے بڑے سیٹھ اور تاجر قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے دفتروں میں بیٹھ کر ٹیلیفون کے ذریعہ ہی یہ کاروبار چلاتے ہیں۔ سٹہ باز کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسی جنس یا چیز کا انتخاب کرتا ہے جس کی ملک میں قلت ہو یا اس کے نایاب ہو جانے کا امکان ہو۔ مثلاً ایک صاحب یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ آجکل سوڈا کاسٹک کا بھاؤ ۳۰۰/ روپے فی من ہے اور تین ماہ تک اس کا بھاؤ ۳۲۰/ روپے من ہو جائے گا۔ وہ کسی مل یا فیکٹری کے مالک کو ٹیلیفون کرتا ہے کہ مجھے تین ماہ تک ایک ہزار من سوڈا کاسٹک درکار ہے۔ بتاؤ کس بھاؤ پر مہیا کر سکتے ہو فیکٹری کا مالک اتنے تھوک کے سودے کو موجودہ

نرخ پہ مہیا کر دینا بھی بہت غنیمت سمجھتا ہے۔ تاہم موجودہ ریٹ سے بھی کم پر عموماً سودا ہو جاتا ہے۔ فرض کر لیجئے کہ ۲۹۰/ روپے فی من پر ایک ہزار من کا سودا تین ماہ کی مدت تک طے پا گیا۔ خریدار ۱۵ یا بیس فیصد کے لگ بھگ رقم بطور بیعانہ فوری طور پر ادا کر دیتا ہے۔ یا جتنی رقم ان میں باہمی سمجھوتہ طے پا جائے۔ بائع ادا کر دیتا ہے اور اتنی مدت میں مشتری کی ذمہ داری ہے کہ وہ پورا مال تیار کر کے یا بازار سے اکٹھا کر مشتری کو دے۔

اب ہوتا یہ ہے کہ دوسرے ضرورت مند لوگ اور دکاندار بھی اس فیکٹری کے مالک سے اس چیز کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن وہ بیچ نہیں سکتا اسے تو یہ فکر ہوتی ہے کہ اپنا آرڈر وقت پر بھگتائے کر دوسرے اس چیز کا اسی وجہ سے بھاؤ بھی بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً ۳۲۰/ روپے فی من ہو جاتا ہے تو بائع مشتری سے خود کہنے لگتا ہے۔ کہ اپنا سودا چھوڑ دو اور ۳۰/ روپے من مجھ سے منافع لو۔ لیکن سیٹھ صاحب یہ جواب دیتے ہیں کہ میں تو اپنا مال ۴۰۰/ روپے سے کم پر ہرگز فروخت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اسی سودا بازی میں کچھ اور مدت گزر جاتی ہے۔ اور مثلاً ۳۵۰/ روپے من وہی فیکٹری کا مالک سیٹھ صاحب سے یہ سودا واپس موڑ لیتا ہے۔ اس طرح سیٹھ صاحب گھر بیٹھے بیٹھے اگر بیعانہ کا چالیس ہزار دیا تھا تو اپنی بیعانہ کی رقم بمعہ اس سے دوگنا وصول پا لیتے ہیں۔

اور اگر چیز فی الواقع نایاب ہو جانے کے امکان نظر آ رہے ہوں تو سیٹھ صاحب کبھی سودا واپس نہیں موڑیں گے۔ اور زیادہ سے زیادہ منافع سمیٹنے کی بات سوچیں گے۔ اور لوگوں کی ضرورتوں اور مجبوریوں سے جس قدر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہوں۔ اٹھائیں گے۔

اب دیکھیے سیٹھ صاحب کو خود سوڈا کا سٹک کی کوئی ضرورت نہیں مزید یہ کہ سوڈا کاسٹک کی پیداوار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ انہوں نے فقط یہ کام کیا ہے کہ اس پیداوار کو سودا کے ذریعے بازار میں آنے سے روک کر مصنوعی قلت پیدا کر دی۔ انہیں وہ چیز خریدنا ہرگز منظور نہ تھی۔ بلکہ ان کی تو غرض ہی لوگوں کی ضرورتوں اور مجبوریوں کو خرید کر زیادہ سے زیادہ رقم بٹورنا اور عوام الناس کا استحصال کرنا تھا۔

حرمت کی وجوہ:

سودا بازی کی یہ شکل یا سٹہ بازی مندرجہ ذیل شرعی دلائل کی بنا پر حرام قرار پاتی ہے۔

(۱) اس قسم کی سٹہ بازی کو ایک مجوزہ سکیم کے تحت احتکار کی شکل دے دی گئی ہے۔ جس کے متعلق پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

(۲) جو چیز پاس موجود نہ ہو اس کی بیع ناجائز ہے[1]۔ سٹہ بازی میں فیکٹری کا مالک ایسی چیز کا سوزا چکا تا ہے جو اس کے پاس موجود نہیں ہوتی۔

(۳) جس مال کو ماپ تول کر تسلی نہ کر لی جائے۔ اس کی بیع ناجائز ہے[2]۔ اور یہاں گننے یا ماپنے تولنے کا سوال ہی کم پیدا ہوتا ہے۔

(۴) جس مال پر قبضہ نہ کیا گیا ہو۔ اس کی بیع ناجائز ہے[3]۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ مال وہاں سے اٹھا کر دوسری جگہ منتقل کیا جائے[4]۔

(۵) چونکہ مالک کی پوری رقم ادا نہیں کی گئی (جیسا کہ بیع سلم یا سلف میں ہوتا ہے) اور مال بھی موجود نہیں لہٰذا بیع النسیۃ بالنسیۃ[5] (یعنی ادھار کے بدلے ادھار کی بیع) کے تحت یہ بیع ممنوع ہے۔

(۶) اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس چیز کا بھاؤ مقررہ مدت یعنی ۳ ماہ تک چڑھتا ہی نہیں یا بعض دفعہ گر بھی سکتا ہے۔ (اگرچہ اس کا امکان بہت کم ہوتا ہے) تو مقررہ وقت پر سیٹھ صاحب کو بقایا رقم ادا کر کے مال اٹھانا پڑتا ہے۔ یا ان کا بیعانہ ضبط ہو جاتا ہے۔ یا وہ نقصان ادا کر کے اس سودا سے سرخرو ہو سکتے ہیں اور اس سودا بازی کی یہ شکل بھی کئی وجوہ کی بنا پر ناجائز ہے۔

۴۔ کسٹم اور سمگلنگ

اسلام اشیاء کی درآمد و برآمد پر خواہ وہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک، نہ کسی قسم کی کوئی پابندی عاید کرتا ہے نہ ہی کوئی ٹیکس عاید کرتا ہے۔ تجارت کی اس آزادی کا واحد مقصد یہ ہے کہ عوام الناس کو ان کی ضرورت کی اشیاء ملتی رہیں اور سستے داموں ملتی رہیں۔ اسی لیے شرعی نقطہ نگاہ سے محصول چنگیوں کا کاروبار بھی سراسر ناجائز ہے لیکن ہمارے ہاں محصول چنگیوں کی اتنی بھرمار ہے کہ

---

۱ تا ۳ بخاری کتاب البیوع - باب بیع الطعام قبل ان یقبض و بیع مالیس عندك - (۲۱۳۵، ۲۱۳۶، ۲۱۳۷)

۴ بخاری کتاب البیوع - باب بیع الطعام قبل ان یقبض و بیع مالیس عندك - (۲۱۳۵، ۲۱۳۶، ۲۱۳۷)

۵ سنن الدارقطنی کتاب البیوع ۳/۷۱، ۷۲، حاکم ۲/۵۷، بیہقی ۵/۲۹۰ اس کی سند میں موسیٰ بن عبیدہ الربذی ضعیف ہے۔ خصوصاً جب وہ عبداللہ بن دینار سے روایت کرے۔ بعض محدثین کو غلطی لگی۔ انہوں نے اس کی سند میں موسیٰ بن عبیدہ کی جگہ موسیٰ بن عقیل کا ذکر کر دیا۔ امام بیہقی نے السنن الکبریٰ ۵/۲۹۰ اور علامہ البانی نے ارواء الغلیل (۱۳۸۲) میں اس پر متنبہ کیا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں۔ موسیٰ بن عبیدہ سے روایت کرنا حلال نہیں اور موسیٰ کی سند کے بغیر میں اس حدیث کو نہیں پہچانتا اور اس کے بارے میں کوئی صحیح حدیث نہیں اور لوگوں کا اجماع اس بات پر ہے کہ ادھار کے بدلے ادھار جائز نہیں۔ العلل المتناھیہ ۲/۱۱۲

سامان خواہ تجارتی ہو یا گھریلو چنگی ٹیکس ادا کیے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا ناممکن بن گیا ہے۔شہروں کی سب اطراف میں چنگیاں قائم ہیں۔حتیٰ کہ معمولی آبادی والی قصبے کو بھی یہ چنگیاں گھیرے ہوتی ہیں۔

بعض لوگ محصول چنگی سے بچنے کی خاطر درآمدی یا برآمدی مال کو چوری چھپے ادھر ادھر کے راستوں سے پار کر جاتے ہیں اسی کا نام سمگلنگ ہے۔

سمگلنگ کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ حکومت ملکی مصنوعات کو فروغ دینے کی خاطر بعض درآمدات پر پابندی لگا دیتی ہے اور بعض پر بھاری کسٹم عائد کر دیتی ہے۔چاہیے تو یہ تھا کہ اہل ملک بیرونی ممالک کے مقابلہ پر اشیاء تیار کریں۔اور مقابلہ پر سستے داموں فروخت کریں۔ یہ محنت تو وہ کرتے نہیں یا کر نہیں سکتے۔اس کے بجائے وہ کرتے یہ ہیں کہ حکومت سے مل ملا کر بیرونی مصنوعات پر بھاری ٹیکس عائد کر دیتے ہیں۔

ان باتوں کے ردعمل میں دو باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ایک یہ بندرگاہوں پر رشوت کا کاروبار خوب گرم ہو جاتا ہے دوسرے کچھ لوگ ممنوع اشیاء کو عام راہوں سے ہٹ کر ملک میں لانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔اور خوب پیسے کماتے ہیں۔اس ذریعہ سے درآمد شدہ اشیاء کا ایک الگ بازار قائم ہو جاتا ہے۔جسے عموماً بارہ مارکیٹ کہا جاتا ہے اور یہاں بھی بلیک مارکیٹنگ کا دھندا ہوتا ہے۔

بلیک مارکیٹنگ اور سمگلنگ یہ دونوں صورتیں قانون کی نگاہ میں جرم ہیں۔اگر تجارت اسلامی اصولوں کے مطابق ہوتی تو یہ صورتیں جنم ہی نہ لیتیں۔بہر حال اب جبکہ یہ صورتیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔تو ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ ہماری اپنی حکومت اور ہمارے ہی بھائی بندوں نے ایک فیصلہ کر کے یہ صورتیں ملکی مفادات کے لیے ضروری قرار دی ہیں اور ان میں اسلام کے کسی اصول پر براہ راست زد بھی نہیں پڑتی لہٰذا ہمیں اس قانون کا احترام بھی کرنا چاہیے۔

آزادانہ تجارت اور کسٹم:

کسٹم کے متعلق ہمیں تاریخ سے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں غیر ملکی تاجروں سے اپنی بندرگاہوں پر اترنے والے مال پر کچھ کسٹم وصول کیا

تھا- وہ بھی جوابی کاروائی کے طور پر صرف ان ملکوں کے تاجروں سے جنہوں نے **مسلمان تاجروں** سے کسٹم وصول کرنا شروع کیا- لیکن ہمارے ہاں جس کثرت سے اندرونِ ملک ہی جا بجا **محصول** چنگیاں قائم کر دی گئی ہیں اور جس **عمومیت** سے بندرگاہوں پر اپنوں سے **غیروں** سے' نجی مال پر بھی اور تجارتی مال پر' نیز برآمدات و درآمدات دونوں پر کسٹم وصول کیا جا رہا ہے- اس کا شرعاً کوئی جواز نہیں-

باب:۵

سود

سود کی حرمت

موجودہ دور میں تجارت اور سود کا چولی دامن کا ساتھ ہے- تاجر لوگ بسا اوقات بنکوں سے قرضے لے کر اپنا کاروبار چلاتے ہیں- اس طرح اپنی حلال کمائی میں حرام کی آمیزش کر لیتے ہیں- لہٰذا سود کے متعلق معلومات حاصل کرنا بہت ضروری ہے-

سرمایہ دارانہ نظام جو ہمارے ہاں فی الوقت رائج ہے- اس میں سود ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے یہ طبقاتی تقسیم کو فروغ دیتا ہے- امیر و غریب کے درمیان جو خلیج پہلے سے حائل ہوتی ہے اس کو وسیع سے وسیع تر کرتا چلا جاتا ہے- انسان میں خود غرضی' تنگ دلی اور شقاوت جیسے اخلاق رذیلہ کی پرورش کرتا ہے- اور غریب عوام کے استحصال کا بہت بڑا ذریعہ ہے- حکومت بنکوں کی سرپرست ہونے کی بنا پر انہی کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے- جس سے بنکوں کو ضرورت مند اور غریب عوام کے خون چوسنے کا پورا پورا موقع میسر آ جاتا ہے اسی حقیقت کی طرف خداوند تعالیٰ نے درج ذیل آیت میں اشارہ فرمایا ہے-

﴿وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (۳۰:۳۹)

(جو رقم تم سود پر دیتے ہو تاکہ وہ لوگوں کے مال میں پھلے پھولے تو یہ مال اللہ کے ہاں بالکل نہیں پھلتا پھولتا-)

آیت بالا میں الفاظ لِيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ کس وضاحت سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں- انہی خرابیوں کی بنا پر سود کو قطعاً حرام قرار دیا گیا- اور اس جرم کا شمار بڑے بڑے (کبائر) گناہوں میں ہوتا ہے- ارشاد باری تعالیٰ ہے-

﴿اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ

(وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں ایسے کھڑے ہوتے ہیں جیسے کسی کو شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں

الْمَسِّ- ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا-﴾ (۲:۲۷۵)

نے کہا کہ تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام-

یہاں سود خور کی مثال ایک ایسے دیوانے سے دی گئی ہے- جسے خودغرضی اور شقاوت قلبی نے اندھا کر دیا ہو- اور وہ ایسے دلائل تلاش کرنے لگے- جن سے تجارت اور سود کو یکساں ثابت کیا جا سکے- حالانکہ اگر اس کی عقل صحیح کام نہیں کرتی - تب بھی اس کے لیے سود کی حرمت سمجھنے کے لیے یہی فرق کافی تھا - کہ اللہ نے بیع کو جائز قرار دیا ہے اور سود کو حرام-

ایک اور مقام پر اللہ رب العزت فرماتے ہیں-

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَابَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ-﴾ (۲:۲۷۹)

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود باقی رہ گیا ہے، چھوڑ دو- اگر تم مومن ہو- سو اگر ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ اعلان جنگ کر دو- اور اگر توبہ کرو تو پھر راس المال تو تمہارے لیے ہے ہی (یعنی اصل رقم کے حقدار تم ہو) نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم ہو-)

آیت بالا کے آخری الفاظ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ سودی معاملات کو ختم کرنے کی نہایت احسن صورت ہے- کہ سود خوار مقروض سے سود لے کر اس پر ظلم نہ کرے اور مقروض اس کا راس المال ہی نہ دبا بیٹھے- اور اس طرح وہ ظلم کا مرتکب نہ ہو- فریقین کو چاہیے کہ وہ اس راس المال کو قرض ہی تصور کریں- اور مقروض بھی اصل رقم کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے-

ارشادات نبوی ﷺ:

اب سود کے متعلق چند ارشادات نبوی ﷺ بھی ملاحظہ فرمائیے-

((عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ آکِلَ الرِّبٰوا وَمُوْکِلَہٗ وَکَاتِبَہٗ وَشَاھِدَیْہِ وَقَالَ ھُمْ سَوَآءٌ- [1]))

(حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود لینے والے دینے والے، اس کی دستاویز رکھنے والے اور اس کے دونوں گواہوں پر لعنت فرمائی ہے-

[1] مسلم- کتاب المساقات والمزارعۃ- باب لعن اکل الربا و مؤکلہ ۱۰۶/ ۱۵۹۸

اور فرمایا کہ یہ سب لوگ (گناہ میں) برابر کے شریک ہیں-)

شراب کی طرح سود بھی تمام متعلقہ آدمیوں کو حرمت کی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور انہیں برابر کے مجرم بنا دیتا ہے- اس جرم کا اندازہ بھی حضور ﷺ کی زبانی سنیے-

((اَلرِّبٰوا سَبْعُوْنَ جُزْءً ا- اَیْسَرُهَا اَنْ یَّنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّهٗ-[1]))

(سود کے اگر ستر حصے کیے جائیں تو اس کا کمزور حصہ بھی (گناہ میں) اپنی ماں سے زنا کے برابر ہے-)

ایک مرتبہ یوں فرمایا-

((دِرْهَمُ رِبًا یَاْکُلُهُ الرَّجُلُ وَهُوَ یَعْلَمُ اَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَثَلٰثِیْنَ زِنْیَةً- [2]))

(سود کا ایک درہم جو آدمی کھاتا ہے اور وہ اس کے سودی ہونے کو جانتا ہے- وہ گناہ میں چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے-)

لہٰذا ہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ نہ صرف خود ہی سود سے بچیں- بلکہ اس لعنت کو حتی المقدور اپنے معاشرہ سے بھی ختم کرنے کی کوشش کریں-

سود کے مفاسد:

یہاں ایک سوال از خود ذہن میں ابھرتا ہے- جو یہ ہے کہ شرعی نقطہ سے کئی ایسے گناہ ہیں جو سود سے بھی بڑے ہیں- مثلاً شرک' قتل ناحق اور زنا وغیرہ- لیکن اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کی وعید اللہ تعالیٰ نے صرف سود کے متعلق سنائی ہے اور خود رسول اللہ ﷺ نے بھی ایسے سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں جو اور کسی جرم کے متعلق استعمال نہیں فرمائے تو آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سود اسلامی تعلیمات کا نقیض اور اس سے براہ راست

---

[1] ابن ماجہ کتاب التجارات باب التغلیظ فی الربا (۲۲۷۴) شعب الایمان بیہقی ۴/۳۹۴'۳۹۵ (۵۵۲۱) المسند الجامع ۱۷/۳۱۶ ابن ماجہ میں الربا سبعون حوبا کے الفاظ ہیں۔ شیخ البانیؒ نے اس حدیث کو صحیح لغیرہ قرار دیا ہے۔ صحیح الترغیب والترہیب اور السنن لابن ماجہ ۲/۵۰۲ تحقیق علی بن حسن الحلبی الاثری اس کی سند میں ابو معشر نجیح بن عبدالرحمن ہے۔ اس حدیث کو ابن ابی الدنیا نے عبداللہ بن سعد عن ابیہ عن ابی ہریرۃ کی سند سے بھی بیان کیا ہے۔ اور عبداللہ بن سعد ضعیف ہے۔

[2] دارقطنی ۳/۱۶ شعب الایمان ۴/۳۹۳'۳۹۴ (۵۵۱۸) مسند احمد ۳۶/۲۸۸ (۲۱۹۵۷) مسند بزار (۳۳۸۱) الآحاد والمثانی (۲۷۵۹) طبرانی اوسط (۲۷۰۳) شیخ البانیؒ نے مشکوۃ کی تحقیق میں اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

متصادم ہے اور اس کا حملہ بالخصوص اسلام کے معاشرتی اور معاشی نظام پر ہوتا ہے- اسلام ہمیں ایک دوسرے کا بھائی بن کر رہنے کی تلقین کرتا ہے- وہ آپس میں مروت ہمدردی' ایک دوسرے پر رحم اور ایک دوسرے سے ایثار کا سبق سکھاتا ہے- رسول اللہ ﷺ نے زندگی بھر اخوت و ہمدردی کا سبق دیا اور ایک دوسرے کے جانی دشمن معاشرے کی وحیِ الٰہی کے تحت اس طرح تربیت کی کہ وہ فی الواقع ایک دوسرے کے بھائی بھائی اور مونس و غمخوار بن گئے اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم احسان شمار کرتے ہوئے اس کا یوں تذکرہ فرمایا کہ-

﴿وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَآءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۚ وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا﴾ (۳:۱۰۳)

(اور اللہ کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اللہ کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے اور تم تو آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے کہ اللہ نے تمہیں اس سے بچالیا-)

اور دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو یوں خطاب فرمایا-

﴿وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ-﴾ (۸:۶۳)

(اور اللہ تعالیٰ نے ہی ان صحابہ کرام کے درمیان الفت پیدا کردی- اگر آپ (اس طریق کار کے علاوہ) دنیا بھر کی دولت بھی خرچ کرتے تو ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے مگر اللہ ہی نے ان کے دلوں میں الفت ڈال دی بیشک وہ زبردست حکمت والا ہے-)

اور یہ چیز رسول اکرم ﷺ کی زندگی بھر کی تربیت کا ماحصل تھا- جبکہ سود انسان میں ان سے بالکل متضاد رزیلہ صفات یعنی بخل' حرص' لالچ اور شقاوتِ قلبی پیدا کر دیتا ہے جو اسلامی روح کی عین ضد ہے-

دوسرے یہ کہ اسلام کے معاشی نظام کا تمام تر ماحصل یہ ہے کہ دولت گردش میں رہے اور اس گردش کا بہاؤ امیر سے غریب کی طرف ہو- اسلام کے نظامِ زکوٰۃ و صدقات کو اسی لیے فرض قرار دیا گیا ہے اور قانون میراث اور حقوق باہمی اسی بات کی تائید کرتے ہیں- جبکہ سودی معاشرہ میں دولت کا بہاؤ ہمیشہ غریب سے امیر کی طرف ہوتا ہے- اس لحاظ سے بھی سود اسلام کے پورے

معاشی نظام کی عین ضد ہے۔

علاوہ ازیں سود کے دیگر معاشی مفاسد بے شمار ہیں۔ جن کو تفصیل سے ذکر کرنے کا یہ موقع نہیں۔ البتہ ان میں سے چند ایک کا ذکر اگلے مضمون میں آ ہی گیا ہے۔

سود کا جواز؟

اتنے سخت احکام کے باوجود ہمارے نام نہاد مسلم معاشرے میں سود دن بدن زور پکڑ رہا ہے۔ ہماری ذہنیت مدینہ اور خیبر کے ان یہودیوں جیسی ہوگئی ہے جنہوں نے کہا تھا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ہم بھی سود کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مسلمانوں ہی کا ایک طبقہ تجارتی سود (کمرشل انٹرسٹ) یا بنک کے سود کو جائز اور حلال ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ یہ مسئلہ چونکہ نہایت اہم ہے۔ اس لیے ہم ان حضرات کے دلائل کا ذرا تفصیل سے جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

بنک کا سود[1]

بنک انٹرسٹ اور کمرشل انٹرسٹ:

سود فارسی زبان کا لفظ ہے۔ اور اس کی ضد میں فارسی میں ''زیان'' ہے۔ سود و زیان نفع و نقصان کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی سود بمعنی فائدہ یا نفع ہے۔ اور یہ لفظ اردو میں بھی مستعمل ہے۔ عربی میں اس کے لیے ربوٰا اور انگریزی میں انٹرسٹ (Interest) کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں کمرشل انٹرسٹ بمعنی تجارتی سود ہے مثلاً زید بکر سے دس ہزار روپے لے کر کاروبار کرتا ہے اور اس کے عوض وہ اسے مقررہ شرح سے نفع دینا طے کرتا ہے تو یہ تجارتی سود یا کمرشل انٹرسٹ ہے اور اگر یہی کام کسی فرد یا ادارہ کے بجائے بنک کرتا تو بنک انٹرسٹ کہلاتا ہے۔ اسے کمرشل انٹرسٹ بھی کہہ دیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ''ربا'' ایسے سود کا نام ہے جو کوئی مقروض اپنی بھوک یا احتیاج دور کرنے کی غرض سے مہاجن یا ساہوکار سے قرض لیتا ہے اور سود خوار اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر

[1] میرا یہ مضمون ترجمان الحدیث فروری، مارچ ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا، تھوڑی سی ترمیم سے اسے یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

بھاری شرح سود پر معاملہ کر کے اس پر ظلم کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایسے ہی شخصی احتیاج کے قرض پر سود کو ''ربا'' کہا جاتا ہے جسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے۔ رہا تجارتی سود تو عہد نبویؐ میں ایسے تجارتی قرضوں کا رواج ہی نہ تھا۔ عرب میں طوائف الملوکی، لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں عام ہوتی تھیں، وسائل سفر انتہائی محدود تھے۔ لہٰذا تجارت بھی برائے نام ہوتی تھی۔ اور جب تجارت ہی برائے نام ہو تو تجارتی قرضوں اور تجارتی سود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ دورِ حاضر کا بنک کا سود اس ربا کی تعریف میں کیونکر آ سکتا ہے جسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے۔

سود کے جواز کے دلائل

مہاجنی سود اور بنک کے سود میں امتیازی فرق کے لیے عموماً درج ذیل نکات پیش کیے جاتے ہیں یا بالفاظ دیگر اس کی اباحت کے لیے درج ذیل دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) مہاجنی قرضہ میں مقروض خود مہاجن کے پاس جا کر قرضہ کی درخواست کرتا ہے جبکہ بنک انٹرسٹ کی صورت میں قرض دینے والا خود بنک کے پاس جا کر اپنی رقم پیش کرتا ہے کہ اسے کاروبار میں لگائے اور منافع میں سے اسے بھی کچھ دے دے بنک اس قرض دہندہ کو ایک پہلے سے طے شدہ شرح سود ادا کرتا ہے۔

(۲) صنعت کار یا تاجر جو بنک سے قرضہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ بسا اوقات بنک کو خود شرحِ سود کی پیش کش کرتا ہے۔ بنک کے اس لین دین میں کسی فریق کی مجبوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سب کام باہمی رضامندی سے طے پاتے ہیں۔

(۳) مہاجنی قرضہ میں شرح سود اتنی بلند ہوتی ہے کہ ایک ضرورت مند مفلس اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ جبکہ تجارتی سود پر تجارت میں نفع نقصان کے احتمال کو سامنے رکھ کر مناسب شرح سود مقرر کی جاتی ہے۔ جو نقصان کی صورت میں قابلِ برداشت ہوتی ہے۔ لہٰذا بنک انٹرسٹ میں مقروض پر کچھ ظلم نہیں ہوتا۔

(۴) مہاجنی قرضے کی صورت میں مہاجن کو بعض دفعہ سود تو بجائے خود رہا۔ اصل بھی وصول نہیں ہوتا جبکہ بنک انٹرسٹ میں بنک اپنے مفادات کا پورا تحفظ کر لیتا ہے۔ بنک زیورات، جنس، خام مال دیگر اشیاء بطور زر رہن رکھ کر اس کا ساٹھ فیصد تک قرضہ دیتا ہے۔ اس طرح بنک بھی

نقصان سے محفوظ رہتا ہے اور ظلم سے بچ جاتا ہے۔ رہے نادار لوگ تو بنک انہیں قرضہ دینے سے یکسر انکار کر دیتا ہے۔

(۵) مہاجنی قرضہ میں نقصان کا پہلو نفع کی نسبت فی الواقع زیادہ ہے۔ کیونکہ اس میں ایک نادار پر ظلم ہوتا ہے۔ جبکہ بنک انٹرسٹ کی صورت میں فریقین سے ہر ایک کے لیے فائدہ تو یقینی ہے اور نقصان کا احتمال بہت کم رہ جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کے اس اصول ﴿ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا ﴾۔ (شراب اور جوئے سے متعلق) کے مطابق بھی بنک انٹرسٹ کو اس ''ربا'' سے مستثنیٰ قرار دینا چاہیے جسے حرام قرار دیا گیا ہے۔

اور اس ''استثناء'' کی ضرورت یا اضطرار یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ موجودہ دور میں تمام تر ملکی و غیر ملکی تجارت کا انحصار بنک کے سود پر ہے۔ لہٰذا عصر حاضر کا تقاضا یہ ہے کہ مندرجہ بالا وجوہات کے پیش نظر ربا کی تعریف میں اجتہاد کر کے مناسب ترمیم کی جانی چاہیے۔ تاکہ اسلام ہر زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے والا نظام ثابت ہو سکے۔

تنقیحات

یہ ہیں وہ دلائل جن کے پیش نظر ''ربا'' کی تعریف میں مناسب ترمیم اور اجتہاد کی سفارش کی جاتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مذکورہ بالا دلائل میں مندرجہ ذیل تنقیح طلب امور سامنے آتے ہیں۔

(۱) کیا عہد نبوی ﷺ میں عرب میں فی الواقع تجارت نہایت محدود تھی؟

(۲) ان ایام میں تجارتی قرضوں یا تجارتی سود کا وجود ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟

(۳) کیا شرح سود کی کمی یا مناسب شرح حرمت سود پر اثر انداز ہو سکتی ہے کہ اسے اباحت کے مقام پر لے آئے؟

(۴) کیا فریقین کی رضامندی سود کو جائز بنا سکتی ہے؟

(۵) کیا فی الواقع حرمتِ سود کی علت ''ظلم'' ہی ہے؟ اگر فریقین میں سے کسی پر بھی ظلم کا احتمال نہ ہو تو سود کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۶) عصر حاضر کے تقاضوں کے تحت سود کی تعریف میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے جبکہ اس کا نفع نقصان سے زیادہ ہے۔

اب ہم ان تنقیحات کو علی الترتیب زیر بحث لائیں گے۔

(۱) عہد نبوی ﷺ میں تجارت:

عرب ایک بے آب و گیاہ ملک ہے جس کا بہت تھوڑا رقبہ کاشت کے قابل ہے۔ اور جو کاشت کے قابل ہے اس پر بھی کم ہی توجہ دی جاتی تھی۔ کیونکہ شرفائے عرب زراعت کو کوئی معزز پیشہ تصور نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح ہاتھ سے کام کرنے یا دست کاری کے کام کو بھی باعث عار سمجھتے تھے۔ عرب میں عام لوگوں کا پیشہ تو بھیڑ بکریاں، گائے اور اونٹ پالنا تھا۔ اور شرفائے عرب کا محبوب مشغلہ تجارت ہی تھا۔ البتہ یمن میں اون کاتنے، چادریں اور کمبل بننے کا کام بھی ہوتا تھا۔ عربوں کو چونکہ فنون سپہ گری سے گہری دلچسپی تھی۔ لہٰذا کہیں کہیں آلات جنگ بھی تیار کیے جاتے تھے۔

نتیجتاً اہل عرب کو اشیائے خورد و نوش اور دیگر ضروریات سامان باہر سے درآمد کرنا پڑتا تھا۔ بلاشبہ ان دنوں لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کا دور دورہ تھا اور کسی اکے دکے مسافر کا جان و مال محفوظ نہ تھا۔ مگر یہ تجارت عموماً قافلوں کی شکل میں ہوا کرتی تھی۔ قریش مکہ کا تو پاسبان حرم ہونے کی وجہ سے بھی احترام کیا جاتا تھا۔ دوسرے قافلے یا تو قریش مکہ کے اثر سے فائدہ اٹھاتے یا اپنی حفاظت کا سامان خود لے کر چلتے تھے۔ غیر ملکی قافلوں کو بحفاظت گزارنے کے عوض ان سے ٹیکس بھی لیا جاتا تھا۔ ارشاد باری ہے۔

﴿لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ الَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ﴾ (سورۃ قریش ۱۰۶)

(اس واسطے کہ مانوس رکھا قریش کو، مانوس رکھنا ان کے سفر سے جاڑے میں اور گرمی میں، تو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی بندگی کریں۔ جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا اور خوف سے امن بخشا۔)

ہوتا یہ تھا کہ ملک میں ہر طبقہ کے لوگ اپنا فروختنی سامان اس قافلہ کے حوالہ کر دیتے جسے وہ اچھے داموں بیچ کر ادھر سے سامان خرید لاتے تھے۔ اس طرح دوہری تجارت سے انہیں دگنا منافع حاصل ہوتا۔ جو بسا اوقات ۵۰ فیصد تک پہنچ جاتا تھا۔ اہل مکہ کی خوشحالی کا دارومدار اس قافلے کی کامیابی پر منحصر ہوتا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے خود بھی بعثت سے پہلے مدینہ، بصرہ اور شام کے متعدد تجارتی سفر کیے تھے۔

یہ قافلے کتنے بڑے ہوتے تھے؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابو سفیان کا وہ قافلہ تجارت جو جنگ بدر کا پیش خیمہ ثابت ہوا- دو ہزار بار بردار اونٹوں پر مشتمل تھا- کئی مؤرخوں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ درآمد برآمد کی کل تجارت ۵۰ لاکھ دینار سالانہ تک ہوتی تھی- دینار سونے کا ایک سکہ ہے جو $4\frac{1}{2}$ ماشہ[1] کے برابر ہے- گویا محتاط اندازہ کے مطابق بھی اگر دینار کی قیمت/ ۱۸۰۰ روپے تصور کر لی جائے تو گویا یہ تجارت ۹ ارب روپے سالانہ تک جا پہنچتی تھی-

پھر یہ تجارتی قافلے صرف قریش مکہ تک ہی محدود نہ تھے- یمنی تاجر مکہ اور مدینہ کے راستے شام تک جاتے تھے- مدینہ کے یہودی جو ایک سرمایہ دار قوم تھی- شام سے گندم اور تیزاب درآمد کرتے تھے- علاوہ ازیں غیر ملکی تاجروں کی آمد ورفت بھی ہوتی رہتی تھی- ملک میں کئی جگہ بازار اور منڈیاں لگتیں- جہاں لوگ خرید وفروخت کے لیے جمع ہوتے تھے- سوداگروں کے قافلے ایران اور عراق سے تجارتی سامان لے کر آتے اور یہاں کی اشیاء اپنے ممالک لے جاتے- اس طرح یمن سے بحر ہند کے راستے ہندوستان سے عراق کے راستے سے مشرقی ممالک سے اور شام و مصر کے راستے سے افریقہ سے تجارت ہوتی تھی- گویا عرب مشرق و مغرب میں بین الاقوامی منڈی بن گیا تھا- جس میں شہر مکہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی-

پھر احادیث میں تجارت کی جن اقسام کا ذکر ملتا ہے اور جن میں سے بیشتر آج بھی رائج ہیں ان سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ ان ایام میں عرب میں تجارت کا کاروبار عروج پر تھا- اور تجارت کے سلسلہ میں جو ہدایات اور احکام مسلمانوں کو دیئے گئے ہیں وہ آج بھی مشعل راہ کا کام دیتے ہیں- اور تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تجارت کی وجہ سے اس دور میں بھی لکھ پتی بن گئے تھے-

اندریں حالات یہ مفروضہ کہ عہد نبوی ﷺ میں تجارت نہایت پر خطر تھی لہٰذا برائے نام رہ گئی تھی ایسا بے معنی مفروضہ ہے جس کی نہ تاریخ تائید کرتی ہے اور نہ قرآن کریم-

(۲) تجارتی قرضے اور تجارتی سود:

اس بحث کو ہم تین حصوں میں تقسیم کریں گے-

[1] زکوٰۃ کے لیے سونے کا نصاب ۲۰ دینار ہے' جسے علماء نے پوری تحقیق کے بعد $7\frac{1}{2}$ تولے سونا قرار دیا ہے- اس لحاظ سے بھی ایک دینار کی مالیت $4\frac{1}{2}$ ماشے سونے کے برابر ہے- اگر ۴۸۰۰ روپے سونے کا بھاؤ فرض کیا جائے تو دینار ۱۸۰۰ روپے کا بنتا ہے- حالانکہ سونے کی قیمت آج کل اس سے بھی زیادہ ہے-

(۱) عہد نبوی میں اندروں عرب تجارتی قرضوں اور تجارتی سود کا وجود
(۲) عہد نبوی میں ہمسایہ ممالک میں تجارتی قرضے اور سود
(۳) آیا ربا کا لفظ قرآن کریم یا لغوی اعتبار سے تجارتی سود کا بھی احاطہ کرتا ہے نہیں۔

(۱) عرب میں تجارتی سود:

عہد نبویؐ میں تجارتی قرضوں پر سود لینے کا رواج موجود تھا۔ جس کا ذکر تفاسیر میں ملتا ہے۔ صاحب تفسیر خازن آیت ﴿وَذَرُوْا مَابَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا﴾ (۲:۲۷۸) کے تحت لکھتے ہیں۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے زمانہ جاہلیت میں شراکت کی تھی اور سودی کاروبار کرتے تھے۔ وہ قبیلہ بنو عمیر (جو قبیلہ ثقیف طائف سے تعلق رکھتا تھا) کے لوگوں کو کاروبار کے لیے سود قرض دیتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ان کی بہت بڑی رقم واجب الوصول تھی جو انہوں نے چھوڑ دی۔

اور اس بات کا اعلان خود حضور اکرم ﷺ نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں ان الفاظ میں فرمایا۔

"جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیئے جائیں گے اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا سود یعنی عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں[۱]۔"

یہ واضح رہے کہ آیت بالا حضور ﷺ کی وفات سے صرف چار ماہ پیشتر نازل ہوئی تھی۔ گویا اس آیت کے نزول اور حجۃ الوداع کا زمانہ تقریباً ایک ہی تھا۔

جلیل القدر مفسر علامہ ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) اس آیت کی تفسیر میں یوں رقمطراز ہیں۔

﴿کَانَ رِباً یَتَبَا یَعُوْنَ بِهٖ فِی الْجَاھِلِیَّةِ-﴾ (یہ وہ سود تھا جس کے ساتھ جاہلیت میں لوگ خرید و فروخت کرتے تھے۔)

(۲) ہمسایہ ممالک میں تجارتی قرضے اور سود:

حضور اکرم ﷺ کے بالکل قریب زمانے میں قیصر روم جسٹنین نے جس کی وفات

---

۱ مسلم۔ کتاب الحج۔ باب حجۃ النبی ﷺ (۱۴۷/۱۲۱۸)

حضور اکرم ﷺ کی پیدائش سے صرف پانچ سال قبل ہوئی تھی- تمام بازنطینی سلطنت میں از روئے قانون زمینداروں اور کاشت کاروں کے قرضوں پر ۴ فیصد، تجارتی اور صنعتی قرضوں پر ۸ فیصد اور بحری تجارت کے قرضوں پر ۱۲ فیصد شرح سود مقرر کی تھی- یہ قانون جسٹنین کے بعد بھی ایک مدت تک بازنطینی سلطنت میں رائج رہا-[1]

روم کی سلطنت عرب کی ہمسایہ مملکت تھی- جس کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے یہاں تجارتی سود اپنی تمام شکلوں میں رائج تھا- اسی طرح دیگر ممالک میں بھی تجارتی سود کے شواہد مل جاتے ہیں جو بوجہ طوالت چھوڑ دیئے جاتے ہیں- یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں- کہ آس پاس کے ملکوں سے اہل عرب کے گہرے تجارتی روابط اور میل جول تھا- اندریں حالات یہ تصور کرنا ناممکن ہے کہ اہل عرب تجارتی سود سے ناواقف ہوں-

اگر ہم بفرض محال تجارتی سود کے حامیوں کے خیال کے مطابق یہ فرض کر بھی لیں کہ اہل عرب اس دور میں تجارتی سود سے نا آشنا تھے تو بھی اس سے سود کی اباحت کے متعلق کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی- ایک طرف تو ہم یہ دعوے کرتے ہیں کہ اسلام کے احکام ابدی اور تمام دنیا کے لیے ہیں- دوسری طرف ہم صرف عرب کے ایک مخصوص دور پر نظر رکھ کر سود کے احکام کو صرف اس دور اور اس علاقے تک محدود رکھنا چاہتے ہیں- سوال یہ ہے کیا (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کو بھی علم نہ تھا کہ اگر عرب میں نہیں تو ہمسایہ ملک میں کس کس قسم کا سود رائج ہے یا آئندہ کیا کچھ ہونے والا ہے؟ کیا یہی علم و حکمت خداوندی ہے؟ سود کے یہ بالا طلاق خدائی احکام اور حضور اکرم ﷺ کا سود کی تمام مشتبہ شکلوں سے پرہیز کو لازم قرار دینا کیا اس بات کی واضح دلیل نہیں کہ سود کی کوئی بھی شکل کسی بھی دور میں حلال قرار نہیں دی جا سکتی-

(۳) تجارتی سود کی حرمت قرآن کریم سے:

اسلام نے تجارتی اور شخصی قرضوں میں کوئی فرق روا نہیں رکھا- اگر ایسی بات ہوتی تو ضرور اس کی وضاحت کر دی جاتی- اس کی نگاہ میں اصل سے ایک مقررہ شرح کے مطابق جو کچھ بھی زائد لیا جائے اور جس طرح بھی لیا جائے- وہ ''ربا'' ہی ہے- ربا کے لغوی معنی بھی اس مخصوص

---

[1] ''سود'' از مولانا مودودی صاحب'' ص ۲۸، بحوالہ
(۱) (Astonyot Civilisation) از رول ڈرافٹ- ج ۴، ص ۱۲۰، ۶-۴۳
(۲) زوال و سقوط دولت روم از گبن- ج ۳ ص ۱۶

اضافہ کے ہیں جو اصل سے زائد لیا جاتا ہے اور شخصی اور تجارتی قرضوں میں فرق کرنا گویا۔

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ (۸۵:۲) (کیا تم کتاب کے کچھ حصے پر تو ایمان لاتے ہو اور کچھ کا انکار کر دیتے ہو۔)

ربا کو مہاجنی قرضی سے مختص کرنا اور سود کا الگ الگ مفہوم مقرر کرنا تو یہ موجودہ دور کی اختراع ہے۔ جس کا مسلمانوں کی طویل تاریخ میں کہیں سراغ نہیں ملتا۔

تجارتی سود کے متعلق الگ احکام یا الگ لغت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اسلام تجارتی قرضوں اور سود کی الگ نوعیت کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ سود کے احکام ہر قسم کے قرضوں پر منطبق ہوتے ہیں۔ ان احکامات میں جہاں شخصی حاجات کے سود کی حرمت کا پتہ چلتا ہے۔ وہاں تجارتی سود کی حرمت پر بھی واضح دلائل موجود ہیں۔ مثلاً

پہلی دلیل: خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (۲۷۵:۲) (اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔)

یہاں خرید و فروخت یا تجارت کے مقابلے میں لفظ ''ربا'' کا استعمال تجارتی سود کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔ کیوں کہ جہاں شخصی حاجات کے قرضوں کا ذکر مقصود تھا وہاں قرآن کریم نے ''ربا'' کے مقابلے میں صدقہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

ارشاد باری ہے۔

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾ (۲۷۶:۲) (اللہ تعالیٰ سود کو ختم کرتا اور صدقات کی پرورش کرتا ہے۔)

دوسری دلیل: قران کریم کے اس ارشاد۔

﴿وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ﴾ (۲۷۹:۲) (پھر اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لیے تمہارے راس المال ہیں۔)

میں بھی تجارتی قرضوں کے متعلق واضح اشارہ ہے۔ کیونکہ راس المال (جس کا معنی سرمایہ ہے) کا اطلاق عموماً تجارت پر لگائی ہوئی رقم کے لیے ہوتا ہے۔

تیسری دلیل: قرض کے لیے عربی لغت میں دو الفاظ ملتے ہیں۔ قرض اور دین' قرض کا

مفہوم عام فہم ہے اور عام طور پر شخصی قرضوں کے لیے آتا ہے۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

﴿اِذَا اَقْرَضَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فَلَا يَاْخُذْ هَدِيَّةً﴾ (بخاری فی تاریخہ) (جب کوئی شخص کسی دوسرے آدمی کو قرض دے تو پھر اس سے ہدیہ قبول نہ کرے۔)

جبکہ دَین کا لفظ ہر قسم کے لین دین پر محیط ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ ذمہ داری یا انگریزی میں (Liability) (ادائیگی کی ذمہ داری) ہوگا۔ جس میں کاروباری قرضے بھی شامل ہوتے ہیں۔

ارشاد باری ہے۔

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ﴾ (۲:۲۸۲) (اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک مقررہ وقت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔)

اور ربا کی تعریف الزيادة فِي الدَّيْن سے کی جاتی ہے نہ کہ الزيادة في القرض سے لہٰذا ازروئے قرآن و لغت بھی تجارتی سود کو ''ربا'' سے خارج کرنے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

(۳) شرح سود میں کمی:

تجارتی سود کی حمایت میں یہ دلیل کہ اس کی شرح نقصان کے احتمال کو مدنظر رکھ کر مناسب اور قابل برداشت مقرر کی جاتی ہے کئی لحاظ سے محل نظر ہے۔

اولاً یہ کہ آج تک مناسب اور معقول شرح کا تعین نہیں ہو سکا۔ کبھی تو یہ شرح ۲ فیصد بھی نامناسب اور غیر معقول قرار دی جاتی ہے۔ جیسا کہ دوسری جنگ عظیم کے لگ بھگ زمانے میں ریزرو بنک آف انڈیا ڈسکونٹ ریٹ مقرر ہوا اور یہی شرح دوران جنگ قائم رہی۔ پھر پونے تین فیصد پر حکومت ہند کو قرضے ملتے رہے۔ اور کبھی یہ شرح ۲۹ فیصد بھی مناسب اور معقول سمجھ لی جاتی ہے۔ (اشتہار انوسٹمنٹ بنک نوائے وقت ۱۱/۸/۱۹۷۷) شرح سود کی مناسب تعین نہ ہو سکنے کی غالباً وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد ہی متزلزل اور کمزور ہے۔ مناسب اور معقول شرح سود کی تعیین تو صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے۔ جب یہ معلوم ہو سکے کہ قرض لینے والا اس رقم سے کتنا یقینی فائدہ حاصل کرے گا۔ اور اس میں سے قرض دینے والے کا معقول حصہ کیا ہونا چاہیے۔ مگر ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ قرض لینے والے کو اس مقررہ مدت میں

کتنا فائدہ ہوگا یا کچھ فائدہ ہوگا بھی یا نہیں؟ تو پھر معقول شرح سود کا تعین کیسے ممکن ہو بلکہ اس سے بھی ذرا آگے بڑھیں اور شرح سود کے بجائے نفس سود اور اس کے جواز پر غور کریں کہ سود آخر کس چیز کا معاوضہ ہے۔ تو اس اہم مسئلہ پر معیشت دانوں کے جتنے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ شاید ہی علم معاشیات کے دوسرے مسئلے پر پائے جاتے ہوں۔

ثانیاً ایک ہی ملک اور ایک ہی وقت میں بنکوں کی شرح سود میں انتہائی تفاوت پایا جاتا ہے۔ مثلاً آجکل پاکستان کے سٹیٹ بنک نے عام بنکوں کو قرض دینے کی شرح ۱۰ فیصد مقرر کر رکھی ہے۔ اب عام بنک کاروباری حضرات کو ۱۶ فیصد شرح پر قرض دیتے ہیں۔ جو سود اور سود کے چکر میں ۱۷ فیصد سالانہ اور بعض حالتوں میں اس سے بھی زیادہ بن جاتی ہے۔ یہ مناسب شرح سود ہے۔ پھر حکومت خود عوام سے کاروبار کے لیے جو قرضے لیتی ہے تو یہ شرح دس سال کے لیے ۲۹ فیصد ہے اور رقم دس سال میں چار گنا ہو جاتی ہے۔ اب آپ خود اندازہ کیجئے کہ اگر یہ کچھ مناسب شرح ہے' تو نامناسب کیا ہو سکتی ہے۔ اور اگر ایسے قرض لے کر تجارت کی جائے جہاں نقصان کے احتمال بھی موجود ہیں تو گرانی اشیاء کا کیا عالم ہوگا؟

ثالثاً یہ بات قابل غور ہے کہ اگر بالفرض شرح سود مناسب حد تک کم اور معقول ہو تو کیا حرمتِ سود پر اثر انداز بھی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اور حقیقتاً یہی اصل مبحث ہے تو ہمارے خیال میں شرح سود ایک فیصد ہو یا ۵۰ فیصد شریعت کی نگاہ میں ایک ہی جیسا جرم ہے۔ شراب کا ایک قطرہ بھی ویسے ہی حرام ہے جیسے ایک چھلکتا جام۔ کیونکہ شریعت کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ

''حرام چیز کی قلیل مقدار بھی ویسے ہی حرام ہے۔ جیسے اس کی کثیر مقدار۔[1]

لہٰذا شرح سود کی کمی یا معقولیت کی بنا پر سود کی اباحت کے لیے راستہ ہموار کرنا بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔''

---

[1] ترمذی۔ کتاب الاشربہ۔ باب ماسکر کثیرۃ فقلیله حرام (۱۸۶۰) ابن ماجہ کتاب الاشربہ باب ماسکر کثیرہ فقلیله حرام (۳۳۹۳)
ابوداؤد (۳۶۸۱) المنتقی لابن الجارود (۸۶۰) ابن حبان (۵۳۸۲) بیہقی ۸/۲۹۶) المسند الجامع ۴/۲۲۵ عن جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہی حدیث عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ابن ماجہ (۳۳۹۴) مسند احمد ۱۱/۱۱۹ (۶۵۵۸) عبدالرزاق (۱۷۰۰۷) بیہقی ۸/۲۹۶ سنن نسائی (۵۶۲۳) میں موجود ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔

(۴) فریقین کی رضا مندی:

فریقین کی رضا مندی کی شرط حلال چیزوں میں ہوا کرتی ہے- جیسے تجارت یا نکاح وغیرہ- حرام چیزوں اور معاہدات میں فریقین کی رضا مندی کی شرط ہی سرے سے غلط اور باطل ہے- فریقین کی رضا مندی زنا یا جوئے کو جائز نہیں بنا سکتی حالانکہ یہ دونوں کام بھی بسا اوقات رضا مندی ہی سے طے پاتے ہیں- پھر آخر سود جیسی حرام اور مکروہ چیز کو لوگوں کی مرضی یا فریقین کی رضا مندی پر کیسے چھوڑا جا سکتا ہے- اسی طرح خواہ سود لینے والا شرح سود کی تعیین کرے یا سود دینے والا- اس سے بھی نفسِ سود کی حرمت میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا-

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ سود دینے والا کبھی سود دینے پر رضا مند نہیں ہوا کرتا- اس کی رضا مندی نہیں ہوتی بلکہ اضطرار ہوتا ہے اگر اسے کم شرح سود پر قرضہ مہیا ہو سکے یا کہیں سے قرض حسنہ ملنے کی توقع ہو تو وہ کبھی یہ سودی قرض لینے پر تیار نہ ہوگا- سودی معاہدات میں رضا مندی کا جتنا پہلو ہوتا ہے اس کا اندازہ درج ذیل تاریخی واقعہ سے بخوبی ہو سکے گا-

دوسری جنگ عظیم کی بات ہے کہ انگلستان نے امریکہ سے ایک بھاری قرض کا معاملہ کیا- جو (Brittonwcso Agreement) کے نام سے مشہور ہے یہ معاہدہ مشہور ماہر معاشیات برطانیہ لارڈ کینز (Keens) کی معرفت طے پایا تھا- انگلستان یہ چاہتا تھا کہ اس کا خوشحال دوست امریکہ جو اس لڑائی میں اس کا رفیق تھا- اسے بلا سود قرض دے دے- لیکن امریکہ سود چھوڑنے پر راضی نہ ہوا- انگلستان اپنی مشکلات کی وجہ سے مجبور ہو گیا- کہ سود دینا قبول کرے- اس کا جو اثر انگریز قوم پر مرتب ہوا وہ بھی سن لیجیے-

لارڈ کینز جنہوں نے انگلستان کی طرف سے یہ معاہدہ کیا تھا' جب اپنے مشن کو پورا کر کے پلٹے تو انہوں نے برطانوی دارالامراء میں تقریر کرتے ہوئے کہا "میں تمام عمر اس رنج کو نہ بھولوں گا جو مجھے اس بات سے ہوا کہ امریکہ نے ہم کو بلا سود قرض دینا گوارا نہ کیا-"

مسٹر چرچل جیسے زبردست امریکہ پسند شخص نے کہا کہ "یہ بنیے پن کا برتاؤ جو ہمارے ساتھ ہوا ہے مجھے اس کی گہرائی میں بڑے خطرات نظر آتے ہیں- سچی بات یہ ہے کہ ہمارے باہمی تعلقات پر بہت ہی برا اثر پڑا ہے-"

اس وقت کے وزیر خزانہ ڈاکٹر ڈالٹن نے کہا کہ "یہ بھاری بوجھ جسے لادے ہوئے ہم جنگ سے نکل رہے ہیں ہماری ان قربانیوں اور جفاکشیوں کا بڑا ہی عجیب صلہ ہے جو ہم نے

مشترک مقاصد کے لیے برداشت کیں۔''

اب بنک کے سود کی طرف آیئے اور غور فرمایئے کہ جو لوگ بنک سے سودی قرضے حاصل کرتے ہیں تو کیا انہیں باہمی رضامندی کا نام دینا مناسب ہے یا اضطراری معاہدے کا۔ اور ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ ایسے بیشتر معاہدے اسی اضطراری نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو بنک میں سود کے لالچ سے روپیہ جمع کراتے ہیں۔ ان کی کیفیت اضطراری نہ سہی وہ تو سود کے معاشی اور معاشرتی نقصانات کو آگے منتقل کر دیتے ہیں۔

یہ تو خیر ایک ضمنی سی بحث تھی کہ سودی معاملات میں رضامندی کا نہیں بلکہ اضطرار کا پہلو بھی شامل ہے تاہم اس پہلو کو نظر انداز کر کے اگر فریقین کی رضامندی کو بھی تسلیم کر لیا جائے۔ تو بھی سود کی حرمت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔

(۵) ربا اور ظلم:

تجارتی سود کی حمایت میں یہ دلیل بڑے شدومد سے پیش کی جاتی ہے کہ یہ معاہدات چونکہ نہایت معقول شرح پر باہمی رضامندی سے طے پاتے ہیں اور ان میں کسی فریق پر ظلم بھی نہیں ہوتا لہٰذا قرآن کریم کے الفاظ ﴿لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴾ کے مطابق یہ سود اس ظلم میں کیسے آ سکتا ہے۔ جس کی بنیاد ظلم پر ہوتی ہے۔ گویا ظلم حرمتِ سود کی علت سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ظلم سود کی حرمت کا بنیادی سبب نہیں ہے۔ آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہے کہ یہ الفاظ سودی معاملات اور معاہدات کو ختم کرنے کی ایک احسن صورت پیش کرتے ہیں۔ یعنی نہ تو مقروض قرض خواہ کی اصل رقم بھی دبا کر اس پر ظلم کرے اور نہ قرض خواہ مقروض کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اصل کے علاوہ اس پر سود کا بوجھ لاد دے۔ ان الفاظ کا اطلاق ہمارے ہاں اس وقت ہوگا۔ جب ہم معاشرہ سے سود ختم کریں گے۔

سود کی حرمت کا بنیادی سبب ظلم نہیں بلکہ بیٹھے بٹھائے اپنے مال میں اضافہ کی وہ ہوس ہے جس سے ایک سرمایہ دار اپنی فاضل دولت میں طے شدہ منافع کی ضمانت سے یقینی اضافہ چاہتا ہے۔ اور جس سے زر پرستی' تنگ دلی اور شقاوت جیسے اخلاق رذیلہ جنم لیتے ہیں۔ سود کے متعلق سب سے پہلی آیت جو مکی دور میں نازل ہوئی اس میں اس کے بنیادی سبب کی پوری وضاحت ملتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

[redacted]

تجارت اور سود کا فرق:

سود میں (خواہ وہ شخصی ہو' بنک کا ہو تجارتی ہو) اور تجارت میں درج ذیل باتوں میں فرق پایا جاتا ہے۔

(۱) سود ایک طے شدہ شرح کے مطابق یقینی منافع ہوتا ہے۔ جبکہ تجارت میں منافع کے ساتھ نقصان کا احتمال موجود ہوتا ہے۔ خواہ کوئی شخص یہ تجارت اپنے سرمایہ سے کرے یا مضاربت[1] کی شکل ہو۔

(۲) مضاربت کی شکل میں فریقین کو ایک دوسرے سے ہمدردی مروت اور مل جل کر کاروبار چلانے کی فضا پیدا ہوتی ہے اور اس سے قومی پیداوار پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ جبکہ سود کی صورت میں سود خور کو محض اپنے مفاد سے غرض ہوتی ہے اور بعض دفعہ سرمایہ دہندہ ایسے نازک وقت میں سرمایہ واپس لے لیتا یا اس کی فراہمی سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ جبکہ کاروبار کو سرمایہ کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن سرمایہ دار سب کچھ اپنے ذاتی مفادات پر قربان کر دیتا ہے۔ اور اس سے قومی معیشت سخت متاثر ہوتی ہے۔

(۳) سود اور مضاربت میں تیسرا فرق یہ ہے کہ مضاربت سے انسان میں ہمدردی مروت اور احسان جیسے اخلاق حسنہ پرورش پاتے ہیں۔ جبکہ سود سے خود غرضی' مفاد پرستی' زبردستی اور سنگدلی جیسے اخلاق رذیلہ پروان چڑھتے ہیں۔ سود کی حرمت کی علت بھی یہی رذیلہ اخلاق اور ہوسِ زر پرستی ہے۔ جس کی وجہ سے ایک سرمایہ دار بیٹھے بٹھائے ایک مقررہ منافع کی ضمانت چاہتا ہے اور حالات خواہ کچھ ہوں اور اس کی وصولی پر مصر ہوتا ہے۔ سودی نظام معیشت نے صرف ایک ہی شائی لاک پیدا نہیں کیا بلکہ ہر دور میں ہزاروں شائی لاک[2] پیدا ہوتے رہے اور آئندہ بھی ہوتے

---

[1] مضاربت تجارت کی وہ قسم ہے جس میں ایک کا سرمایہ ہو اور دوسرا محنت کرے۔ مضاربت کی شکل میں اگر نقصان ہو جائے تو یہ نقصان سرمایہ دار برداشت کرے گا۔ اور محنت کش کی محنت ضائع ہوگی جو سرمائے کے مقابلہ پر برابر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر مضاربت کی شکل یہ ہوتی ہے کہ سرمایہ دار اور محنت کش دونوں نفع ونقصان میں شریک سمجھے جاتے ہیں۔ یہ شرط خالصتاً سرمایہ دار نظام کے ذہن کی پیداوار ہے۔ جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں یہی وجہ ہے کہ اسلام محنت کے مقابلہ میں سرمایہ کی بالادستی کو تسلیم نہیں کرتا۔ الایہ کہ سرمایہ دار محنت کنندہ پر یہ شرط عاید کرے کہ وہ فلاں کام یا فلاں کاروبار نہ کرے۔ ورنہ وہ سرمایا دہندہ کے نقصان کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

[2] ایک سنگدل یہودی سود خور جس نے ایک مقروض کو قرض دیتے وقت یہ شرط عاید کی تھی کہ اگر مقررہ وقت تک اصل بمعہ سود ادا نہ کرے گا۔ تو وہ اس کی ران سے گوشت کاٹ لے گا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ مقروض کسی مجبوری کی وجہ سے اس سود خوار کی رقم بروقت ادا نہ کر سکا تو اس سنگدل مثالی کردار نے فی الواقع اس کی ران سے بے دریغ گوشت کا ٹکڑا کاٹ لیا تھا۔

رہیں گے۔ سود اور حرام خوری کے جواز میں یہودیوں نے ایک اور بہانہ تراش رکھا تھا۔ جو یہ تھا کہ انہیں امّی لوگوں (ان پڑھ۔ غیر یہودی یعنی مشرکین) کا مال سود یا کسی بھی دوسرے ناجائز طریقے سے ہتھیا لینے میں چنداں مضائقہ نہیں۔ قرآن کریم نے یہود کی اس ذہنیت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

﴿قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (۳:۷۵)

(یہود کہتے تھے کہ امّیوں کے بارے میں ہم سے مواخذہ نہ ہوگا۔ یہ لوگ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں حالانکہ جانتے بھی ہیں۔)

اور یہی کام آج کا مسلمان امّی کے بجائے دارالحرب کا نام لے کر اور اس میں فقہی موشگافیوں کا سہارا لے کر کر رہا ہے۔ اس ''کارِ خیر'' کی ابتدا سرسید احمد خاں نے کی اور بعد میں کئی ''بزرگ ہستیاں'' اس کار خیر میں شامل ہوگئیں۔

دوسرا اعتراض۔ سود اور کرایہ جات

تجارتی سود کے جواز کی حمایت میں یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے۔ کہ اگر سود یقینی منافع کی بنا پر ناجائز سمجھا جاتا ہے تو اسلام میں اور بھی کئی ایسی باتوں کا جواز ملتا ہے۔ جہاں منافع بھی یقینی ہوتا ہے پھر بھی وہ جائز اور درست سمجھی جاتی ہیں۔ مثلاً مکانوں، دکانوں اور بعض دیگر اشیائے استعمال مثلاً سائیکل اور کراکری کا کرایہ یا زمین کا لگان وغیرہ تو پھر آخر سود کو یقینی منافع کی بنا پر کیوں ناجائز قرار دیا جاتا ہے۔

یہ دلیل بھی ہمارے نزدیک ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی کیونکہ کرایہ اور منافع دونوں الفاظ بالکل الگ الگ مفہوم کے حامل ہیں۔ تاہم ان کا فرق ذرا وضاحت سے بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) ملکیت میں تبدیلی:

کرایہ کی صورت میں اشیاء کی ملکیت میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ کوئی کرایہ دار مالک مکان یا دکان نہیں بن سکتا۔ نہ ہی اس میں مالک کی مرضی کے بغیر کسی قسم کے تصرف کا حق رکھتا ہے جبکہ سرمایہ دار کی رقم جب سرمایہ دار سے جدا ہوئی ہو تو وہ دوسرے کی ملکیت ہوگئی۔ اب وہ اسے جس

طرح چاہے استعمال کرنے کا پورا حق رکھتا ہے- جیسے چاہے تصرف کرسکتا ہے-

(۲) ماہیت میں تبدیلی:

کرائے کی اشیاء مثلاً مکان' دکان یا سائیکل وغیرہ کی بنیادی حیثیت برقرار رہتی ہے- جبکہ سرمایہ بنیادی شکل کو ختم کرکے اسے کسی دوسری شکل میں تبدیل کردیا جاتا ہے اور جب تک اس کی بنیادی حیثیت کو تبدیل نہ کیا جائے تجارت کا تصور ہی ناممکن ہے- جبکہ سود کی شکل میں اس کی ختم شدہ حیثیت کو واپس لانا اور ساتھ سود بھی ادا کرنا ہوتا ہے-

(۳) عوضانہ:

کرایہ اور سود میں سب سے بڑا اور بنیادی فرق یہ ہے کہ اشیاء کا ملک کرایہ کی رقم اس چیز کی گھسائی' ٹوٹ پھوٹ اور مرمت کے عوض وصول کرتا ہے کیونکہ اس کی نگہداشت اور بہبود مالک کے ذمہ ہوتی ہے- الا یہ کہ پہلے سے کوئی خاص شرط عاید کردی جائے- جبکہ رقم کی صورت میں اس کی ٹوٹ پھوٹ یا مرمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا- سود کی رقم محض مدت کے عوض وصول کی جاتی ہے-

زمین کے لگان یا ٹھیکہ کا مسئلہ بھی کرایہ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں- زمین کی صورت میں نہ اس کی ملکیت تبدیل ہوتی ہے اور نہ ماہیت' نگہداشت بھی مالک کے ذمہ ہوتی ہے- اس میں اگر ٹوٹ پھوٹ اور مرمت کا عنصر کم ہوتا ہے- تو سیم تھوہر کی وجہ سے کلر بنجر بن سکتی ہے- پھر بھی بعض علماء اسے سود کی مثل قرار دے کر اس سے اجتناب ہی کو بہتر سمجھتے ہیں اور بعض دوسرے اس صورت میں جائز سمجھتے ہیں- کہ اگر فصل کسی اتفاقی حادثہ کی وجہ سے کم پیدا ہو یا تباہ ہو جائے تو مالک زمین اس طے شدہ ٹھیکہ میں اسی قدر مناسب تخفیف کردے یا معاف کردے- اندریں صورت یہ بھی مضاربت ہی کی شکل بن جاتی ہے-

مندرجہ بالا تصریحات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اشیاء کے کرایہ یا ٹھیکہ اور سود میں مشابہت یا مماثلت کو دور کا بھی واسطہ نہیں-

اب تک ہم جن دلائل کا جائزہ لے چکے ہیں- ان کی حیثیت یا تو شرعی تھی یا تاریخی- اب حامیان سود کے اس اعتراض کا جواب دیں گے جس کا تعلق سراسر معاشیات سے ہے-

تیسرا اعتراض-سود اور قومی معیشت

بچت اور سرمایہ کاری کا اسلامی نظریہ

حامیان سود کی طرف سے بڑے شد و مد سے یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ سود کی کشش کی وجہ سے لوگ بچت کرنے کے عادی ہوتے ہے۔ اگر بینکوں کے سود کو ختم کر دیا جائے۔ تو لوگ بچت کرنا چھوڑ دیں گے اور اس طرح قومی معیشت متاثر ہو گی۔

اس اعتراض پر تین پہلوؤں سے غور کیا جا سکتا ہے۔

(ا) کیا فی الواقع بچتوں کا محرک صرف سود ہی ہے؟

(ب) کیا انفرادی بچتیں قومی بچت کو متاثر کرتی ہیں؟

(ج) سود کو ختم کرنے سے اسلامی نظامِ حیات میں بچتوں پر کیا اثر پڑے گا؟

(ا) بچت اور سود:

ہمارے خیال میں یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ لوگ محض سود کی کشش کی وجہ سے بچت کے عادی ہوتے ہیں۔ بچت کے اور بھی بہت سے محرکات ہیں جو سود سے قوی تر ہیں۔ جدید ماہرین معاشیات اس امر پر متفق ہیں کہ بچت کے بہت سے دیگر عوامل میں سے ایک سود بھی ہے۔ مشہور برطانوی معیشت دان لارڈ کینز (J.M. Keynes) نے اپنی کتاب "روزگار، سود اور زر کا عام نظریہ"[1] میں بچت کے داخلی محرکات کا ذکر کرتے ہوئے جن باتوں کا ذکر کیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) اتفاقی حوادث کے لیے پیش بندی۔

(۲) مستقبل میں متوقع اخراجات، لڑکوں کی تعلیم اور شادیوں کے اخراجات۔

(۳) بڑھاپے میں قوتِ کار کم ہو جانے کی وجہ سے آمدن کا محدود ہونا۔

(۴) احتیاج سے آزادی چاہنا۔

(۵) معیارِ زندگی میں اضافہ کے خیال سے بچت کرنا۔

(۶) کاروبار کے لیے کچھ سرمایا بچا کر رکھنا یا ورثاء کے لیے ترکہ چھوڑنے کی خواہش۔

---

[1] The General Theory of Employment Interest and Money. P, 10 Macmillpnar London.

(۷) طبعی کنجوسی کے سبب پس انداز کرنا۔

(۸) سود۔ بچت میں مزید اضافہ حاصل کرنے کے لیے۔

گویا لارڈ موصوف نے سود کو بچت کے عوامل میں آٹھویں نمبر پر شمار کیا ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ بچت میں مزید اضافہ کا محرک کوئی بھی متوقع آمدنی ہوسکتی ہے۔ ضروری تو نہیں کہ وہ سود ہی ہو۔

لارڈ موصوف کے بعد اس سلسلہ میں مزید تحقیق کے نتیجہ میں کوئی اور محرکات بھی سامنے آئے ہیں۔ مثلاً سیاسی نظم و استحکام' صارفین کو قرض کی فراہمی' سابق معیار زندگی اور آمدنی میں اضافہ کی رفتار وغیرہ وغیرہ۔ گویا یہ ایک ایسا مفروضہ ہے جسے ماہرین فن بھی اہمیت نہیں دیتے جن کے ہاں سود ''حرام'' بھی نہیں ہے تو بھلا ہم ان حقائق کی روشنی میں اس مفروضہ کو کیونکہ درست تسلیم کر سکتے ہیں؟

(ب) انفرادی بچت اور قومی بچت:

جب ہر شخص بچت پر آمادہ ہو جائے تو ظاہر ہے کہ عوام کی قوت خرید کم ہو جائے گی اور جب اشیائے صرف کی خرید رک جائے گی تو ملکی معیشت ایک دوسرے انداز سے متاثر ہونا شروع ہو جائے گی۔ جو لوگ اشیاء صرف پیدا کرتے ہیں ان کی آمدن اور اسی طرح بچت اس حد تک محدود ہو جائے گی جس حد تک ان کی بچتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ بچت کے متعلق لارڈ کینز موصوف کا یہی نظریہ ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

قومی بچت افرادی بچت سے متاثر نہیں ہوتی۔ جب معاشرہ کے چند لوگ بہت زیادہ بچت کرنے لگتے ہیں۔ تو دوسروں کی قوت پس اندازی کم ہو جاتی ہے۔ قومی بچت تب ہی بڑھ سکتی ہے۔ جب قومی آمدنی میں اضافہ ہو۔ لہٰذا تمام تر توجہ پیداوار اور وسائل بڑھانے پر مرکوز کرنی چاہیے۔

(ج) اسلام اور نظریہ بچت:

اسلام نے اس مسئلہ میں اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے کفایت شعاری ایک اچھی صفت ہے۔ لیکن اگر بخل کی حد تک پہنچ جائے تو یہ ایک اخلاقی جرم ہے۔ اسلام ہمیں یہ بھی سکھاتا ہے کہ کفایت شعاری سے بچت کی جائے۔ اور جو کچھ پس انداز ہوا گر ہو سکے تو یہ

سب کچھ فقیر محتاج لوگوں کی ضروریات پر خرچ کر دیا جائے- بموجب ارشاد باری تعالیٰ-

﴿وَيَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ (۲۱۹:۲) (اے نبی ﷺ! آپ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے جو کچھ پس انداز ہو (سب ہی خرچ کرو)

لیکن ایسا کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے- اور اس پر صرف اہل عزیمت اور متقی لوگ ہی عمل پیرا ہو سکتے ہیں- کیونکہ انسان میں بچت کرنے کے بہت سے داخلی محرکات ہیں- جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے لہٰذا خلاقِ فطرت نے انسان کی اس کمزوری کا پورا لحاظ رکھا ہے- اور اس بچی ہوئی رقم کا ایک قلیل حصہ یعنی اڑھائی فیصد اللہ کی راہ میں فقراء و مساکین کی ضروریات پر خرچ کرنے کی پابندی عاید کی ہے- باقی ۳۹ حصے انسان بچا کر خود اپنے پاس بھی رکھ سکتا ہے اور اسے مزید نفع آور کاموں یعنی تجارت وغیرہ میں بھی لگا سکتا ہے- ظاہر ہے اس طرح انفرادی بچت میں تو معمولی سا فرق پڑ سکتا ہے- لیکن قومی بچت متاثر نہیں ہوگی- جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے-

سود کے خاتمہ کی صورت میں ہمارے اندازے کے مطابق بنک میں جمع ہونے والی رقوم میں کوئی فرق نہیں پڑے گا- اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام میں آج بھی ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو بنک کے سود کو حرام سمجھتا ہے اور اس کے لین دین سے گریز کرتا ہے- کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو اپنی رقوم محض اس لیے چالو کھاتہ میں رکھواتے ہیں کہ انہیں سود لینے سے نفرت ہے غیر سودی نظام میں ایسی تمام رقوم چالو کھاتہ (Current Account) سے نکل کر کاروبار' مضاربت یا شراکت کے لیے بچت کھاتوں میں چلی جائیں گی- اور چالو کھاتہ میں کمی واقع ہو جائے گی- پھر کچھ ایسے بھی ہیں جو سرے سے بنک میں رقوم ''برائے حفاظت'' رکھوانے کے بھی روادار نہیں- ان کا نظریہ یہ ہے کہ آخر بنک بھی ہماری رقوم سے سودی کاروبار کیوں کرے فائدہ تو بنک اٹھا جائے- اور اس کاروبار میں حصہ ہمارا بھی ہو- بموجب ارشاد باری تعالیٰ-

﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ-﴾ (۲:۵) (اور کسی گناہ یا زیادتی کے کام میں مت تعاون کرو-)

وہ اس چیز سے بھی پرہیز کرتے ہیں- لہٰذا وہ اپنی رقوم کی حفاظت کا انتظام گھر پر یا دوسرے ذرائع سے کر لیتے ہیں غیر سودی نظام میں یہ تمام رقوم گھروں سے نکل کر بینکوں میں چلی جائیں گی اور چالو کھاتہ کی رسد برقرار رہے گی-

علاوہ ازیں مالدار طبقہ اپنی رقوم کا ایک حصہ گھر پر رکھتا ہے تاکہ حکومت کے عاید کردہ ٹیکسوں جنہیں اکثر لوگ ناجائز تصور کرتے ہیں' سے بچ سکے- اسلامی نظام معیشت میں ٹیکسوں کے بجائے نظام زکوٰۃ رائج ہوتا ہے- لہٰذا ان لوگوں کو ایسی رقوم گھر پر رکھنے کا چنداں فائدہ نہ ہوگا- کیونکہ زکوٰۃ ایک اہم فریضہ' مالی عبادت اور اللہ کا مسلمان پر حق ہے- جس سے ایک مسلمان کے لیے کوئی مفر نہیں ہے لہٰذا گھروں میں محفوظ ایسی تمام رقوم بھی بینکوں کے حوالے کر دی جائیں گی- اندریں حالات غالب گمان یہی ہے کہ بینکوں میں سرمایہ کی فراہمی کم ہونے کی بجائے بڑھ جائے گی-

سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی:

سود کا سب سے بڑا فائدہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے ملک کی صنعت و تجارت کو ''حیات بخش خون (سرمایہ)'' مہیا ہوتا ہے- سود کے لالچ کے بنا پر ہی بنک سرمایہ فراہم کرتے ہیں- جس سے ملکی پیداوار اور قومی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے- روزگار عام ہوتا ہے اور خوشحالی بڑھتی ہے- اگر سود کو ختم کر دیا جائے تو ملک کی اقتصادی ترقی کی رفتار رک جائے گی-

اسلام نے نفع آور اغراض کے لیے سود کے بجائے تجارت کی راہ دکھائی ہے جس کی تفصیلات ہم نے کسی دوسرے موقعہ پر پیش کر دی ہیں- اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ بنک کون کون سے طریقوں پر عمل کر کے تجارت میں خسارہ کے احتمالات سے بچ سکتا ہے- نیز یہ کہ تجارت کی صورت میں بمقابلہ سود نفع کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں- اور غیر سودی معیشت میں بھی ملکی صنعت و تجارت کو حیات بخش خون مہیا کیا جا سکتا ہے-

بلاشبہ تجارتی بنیادوں پر سرمایہ دار کی ''خدمت'' کرنے سے سودی نظام سے کہیں بہتر نتائج پیدا ہو سکتے ہیں- سرمایہ و محنت کے اشتراک عمل سے کاروباری مزاحمت کم ہوگی- لہٰذا گرانی بھی کم ہوگی- کساد بازاری کا رجحان بھی ختم ہوگا- قومی آمدنی بھی بڑھے گی فی کس آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا- تھوڑے بہت لوگوں کو...... حسب ضرورت سرمایہ دار کی طرف سے روزگار بھی میسر آئے گا- مگر غریبوں کے مسائل پوری طرح حل نہ ہو سکیں گے- گردشِ زر کا دائرہ محدود ہی رہے گا- لہٰذا مملکت پوری طرح فلاحی مملکت نہ بن سکے گی- وجہ یہ ہے کہ ہم نے سرمایہ کاری کے لیے وہی راہ اختیار کی ہے جو سرمایہ داری نظام کے لیے مختص اور سرمایہ دار ہی کی خدمت پر مامور ہے-

سرمایہ کاری اور اسلام:

سرمایہ داری نظام میں سرمایہ کاری کا میدان' تاجر' زمیندار اور صنعت کار ہے- عوام کی

بچتیں انہیں حضرات کے سامنے لا کر ڈھیر کی جاتی ہیں تاکہ وہ اور بھی پھلیں پھولیں- اس کے برعکس اسلام میں سرمایہ کاری کا میدان غریب طبقہ ہے- امراء سے ان کی بچتوں کا ایک حصہ وصول کر کے ان کی خدمت کی جاتی ہے- علاوہ ازیں امراء کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی ہر وقت اس غریب طبقہ کا خیال رکھیں- اب ہم یہ دیکھیں گے کہ غریب طبقہ کی خدمت سے سرمایہ کاری کیونکر ہوتی ہے- اور وہ قومی معیشت پر کیسا خوشگوار اثر ڈالتی ہے؟

قومی معیشت میں صدقات وخیرات کی اہمیت:

فرض کیجئے کہ کسی مخصوص معاسرہ میں بچت کا میلان ۳/ ۱ ہے- بالفاظ دیگر ایک عام آدمی کی ماہوار آمدنی ۳۰۰ روپے ہے جس میں سے وہ/ ۲۰۰ روپے اشیائے ضرورت پر صرف کر دیتا ہے- اور/ ۱۰۰ روپے ماہوار بچاتا ہے- علم معاشیات کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ ایک شخص کا خرچ دوسرے کی آمدنی ہوتی یعنی جس شخص نے/ ۳۰۰ روپے کمائے ہیں تو یہ دوسرے لوگوں کا خرچ ہے- اور یہ جو/ ۲۰۰ روپے اپنی اشیائے ضرورت پر خرچ کرے گا- تو یہ دوسروں کی آمدنی ہے- مثلاً زید بازار میں جا کر/ ۱۰ روپے کا گوشت خریدتا ہے ۲۰ روپے کا کپڑا' ۵ روپے کی ڈاکٹر سے دوائی لاتا ہے اور ۵ روپے میں حجامت بنواتا ہے- تو زید کا یہ چالیس روپے کا خرچ فی الحقیقت قصاب' کپڑا فروش ڈاکٹر اور حجام کی آمدنی ہے- اب دیکھئے ایک شخص نے ایک ہزار روپیہ تنخواہ پائی تو یہ آدمی اس مخصوص میلان بچت کے تحت ۶۶۶ روپے تو خرچ کر دے گا اور ۳۳۳ روپے بچائے گا- اس کا/ ۶۶۶ روپے کا خرچ دوسروں کی آمدنی ہے- اب یہ دوسرے لوگ بھی/ ۶۶۶ روپے دبا کر نہیں بیٹھ جائیں گے- بلکہ اس میں سے/ ۴۴۴ روپے خرچ کر دیں گے جو دوسروں کی آمدنی ہوگی- اس طرح قومی آمدنی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا- یہاں تک کہ یہ ایک ہزار روپیہ کا خرچ کئی مراحل[1] کے بعد قومی آمدنی میں تین ہزار روپے کا اضافہ کا سبب بنے گا- اور یہ خرچ یا قومی آمدنی میں اضافہ بالآخر ان لوگوں کی جیب میں چلا جائے گا- جو اشیائے صرف پیدا کرتے ہیں-

اب اگر معاشرہ اپنی بچت ۳/ ۱ میں سے آدھا زکوٰۃ کے ذریعے غرباء میں تقسیم کر دے یعنی میلانِ صرف ۶/ ۵ ہو جائے اور میلان بچت ۶/ ۱ رہ جائے تو اتنے ہی مراحل گزرنے کے بعد قومی آمدنی میں/ ۶۰۰۰ روپے کا اضافہ ہو جائے گا- اسی طرح اگر میلان صرف بڑھ کر ۱۰/ ۹ ہو

[1] قومی آمدنی میں اضافہ بہ رفتار علم معاشیات میں اصول مضارب (Principle of Multipiler) سے واضح کی جاتی ہے-

جائے۔ اور میلان بچت اور بھی کم یعنی ۱۰/۱ رہ جائے۔ تو اتنے ہی مراحل گزرنے کے بعد قومی آمدنی میں ۱۰ روپے کا اضافہ ہوگا۔ یہ اضافہ سب اشیائے صرف پیدا کرنے والے یعنی امیر طبقہ کی طرف واپس لوٹ جائے گا۔ ان مراحل کو نقشہ کے ذریعہ یوں واضح کیا جاسکتا ہے۔

	میلان بچت ۳/۱ کے بعد صرف دولت یا قومی آمدنی میں اضافہ	میلان بچت ۶/۱ کے بعد صرف دولت یا قومی آمدنی میں اضافہ	میلان بچت ۱۰/۱ کے بعد صرف دولت یا قومی آمدنی میں اضافہ
پہلا مرحلہ	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰
دوسرا مرحلہ	۶۶۶	۸۳۳	۹۰۰
تیسرا مرحلہ	۴۴۴	۶۹۴	۸۱۰
چوتھا مرحلہ	۲۹۶	۵۷۸	۷۲۹
پانچواں مرحلہ	۱۹۷	۴۸۱	۶۵۷
	-----	-----	-----
	-----	-----	-----
آخری مرحلہ	۳۰۰۰	۶۰۰۰	۱۰،۰۰۰

یہ رقم جو خرچ کے باعث قومی پیداوار میں مزید اضافہ کا سبب بنتی ہے۔ یعنی دوسری صورت سے مزید ۳۰۰۰ روپے کا اضافہ اور تیسری صورت میں مزید ۷۰۰۰ روپے کا اضافہ ہے یہ سب کچھ اشیائے صرف پیدا کرونے والے طبقہ یعنی سرمایہ دار کے پاس پہنچ جائے گا۔ اور یہ اس کا حقیقی اور ذاتی سرمایہ ہوگا۔ جس کے لیے اسے کسی بنک کے پاس قرضہ لینے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی سرمایہ دار کی رہی سہی ضرورت بنک اپنے ذاتی سرمایہ سے پوری کردیں گے۔ اور بینکوں کو بھی کارخانہ داروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے عوام سے بچتیں اکٹھا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ جس کے لیے وہ طرح طرح ہتھکنڈے استعمال کررہے ہیں۔

نقشہ بالا میں دوسرے مرحلہ پر دوسری صورت میں ۱۶۷ روپے پہلی صورت سے زائد اور تیسری صورت ۲۳۴ روپے پہلی صورت سے زائد دکھائے گئے ہیں۔ گویا اتنی رقم مزید غریب طبقہ میں سرمایہ کاری ہوئی ہے۔ اگر اتنی ہی رقم بنک کی معرفت سرمایہ کاری میں صرف ہوتی تو کبھی اتنا اضافہ پیدا نہ کرسکتی تھی۔

رہا یہ سوال کہ یہ مراحل کتنی مدت میں طے ہوتے ہیں؟ تو اس کا انحصار دو باتوں پر ہے۔

(۱) دولت کی گردش کا دائرہ کتنا وسیع ہے- اگر دولت صرف متوسط اور امیر طبقہ میں ہی گردش کرتی رہے تو یہ دائرہ بہت محدود ہوگا- کیونکہ غریب طبقہ کی تعداد زیادہ ہے اور اگر یہ گردش غریب طبقہ تک بھی پہنچ گئی- تو دائرہ گردش زر دگنے سے زیادہ وسیع ہو جائے گا-

(۲) جس طبقہ میں دولت خرچ ہو رہی ہے یا کی جارہی ہے- اس کی ضرورت کتنی شدید ہے- جتنی یہ ضرورت شدید ہوگی اتنی ہی دولت تیزی سے گردش کرے گی- اگر کسی غریب آدمی کو ایک سو روپیہ مل جائے تو عین ممکن ہے کہ وہ اسے ایک آدھ دن میں خرچ کر دے- کیونکہ اس نے اپنی ضروریات پیسہ کی کمی کی وجہ سے عرصہ سے روک رکھی تھیں اور اگر یہی ۱۰۰ روپے کی رقم امیر آدمی کو مل جائے تو عین ممکن ہے کہ یہ رقم کئی ماہ اس کے گھر پر یا بنک میں پڑی رہے- کیونکہ اس کی ضروریات پہلے سے ہی پوری ہو رہی ہیں-

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظامِ معیشت میں صدقات و خیرات کے ذریعہ دولت کی گردشت کئی گنا بڑھ جاتی ہے- اور یہی حقیقی سرمایہ کاری ہوتی ہے-

گردش دولت کی رفتار:

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر امیر طبقہ اپنا ہی ذاتی خرچ بڑھا کر بچت کم کر دیں تو کیا نظریاتی طور پر وہی نتائج برآمد ہوں گے جو اوپر بیان ہوئے ہیں؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو پھر بچت کو غریبوں میں تقسیم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے' کہ نظریاتی طور پر تو وہی نتائج پیدا ہونے چاہیں- لیکن ان مراحل کی رفتار اتنی دھیمی ہوگی جسے معاشرہ محسوس تک بھی نہ کر سکے گا- میدان صرف کی تنگی اور عدم ضرورت کی وجہ سے متوقع نتائج برآمد نہ ہو سکیں گے- یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں اسراف کو اخلاقی جرم قرار دیا ہے اور جابجا ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ کہہ کر فضول خرچی یا اپنی ذات پر ضرورت سے زائد خرچ کرنے سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے- وہاں میدانِ صرف کو تنگ رکھنے سے بھی منع فرمادیا- ارشاد باری ہے-

﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ-﴾ (۵۹:۷) (ایسا نہ ہو کہ دولت تمہارے امراء میں ہی گردش کرتی رہے-)

سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت اور اسلامی نظامِ معیشت میں گردشِ زر کی رفتار کو واضح کرنے کے لیے ایک مثال پیش کی جاتی ہے- معاشرہ کی مثال اس گہرے پانی کی سی ہے جو کسی کھلے منہ

والے برتن میں پڑا ہو- ہوا کی لہریں پانی کی اوپر کی سطح کو متحرک رکھتی ہیں-- جس کا اثر تھوڑا بہت درمیانی حصہ تک بھی پہنچ جاتا ہے- لیکن نچلا حصہ بالعموم ساکن رہتا ہے- یا بہت کم اثر قبول کرتا ہے- یہی صورتِ حال گرمی کی بھی ہے کہ وہ پانی کی اوپر کی سطح کو گرم کر دیتا ہے-- جس کا اثر درمیانی حصہ پر پہنچ جاتا ہے- لیکن گہرائی والا پانی عموماً ٹھنڈا ہی رہتا ہے یا بہت کم اثر پذیر ہوتا ہے- یہ صورت حال سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں واقع ہوتی ہے- جہاں غریب کا کوئی بھی پرسان حال نہیں ہوتا روپے کی گردش صرف اسی حد تک ہوتی ہے کہ وہ بمشکل بسر اوقات کر سکتے ہیں- یا اپنا وجود قائم رکھ سکتے ہیں-

اور اسلامی نظام معیشت کی مثال یہ ہے جیسے اس پانی کو نیچے سے آگ کے ذریعہ جوش دے دیا جائے- تو پانی نیچے سے اٹھ کر تمام پانی کو گرم اور متحرک کر دے گا- اوپر کے پانی کو نیچے آنا پڑے گا- اور نیچے کا پانی ضرور اوپر اٹھے گا- کیونکہ امراء کی دولت میں جو اسلام نے غریب کا حق مقرر کیا ہوا ہے- وہ صرف خیرات نہیں کہ امیر لوگ محض اپنی مہربانی سے کسی پر نظر کرم کر کے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جائیں اور پھر یہ بھی چاہیں کہ وہ غریب ان کے ممنونِ احسان بھی ہوں تو جس طرح جوش کھایا ہوا پانی سارے پانی کو متحرک کر دیتا ہے- اسی طرح غریب طبقہ میں سرمایہ کاری کی تخم ریزی گردش دولت کی رفتار کو کئی گنا تیز کر دیتی ہے- اور یہ تو علم معاشیات کا مسلمہ اصول ہے کہ گردش دولت کی رفتار جتنی تیز ہوگی- معاشرہ کی معیشت اسی رفتار سے مضبوط ہوتی جائے گی- لہٰذا اسلامی نظام معیشت میں سرمایہ دار کو ایسے حیات بخش خون کی ضرورت ہی نہیں رہتی-- جس کی بنیاد سودی بچتوں پر ہو-

باب: ٦

سود کی اقسام اور مختلف شکلیں

سود دراصل رقم یا اصل زر سے "کچھ زیادہ" لینے کا نام ہے اور یہ زائد رقم مقروض یا مدیون کو صرف مدت کے عوض ادا کرنا پڑتی ہے سود خور اپنی رقم ایک مقررہ شرح سے اور مقررہ مدت تک ضرورت مند کو دیتا ہے- یہ شرح سود ضرورت مند کی ضرورت کے مطابق کم و بیش کر لی جاتی ہے- مدت گزرنے پر سود خور اپنی اصل رقم مع سود مقروض سے وصول کر لیتا ہے- گویا سود خوار کا سرمایہ ضرورت مند کی بھی کچھ رقم اپنے ساتھ کھینچ لاتا ہے- اسے عام زبان میں سود مفرد کہتے ہیں- اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا-

﴿وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (۳۰:۳۹) (جو رقم تم سود پر دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں بڑھ جائے تو ایسا مال اللہ کے ہاں بالکل نہیں بڑھتا-)

اب اگر مقروض مقررہ مدت پر اصل رقم اور سود ادا نہیں کر سکا تو سود خوار اصل رقم اور سود مجموعی رقم کو اصل زر شمار کر لے گا- اور اسی طے شدہ شرح سود پر مزید مہلت دے دے گا- اسے عام زبان میں سود مرکب یا سود در سود کہتے ہیں- سود در سود کی مدت ایک سال بھی ہو سکتی ہے- چھ ماہ بھی اور تین ماہ بھی حتی کہ اگر ضرورت مند سخت مجبور ہو تو ایک ماہ بھی ہو سکتی ہے- اس طرح سود مرکب کی رقم سود مفرد سے بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے- اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا-

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً﴾ (۳:۱۳۰) (اے ایمان والو اضافہ در اضافہ والا سود نہ کھاؤ-)

سود کی تیسری قسم مِتی کاٹا یا ڈس کاؤنٹ ہے (Discount) ہے- اس میں معاملہ برعکس ہوتا ہے- اس کی مثال یوں سمجھئے کہ مثلاً (الف) نے کوئی چیز (ب) سے ایک ہزار روپے میں تین ماہ کے وعدہ پر خریدی اور اس کو تحریر لکھ کر دے دی- اب (الف) کوئی قابلِ اعتماد فرم یا شخص یا گورنمنٹ بذاتِ خود ہے-جس کی تحریر ہنڈی- تمسک یا پوسٹ ڈیٹ چیک کی صورت میں

ہے- جسے لینے سے کوئی انکار نہیں کرتا- اور (الف) کو سردست رقم کی ضرورت ہے وہ یہ دستاویز لے کر کسی بنک یا کسی شخص مثلاً (ج) کے پاس جاتا ہے تو (ج) کہتا ہے کہ میں یہ رقم دستاویز ادا کر دیتا ہوں- مگر پانچ فیصد کے حساب سے کاٹ لوں گا- اور آج ساڑھے نوسو روپے ادا کر دوں گا- تو یہ بھی خالص سود ہے اور تجارتی حلقوں میں اس قسم کا سود بھی مروج ہے-

ربا النسیئۃ:

سود کی یہ تینوں صورتیں بالعموم معروف اور مروج ہیں- ان تمام صورتوں میں زائد رقم چونکہ مدت یا مہلت کے عوض لی یا دی جاتی ہے- لہٰذا ایسے سود کو شرعی اصطلاح میں رباء النسیئۃ کہا جاتا ہے- (یعنی مدت یا ادھار کی وجہ سے سود)

ربا الفضل:

سود کی ان اقسام کے علاوہ سود کی ایک اور قسم بھی ہے جس سے صرف اسلام ہی نے متعارف کرایا ہے اور وہ ہے **رِبَا اَلْفَضْل**- ربا الفضل یہ ہے مثلاً (الف) کے پاس ناقص گندم ہے اور (ب) کے پاس اعلیٰ قسم کی- (الف) (ب) سے کہتا ہے کہ تم مجھ سے چار کلو گندم لے لو اور اس کے عوض اپنی گندم تین کلو دے دو- اور وہ دونوں آپس میں لین دین کر لیتے ہیں- ایسا لین دین نہ بظاہر سود معلوم ہوتا ہے نہ ہی اسے دنیا سود شمار کرتی ہے- لیکن اسلامی نقطہ نظر سے (ب) نے (الف) سے جو زائد ایک سیر گندم لی ہے وہ سود ہے اور (الف) اور (ب) دونوں سودی لین دین کے مجرم ہیں- اب ارشادات نبوی ﷺ ملاحظہ فرمایئے-

((عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ: قَالَ جَآءَ بِلَالٌ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ بِتَمْرٍ بَرْنِیٍّ فَقَالَ لَهُ النَّبِیُّ ﷺ مِنْ اَیْنَ هٰذَا قَالَ عِنْدَنَا تَمْرٌ رَدِیٌّ فَبِعْتُ مِنْهُ صَاعَیْنِ بِصَاعٍ- قَالَ اَوَّهْ عَیْنُ الرِّبٰوا' عَیْنُ الرِّبٰوا: لَا تَفْعَلْ وَلٰکِنْ اِذَا اَرَدْتَّ اَنْ تَشْتَرِیَ فَبِعِ التَّمْرَ بِبَیْعٍ اٰخَرَ ثُمَّ اشْتَرِبِهٖ-[1]))

(حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس برنی کھجور (عمدہ قسم کی) لائے- آپ ﷺ نے فرمایا ''کہاں سے لائے'' کہا ہمارے پاس ناکارہ کھجوریں تھیں تو میں نے ایک صاع کے بدلے دو صاع کے حساب سے بیچ دیں- آپ ﷺ نے فرمایا اوہ خالص سود خالص سود! ایسا مت کرو- ہاں جب ایسا ارادہ ہو تو

[1] بخاری- کتاب الوکالۃ- باب اذا باع الوکیل شیئا فاسدا فبیعہ مردود (۲۳۱۲)' نیز کتاب البیوع- باب بیع الخلط من التمر (۲۰۸۰)

اپنی کھجور الگ بیچو اور دوسرے سودے سے خود خریدلو- یعنی ان کو پہلے قیمتاً فروخت کرو- پھر اس رقم سے عمدہ کھجوریں خریدلو-)

دوسرا ارشاد بھی ملاحظہ فرمایئے:

((عَنْ سَعْدِ ابْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ سُئِلَ عَنْ شَرَی التَّمْرِ بِالرُّطَبِ فَقَالَ اَیَنْتَقِصُ الرُّطَبُ اِذَا یَبِسَ؟ فَقَالَ نَعَمْ فَنَهَاهُ عَنْ ذٰلِکَ-[1]))

(حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ میں نے سنا رسول اللہ ﷺ سے تازہ کھجور کے عوض خشک کھجور خریدنے کے متعلق پوچھا گیا- آپ نے فرمایا ''کیا تازہ کھجور خشک ہوکر وزن میں کم ہوجاتی ہے- حضرت سعد کہنے لگے- ہاں تو آپ ﷺ نے ایسے سودے سے منع فرمایا-)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے براہ راست تبادلہ سے کیوں منع کیا- جبکہ نتیجہ پھر بھی (یعنی جنس فروخت کرکے اس رقم سے اچھی جنس خریدنے پر بھی) اس کے لگ بھگ ہی نکلتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو اسلام اس ''لگ بھگ'' والی بات کو ختم کرنا چاہتا ہے کہ فریقین میں کسی کو تھوڑا بہت بھی نقصان نہ ہو اور دوسرے یہ کہ ایسے براہ راست لین دین میں ''زیادہ ستانی'' کی ہوس کو فروغ ہوتا ہے اور بالعموم اچھی جنس والا ہی فائدہ میں رہتا ہے- مثال کے طور پر حدیث نمبر ۱ میں اگر حضرت بلال رضی اللہ عنہ دو صاع نرم کھجور منڈی میں بیچ کر اس رقم سے برنی کھجور خریدتے تو اغلب گمان یہی ہے کہ انہیں ایک صاع سے زیادہ کھجور مل سکتی تھی-

---

[1] نسائی کتاب البیوع باب اشتراء التمر بالرطب (۴۵۵۹، ۴۵۶۰) سنن نسائی میں الفاظ یوں ہیں۔ ''سئل رسول الله ﷺ عن التمر بالرطب فقال لمن حوله اینقص الرطب اذا یبس؟ قالو انعم فنهی عنه'' دوسری روایت میں ہے ''سئل رسول الله ﷺ عن الرطب بالتمر فقال اینقص اذا یبس؟ قالو انعم فنهی عنه''

ابوداؤد کتاب البیوع والاجارات باب فی التمر بالتمر (۳۳۵۹) ابن ماجہ کتاب التجارات باب بیع الرطب بالتمر (۲۲۶۴) ترمذی بیوع باب ماجاء فی النهی عن المحاقلة والمزابنة (۱۲۲۵) عبدالرزاق (۱۴۱۸۵) ابن ابی شیبہ ۱۸۲/۶، ۲۰۴/۱۴ مسند حمیدی (۷۵) مسند ابی یعلی (۷۱۲) حاکم ۳۸/۲، ۳۹ بیہقی ۲۹۴/۵ المسند الجامع ۹۰/۶، ۹۱ (۴۰۶۷) المنتقی لابن الجارود (۶۵۷) اس حدیث کو امام ابن الجارود امام حاکم و امام ذہبی نے صحیح کہا اور امام ترمذی نے حسن صحیح قرار دیا ہے۔

ربا النسیئہ اور ربا الفضل کی مرکب شکلیں:

اب اگر ایک ہی جنس کے لین دین میں ادھار اور کمی بیشی دونوں باتوں کو جائز قرار دے لیا جائے تو لین دین کی بیسیوں شکلیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اور ان سب میں کسی نہ کسی طرح سود کا عنصر بھی شامل ہوگا۔ لہٰذا آپ ﷺ نے ایک نہایت جامع قسم کا ارشاد فرمایا۔

((اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلًا بِمِثْلٍ يَدًا بِيَدٍ فَمَنْ زَادَ أَوِ اسْتَزَادَ فَقَدْ أَرْبٰى۔ اَلْآخِذُ وَالْمُعْطِي فِيهِ سَوَاءٌ۔))[1]

(سونا سونے کے بدلے چاندی چاندی کے عوض، گندم گندم کے، جو جو کے کھجور کھجور کے بدلے اور نمک نمک کے بدلے ایک ہی جیسے (وزن میں) اور دست بدست خرید فروخت جائز ہے۔ پس جس نے زیادہ لیا یا زیادہ کا مطالبہ کیا۔ اس نے سود کھالیا۔ لینے والا اور دینے والا دونوں (گناہ میں) برابر کے شریک ہیں۔)

اس حدیث میں چھ اجناس شمار کی گئی ہیں۔ سونا، چاندی، گندم، جو، کھجور اور نمک۔ اگر ان کی برابر برابر دست بدست سودا بازی کی جائے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ بیع درست نہ ہوگی۔ اس حدیث میں مِثْلًا بِمِثْلٍ کے الفاظ ربا الفضل کے نہی کے لیے اور یَدًا بِیَدٍ کے الفاظ ربا النسیئہ کی نہی کے لیے آئے ہیں۔ اور ان میں جو چھ اجناس شمار کی گئیں ہیں۔ ان میں سے سونا چاندی تو زر مبادلہ ہیں اور باقی چار خوردنی اجناس، بخاری کی ایک دوسری روایت میں منقہ کا بھی ذکر ہے۔ کیونکہ وہاں انگور بھی بکثرت ملتا تھا۔

اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل دو باتوں کو بغور سمجھ لینا چاہیے۔

(۱) اگر جنس بدل جائے تو لین دین درست ہوگا۔ مثلاً تین کلو گندم کا تبادلہ چار کلو جو کے یا چار کلو نمک کے عوض۔ اس میں برابر کی قید ختم ہو جائے گی۔ لیکن نقد بہ نقد بحال رہے گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ۳ کلو گندم تو آج لے اور ۴ کلو جو ۳ ماہ بعد دے۔

حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔

((فَإِذَا اخْتَلَفَ هٰذِهِ الْأَصْنَافُ فَبِيعُوهُ (پھر اگر جنس مختلف ہو جائے تو جیسے چاہو

[1] صحیح مسلم کتاب المساقاۃ والمزارعۃ باب الصرف وبیع الذھب بالورق نقدا ۱۵۸۴/۸۲

كَيْفَ شِئْتُمْ اِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ۔[1])) لین دین کر لو۔ بشرطیکہ یہ تبادلہ دست بدست ہو یعنی نقد بہ نقد ہو۔)

(۲) اور اگر تین کلو گندم کی جو سے تین ماہ کے ادھار پر بیع کرنا چاہے۔ تو یہ اس صورت میں جائز ہوگی کہ بیع کے دن گندم کا نرخ دریافت کر کے قیمت لگائی جائے اور تین ماہ بعد اس کے جتنے جو مارکیٹ ریٹ کے حساب سے آتے ہوں[2]۔ اتنے ہی لیے جائیں۔

سود کے دوسرے چور دروازے:

(۱) مقروض سے ہدیہ وصول کرنا۔

حضرت عبداللہ بن سلام سے اس قسم کے سود کی تعریف سنیے۔

((اَنَّ اَبِیْ بُرْدَةَ بْنِ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَدِمْتُ الْمَدِیْنَةَ فَلَقِیْتُ عَبْدُ اللّٰهِ ابْنِ سَلَامٍ فَقَالَهُ اِنَّکَ بِاَرْضٍ فِیْهَا الرِّبٰوا فَاشٍ فَاِذَا کَانَ لَکَ عَلٰی رَجُلٍ بِحَقٍّ فَاَهْدٰی اِلَیْکَ حَمْلَ تِبْنٍ اَوْ حَمْلَ شَعِیْرٍ اَوْ حَبْلَ قَتٍّ تَاْخُذْهُ فَاِنَّهُ رِبٰوا۔[3]))

(حضرت ابی بن بردہ بن ابی موسیٰ سے روایت ہے کہ میں مدینہ آیا تو عبداللہ بن سلام سے ملا۔ انہوں نے کہا کہ تو اس سرزمین میں رہتا ہے جہاں علانیہ سود کا رواج ہے۔ سو اگر کسی شخص پر تیرا حق (قرضہ) ہو۔ اور وہ تجھے بھس کا گٹھا جو یا گھاس کا گٹھا ہدیہ دے۔ تو مت قبول کر کیونکہ وہ سود ہے۔)

((عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ اِذَا اَقْرَضَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فَلَا يَاْخُذْ هَدِيَّةً۔[4]))

(حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب کوئی شخص کسی دوسرے آدمی کو قرض دے۔ تو پھر اس سے

---

[1] ابوداؤد کتاب البیوع باب فی الصرف (۳۳۵۰) التمہید ۱۹/۱۸۰ صحیح مسلم کتاب المساقاۃ باب الصرف وبیع الذہب بالورق نقدا ۸۱/۱۵۸۷

[2] ابوداؤد۔ کتاب البیوع۔ باب النہی عنہا من البیوع۔ فصل ثانی

[3] بخاری کتاب المناقب۔ باب مناقب عبداللہ بن سلام۔ (۳۸۱۴) و کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ (۷۳۴۲) صحیح بخاری کتاب المناقب میں ابوھریرۃ سے یوں مروی ہے "اتیت المدینۃ فلقیت عبداللہ بن سلام فقال تجئی فاطعمک سویقا وتمرا وتدخل فی بیت؟ ثم قال انک بارض الربا بھا فاش اذا کان لک علی رجل حق فاھدی الیک حمل تبن او حمل شعیر او حمل قت فلا تاخذہ فانہ ربا"

[4] رواہ البخاری فی تاریخہ۔ مشکوۃ (۲۸۳۲) ان الفاظ کے ساتھ مجھے یہ روایت کسی کتاب سے نہیں ملی اسے صاحب مشکوۃ نے المنتقی کے حوالے سے تاریخ بخاری کی طرف سے منسوب کیا ہے۔

ہدیہ قبول نہ کرے۔)

ہاں اگر مقروض خواہوں کے درمیان اس قرضہ سے پہلے بھی ایک دوسرے کو ہدیہ دینے دلانے کے تعلقات موجود ہوں تو پھر مقروض سے ہدیہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

(۲) سفارش کرنے والے کو بھی ہدیہ قبول کرنا ممنوع ہے۔

((عَنْ اَبِی اَمَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ شَفَعَ لِاَحَدٍ شَفَاعَةً فَاَهْدٰی لَهٗ هَدِيَّةً عَلَيْهَا فَقَبِلَهَا فَقَدْ اَتٰی بَابًا عَظِيْمًا مِنْ اَبْوَابِ الرِّبٰوا۔[1]))

(حضرت ابو امامۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جوکوئی کسی شخص کی سفارش کرے۔ پھر وہ اس سفارش کے عوض اس سفارش کنندہ کو کوئی تحفہ بھیجے اور وہ اسے قبول کرے تو وہ سود کے دروازوں میں سے ایک بڑے دروازے میں داخل ہوگیا۔)

(۳) اگر جنس مخلوط ہو اور وہ الگ الگ کی جاسکتی ہو۔ الگ الگ کرنے کے بعد ہی فروخت کرنا چاہیے چنانچہ حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خیبر کے دن میں نے بارہ دینار میں ایک ہار خریدا۔ جس میں سونا اور نگ تھے۔ میں نے ان دونوں جنسوں کو الگ الگ کیا تو صرف سونا ہی بارہ دینار سے زیادہ رقم کا نکلا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ ایسی چیزوں کو جدا کیے بغیر نہ بیچنا چاہیے[2]۔

(۴) نقد اور ادھار کی الگ الگ قیمت ممنوع ہے:

ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

((عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِیْ بَيْعَةٍ۔[3]))

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی چیز کو دو مختلف صورتوں میں بیچنے سے منع فرمایا۔ (یعنی نقد کم قیمت پر اور ادھار زیادہ قیمت پر) کیونکہ یہ بھی سود ہے۔)

---

[1] ابوداود کتاب الاجارۃ باب فی الهدية لقضاء الحاجة (۳۵۴۱) مسند احمد ۵۸۸/۳۶ (۲۲۲۵۱) طبرانی (۷۹۲۸) اور طبرانی کے طریق سے یحیی بن حسین الشجری نے کتاب الامالی ۲۳۶/۲ میں ذکر کی ہے اس کی سند حسن ہے جیسا کہ علامہ ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ نے العلل المتناھیة کی تعلیق ۲۶۷/۲ میں لکھا ہے۔

[2] صحیح مسلم کتاب المساقاۃ باب بیع القلادة فيها خرز و ذهب (۱۵۹۱)

[3] الموطا کتاب البیوع باب النهي عن بيعتين فی بيعة ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فی النهی عن بيعتين فی بيعة (۱۲۳۱) نسائی کتاب البیوع باب بيعتين فی بيعة (۴۶۴۶) اس کی سند حسن ہے۔

((وَلِاَبِیْ دَاوٗدَ مَنْ بَاعَ بَیْعَتَیْنِ فِیْ بَیْعَةٍ فَلَهٗ اَوْکَسُهُمَا اَوِالرِّبَا-[1])) (اور ابوداؤد میں ہے جس کسی نے ایک چیز دو مختلف صورتوں میں بیچی- تو خریدار کم قیمت والی کا مستحق ہے یا پھر وہ سود ہے-)

بعض علماء کا خیال ہے- ایک بیع میں دو بیع کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جبکہ ایک ہی شخص سے یہ کہا جائے کہ نقد لو تو چار سو روپے اور چھ ماہ کے ادھار پر لو تو ساڑھے چار سو روپے- لیکن اگر ایک شخص نقد کی قیمت ہی الگ کرتا ہے اور نقد والوں کو چار سو روپے میں دیتا ہے اور ادھار کی قیمت ہی ساڑھے چار سو روپے رکھتا ہے اور ادھار والوں کو اس نرخ پر دیتا ہے- تو یہ جائز ہے کیونکہ یہ ایک ہی شخص سے دو بیع نہیں ہیں-

(۵) اقساط پر فروخت ہونے والی اشیاء:

ہم اس جواب پر مطمئن نہیں کیونکہ ہمارے ہاں اقساط پر فروخت کرنے کا عام رواج ہے- اور یہ ایک آدمی سے ایک ہی بیع ہوتی ہے- لیکن اگر کوئی شخص اپنی باقی ماندہ اقساط یک مشت ادا کر دے- تو اقساط کی نسبت سے باقی قیمت میں کمی کر دی جاتی ہے- اب سوال یہ ہے کہ اگر اس ادھار میں سود نہ تھا- تو اس میں اقساط کی نسبت سے مقررہ نرخ پر رقم مجرا کیسے مل جاتی ہے؟

ہاں اگر کسی نے ایک چیز تین ماہ کے ادھار پر خریدی- اور تین ماہ گزرنے سے پیشتر ہی رقم میسر آ گئی اور وہ رقم بائع کے حوالے کر دے اور بائع خوش ہو کر اپنی مرضی سے کچھ رقم چھوڑ دے یا واپس کر دے جو اس نے طے نہ کی تھی- تو یہ صورت جائز ہے اور اس میں کچھ قباحت نہیں-

(۶) بیع عینہ:

یہ ایسی بیع ہے جس میں حیلہ سازی کے ذریعہ سود کو بیع کی شکل دے کر اسے جائز بنانے کی کوشش کی گئی ہے- اس کی مثال یوں سمجھئے کہ مثلاً (الف) کو کچھ نقد رقم کی ضرورت پڑتی ہے- لیکن اس کے پاس رقم نہیں اور وہ براہ راست سود میں ملوث نہیں ہونا چاہتا- تو (ب) سے کوئی چیز مثلاً گھوڑا پانچ ہزار روپے میں ایک سال کے وعدہ پر خریدتا ہے- پھر ایک آدھ دن کے بعد (الف) وہی گھوڑا (ب) کے پاس چار ہزار روپے میں نقد فروخت کر دیتا ہے- اور سال بعد

---

[1] ابوداؤد کتاب الاجارة باب فیمن باع بیعتین فی بیعة (۳۴۶۱) ابن حبان (۱۱۱۰ موارد) تمہید ۳۸۹/۲۴ ابن ابی شیبة ۱۲۰/۶ المستدرک ۴۵/۲ اس حدیث کو امام حاکم اور امام ذہبی نے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے-

(الف)' (ب) کو پانچ ہزار روپے ادا کر دیتا ہے اس طرح (الف) کو فوراً چار ہزار روپے میسر آ گئے اور (ب) کو ایک سال بعد ہزار روپے منافع مل گیا- جو دراصل چار ہزار روپے کا ایک سال کا سود ہے- اور گھوڑے کی بیع کو درمیان میں لا کر اس سود کو حلال بنانے کی کوشش کی گئی ہے- یہ بیع عینہ[1] کہلاتی ہے- اور یہ خالص سود ہے اور (الف) اور (ب) دونوں گنہگار ہیں-

اسی سے ملتی جلتی وہ شکل ہے جس کے ذریعے بینکوں کے شراکتی کھاتوں کو سود سے پاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور جس کا تفصیلی بیان آگے آ رہا ہے-

چند معروف سودی لین دین

آج کل سود پوری قوم کے رگ و ریشہ میں کچھ اس طرح سرایت کر گیا ہے- جس سے ہر شخص شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر ہو رہا ہے- یہی وہ کیفیت ہے جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ

((لَيَاْتِيَنَّ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقٰى اَحَدٌ اِلَّا اٰكِلَ الرِّبٰو فَاِنْ لَمْ يَاْكُلْهُ اَصَابَهُ مِنْ بُخَارِهٖ وفي رواية مِنْ غُبَارِهٖ[2]))

(لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ ہر کوئی سود کھانے والا ہوگا- اور اگر سود نہ کھائے تو بھی اس کا بخار اور دوسری روایت میں الفاظ ہیں (اس کا غبار) اسے ضرور پہنچ کر رہیگا-)

آج ایک مسلمان اگر پوری نیک نیتی سے سود سے بچنا ہی چاہے تو اسے کئی مقامات پر الجھنیں پیش آتی ہیں- مثلاً اگر کوئی شخص گاڑی (سکوٹر) کار' ویگن' ٹرک وغیرہ خریدے گا- تو اسے لازماً اس کا بیمہ کرانا پڑے گا- اگرچہ اس قسم کے بیمہ کی رقم قلیل ہوتی ہے- اور یہ وہ بیمہ نہیں ہوتا جس میں حادثات کی شکل میں بیمہ کمپنی نقصان ادا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے- تاہم ہمارے ہاں قانون یہ ہے کہ جب تک نئی گاڑی کا بیمہ نہ کرایا جائے وہ استعمال میں نہیں لائی جاسکتی- اور اس قلیل رقم کی قسم کا بیمہ ہر سال کرانا پڑتا ہے- بیمہ کمپنی کا کاروبار کیا ہوتا ہے- اس کی تفصیل آگے

---

[1] موطا امام مالک- کتاب البیوع- باب العينة

[2] نسائی- کتاب البیوع- باب اجتناب الشبهات في الكسب- (۴۴۶۷) ابوداؤد کتاب البیوع باب في اجتناب الشبهات (۳۳۳۱) ابن ماجہ کتاب التجارات باب التغليظ في الربا (۲۲۷۸) مسند احمد ۱۶/ ۲۵۸ (۱۰۴۱۰) مسند ابی یعلی (۶۲۳۳) (۶۲۴۱) بیہقی ۵/ ۲۷۵' ۲۷۶ کتاب السنۃ للمروزی (۲۰۲) حاکم ۲/ ۱۱۱ اس کی سند ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں حسن بصری کا ابو ہریرہؓ سے سماع ثابت نہیں اور حسن بصری کثیر التدلیس بھی ہیں- جامع التحصیل (۱۶۲) للعلائی

آ رہی ہے۔

اسی طرح اپنی بچت یا زائد رقم کو کہیں محفوظ رکھنے کا معاملہ ہے۔ جس کی ضرورت تقریباً ہر شخص کو پیش آتی ہے۔ اور لامحالہ اسے بنک کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ وہ خود سود نہ بھی لے تو بھی بنک اس کے پیسہ سے سودی کاروبار کریں گے۔

تاجر پیشہ حضرات بنک سے تعلق رکھے بغیر نہ مال برآمد کر سکتے ہیں اور نہ درآمد۔ ان کے لیے آسان راہ یہی ہوتی ہے کہ وہ بنک سے ایل سی (Letter of Credit) یا اعتماد نامہ حاصل کریں۔ اس طرح تمام درآمد اور برآمد کردہ مال سودی کاروبار سے متاثر ہوگا۔ اسی طرح منڈیوں میں کاروبار کرنے والے حضرات جس طرح بنک کے ساتھ مل کر کاروبار کر رہے ہیں۔ اس کی تفصیل کسی دوسرے مقام پر دی گئی ہے۔ ایسے کاروبار میں بنک کا اپنا مفاد ہوتا ہے اور تاجر کا اپنا۔ کوئی ہی درآمد کرنے والا تاجر ہوگا۔ جو اس طرح کے سودی کاروبار سے بچا ہوا ہو۔ اندریں حالات رسول اللہ ﷺ کی یہ پیش گوئی ایک ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ رہی ہے۔ کہ اگر کوئی شخص سود کا لین دین نہ بھی کرے تو بھی اس کا غبار اسے ضرور پہنچ کر رہے گا۔

اس باب میں ہم ایسے ہی چند سودی معاملات کا ذکر کر رہے ہیں۔

۱۔ بیمہ پالیسی[۱]

موجودہ زمانہ کی لعنتوں میں ایک لعنت بیمہ ہے جو پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے بیمے کی ابتدا خالص انسانی ہمدردی کے جذبے سے شروع ہوئی تھی۔ تقریباً ۱۴۰۰ء میں اٹلی کے تاجروں میں سے ایک تاجر کا جہاز سمندر میں غرق ہو گیا اور وہ انتہائی تنگ دست ہو گیا۔ دوسرے تاجروں نے اس کے ساتھ تعاون کیا اور اس کے لیے کچھ رقم اکٹھی کر کے اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔

چونکہ ایسے حادثات کا آئندہ بھی امکان تھا لہٰذا تاجروں نے آپس میں ایک تجویز منظور کی کہ آئندہ تمام تاجر ہر ماہ یا ہر سال جیسی بھی صورت ہو ایک معین رقم ادا کر دیا کریں تاکہ اس فنڈ سے اس قسم کے حوادث وخطرات کے نقصان کا کسی حد تک تدارک کیا جا سکے۔

---

[۱] میرا یہ مضمون ماہنامہ المعارف لاہور جنوری ۱۹۷۹ء میں "بیمے کی شرعی حیثیت اور اس کا متبادل حل" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

لیکن آہستہ آہستہ امداد باہمی کا یہ ادارہ کاروباری شکل اختیار کرنے لگا اور ایسے ادارے کا نام انشورنس کمپنی (Insurence Company) تجویز ہوا۔ انشورنس "یقین دہانی" کو کہتے ہیں۔ بیمہ اسی انگریزی الفظ "انشورنس" کا ترجمہ ہے۔ گویا بیمہ کمپنی ایک ایسا ادارہ ہے۔ جو آفات و حوادث کے وقت نقصان کی تلافی کی یقین دہانی کراتا ہے۔

ابتداًء املاک (مثلاً بس' ٹرک' جہاز' عمارات) کا بیمہ شروع ہوا۔ بعد ازاں انسانی زندگی کا بھی بیمہ ہونے لگا۔ آجکل اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہو چکا ہے۔ انسان کے ایک ایک عضو کا بیمہ جانوروں کا بیمہ اور بعض ذمہ داریوں (مثلاً بچوں کی تعلیم اور شادی وغیرہ) کا بھی بیمہ کیا جاتا ہے۔

بیمے کے کاروبار کو بیشتر ممالک میں حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ اور بعض اوقات تو مجبوراً زندگی اور املاک کا بیمہ کرانا پڑتا ہے۔ ۱۹۷۳ء سے پہلے ہمارے ملک میں کمپنیاں نجی طور پر بیمے کا کاروبار کرتی تھیں۔ اور ملک کے طول و عرض میں بے شمار کمپنیاں ایسی خدمات سرانجام دیتی تھیں۔ لیکن ۱۹۷۳ء میں حکومت نے ان کو اپنی تحویل میں لے لیا اور سب کمپنیوں کو مدغم کر کے سٹیٹ لائف انشورنس کے نام سے اس کاروبار کو مزید فروغ بخشا۔ آج کل ہر سرکاری و نیم سرکاری ملازم' نیز ہر صنعتی اور تجارتی ادارے کے ملازم کا بیمہ لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس کی موت یا حادثے کی صورت میں مقررہ رقم اس کے ورثاء کو مل جاتی ہے۔ جو حکومت یا متعلقہ ادارہ ادا کرتا ہے۔

بیمے کی شرائط:

اگر ایک شخص اپنی زندگی کا بیمہ کرانا چاہتا ہے تو اس کا طریق کار یہ ہے کہ بیمہ کمپنی کا ایک ڈاکٹر اس کی صحت کا معائنہ کر کے اندازہ کرتا ہے کہ یہ شخص اتنی مدت مثلاً بیس سال تک طبعی طور پر زندہ رہنے کے قابل ہے۔ اب بیمہ کمپنی والے اور بیمہ دار کے درمیان ایک معاہدہ طے پاتا ہے۔ بیمہ دار جتنی رقم کا بیمہ کرانا چاہتا ہے' اسے سالانہ اقساط میں تقسیم کر کے بالاقساط بیمہ کمپنی کو ادا کرتا رہتا ہے۔ شرائط بالعموم یہ ہوتی ہیں۔

(۱) اگر بیمہ دار اپنی مدت مقررہ تک زندہ رہے اور اقساط ادا کرتا رہے۔ تو اس مدت کے اختتام پر اس کو اس کی تمام جمع شدہ رقم مع مقررہ شرح کے سود۔ جسے بیمہ کمپنی کی اصطلاح میں ایک معصوم سا نام "بونس" (فالتو رقم) دیا گیا ہے۔ ادا کر دی جاتی ہے۔

(۲) اگر دوران مدت بیمہ' بیمہ دار طبعی طور پر یا کسی حادثے کے نتیجے میں مر جاتا ہے تو اس کی اب تک جمع شدہ رقم مع سود کے ورثاء کو جنہیں وہ خود ہی نامزد کر چکا ہوتا ہے۔ مل جاتی ہے یہ بات

قابل ذکر ہے کہ ادائیگی اقساط کی مدت جتنی کم ہوگی یا بالفاظ دیگر بیمہ دار جتنی جلدی مرتا ہے شرح سود اسی نسبت سے زیادہ ہوتی ہے۔

(۳) اگر بیمہ دار کسی خاص مجبوری سے یا بالارادہ اقساط دینا چھوڑ دے تو پہلی ادا کردہ اقساط بحق کمپنی ضبط متصور ہوتی ہیں۔ الا یہ کہ پالیسی پھر سے شروع کر دی جائے اور غیر ادا شدہ اقساط یکمشت ادا کر دی جائیں۔

آج کل اس شق میں یہ ترمیم کی گئی ہے۔ کہ پالیسی ختم کرنے والے کو کل ادا شدہ رقم کا ۶۰ فیصد رقم واپس مل جاتی ہے۔

املاک یا بیمے کی دوسری اقسام میں بھی اس سے ملتی جلتی شرائط طے پاتی ہیں۔

بیمہ پالیسی کا اسلامی نقطہ نظر سے تجزیہ:

غور کیا جائے تو بیمہ پالیسی چند در چند شرعی جرائم ومنہیات سے ترتیب پاتی ہے جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) شرط نمبر ا اصل ادا شدہ رقم سے زائد (مقررہ شرح سے) جو رقم ملتی ہے۔ وہ سود ہے جس کی حرمت میں کسی قسم کا شک نہیں۔

(۲) شرط نمبر ۲ کے مطابق جو آدمی ایک آدھ قسط ادا کرنے کے بعد مر جاتا ہے' تو اسے اس کی ادا کردہ رقم سے کئی گنا زائد رقم مل جاتی ہے۔ جو قمار یا جوئے سے مشابہت رکھتی ہے۔ تھوڑی سے محنت پر اتفاقی طور پر بہت زیادہ رقم مل جانے کو ہی قمار کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے قمار یا جوئے کے لیے ''میسر'' کا لفظ استعمال کیا ہے جو بالکل یہی مفہوم ادا کرتا ہے۔

(۳) شرط نمبر ۲ شرعی احکام وراثت کو بھی متاثر کرتی ہے۔ کیونکہ اگر ایک شخص اپنی بیوی یا بیٹے کو اپنا وارث نامزد کرتا ہے تو کمپنی اس خاص آدمی کو رقم حوالے کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ جبکہ عام حالات میں اگر کوئی شخص ایسی غلط وصیت کر بھی جائے تو وہ قانوناً غیر مؤثر ہوتی ہے۔ غلط قسم کی وصیت بجائے خود ایک گناہ ہے۔ لیکن قرآن کے واضح احکام کے سامنے اس وصیت پر کوئی عمل پیرا نہیں ہوتا۔ نہ قانوناً ہو سکتا ہے اور نہ دوسرے وارث اسے ہونے دیتے ہیں۔ لیکن بیمہ کمپنی کی شرائط کی رو سے۔ جسے عموماً حکومت کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔ نامزد وارث دوسرے وارثوں کا حق غصب کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

(۴) ایسے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں کہ نامزد وارث بیمہ دار کو...... محض حصول زر کی خاطر کسی حیلے بہانے موت کے گھاٹ بھی اتار دیتا ہے۔ اسے یہ تو پہلے ہی یقین ہوتا ہے کہ دوسرے وارث اس رقم سے حصہ نہیں بانٹ سکتے۔ یہ ''یقین دہانی'' اسے قتل جیسے جرم کے ارتکاب کے لیے دلیر کر دیتی ہے املاک کے بیمہ دار اپنی املاک کو اپنے ہاتھوں تلف کرتے دیکھے گئے ہیں۔ ایسی ہی صورت بیمے کی دوسری شکلوں میں بھی ہے۔

(۵) بیمے کی شرط نمبر ۳ کے مطابق اگر کوئی شخص بیمہ جاری نہیں رکھ سکتا۔ اور کسی مجبوری کی بنا پر پالیسی سرنڈر (Surrender) یعنی ختم کرنے پر مجبور ہے تو اسے ادا کردہ رقم کے ۴۰ فیصد بحق بیمہ کمپنی سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ شریعت اس رقم کو ضبط کرنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتی' اور یہ تجارت کے متعلق قرآن کے حکم'' عن تراضٍ منکم'' کی صریح خلاف ورزی ہے۔

(٦) شرط نمبر ۳ کے مطابق نہ تو بیمہ دار کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنی قسطیں ادا کرے گا۔ اور نہ بیمہ کمپنی کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا وصول کرے گی اور اسے کیا کچھ ادائیگی کرنا پڑے گی۔ لہٰذا یہ ''اندھا سودا'' یا بیع غرر (دھوکے والی بیع) ہے۔ جو قطعاً ناجائز ہے۔

بیمے کے مزعومہ فوائد اور ان کا شرعی متبادل حل:

بیمہ پالیسی کے عموماً مندرجہ ذیل فوائد بیان کیے جاتے ہیں اور سماجی تحفظ کے نام سے اسے مقبول بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۱) اس صورت میں ایک شخص کی رقم آسانی سے اقساط میں جمع ہوتی رہتی ہے جو ایک طویل مدت معینہ کے بعد منافع (سود) سمیت اسے واپس مل جاتی ہے۔ گویا سرمایہ بھی محفوظ رہتا ہے اور اس میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

(۲) حوادث کی صورت میں نقصان کی تلافی ہوسکتی ہے۔

(۳) متوفی کا بڑا بیٹا اگر خودسر ہو تو وہ جائز وارثوں یعنی ماں اور اپنے چھوٹے بھائیوں کا حق غصب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جبکہ بیمہ کمپنی متوفی کی آرزو کے مطابق اس کے نامزد کردہ وارث یا وارثوں کو یہ رقم ادا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں بڑا بھائی چھوٹے بھائیوں کی تعلیم وتربیت میں دلچسپی نہیں رکھتا'' ذمہ داری'' کے بیمے کی صورت میں بیمہ کمپنی ایسی اولاد کی اعلیٰ تعلیم اور شادیوں کے اخراجات کی کفیل ہوتی ہے۔

(۴) ایک غریب آدمی کے لیے عام حالت میں کچھ رقم پس انداز کرنا یا ترکہ چھوڑنا مشکل ہوتا ہے بیمہ پالیسی کی صورت میں تھوڑی تھوڑی جمع شدہ رقم یتیموں اور بیواؤں کا سہارا بنتی اور' آڑے وقت میں ان کے کام آتی ہے۔

تھوڑا سا غور کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا تمام تر صورت احوال سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام ایک مخصوص ذہن عطا کرتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہر شخص محض اپنا ہی فائدہ سوچتا ہے اور یہ بات اسلامی معیشت کی رو سے سراسر منافی ہے جس کا پہلا سبق ہی یہ ہے کہ

((لَايُوْمِنُ اَحَدُ کُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْهِ مَایُحِبُّ لِنَفْسِهٖ۔ [۱])) (یعنی کوئی مسلمان اس وقت تک مسلمان نہیں۔ جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔)

لہٰذا اسلامی نظام معیشت میں ان مندرجہ بالا صورتوں میں سے کچھ تو پیدا ہی نہیں ہوتیں۔ کیونکہ بیت المال میں ہر وہ یقین دہانی موجود ہے۔ جو ایک بیمہ کمپنی کرا سکتی ہے۔ اور اگر کچھ ہوتی ہیں تو ان کا واضح حل موجود ہے۔

اب ہم علی الترتیب مندرجہ بالا ''فوائد'' کا جائزہ لیں گے۔

(۱) جہاں تک سرمایہ کے جمع ہونے اس کے تحفظ اور اس میں اضافے کا تعلق ہے تو یہ کاروبار یا تجارت کی صورت میں بیمہ یا بنک سے بہتر بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تو واضح بات ہے کہ تجارت میں منافع سود سے زیادہ ہوتا ہے ورنہ دنیا کا کاروبار مفقود ہو جاتا۔ اور سود پر رقوم لینے والے بنک اور بیمہ کمپنیاں بھی بالآخر کاروبار ہی کرتے ہیں۔ تو گویا ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ کاروبار سود کے بجائے تجارتی بنیادوں پر ہو۔ چاہے یہ کاروباری ادارے بنک ہوں یا بیمہ کمپنیاں یا مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں یا دوسرے نجی ادارے یعنی اصل مسئلہ ان اداروں کو سود سے پاک کرنے کا ہے نہ کہ عوام کو سودی کاروبار میں پھنسانے کا۔ یہ مسئلہ فی الحقیقت حکومت کی توجہ کا طالب ہے۔ تاہم اگر یہ ادارے چاہیں تو خود بھی اپنا کاروبار شرعی تجارت کے اصول پر چلا سکتے ہیں' اور ایسے اداروں کی نشان دہی بھی کی جا سکتی ہے۔ جو بلا سود تجارتی کاروبار کرتے' لوگوں سے ان کی بچتیں وصول کرتے اور انہیں نفع تقسیم کر دیتے ہیں۔ ایسے اداروں میں رقوم جمع کرانے سے جہاں مطلوبہ فوائد حاصل ہوتے ہیں' وہاں سود کی کسک سے انسان کو نجات مل جاتی ہے اور وہ حلال کمائی پر مطمئن بھی ہوتا ہے۔

---

[۱] بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب من الإیمان ان یحب لأخیه مایحب لنفسه (۱۳)

(۲) حوادث کے موقع پر نقصان کی تلافی:

اسلامی نظام معیشت میں ایسی صورتوں میں حسب ضرورت بیت المال کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور بیت المال کی ذمہ داری ہے کہ وہ مناسب امداد فراہم کرے۔ لیکن ہمیں اس بات کو اسلامی نظام پر معلق نہیں رکھنا چاہیے کہ کب بیت المال قائم ہو اور اس مسئلے کا متبادل حل سامنے آئے۔ موجودہ دور میں اس کا حل وہی ہے جہاں سے بیمے کی ابتدا ہوئی تھی۔ مثلاً بسوں اور ٹرکوں کے مالکان ایک ایسی انجمن بنائیں۔ جس میں وہ ماہانہ چندہ اور عطیات ادا کریں۔ اس جمع شدہ رقم کو تجارت پر لگائیں اور منافع تقسیم کرنے کی بجائے حوادث کی تلافی کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ بلکہ حسب ضرورت اصل سرمائے سے بھی رقم استعمال کی جا سکتی ہے کسی بس یا ٹرک کا ایکسیڈنٹ ہو جائے یا جانی نقصان کی وجہ سے معاوضہ ادا کرنا پڑے تو اس فنڈ سے ادا کر دیا جائے۔ اس طرح اصل سرمایہ بھی محفوظ رہے گا اور منافع کی رقم سے جو دوسرے مصیبت زدہ بھائی کی امداد اور ہمدردی پوری کی جائے گی۔ اس کا بھی بالواسطہ ہر ایک کو فائدہ ہے۔

یہ طریقہ اس لحاظ سے بہتر ہے کہ حوادث پر کنٹرول کرنے کی فکر خود اس انجمن کو ہو گی۔ وہ خود ایسی تجاویز پیش کرے گی۔ جس سے حادثات کم سے کم رونما ہوں۔ جبکہ بیمے کی صورت میں قطعاً یہ احتیاط نہیں کی جاتی۔ بلکہ بعض اوقات مالکان خود اپنی املاک تلف کرنے کا ارتکاب کرتے ہیں۔ تاکہ وہ بیمہ کمپنی سے معقول رقم وصول کر سکیں۔ رہا قانونی گرفت کا سوال تو اس سے بچنے کی راہیں ملک کے نرم قوانین اور پھر وکلاء کی موشگافیوں نے بہت حد تک ہموار کر رکھی ہیں۔

ایسی انجمنیں یا کمپنیاں جتنی زیادہ ہوں گی اتنا ہی معاشرے کی فلاح کے لیے بہتر ہو گا۔ کسی ایک مارکیٹ کے تاجر مل کر ایسی انجمن تشکیل کر سکتے ہیں۔ دکانوں کو بھی بعض دفعہ آگ لگ جاتی ہے کہیں ڈاکہ پڑ جاتا ہے۔ تو ایسی صورت میں انجمن کے فنڈ سے تلافی کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح صنعت کار' کسان اور دوسرے کاروباری طبقے پیشے اور کاروباری اشتراک کو ملحوظ رکھ کر ایسی انجمن بنا سکتے ہیں۔

ہمارے خیال میں حکومت کو خود اس طرف توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ مثلاً بس اور ٹرک مالکان کی انجمن بننے سے ٹریفک کے حوادث میں خاطر خواہ کمی واقع ہو سکتی ہے اور عوام کو ٹریفک پولیس کی رشوت اور چالان سے بھی نجات مل سکتی ہے۔ علی ہذا القیاس دوسری صورتوں میں بھی حکومت کی ذمہ داریاں بہت کم ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا حکومت کو چاہیے کہ وہ کاروباری لوگوں کو ایسی

انجمنیں بنانے کے لیے قوانین بنائے۔

(۳) متروکہ مال کی تقسیم میں گڑبڑ:

ہمارے ہاں آج کل قانون وراثت رائج ہے۔ لہٰذا اگر متوفی کوئی غلط قسم کی وصیت کرے۔ تو وہ قانوناً اور شرعاً دونوں لحاظ سے غیر مؤثر ہوگی۔ بیمہ کمپنی میں شریعت کے قانون وراثت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا اور چونکہ بیمہ کمپنی حکومت کی تحویل میں ہے۔ لہٰذا ایسی رقم جو کسی نامزد وارث نے بیمہ کمپنی سے حاصل کی ہو اسے اس سے واپس لے کر قانون کے مطابق تقسیم کرنے میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔ بلکہ یہ ایک ناممکن سی بات ہے۔

رہا بڑے بیٹے کے خودسر ہونے کا سوال' تو ایسی صورت میں شریعت میں ''وصیت'' کا انتظام موجود ہے۔ اگر ایسا خطرہ موجود ہو تو متوفی اپنی برادری کے کسی قابل اعتماد اور دیانت دار آدمی کو وصی مقرر کر سکتا ہے۔ اگر برادری میں ایسا آدمی نہ ملے تو کسی بھی معروف اور امین آدمی کو وصی مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اگر مرنے والا خود کسی وجہ سے وصی مقرر نہیں کر سکا تو حاکم وقت یا اس کے کسی بھی نائب کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ وصی مقرر کر دے۔

وصی کے باضابطہ فرائض ہیں اور وہ ان کے لیے جواب دہ ہے۔ وصی کے فرائض یہ ہیں کہ وہ ترکے کو حسب دستور شریعت تقسیم کرے۔ اور اگر وہ یہ دیکھے کہ بچے نادان چھوٹے اور بے سمجھ یا عیاش ہیں تو وہ ترکے کی رقم ان میں تقسیم نہیں کرے گا۔ بلکہ یہ متروکہ جائیداد یا تو بیت المال میں جمع کرا دے گا۔ یا خود اپنے پاس بطور امانت رکھے گا۔ اور حسب ضرورت خرچ کرتا رہے گا۔ گویا وصیت کے نظام میں ''ذمہ داریوں کے بیمے'' کا مکمل حل موجود ہے۔

''وصایا'' کے نظم پر عہد نبوی ﷺ اور دورِ صحابہ میں برابر عمل ہوتا رہا خود رسول اللہ ﷺ نے کئی بار یہ ذمہ داری قبول فرمائی۔ حضرت زبیر بن العوام اس ''بار وصایت'' کے اٹھانے میں بہت مشہور تھے۔ چنانچہ سات جلیل القدر صحابہ نے آپ کو وصی مقرر کیا تھا[1]۔

(۴) پس ماندگان کی امداد:

ایسے یتیم اور بیوہ جن کی گزر اوقات کے لیے کچھ ترکہ نہ ہو' اسلامی نظام معیشت میں ان کے اخراجات کی ذمہ داری بیت المال پر ہے۔ اور یہی ادارہ ان مشکلات کا مؤثر حل ہے۔ موجودہ

---

[1] بیمہ زندگی۔ از مفتی محمد شفیع صاحب

دور میں اس کا حل یہ ہے کہ کاروباری انجمن کی طرز پر پیشے کی سطح پر بھی ایسی انجمنیں تشکیل دی جانی چاہئیں- مثلاً مستری اپنی انجمن تشکیل دیں' باربر یا حجام اپنی' لوہار اپنی وغیرہا- یہ لوگ اپنے حلقہ انجمن کو وسیع سے وسیع تر اور محدود سے محدود تر کر سکتے ہیں- اور ایسی انجمنوں سے پس ماندگان کی وقتی امداد کے علاوہ کئی اور فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں- کیونکہ یہ باہمی تعاون اور ہمدردی کی بنا پر قائم ہوتی ہیں- مثلاً یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے روزگار کا خیال رکھنا اور ان کی شادی کا انتظام وغیرہ- اور یہ ظاہر ہے کہ اتنے فوائد بیمہ کمپنی سے کسی صورت میں میسر نہیں آ سکتے-

بیمہ کمپنی اور بیت المال کا تقابلی مطالعہ:

اب ہم ان بیمہ کمپنیوں یا سماجی تحفظ دینے والے اداروں کا بیت المال سے چند پہلوؤں میں موازنہ کریں گے-

(۱) بیمہ کمپنی صرف اس شخص کی امداد کرتی ہے- جو بیمہ دار ہو اور اس کی اقساط ادا کرتا ہو- عام لوگوں سے اس کا کچھ تعلق نہیں ہوتا- جبکہ بیت المال' ہر مصیبت زدہ اور پریشان حال کی امداد کو پہنچتا ہے خواہ اس نے عمر بھر بیت المال میں ایک پیسہ بھی جمع نہ کرایا ہو- یا وہ جمع کرانے کے قابل ہی نہ ہو-

(۲) بیمہ کمپنی کے بیمہ دار یا امیر طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں- یا پھر متوسط طبقہ کے جو کچھ بچت کر سکتے ہوں- اور وقت آنے پر یہی لوگ بیمہ کمپنی سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں- جبکہ بیت المال سے فیض یاب ہونے والا بالعموم غریب طبقہ ہوتا ہے-

(۳) بیمہ کمپنی ایک خالص سودی کاروباری ادارہ ہے- اور صرف منافع کے حصول کے لیے یہ دھندا کرتا ہے- باہمی ہمدردی اور تعاون ایک ڈھونگ ہے- وہ جمع شدہ رقوم کے سود سے کچھ حصہ بیمہ داروں کی نذر کرتا ہے- باقی سب کچھ اس کا اپنا ہوتا ہے- اس کاروبار میں اس کا اپنا منافع کتنا ہوتا ہے- اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ۱۹۷۹ء میں امریکہ کی بیمہ کمپنیوں کو اپنے بیمہ داروں سے ۹۸ ارب ڈالر کی رقم وصول ہوئی اور اس رقم میں سے صرف ۴ ارب ڈالر اپنے بیمہ داروں کو ادا کیے[1]- اس طرح اربوں ڈالر کی رقم اپنے پاس جمع کر لی-

گویا بیمہ کمپنی کا کاروبار بنک کے کاروبار سے بھی زیادہ منفعت بخش ہے- اور معیشت پر اس کے بعینہ وہی اثرات مرتب ہوتے ہیں- جو سود سے ہوتے ہیں- یعنی عوام کی دولت سے فائدہ

[1] روزنامہ جنگ 10/5/1979 بحوالہ جدید اقتصادی نظریات ص ۴۶- از منور حسین چیمہ

صرف امیر طبقہ ہی اٹھاتا ہے- بالفاظ دیگر گردش دولت کا رخ غریب سے امیر کی طرف ہوتا ہے-

جبکہ بیت المال کوئی کاروباری ادارہ نہیں- وہ صرف حاجتمندوں کی حاجت روائی کے لیے قائم کیا جاتا ہے- جس میں گردش دولت کا رخ امیر سے غریب کی طرف ہوتا ہے- یعنی اغنیاء سے زکوٰۃ صدقات لیے جاتے ہیں اور مفلس نادار اور حاجت مندوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں-

(۴) بیمہ کے نظام کو تعاون و تکافل کا نظام کہنا دراصل حقائق سے چشم پوشی ہے- بیمہ کمپنی ہر بیمہ دار سے علیحدہ علیحدہ دوطرفہ معاہدہ کرتی ہے- اور کوئی بھی بیمہ دار دوسرے بیمہ دار سے کسی اخلاقی یا قانونی رشتے میں وابستہ نہیں ہوتا- اور نہ ہی کسی طرح نقصان کی تلافی کا پابند ہوتا ہے- نقصان کی تلافی یا بیمہ کی رقم دینے کی پابند صرف بیمہ کمپنی ہوتی ہے- بیمہ کمپنی کے تکافل و تعاون کے دعوے کے باطل ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ بیمہ کمپنی کے مالکوں تک کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ انہوں نے بیمہ پالیسی خود بھی خریدی ہو- یا جن خوبیوں کا وہ دن رات پراپیگنڈہ کرتے ہیں اس پر نہ وہ خود ایمان لاتے ہیں اور نہ اس پر عمل پیرا ہونا پسند کرتے ہیں-

اس کے برعکس اسلامی معاشرہ کے تعاون و تکافل کی صورت حال یہ ہے کہ اگر ایک شخص کو کوئی تکلیف پہنچے تو دوسرا فوراً اس کی مدد کو اٹھ کھڑا ہوتا ہے- اور بیت المال کی طرف رجوع تو آخری چارہ کار کی صورت میں ہوتا ہے-

۲- پراویڈنٹ فنڈ

اسی طرح کا ایک مسئلہ سرکاری ملازمین' نیم سرکاری اور بعض تجارتی اداروں کے ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ کا ہے- جس میں کچھ رقم تو ملازموں کی اپنی تنخواہ سے ماہوار وضع ہوتی اور جمع ہوتی رہتی ہے- ساتھ ہی سود در سود کے حساب سے اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے- اب اس سود کی رقم کا کیا کیا جائے- یہ مسئلہ خاصی الجھن کا سبب[1] بنا ہوا ہے- بعض لوگوں نے چند ایک

---

[1] عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ پراویڈنٹ کا مسئلہ اضطراری ہے اور ملازم پراویڈنٹ کے سلسلہ میں مجبور ہے اور یہ حکومت یا اداروں کا یکطرفہ فیصلہ ہوتا ہے- حالانکہ یہ بات محض لاعلمی کی بنا پر کہی جاتی ہے- اگر کوئی سود نہ لینا چاہے تو اسے کوئی مجبور نہیں کرتا- علاوہ ازیں پراویڈنٹ فنڈ کے معاہدہ فارم کی پشت پر جو شرائط لکھی ہوئی ہیں ان میں شق نمبر ۱۶ میں یہ بات وضاحت سے درج ہے کہ جو شخص سود نہ لینا چاہے اسے کوئی مجبوری نہیں- اصل معاملہ یہ ہے کہ انسان فطرتاً حریص واقع ہوا ہے جو مال اس راہ سے آتا ہے اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا- اب جو لوگ کچھ دیندار قسم کے ہیں وہ سودی پیسہ کو حرام بھی سمجھتے ہیں لیکن اس کا مصرف کیا ہو- یہی بات الجھن کا سبب بن جاتی ہے-

مصلحتوں کے پیش نظر اس کو لے لینا جائز قرار دیا ہے۔بشرطیکہ اسے خود استعمال نہ کیا جائے۔ بلکہ

(ا) غریبوں اور یتیموں میں تقسیم کر دیا جائے۔

(ب) اگر کبھی بنک سے قرضہ لینے کی ضرورت پڑے تو اس سود کی جگہ یہ رقم ادا کر دی جائے۔

(ج) گورنمنٹ جو ناجائز ٹیکس عائد کرتی ہے۔ایسی مدارت میں یہ سود کی رقم صرف کر دی جائے۔

مگر جب ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ ساری مصلحتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا اس گندگی سے بہر صورت پرہیز لازم ہے۔ پہلی صورت بظاہر بڑی مستحسن نظر آتی ہے۔مگر خدا کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو۔

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ۔﴾ (۲/۲۶۷)

(اے ایمان والو! اپنی پاکیزہ کمائی سے خرچ کرو۔ اور ہم نے تمہارے لیے جو کچھ زمین سے نکالا ہے۔ اس میں سے ناپاک چیز خرچ کرنے کا قصد مت کرو۔)

یہاں انفاق فی سبیل اللہ میں پاک کمائی صرف کرنے کی تاکید کی جارہی ہے اور ناپاک کمائی سے منع کیا جارہا ہے اور ظاہر ہے کہ سود کبھی پاک نہیں ہو سکتا۔

دوسری اور تیسری صورت اس سے بھی قبیح تر ہے۔ کہ انسان سود لے بھی اور دے بھی۔ صرف اپنی ذات پر خرچ نہ کرے۔ تو ایک مسلمان کے لیے یہ جسارت بہت ہی خطرناک ہے جو بالآخر اسے مکمل سود کی لپیٹ میں لے آئے۔ نعمان بن بشیر کی مشہور حدیث جو صحیح بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہے اس کے الفاظ ہیں۔ **من وقع فی الشبهات وقع فی الحرام** جو شبہ والی چیزوں میں پڑا وہ بالآخر حرام ہی میں جاپڑا) کا ان لوگوں کے پاس کیا جواب ہے؟

لہٰذا ایک مسلمان کے لیے محفوظ ترین راستہ یہی ہے کہ مصلحت کوشیوں کو خدا کے سپرد کرے اور بہر حال اپنے آپ کو اس نجاست سے محفوظ رکھے۔

۳۔ بنک کے چالو کھاتے اور شراکتی کھاتے

ضیاء الحق مرحوم نے بینکوں سے سود کے خاتمہ کا اعلان کیا اس سے پیشتر بینکوں میں تین

(بقیہ پچھلا صفحہ) علاوہ ازیں اب تو یہ مسئلہ علماء کے زیر بحث نہ آنا چاہیے کیونکہ ضیاء الحق مرحوم نے اس کے متبادل حل کو قانونی شکل دے دی ہے کہ جو شخص اپنے جی پی فنڈ سے سود نہیں لے گا اسے حکومت کی طرف سے کسی بھی وقت ۸۰ فیصد (پیشگی) قرضہ مل سکتا ہے اور یہ رقم بھی بلا سود ہی ہو گی۔

طرح کے حسابات یا کھاتے ہوتے تھے۔

(۱) کرنٹ اکاؤنٹ یا چالو کھاتے۔ ان کھاتوں میں وہ لوگ اپنا حساب کھلواتے ہیں جو کسی قیمت پر سود لینا گوارا نہیں کرتے اور محض اپنی رقم کی حفاظت کی خاطر اپنی رقم بنک میں رکھتے ہیں۔

(۲) سیونگ اکاؤنٹ یا بچت کھاتے۔ ایسے کھاتے عموماً تھوڑی تھوڑی رقوم جمع کروانے والوں کے مختص ہیں۔ ان کی جمع شدہ رقم پر انہیں سود ملتا ہے۔ لیکن شرح سود نسبتاً کم ہوتی ہے۔ ایسے کھاتوں سے ایک مقررہ حد کے اندر اندر ہفتہ میں دو بار حسب ضرورت رقم نکلوائی جاسکتی ہے۔

(۳) فکسڈ ڈیپازٹ۔ ایسے کھاتوں میں بڑی رقوم ایک معینہ مدت مثلاً تین چار یا پانچ سات سال تک جمع کرائی جاتی ہیں۔ اس پر شرح سود سیونگ سے کافی زیادہ مل جاتی ہے اور عام حالات میں مقررہ مدت سے پہلے رقم نہیں نکلوائی جاسکتی۔

ضیاء الحق کے دور میں ۱۹۸۰ء میں شراکتی کھاتے (Profit & Loss Shaers) (یعنی نفع ونقصان پر حصہ داری) کھاتے کھولے گئے۔ جنہیں مختصر کر کے P-L-S کہا جاتا ہے۔ اور اعلان کیا گیا ہے کہ بتدریج سیونگ اور فکسڈ کھاتے ختم کر دیئے جائیں گے اور چالو کھاتہ بحال رہنے دیا گیا۔

سود سے پرہیز کرنے والے حضرات پہلے بھی چالو کھاتے میں حساب رکھتے تھے۔ اور اس سکیم کے بعد بھی اسی میں رکھتے ہیں۔ وہ شراکتی کھاتہ میں حساب کیوں نہیں رکھتے اس کا جواب شراکتی کھاتے کی تفصیلی بحث میں آرہا ہے۔

چالو کھاتے کے سلسلہ میں فریق مخالف' جو بنک کے سود کی حرمت کے سلسلہ میں نرم گوشہ رکھتا ہے' کا ایک اعتراض موجود ہے جو یہ ہے کہ اگر سود بنک کے پاس موجود چھوڑ دیا جائے تو بنک اس رقم سے مزید سودی کاروبار کرے گا۔ خدا تعالیٰ کے اس ارشاد مبارک کی خلاف ورزی ہے۔[1]

---

[1] یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس مجبوری کا کوئی حل ہے بھی۔ بعض علماء نے ایسی صورت حال میں پہلی شق ہی کو ترجیح دی ہے۔ یعنی ایسا مال غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے ان کی دلیل یہ ہے کہ ہاتھ کی تبدیلی سے احکام شریعت بدل جاتے ہیں۔ میرے پاس جو سود کی رقم ہے۔ میں اسے صدقہ کر دوں تو صدقہ دینے والے کے لیے وہ سود تصور نہ ہوگا۔ وہ اسے ہر جائز مصرف میں لاسکتا ہے لیکن ہم اس مصلحت کے قائل نہیں۔ ہم اپنی ذات کی حد تک ذمہ دار ہیں۔ اور نہ ہی ہمارا یہ مقصد ہوتا ہے کہ ہم بنک میں رقم اس لیے جمع کرائیں کہ بنک اس سے سود کمائے۔ ہمارا مقصد صرف رقم کی حفاظت تھا وہ پورا ہو جاتا ہے۔

﴿وَلاَ تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ-﴾ (۳۹:۴۰) (گناہ اور زیادتی والے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون مت کرو-)

بینکوں کے شراکتی کھاتے

اس سلسلہ میں ایک تفصیلی مضمون ماہنامہ ''محدث'' جولائی ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا تھا جو ایک سوال کے جواب میں تھا افادیت کے پیش نظر اس سے بعینہٖ یہاں درج کیا جا رہا ہے-

عبدالغفار صاحب' لیاقت کالونی حیدر آباد (سندھ) سے لکھتے ہیں-

'' کچھ عرصہ پہلے ہمارے ملک میں سودی نظام بینکوں میں رائج تھا- اس سودی نظام کو تبدیل کیا گیا- اور اس نظام کی جگہ بلا سودی نظام یعنی نفع و نقصان کے شراکتی کھاتہ نے لے لی ہے- اب آپ اس بات کی وضاحت کر دیں کے اس سودی اور بلا سودی بنکاری میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ یا نفع ونقصان شراکتی کھاتہ بھی سود کی ایک شکل ہے یا یہ ایک سود سے پاک نظام ہے؟ اس بات کی وضاحت قرآن وحدیث کی روشنی میں کیجئے مہربانی ہوگی- والسلام''-

جواب: اس سوال کے جواب میں ہم چند حقائق بیان کر دیتے ہیں جس سے ہر شخص ازخود یہ نتیجہ نکال سکے گا کہ بینکوں سے سود ختم ہوا یا ابھی صرف اس نے ایک نیا بھیس ہی بدلا ہے؟ اس سلسلہ میں صدر مملکت کے اعلان کے نتیجہ میں-

(۱) یکم جنوری ۱۹۸۱ء کو بینکوں میں شراکتی کھاتے (PLS) کھولے گئے اور بتایا گیا کہ ان کھاتوں میں نفع ونقصان میں شراکت کی بنیاد پر سرمایہ کاری کی جائے گی- تاہم ہر شخص اس معاملہ میں آزاد تھا کہ وہ اپنا حساب بچت کھاتوں (Saving Account) میں کھولے یا میعادی کھاتوں (Fixed Deposits) یا شراکتی کھاتوں میں- گویا بینکوں میں بیک وقت سودی کاروبار بھی جاری تھا اور شراکتی بھی-

(۲) پھر چار سال بعد یکم جنوری ۱۹۸۵ء کو تمام بینکوں کے لیے لازم قرار دیا گیا تھا کہ وہ فیڈرل حکومت صوبائی حکومتوں قومیائے ہوئے یا سرکاری تجارتی اداروں کو تمام سرمایہ صرف انہی بنیادوں پر مہیا کرے گی- جو سٹیٹ بنک نے سود کے متبادل راستہ کے طور پر منظور کی ہیں-

(۳) یکم اپریل ۱۹۸۵ء کو یہ شرائط تمام غیر سرکاری یا نجی تجارتی اداروں اور عام افراد کے لیے بھی لازم قرار دی گئیں۔

(۴) یکم جولائی ۱۹۸۵ء کو یہ اعلان کیا گیا کہ بنک کوئی بھی امانت یعنی خواہ بچت کھاتوں سے تعلق رکھتی ہو یا میعادی کھاتوں سے' سود کی شرائط پر نہیں رکھ سکیں گے۔ اس طرح گویا ہر نئے کھاتے کھولنے والے کے اس اختیار کو ختم کر دیا گیا کہ وہ چاہے تو سودی کھاتوں میں حساب رکھے اور چاہے تو شراکتی کھاتوں میں۔ اس طرح گویا بینکوں کو سود سے پاک کر دیا گیا۔

پھر بینکوں کی طرف سے کچھ ایسے اقدامات بھی کیے گئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سود کو فی الواقع "بنک بدر" کر دیا گیا ہے۔ مثلاً

(ا) بینکوں کے کاغذات میں باقاعدہ اشیاء کی خرید و فروخت کے اندراج کا اہتمام کیا گیا۔

(ب) بنک پہلے ایک مقررہ شرح پر رقوم لوگوں سے لیتے تھے۔ مگر اب چھ ماہ بعد باقاعدہ شرح منافع کا اعلان کیا جاتا ہے۔

(ج) بینکوں کی یہ شرح منافع بھی الگ الگ ہوتی ہے۔ مثلاً اگر حبیب بنک $8\frac{3}{4}$ فیصد شرح منافع کا اعلان کرتا ہے تو کوئی دوسرا بنک $8\frac{1}{4}$ فیصد کا اعلان کرتا ہے۔

ان تمام اقدامات اور اعلانات سے ایک عام شخص یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہے کہ بنک میں کاروبار نہیں رہا۔ مگر ہمیں افسوس ہے کہ ابھی یہ منزل بہت دور ہے۔ آج کے دور میں بنک فی الواقع ایک مفید ادارہ ہے۔ جو بعض ایسے مفید کام بھی کرتا ہے جن میں سود کا شائبہ تک نہیں بلکہ وہ یہ کام معمولی کمیشن یا فیس کی بنیاد پر کرتا ہے۔ مثلاً ترسیل زر' خواہ وہ بنک ڈرافٹ کی شکل میں ہو یا ٹیلیگراف ٹرانسفر کی شکل میں یا میل ٹرانسفر کی شکل میں۔ یا مسافر چیک یا امانتوں کے لیے لاکرز (Lockers) کا اہتمام وغیرہ وغیرہ۔ مگر بینکوں کا اصل کام سرمایہ کاری ہے اور ہر بنک کا نصف سے زیادہ سرمایہ اسی کام میں لگا رہتا ہے۔ کیونکہ یہی کام زیادہ منافع بخش ہوتا ہے بنک ایک طرف سے کم شرح سود مثلاً ۸ فیصد لوگوں سے بچتیں وصول کرتے اور دوسری طرف زیادہ شرح سود مثلاً ۱۴ فیصد پر صنعت کاروں' تاجروں اور زمینداروں وغیرہ کو سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ اور اس طرح ۶ فیصد سود گویا اپنے محنتانہ کے طور پر وصول کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں بینکوں کو چالو کھاتوں کی رقوم سے بھی معقول منافع ہو جاتا ہے۔ جبکہ ایسے کھاتہ داروں کو وہ کچھ ادا نہیں کرتے۔ بلکہ اگر چالو کھاتے میں رقم /۲۰۰ سے کم ہو تو /۱۰ روپے ششماہی محنتانہ کے طور پر وصول کرتے ہیں۔

لیکن اسلام نے سود کے بجائے تجارت کی راہ دکھائی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔) (۲:۲۷۵)

اب تجارت کی عام شکلیں یہ ہیں۔

(۱) ایک شخص مثلاً زید اپنے ہی پیسے سے اپنا کاروبار چلاتا ہے اس صورت میں سرمایہ لینے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔

(۲) زید کاروبار کرنا جانتا ہے۔لیکن اس کے پاس سرمایہ نہیں۔سرمایہ کوئی دوسرا فریق لگاتا ہے۔ جسے شرعی اصطلاح میں ''رب المال'' کہتے ہیں۔اس طرح کا کاروبار ''مضاربت'' یا ''مقارضت'' کہلاتا ہے اور زید کی حیثیت ''مضارب'' کی ہے۔اسے ''مدیون'' یا ''اجیر'' بھی کہہ سکتے ہیں۔

(۳) زید اپنا کاروبار کررہا ہے۔لیکن اسے اس کاروبار میں اپنے سرمایہ کے علاوہ مزید سرمایہ بھی درکار ہے لہٰذا وہ مزید سرمایہ کسی دوسرے فریق سے حاصل کرتا ہے یا اسے بھی ساتھ ملا لیتا ہے' اور وہ مل کر کاروبار کرتے ہیں۔یہ صورت ''شراکت'' یا ''مشارکت'' کہلاتی ہے۔اور ان میں سے ہر کوئی ''شریک'' کہلاتا ہے۔گویا تجارت کی دوسری اور تیسری شکل یعنی مضاربت یا مشارکت کی صورت میں سرمایہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔جس کے لیے بسا اوقات بینکوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اب ہم یہ دیکھیں گے کہ ہمارے مرکزی بنک یا سٹیٹ بنک آف پاکستان نے سود کے متبادل راستہ یعنی مضاربت اور شراکت کے لیے وہ کونسی بنیادیں فراہم کی ہیں۔جن کے مطابق بنک حکومت اور دوسرے تجارتی اداروں کو سرمایہ فراہم کررہے ہیں۔

شرح سود اور مارک اپ:

مرکزی بنک نے شرح سود کے بجائے سب سے بڑی بنیاد جو فراہم کی ہے وہ ''مارک اپ'' (Mark Up) کی اصطلاح ہے۔شرح سود اور ''مارک اپ'' کا تقابلی جائزہ یہ ہے کہ

(ا) شرح سود تو بنک مقرر کرتا ہے۔لیکن ''مارک اپ'' مضارب اور رب المال یا زید اور بنک کے باہمی سمجھوتے سے طے پاتی ہے۔

(ب) شرح سود فیصد سالانہ ہوتی ہے' جبکہ ''مارک اپ'' فی ہزار یومیہ کے حساب سے طے کی جاتی ہے۔مثلاً آج کل بنک اپنے پرانے قرض داروں سے ۱۶ فیصد یا ۱۵ فیصد کے حساب سے سود

وصول نہیں کرتے بلکہ ۴۳ پیسے فی یوم فی ہزار کے حساب سے ''مارک اپ'' یا منافع وصول کر رہے ہیں۔ اور یہ ۱۵ فیصد شرح سود بنتی ہے۔

(ج) شرح سود ہو یا مارک اپ دونوں ابتدا ہی میں طے کر لی جاتی ہیں۔

اب دیکھئے سود اور اسلامی نظریہ تجارت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ

(۱) مضاربت کی صورت میں اگر نقصان ہو جائے تو نقصان سرمایہ دار یا رب المال پر پڑتا ہے اور مضارب کی محنت ضائع ہو جاتی ہے۔ گویا اسلام سرمایہ کی بالادستی کو تسلیم نہیں کرتا۔ کہ نقصان کی صورت میں مضارب بھی نقصان میں شریک ہو۔ اس کے لیے اتنا ہی نقصان کافی ہے کہ اس کی محنت ضائع ہو گئی۔

(۲) شراکت کی شکل میں اگر نقصان ہو جائے تو جو نسبت آپس میں منافع کی طے پائی تھی۔ اسی نسبت سے فریقین نقصان میں بھی شریک ہوں گے۔

اب ہم چند مثالوں سے یہ بات واضح کریں گے کہ آیا مرکزی بنک کی فراہم کی ہوئی بنیادیں اسلامی نظریہ تجارت کے تقاضے پورے کرتی ہیں یا یہ سود ہی کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔

مضاربت:

فرض کیجئے کہ زید کو کپڑے کی تجارت کے لیے بیس ہزار روپے چھ ماہ کے لیے درکار ہیں۔ اور وہ اس غرض کے لیے اپنے بنکر کے پاس جاتا ہے اب بنکر اور زید کے درمیان اس کاروبار اور اس کے متوقع منافع پر تبادلہ خیال ہوتا ہے۔ اور ان کا اندازہ یہ ہے کہ اس سے بیس فیصد منافع ہوگا اور منافع ۲:۳ کی نسبت سے طے پاتا ہے یعنی زید مضارب کو ۲/۵ منافع ہوگا اور بنک یا رب المال کو ۳/۵۔ اس طرح بیس ہزار پر ۵ ہزار روپے منافع میں سے ۲ ہزار زید کے اور ۳ ہزار بنک کے ہوں گے (یہ بات یاد رکھئے کہ بنک کو اگر مقرر شرح سود سے کم منافع نظر آتا ہو تو وہ ایسا معاہدہ ہرگز نہیں کرے گا) اب اس منافع کو 'مارک اپ'' کی شکل میں ڈھالا جائے گا۔ جو تقریباً وہی ۴۳ پیسے فی دن فی ہزار بنتی ہے۔ جب یہ سمجھوتہ طے پا جائے گا۔ تو بنک زید سے ۲۰ ہزار روپے کا مال خریدے گا۔ جو زید خود پہلے بازار سے خریدے گا۔ پھر بنک کے ہاتھ فروخت کرے گا۔ پھر اسی وقت یا اس سے ایک آدھ دن بعد وہ مال بنک مقررہ مدت تک کے لیے' مارک اپ ساتھ شامل کر کے (یعنی بمعہ منافع) زید یا مضارب کے ہاتھ فروخت کر دے گا۔ بعد ازاں زید مقررہ مدت کے

لیے اندر بالاقساط اصل بمعہ مارک اپ کے بنک کو واپس ادا کر دے گا۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر زید مقررہ مدت کے اندر اندر اصل بمعہ مارک اپ ادا نہ کرے یا نہ کر سکے تو پھر کیا صورت ہوگی؟ ایسی صورت حال سے نپٹنے کے لیے بنک مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کرتا ہے۔

(۱) بنک صرف اس شخص کو قرضہ دینا منظور کرتا ہے۔ جس کی اس بنک سے پہلے سے ڈیلنگ ہو اور وہ اس کی نظر میں قابل اعتماد ہو۔

(۲) ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ زید ہے تو فی الواقع قابل اعتماد، مگر کسی اتفاقی حادثہ کی وجہ سے وہ بروقت رقم بنک کو ادا نہیں کر سکا۔ تو اس کا حل مرکزی بنک نے یہ سوچا ہے کہ وہ ۲۱۰ دن کا زائد مارک اپ بھی قیمت میں شامل کر دیتا ہے۔ اب اگر زید مقررہ معیاد کے اندر اصل زر بمعہ منافع واپس کر دیتا ہے تو یہ ۲۱۰ دن (سات ماہ) کا مارک اپ رعایت کے نام پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اگر زید چھ ماہ کے بجائے ۸ ماہ میں کل رقم ادا کر پاتا ہے تو اس کو پانچ ماہ یا ۱۵۰ دن کا مارک اپ بطور رعایت چھوڑا جائے گا۔ اس طرح کاغذی اور قانونی کاروائی بھی پوری کر دی جاتی ہے اور بنک ایسے خطرے سے بھی محفوظ رہتا ہے۔

(۳) اور آخری صورت یہ ہے کہ زید ان مزید ۲۱۰ دنوں تک بھی کل رقم ادا نہیں کر سکا اور ایسی صورت شاذ ہی ہو سکتی ہے۔ تو اندریں صورت بنک مزید مارک اپ لگانے کا مجاز نہیں ہوگا۔ بالفاظ دیگر سود اب لامتناہی عرصہ کے لیے بڑھتا نہیں چلا جائے گا۔ اب بقایا رقم جو زید کے ذمہ رہ گئی ہے بنک اس کے لیے زید کو مزید مدت بلا سود کی اجازت بھی دے سکتا ہے۔ چاہے تو اس معاملہ کو بنک ٹربیونل میں بھی لے جا سکتا ہے۔ اور چاہے تو اسے ڈوبا ہوا قرضہ قرار دے کر بنک کے منافع سے بطور نقصان بھی وضع کر سکتا ہے۔ لیکن کسی اتفاقی حادثہ کی بنا پر کسی قابلِ اعتماد انسان کا بقایا قرضہ معاف کر دینا غالباً بنک کے کسی قانون میں نہیں ہے۔

مارک ڈاؤن:

سود کو ''بنک بدر'' کرنے کے لیے جس طرح مرکزی بنک نے ''مارک اپ'' کی اصطلاح ایجاد کی ہے اسی طرح متی کاٹا یا (Discount) کی جگہ ''مارک ڈاؤن'' (Mark Down) کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ جس کی ضرورت ''تجارتی ہنڈیوں یا پرامیسری نوٹ یا

دیگر سرکاری وثائق کی صورت میں پیش آتی ہے۔ یہ تجارتی ہنڈیاں کیا چیز ہیں؟ بس انہیں ایک لحاظ سے پوسٹ ڈیٹ چیک ہی سمجھ لیجئے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پوسٹ ڈیٹ چیک ایک عام آدمی دوسرے عام آدمی کے نام لکھتا ہے' جبکہ ایسی ہنڈیاں اور وثائق بنک یا قابل اعتماد اداروں کی طرف سے جاری کیے جاتے ہیں۔ جن کے کیش نہ ہونے (Dishonour) کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ اب مسئلہ صرف دو تین ماہ کی مدت کا رہ جاتا ہے پہلے بنک ایسی ہنڈیوں وغیرہ کو فوری طور پر بدیں صورت کیش کر دیتے تھے کہ مقررہ شرح سود کے مطابق مدت کے لحاظ سے کٹوتی کر لیا کرتے تھے۔ مگر اب کٹوتی یا (Discount) شرح سود کی بنیاد پر نہیں کرتے بلکہ مارک ڈاؤن کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔

جائیداد یا مشینری وغیرہ کی خرید وفروخت:

فرض کیجئے کہ وہی زید جو بنک کے نزدیک قابل اعتماد آدمی ہے۔ مشینری کی خرید کے لیے بنک سے پچاس ہزار روپے قرضہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ اب بنک یہ کرے گا کہ اس رقم کے عوض مشینری خود زید سے خرید لے گا۔ اس پر متوقع منافع کا انداز کر کے ''مارک اپ'' لگا کر زید سے ''مارک اپ'' بطور کرایہ ہر ماہ وصول کرتا رہے گا۔ اور اگر زید مقررہ مدت کے اندر اصل زر بمعہ مارک اپ بالاقساط ادا نہیں کر سکا تو بینک کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ مشینری کو فروخت کر کے اپنا سب کچھ کھرا کر لے باقی جو کچھ بچے گا وہ زید کا ہوگا۔ بنک کو مشینری کے حصول' اخراجاتِ حصول' حصول کے دوران تلفی کا خطرہ اس کی نگہداشت اور وقت سے پہلے ناکارہ ہونے کی چنداں فکر نہیں ہوتی' وہ ایسے تمام خطرات کی ذمہ داری زید پر ڈال دیتا ہے۔ اور خود کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لیتا۔ اب آپ خود دیکھ لیجئے کہ مضاربت کی اس شکل کو اسلامی نظریہ بیع سے کس قدر تعلق ہے؟ یہ شکل تو خالص رہن کی ہے۔

اسی طرح اگر زید کوئی بھی جائیداد منقولہ یا غیر منقولہ خریدنا چاہتا ہے تو اس کی بعینہ ایسی ہی صورت ہوگی۔

شراکت:

فرض کیجئے کہ زید بنک کو اپنے کاروبار میں شریک کرنا چاہتا ہے۔ بنک کو زید کی مالی حیثیت کا بھی اندازہ ہے اور اس کے قابل اعتماد ہونے کا بھی۔ تو اب بنک اس کاروبار کے فروغ کا

جائزہ لے گا- اور اگلے پانچ سال کے متوقع منافع کا اندازہ بھی لگائے گا- اگر یہ اندازہ موجودہ شرح سود سے کچھ زیادہ ہوگا تو بنک کاروبار میں شراکت پر آمادگی کا اظہار کردے گا- اور ہر تین ماہ کے لیے ایک عبوری شرح منافع طے کر کے یہ منافع بنک زید سے ساتھ کے ساتھ وصول کرتا رہے گا- سال بعد اگر حساب کرنے پر اگر منافع عبوری منافع سے زائد نکلے تو بنک یہ مزید منافع بھی لے سکتا ہے- اس زائد منافع سے ریزروفنڈ بھی قائم کرسکتا ہے اور چاہے تو ازارہ احسان یہ زائد منافع چھوڑ بھی سکتا ہے- لیکن اگر یہ حقیقی منافع عبوری منافع سے کم نکلے تو بینکوں کی حالیہ ترمیم کے مطابق

(۱) بنک عبوری شرح منافع کے حساب سے اپنا حصہ پورا وصول کرے گا- پھر جو کچھ منافع بچ رہے گا وہ زید کا ہوگا-

(۲) اور اگر یہ حقیقی منافع سے بھی کم ہو تو سب کچھ بنک لے لے گا اور زید کو کچھ بھی نہیں ملے گا-

اب آپ خود دیکھ لیجئے کہ اس جام نو میں وہی پرانی شراب ہی نہیں پیش کی جا رہی؟

ہم سمجھتے ہیں کہ چند ایک امور میں سود کو ختم کرنے کی صحیح سمت بھی اختیار کی گئی ہے- مثلاً ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن یا دوسرے بینکوں کی کرایہ میں شراکت کی بنیاد پر سرمایہ کی فراہمی یا مثلاً جو ملازم اپنے پراویڈنٹ فنڈ پر سود لینا گوارا نہیں کرتا- اسے بوقت ضرورت اس کے جمع شدہ پراویڈنٹ کا ۸۰ فیصد تک بطور قرضہ حسنہ مل جاتا ہے- جسے وہ بعد میں بالاقساط اپنی تنخواہ میں سے وضع کرواتا رہتا ہے- مگر یہ چند باتیں مستثنیات میں شمار ہوں گی- اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ آیا بینکوں میں فی الواقع سود کے بجائے تجارتی بنیادوں پر کام شروع ہو چکا ہے- تو ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے-

بینکوں سے سود کے خاتمہ کی اس سست رفتاری (بلکہ حقیقتاً ناکامی) کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بینکوں میں موجودہ سودی نظام کئی صدیوں سے اپنے ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا اس مقام پر پہنچا ہے- اب اگر ہم پوری خلوص نیت سے سود کو ختم کرنا چاہیں بھی تو یہ چند سالوں کا مسئلہ نہیں بلکہ اسکے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہے آغاز سفر اگر ہو چکا ہے تو کسی نہ کسی وقت صحیح منزل بھی سامنے آ ہی جائے گی-

ہمارے خیال میں یہ جواب درست نہیں- وجہ یہ ہے کہ ہمارے بینک اپنے بنیادی ڈھانچہ کے لحاظ سے مالیاتی توسط کے ادارے ہیں- تجارتی ادارے نہیں ہیں- وہ اپنا حق المحنت سود یا یقینی منافع کی شکل میں وصول کرتے ہیں- لیکن کاروباری خطرات کی ذمہ داری کسی قیمت پر

لینا گوارا نہیں کرتے اور یہی بات سود اور تجارت کا بنیادی فرق ہے۔ لہٰذا جب تک بینک ذہنی طور پر اس بنیادی ڈھانچہ میں تبدیلی گوارا نہ کریں گے۔ سود کے خاتمہ کے لیے جو تجاویز بھی سامنے لائیں گے یا جو کچھ اقدامات بھی کریں گے۔ سود اپنی نئی نئی شکلوں میں جلوہ گری کرتا رہے گا۔ ہمیں نہ حکومت کے اعلانات سے کچھ بدظنی ہے نہ ہی ہم مرکزی بینک کی فراہم کردہ بنیادوں کو نیت کے فتور پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ بلکہ ہمارے خیال کے مطابق اصل خرابی یہ ہے کہ جب تک بینک مالیاتی ایجنٹ کے بجائے شریک یا مضارب کی صحیح صحیح شکل میں سامنے نہیں آئیں گے اور ہر طرح کے کاروباری نفع ونقصان کی ذمہ داریوں کو قبول نہیں کریں گے۔ بینکوں سے سود کا خاتمہ ناممکن ہوگا۔

۴۔ انعامی بانڈ (Prize Bond)

آج عوام میں انعامی بانڈ کا بھی خوب چرچا ہے۔ اور ان پر ملنے والے انعامات کا بھی۔ یہ دراصل سود اور قمار کی مرکب شکل ہے۔ اور یہ کاروبار حکومتی سطح پر کیا جاتا ہے۔ حکومت کو جب سرمایہ کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اس ذریعہ سے سود کا نام لیے بغیر عوام سے روپیہ حاصل کرتی ہے۔ طریق کار یہ ہے کہ مثلاً آج کل حکومت اسلامی جمہوریہ پاکستان نے ۵۰/ روپے' ۱۰۰/ روپے' ۵۰۰/ روپے' ۱۰۰۰/ روپے کے بانڈ (سرکاری تمسکات) چھاپ رکھے ہیں۔ جو کسی بھی وقت ہر بینک سے کیش بھی کرائے جاسکتے ہیں۔ ان پر نمبر بھی اس طریق پر طبع کیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ کرنسی نوٹوں پر ہوتے ہیں۔ اب مثلاً جنوری ۱۹۹۱ء میں ۵۰/ روپے کے بانڈ فروخت ہوتے رہتے ہیں۔ پھر فروری میں ۱۰۰/ روپے والے بانڈز فروخت ہوں گے۔ اور مارچ میں ۵۰/ روپے والوں کی قرعہ اندازی ہوگی۔ اور قرعہ میں آنے والے نمبروں کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اس طرح باری باری ہر قسم کے بانڈی کی دو ماہ بعد قرعہ اندازی ہوتی رہتی ہے۔ جو نمبر قرعہ اندازی میں آتے ہیں وہ جس کے پاس ہوں گے۔ وہ دکھا کر سٹیٹ بنک آف پاکستان یا قومی بچت کے کسی مرکز سے اعلان شدہ انعام حاصل کر لے گا۔

یہ کاروبار چونکہ حکومت خود چلا رہی ہے۔ لہٰذا اسے خاص فروغ حاصل ہوا ہے۔ ہر دو ماہ بعد انعامات تقسیم ہوتے ہیں۔ وہ دراصل اس جمع شدہ رقم کا دو ماہ کا سود ہوتا ہے۔ جو سب حقداروں میں تقسیم کرنے کے بجائے بذریعہ قرعہ اندازی چند افراد کو دے دیا جاتا ہے۔ اس کاروبار میں اس ناپاک اور حرام چیز ''سود'' کا نام ''انعام'' رکھ دیا گیا ہے۔ اور قرعہ اندازی سے یہ انعام کسی کو عطا

کرنا ہی میسر ہے اور یہی کچھ لاٹری میں ہوتا ہے۔

سودی کاروبار انہی مشاغل پر منحصر نہیں۔ اگر بنک سودی کاروبار کرتے ہیں۔ تو ڈاکخانہ والے بھی کرتے ہیں۔ اور قومی بچت کے مراکز بھی۔ پھر بہت سے سرکاری' نیم سرکاری اور نجی ادارے ہیں۔ جو سود پر رقم لے کر اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ ہر طرف ہی فضا سود کے اثرات سے مسموم ہو چکی ہے۔

بایں ہمہ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر آج بھی کوئی شخص سود سے بچنے کا عزم کرلے تو وہ سود سے بچ سکتا ہے۔ البتہ اگر ناقابل علاج چیز ہے تو وہ انسان کی حرص ہے اگر ایک تاجر دوسروں کی دیکھا دیکھی ایک لاکھ کے سرمایہ سے بنک کی ملی بھگت سے چار لاکھ کا کاروبار کرنا چاہتا ہے۔ تو وہ اسے اضطرار کا نام کیوں دیتا ہے اگر کوئی چیز درآمد کرتا ہے تو وہ پوری رقم پیشگی جمع کرا کر سود کے دھندے سے بھی بچ سکتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ اضطرار کہیں بھی نہیں ہوتا صرف یہ کہ حلال کی کمائی کم ہوتی ہے۔ اور اگر بالفرض کہیں اضطرار ہو بھی تو وہاں گناہ نہیں۔ وہ اللہ معاف فرما دے گا۔ محض زیادہ کمائی کی خاطر سود میں خود ملوث ہونا اور پھر اسے اضطرار کا نام دینا ڈھٹائی نہیں تو اور کیا ہے۔ اور ایسے حیلوں بہانوں سے کمائی ہوئی ساری دولت حرام ہوتی ہے۔

اگر سودی دھندا کرنے والے ادارے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں تو ایسے ادارے بھی موجود ہیں جو مضاربت اور شراکت کی بنیادوں پر لوگوں سے سرمایہ اکٹھا کرتے ہیں۔ مثلاً جائنٹ سٹاک کمپنیاں اور کواپریٹو سوسائٹیاں خالص تجارتی بنیادوں پر کاروبار کرتی ہیں۔ جن کا ذکر شراکت کے باب میں آئے گا۔ علاوہ ازیں آج بھی کئی ایسے دیانتدار تاجر موجود ہیں۔ جو مضاربت کی شرائط پر رقوم قبول کرتے اور وقت مقررہ پر طے شدہ شرائط کے مطابق منافع بھی ادا کرتے ہیں اور بوقت ضرورت رقم بھی واپس کر دیتے ہیں۔ لہٰذا اس جرمِ عظیم سے بہر صورت اجتناب لازم ہے۔

بلاسود بینکاری

آج کے دور میں بلاسود بینکاری کو ناکام ثابت کرنے کے لیے حامیانِ سود کی طرف سے جو سب سے بڑی دلیل دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ آج کل معاشرہ میں جھوٹ' فریب کاری اور بددیانتی عام ہے۔ لہٰذا جو لوگ مضاربت یا مشارکت کے لیے بینکوں سے رقوم حاصل کریں گے وہ

حسابات میں ہیرا پھیری کر کے یا تو نقصان دکھائیں گے- یا پھر اصل نفع سے بہت کم نفع دکھائیں گے- اور نتیجتاً یہ سکیم بالکل ناکام ہو جائے گی-

اس کا اصل علاج تو یہ ہے کہ لوگوں میں خوف خدا اور دیانت پیدا کی جائے- انہیں پوری طرح احکام شرعیہ سے روشناس کیا جائے نہ کہ ایسی بددیانتی کو بنیاد بنا کر شراکت ومضاربت کی حوصلہ شکنی کی جائے اور سود کے لیے میدان کھلا چھوڑ دیا جائے اور اس کام کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ نصاب تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں اور ملازمین کی جب نئی تقرری کرنا ہو تو ان کے دین سے لگاؤ اور دیانت کو بھی ملحوظ رکھا جائے اور پرانے ملازمین کے لیے تربیتی کورس تجویز کر کے انہیں اسلامی تعلیمات واحکام سے روشناس کرایا جائے-

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آج کے دور میں ہی کئی مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں نفع و نقصان کی بنیاد پر کام کر رہی ہیں- اور بینکوں کے سود سے زائد منافع بھی دکھا رہی ہیں اور انہوں نے ایسے قواعد تیار کر رکھے ہیں کہ جن سے بددیانتی کو غیر مؤثر بنایا جا سکتا ہے تو پھر بینکوں کے لیے ایسے قواعد کیوں نہیں بنائے جا سکتے اور ایسے انتظامات کیوں نہیں کیے جا سکتے؟

آج کل عدالتوں میں جو مقدمات جاتے ہیں- ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں- مدعی جھوٹ مکر وفریب اور بددیانتی سے کام لیتا ہے اور مدعا علیہ بھی- فریقین کے گواہ بھی جھوٹ بولنے میں کسر نہیں اٹھا رکھتے تو کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہوگا- کہ چونکہ آج کل جھوٹ مکر وفریب اور بددیانتی عام ہو چکی ہے- لہٰذا عدالتوں کو بند کر دینا چاہیے- جھوٹ اور بددیانتی کے فروغ سے عدالتوں کا کام لمبا ضرور ہو جاتا ہے لیکن بالآخر جھوٹ کے اس ڈھیر سے سچ نتھر ہی آتا ہے- ہاں اگر لوگوں میں خدا خوفی ہو تو مقدمات کا فیصلہ نسبتاً بہت تھوڑے عرصہ میں ہو جاتا ہے-

بالکل یہی صورت دوسرے معاملات کی ہے- مضاربت اور شراکت کا معاملہ بھی انہی میں سے ایک ہے- بددیانتی کی روک تھام کے لیے قواعد بھی وضع کیے گئے ہیں اور کیے جا سکتے ہیں- اور اقدامات بھی اختیار کیے جا سکتے ہیں- ضرورت صرف عزم کی ہے-

بلاسود بینکاری پر آج کل کئی تصنیفات منظر عام پر آ چکی ہیں- جن میں ہر مصنف نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے اپنی اپنی دانست کے مطابق بلاسود بینکاری کے مجمل اور مفصل خاکے پیش کیے ہیں- راقم الحروف نے بھی آج سے دس سال قبل اس موضوع پر ایک کتاب کا مسودہ تیار کیا تھا- لیکن انہی دنوں ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور کی جولائی ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں

خلیل حامدی صاحب کا ایک مضمون ''اسلامی بینکوں کی عالمی تحریک'' نظر سے گزرا جسے پڑھ کر بہت خوشی حاصل ہوئی کہ جس مقام پر اس وقت پاکستان کھڑا ہے بعض اسلامی ممالک اس سے بہت آگے نکل کر عملی اقدامات بھی کر چکے ہیں۔ لہٰذا میں نے کتاب کی اشاعت کا خیال دل سے نکال دیا۔ کیونکہ اب خاکوں کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب عند الضرورت ان بینکوں سے پوری رہنمائی بھی لی جا سکتی ہے جو اس میدان میں اتر کر کام کا آغاز کر چکے ہیں۔ یہاں اسی مضمون سے چیدہ چیدہ اقتباس پیش کر رہا ہوں تاکہ آپ کو یہ معلوم ہو سکے کہ سود کے حامیوں نے جو آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے کہ آج کے دور میں بلاسود بینکاری ناکام ہو جائے ان کا یہ دعویٰ بالکل لغو اور باطل ہے۔

حامدی صاحب لکھتے ہیں کہ

اسلامی بینکوں کا قیام

(۱) غیر سودی بینکاری کا پہلا تجربہ سوشل سیکورٹی بنک آف مصر کی شکل میں ہوا۔ پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس منعقدہ رباط ۱۹۶۹ء کے فیصلہ کے تحت جدہ میں اسلامی سیکرٹریٹ قائم کیا گیا۔ اس کا ایک شعبہ اس غرض کے لیے قائم کیا گیا کہ بلاسود بینکاری کے امکانات و مسائل پر غور کرے۔ چند مصری ماہرین نے اس موضوع پر خصوصی توجہ دی اور ''مصری مطالعہ برائے اسلامی بینکاری'' ہی کے نام سے ایک جامع دستاویز مرتب کی۔ اصل تجویز تو یہ تھی کہ اسلامی سیکرٹیریٹ کی سرپرستی میں ایک اسلامی بینک کھولا جائے۔ مگر ان مصری ماہرین نے خود ہی عملی اقدام کر ڈالا۔ اور قاہرہ میں ۱۹۷۲ء میں غیر سودی بنیادوں پر ''سوشل سیکورٹی بنک'' قائم کر دیا۔

(۲) شاہ فیصل مرحوم کی خصوصی توجہ کی بدولت ۱۹۷۵ء میں جدہ میں دوسرا غیر سودی بنک ''اسلامی ترقیاتی بنک'' کے نام سے کھولا گیا۔ بنک مسلم حکومتوں کے اشتراک و تعاون سے قائم ہوا تھا۔ اور اس سے استفادہ کرنے والے بھی افراد نہیں بلکہ حکومتیں ہی ہیں۔ لیکن چونکہ عالم اسلامی کی سطح پر غیر سودی بینکاری کے تجربے کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس لیے اس کے متعدد حلقوں کی طرف سے شدید مزاحمت کی گئی۔

سعودی عرب کے ایک اسلام پسند مخلص تاجر شیخ احمد صلاح جموم جو اس میدان میں شروع سے بڑی سرگرمی سے کام کر رہے ہیں۔ اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اسلامی بینکوں کے قیام کی تاریخ میں ہرگز فراموش نہیں کر سکتا۔ اس تاریخ کا آغاز اس

وقت سے ہوتا ہے- جب مرحوم شاہ فیصل نے اسلامی بنک کے قیام کا مصمم ارادہ کرلیا- مجھے یاد ہے کہ جب جدہ میں اسلامی کانفرنس کے اجلاس ختم ہوئے تو جدہ میں سعودی بینکوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی بھرمار ہونے لگی اور وہ شب و روز اس امر کے لیے کوشش کرنے لگے کہ اسلامی بینکاری کی مساعی کو پراگندہ کردیں-

اسلامی ترقیاتی بنک کے قیام کی قرار داد صادر ہونے کے بعد فرانس کے بعض اخبارات اور رسائل نے یہاں تک لکھا کہ

''اگر اسلامی بنک اپنی صحیح شکل میں قائم ہوگیا تو یہ مغرب کے لیے ہائیڈروجن بم سے بھی زیادہ خطرناک ہوگا-''

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنے عزائم میں پوری طرح کامیاب ہوگئے- لیکن وہ اس میں ضرور کامیاب ہوگئے کہ اس بنک نے کم از کم وقت میں جو مہمات و فرائض انجام دینے تھے اور جو نشوونما کرنی تھی وہ نہ ہوسکی- (روزنامہ المدینہ- جدہ شمارہ ۳۱ مارچ ۱۹۸۱ء)

۳ تا ۵- تین مزید غیر سودی بینک:

۱۹۷۵ء ہی میں دوبئی میں وہاں کے ایک مشہور تاجر جناب احمد سعید لوتاہ نے اپنے کاروباری شرکاء کے ساتھ مل کر ''اسلامی بنک آف دوبئی'' کے قیام کا اعلان کردیا- اس کا ابتدائی سرمایہ ۵۰ ملین درہم تھا- جو ایک لاکھ کھاتوں میں تقسیم کیا گیا- متحدہ عرب امارات' قطر اور کویت کے مسلمان سرمایہ داروں نے اس بنک کی خوب حوصلہ افزائی کی- اور اب یہ بنک مختلف تجرباتی ادوار سے گزر کر اپنی مضبوط بنیادوں پر قائم ہوچکا ہے-

پھر ایک سال کے وقفے سے جب ۱۹۷۷ء کا آغاز ہوا تو اسلامی بینکوں کے قیام کا فرض سعودی عرب کے ایک نیک طینت شہزادے شاہ فیصل مرحوم کے لڑکے امیر محمد الفیصل نے سنبھال لیا- چنانچہ ۱۹۷۷ء میں ان اور ان کے چند صحیح الفکر رفقاء کی مساعی حمیدہ سے ایک اسلامی بنک قاہرہ میں ''فیصل اسلامی بنک آف مصر'' کے نام سے- اور دوسرا اسلامی بنک خرطوم میں ''فیصل اسلامی بنک آف سوڈان'' کے نام سے جاری کردیا گیا- مصر کا فیصل اسلامی بنک آٹھ ملین ڈالر کے سرمائے سے قائم ہوا- اس سرمائے کو ۸۰ ہزار حصص میں تقسیم کیا گیا- اس میں ۵۱ فیصد حصے مصریوں کے لیے اور ۴۹ فیصد حصے سعودی شہریوں کی ملکیت قرار پائے- اس مقابلے

میں سوڈان کے فیصل اسلامی بنک کا ابتدائی سرمایہ دس ملین سوڈانی پاؤنڈ تھا۔ اور یہ سرمایہ ایک ملین حصص میں تقسیم ہوا۔ غیر سوڈانی مسلمانوں کو بھی اس کے حصص خریدنے کی اجازت دی گئی۔ چنانچہ اس بنک کے چالیس فیصد حصص سوڈانیوں کے لیے۔ چالیس فیصد سعودی باشندوں کے لیے اور بیس فیصد دیگر مسلمانوں کے لیے مخصوص کر دیئے گئے۔

یہ دونوں بنک بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں۔ فیصل اسلامی بنک آف سوڈان کی خود سوڈان کے اندر تین مزید شاخیں کھل چکی ہیں۔ یہ بنک صنعت و حرفت کے میدان میں اصولِ شراکت کے تحت سرمایہ کاری کر رہا ہے۔

حوصلہ افزا نتائج:

فیصل اسلامی بنک سوڈان کی تازہ ترین رپورٹ جو عرب اخبارات میں چھپی ہے اس میں ملک کی ترقی اور کامیابی کا جو حجم پیش کیا گیا ہے وہ بنکاری کی دنیا میں ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔ ہفت روزہ الدعوۃ ریاض شمارہ یکم جون ۱۹۸۱ء کے مطابق گزشتہ سال اور سال رواں کے اندر بنک کے کاروبار کا دائرہ ایک ہزار دو سو فیصد کے حساب سے پھیلا۔ اصل سرمایہ پر جو منافع ہوا وہ ۴۵ فیصد ہے۔ یہ تمام منافع کھاتے داروں میں تقسیم نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کا صرف ۲۰ فیصد تقسیم کیا گیا ہے۔ اس طرح سے بنک کا سرمایہ پانچ گنا بڑھ گیا ہے۔ اور سرکاری بینکوں کے بعد فیصل اسلامی بنک سوڈان کا سب سے بڑا بنک بن گیا ہے۔ سوڈانی اقتصادیات کو بھی اس بنک کے ذریعے تجارت اور کاروبار کے میدان میں بڑی تقویت پہنچی ہے۔

قاہرہ کے فیصل اسلامی بنک نے بھی ۱۹۸۰ء...... ۱۹۸۱ء کی جو رپورٹ شائع کی ہے اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مصری مسلمانوں کے اندر اس کی شہرت و مقبولیت روز افزوں ہے۔ قاہرہ برانچ کی رپورٹ کے موجب سرمایہ کاری کے کھاتے میں سالانہ آمدنی ۱۲٫۰۳ فیصد ہوئی۔ اصل سرمایہ پر آمدنی مع زکوٰۃ ۱۶٫۲۹ فیصد اور زکوٰۃ نکال کر ۱۴٫۱۷ فیصد ہوئی۔ مالی ذرائع میں اضافہ ۳۴۵ فیصد ہوا نئے حسابات کا تناسب ۸۲۲ فیصد رہا۔ ۱۹۸۱ء میں اسیوط' اسکندریہ اور ازہر میں نئی برانچیں کھولی جائیں گی۔ اگلے تین سال مزید تین برانچیں طنطا' سویز اور مصر الجدیدہ میں قائم کی جائیں گی۔ بنک کی اس رپورٹ پر ماہرین نے اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ سوڈان کے فیصل اسلامی بنک کی تازہ رپورٹ بھی تحریک اسلامی کے حلقوں میں مسرت کا موجب بنی ہوئی ہے۔

(۶) کویت کا اسلامی بنک:

۱۹۷۷ء ہی کی بات ہے کہ کویت کے مسلمان تاجروں نے بھی اس میدان میں قدم رکھ دیا- یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ کویت مالدار ترین عرب ملک ہے- اور کویت ہو یا دوسرے خوشحال عرب ممالک سب کا بیشتر سرمایہ یورپی اور امریکی بینکوں کی طرف رخ کرتا ہے- اور یوں مسلمان سرمائے سے یہودی اور عیسائی ادارے دنیا کے اندر سودی نظام کے محافظ بنے ہوئے ہیں- کویت کی اسلامی تحریک کی تگ ودو کے نتیجے میں کویتی تاجروں کی معتد بہ تعداد نے مل کر کویت میں اسلامی بنک کی طرح ڈال دی- اس کا نام ہے بیت التمویل الکویتی (کویت فنانس ہاؤس) آغاز میں اس کا راس المال دس ملین کویتی دینار تھا- جسے دس ملین حصص میں بانٹ دیا گیا- اور ایک حصہ کی قیمت ایک دینار رکھی گئی- ان تین سالوں کے اندر کویتی فنانس ہاؤس نے جو ترقی کی ہے وہ بھی کویت کے مسلمانوں کے لیے خوش آئند مستقبل کی نوید ہے- یہ بنک دوسرے اسلامی بینکوں کی طرح ہر نوعیت کے حسابات رکھتا ہے- جاری کھاتہ- بچت کھاتہ- اور میعادی کھاتہ تینوں کھاتوں میں اس نے بنکاری شروع کر رکھی ہے- بنک قرض کا لین دین کرنے کے بجائے شراکت اور مضاربت کے اصولوں پر کام کرتا ہے اور خود براہ راست سرمایہ کاری بھی- جائیدادوں کی خرید وفروخت اور عمارات کی تعمیر- زر مبادلہ کی خرید وفروخت اور مالی دستاویزات کا اجراء اور لیٹر آف کریڈیٹ کا اجراء اس کے کاروباری میدان ہیں- مشارکت' مضاربت اور مرابحت کے اسلامی اصول اس کے کاروبار کی حدود ہیں- اس بنک نے فقہ اسلام کے نام سے ایک شعبہ کھول رکھا ہے اور اس کے اندر ایک نامور ازہری عالم دین کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں- جو بنک کو قدم قدم پر شرعی اصولوں کی روشنی میں مشورے دیتے ہیں اور کسی ایسے غلط کاروبار سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں' جس میں شریعت کے حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہو- بنک کے چیئر مین جناب احمد البزیع الیٰسین خود بھی اسلامی علوم سے واقفیت رکھتے ہیں- اور کویت کی اسلامی تنظیم جمعیت الاصلاح کے سیکرٹری جنرل ہیں- یہ جمعیت کویت میں صحیح اسلامی معاشرے کے قیام اور اسلامی شریعت کے نفاذ کی علمبردار ہے-

سال رواں میں کویتی فنانس ہاؤس نے میعادی کھاتے داروں کے لیے جس حلال منافع کا اعلان کیا ہے وہ ۲۴ فیصد ہے- جب کہ کویت ہی کے سودی بینکوں نے میعادی کھاتوں پر

ساڑھے گیارہ فیصد سے زیادہ سود نہیں دیا۔عوام الناس کا رجحان بھی اس بنک کی طرف بہت بڑھ رہا ہے۔سال رواں میں اس نے تین نئی شاخیں کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔مرکزی شاخ میں عورتوں کے لیے الگ اور باپردہ شعبہ کھولا گیا ہے۔جہاں بنک کے تمام کاموں کے لیے خواتین مقرر کی گئی ہیں۔یعنی حساب دانی کے فرائض سرانجام دینے والی اور کمپیوٹر پر کام کرنے والی اور رقم کا لین دین کرنے والی سب اسلام پسند خواتین ہیں۔

(۷) عمان کا اسلامی بنک:

اگلے ہی سال یعنی ۱۹۷۸ء میں اسلامی بنک آف عمان کا قیام عمل میں آ گیا۔ اوران کے مسلمان بھی اس مبارک قافلے میں شریک ہو گئے۔اس بنک نے ۴ ملین اردنی دینار کے ابتدائی سرمائے کو چار ملین حصوں میں تقسیم کر کے کام کا آغاز کر دیا۔علمائے اسلام کی ایک قابل قدر ٹیم اس کی قانونی اور شرعی پشت پناہی کر رہی ہے۔اور وہ ہر مسلمان جو سود سے اپنا دامن پاک رکھنا چاہتا ہے سودی بینکوں کی بجائے اسلامی بنک میں سرمایہ جمع کروا رہا ہے۔گو ملکی اور غیر ملکی سودی بنک حوصلہ شکنی اور در پردہ سازشوں میں کوئی کسر نہیں اٹھا رہے ہیں۔مگر اس سب کے باوجود مسلم سرمائے کا بہاؤ اسلامی بنک کی طرف جاری ہے۔علی الخصوص نوجوان طبقہ جو تیزی کے ساتھ اسلامی تحریک سے متاثر ہو رہا ہے ہر قیمت پر اسلامی بنک کو کامیاب کرنے کا عزم کئے ہوئے ہے۔

(۸) بحرین میں اسلامی بنک

۱۹۷۹ء میں اسلامی بنک آف بحرین کے قیام کی خوشخبری پہنچی۔اس کے قیام کے لیے بحرین کی جمعیت اصلاح کے صدر جناب عبدالرحمٰن الجودر کی تگ و دو خاص طور پر قابل ذکر ہے۔تاہم یہ بھی تسلم کرنا چاہیے کہ بحرین اور کویت دونوں جگہ مقامی حکومتوں نے بھی تعاون کیا ہے اور اسلامی بینکوں کو سرکاری تحفظ دے کر ان کے لیے راستہ ہموار کیا ہے۔اسلامی بنک آف بحرین کی تاسیس میں مقامی سرمائے کے علاوہ اسلامی ترقیاتی بنک کا تعاون بھی خوشگوار صورت میں ہوا ہے۔یعنی یہ بنک جس نے بیس ملین بحرینی دینار کے سرمائے سے دس ملین حصص سے اپنی مہم کا افتتاح کیا ہے اس میں سرمائے کا ۱۵ فیصد اسلامی ترقیاتی بنک نے ادا کیا ہے۔قطر میں بھی اسلامی بنک کے اجراء کا نظریہ پایا جاتا تھا۔مگر قطر کے ویزر داخلہ شیخ جاسم خلیفہ نے راقم کو بتایا کہ بعض عناصر کے افسوس ناک رویے کی وجہ سے یہ اسکیم ختم کر دی گئی ہے۔

(۹) اسلامی بنک آف جنیوا:

مذکورہ بالا بینکوں کے علاوہ ایک اسلامی بنک جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں بھی قائم ہو چکا ہے۔ اور اس وقت کارکردگی اور پیش قدمی کے لحاظ سے جو تین اسلامی بنک سرفہرست ہیں ان میں سے ایک ہے یعنی فیصل اسلامی بنک سوڈان اور فیصل اسلامی بنک مصر اور تیسرا اسلامی بنک آف جنیوا۔

مزید ترقی:

اسلامی بینکوں کے عالمی وفاق کے سربراہ امیر محمد الفیصل کا بیان ہے کہ عوامی پیمانے پر اسلامی بینکوں کے قیام کے لیے اب تک ۲۱ درخواستیں موصول ہو چکی ہیں۔ ان میں سے بالفعل گیارہ ایسے مالی ادارے قائم کیے جا چکے ہیں۔ جن کی بنیاد شریعت اسلامی پر رکھی گئی ہے۔ ایک خلیج سرمایہ کاری کمپنی۔ دو اسلامی انشورنس کمپنیاں اور ۹ اسلامی بنک۔

اتحاد البنوک الاسلامیہ (اسلامی بینکوں کے وفاق) کے نام سے ایک ادارہ چار سال پیشتر مکہ معظمہ میں قائم کیا گیا ہے۔ اس ادارے کے سربراہ بھی امیر محمد الفیصل ہیں۔ اس کا مقصد اسلامی بینکوں کے مابین ہم آہنگی اور تعاون کو بروئے کار لانا ہے تاکہ یہ بنک اپنے مسائل حل کریں' یکساں پالیسی اختیار کریں اور اتفاق باہم سے نئے اسلامی بنک قائم کریں۔ ظاہر ہے کہ اس مسئلے پر عالمی سودی نظام کا سامنا کرنے کے متحدہ محاذ کا وجود امر ناگزیر ہے۔ اسلامی بینکوں کے وفاق کا ایک باضابطہ نظام وضع کر لیا گیا ہے اسی نظام کے تحت اسلامی بینکوں نے اس کی رکنیت اختیار کی ہے۔

اسلامی بینکوں کی تحریک نے ۲۵ تا ۲۷ مارچ ۱۹۸۱ء کو قبرص کے مشرقی ساحل پر واقع شہر فاماگوستا میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ قبرص میں ایک ادارہ قائم کیا جائے۔ جس کا نام ہو۔ ''انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک بنکنگ اینڈ اکنامکس'' یہ اجتماع اس لحاظ سے نہایت کامیاب رہا ہے کہ اس میں مسلم ممالک کے کئی قابل ذکر ادارے شریک ہوئے ہیں۔ ان اداروں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی بنکوں کی تحریک سرمایہ کاری کے دوش بدوش ''انسان سازی'' کی ضرورت بھی محسوس کرتی ہے اور مسلم ممالک کا سنجیدہ عنصر اس کی کامیابی اور ترقی کے لیے ہر ممکن تعاون کرنے کے لیے تیار ہے۔ شریک اداروں کے نام یہ ہے۔

(۱) ازہر یونیورسٹی مصر (۲) ملک عبدالعزیز یونیورسٹی۔ جدہ۔ سعودیہ

(۳) ملک فیصل یونیورسٹی دمام-سعودیہ
(۴) اسلامی یونیورسٹی ام درمان-سوڈان
(۵) فیصل فاؤنڈیشن-سعودیہ
(۶) ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ-سعودیہ
(۷) متحدہ عرب امارات یونیورسٹی-ابوظبہی
(۸) امام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی-ریاض
(۹) استنبول یونیورسٹی-ترکی
(۱۰) ملایا یونیورسٹی-ملائیشیا
(۱۱) اسلامی یونیورسٹی بنڈونگ-انڈونیشیا
(۱۲) عرب تربیتی بیورو برائے ممالک خلیج
(۱۳) قائداعظم یونیورسٹی-اسلام آباد
(۱۴) اسلامی یونیورسٹی-اسلام آباد
(۱۵) نیشنل یونیورسٹی-ملائیشیا
(۱۶) سائنٹیفک ریسرچ سنٹر استنبول
(۱۷) اسلامی بنکوں کا بین الاقوامی وفاق
(۱۸) شیخ احمد صلاح جموم (ذاتی حیثیت میں)

اس اجتماع میں کچھ ادارے مبصر کی حیثیت سے شریک ہوئے-مثلاً دارالافتاء سعودی عرب' اسلامی سکرٹریٹ-اسلامک کونسل آف یورپ' مدراس اسلامیہ کا عالمی وفاق-سنٹرل بنک ترکی-

اسلامی بنکوں کا بنیادی نظریہ:

اسلامی بنکوں کے اندر جو نظریہ کام کر رہا ہے-وہ یہ ہے کہ یہ بنک لوگوں کو نقد سرمایہ قرض پر نہیں دیتے-جس طرح سودی بنک سود پر سرمایہ لگاتے ہیں-اور کبھی سرمائے کا سیلاب اٹھا دیتے ہیں اور کبھی قحط پیدا کرتے رہتے ہیں نئے اسلامی بنک کاروبار میں مشارکت ومضاربت تک محدود رہتے ہیں-اس طرح ایک تو نقد سرمائے سے جو غلط نوعیت کے کاروبار چلائے جاتے ہیں وہ نہیں ہوتے-اور دوسرے کاروبار میں بنک حصہ لے کر ملکی معیشت کو متحرک کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے-اسلامی بنکوں کا دوسرا بنیادی نظریہ خود کرنسی کے اساسی تصور سے متعلق ہے-مغرب کے ماہرین اقتصادیات روپے کو سامان قرار دیتے ہیں-یعنی جیسے انسان کے لیے زمین اور جائیداد اور مشینری سامان ہے-اسی طرح روپیہ بذات خود ایک سامان ہے-یہی وجہ ہے کہ مغربی ماہرین جس طرح زمین' عمارت' جائیداد اور مشینری وغیرہ کو کرائے پر دے کر نفع حاصل کرنے کو درست سمجھتے ہیں-اسی طرح نقد روپے کو کرائے پر دینا بھی درست سمجھتے ہیں-اور اسی کا نام سود ہے-اس کے مقابلے میں اسلامی بنک اور مسلم ماہرین اقتصادیات روپے کو فی نفسہ سامان یا جنس (Commodity) نہیں بلکہ ذریعہ حصول سامان واجناس سمجھتے ہیں-اسلام کی نظر میں نقود قیمت نہیں ہیں بلکہ نقود قیمت کا پیمانہ ہیں یعنی نقود فی نفسہ قیمت نہیں سمجھے جاتے - بلکہ ان کی قیمت وہ

خدمات ہیں- یا وہ اجناس ہیں جو ان کے ذریعے سے خریدی جا سکتی ہیں- اسی تصور نے اسلامی بنکوں کا راستہ بنیادی طور پر سودی بنکوں سے الگ کر دیا ہے-

اسلامی بنکوں کی کامیابی تین بنیادی چیزوں کی مرہونِ منت ہے- ایک خود مسلمانوں کے اصحاب ثروت حضرات کا تعاون کہ وہ اپنے مالی ذرائع خدا اور رسولؐ کے خلاف جنگ میں جھونکنے کے بجائے غیر سودی اسلامی بنکوں کے حوالے کر دیں- چنانچہ اسلامی تحریکوں کی جدوجہد اور مصلحین امت کے مسلسل جہاد کی بدولت اب یہ رغبت تو مسلمانوں کے اندر پیدا ہو چکی ہے کہ اگر ان کے سرمائے کو تحفظ ملے تو وہ یقیناً غیر سودی بنکوں ہی کی طرف رخ کریں گے- چنانچہ جن جن ملکوں میں اسلامی بنک قائم کیے گئے ہیں انہیں سرمائے کی کمی کی شکایت نہیں ہوئی- بلکہ بعض اسلامی بنکوں کی جانب سرمائے کا رخ اس قدر بڑھ چکا ہے کہ وہ بنک اپنے انتظامی وسائل کی کمی کی وجہ سے اس سرمائے کو سنبھالنے میں دقت محسوس کر رہے ہیں- مثلاً کویت کے اسلامی بنک کا اس وقت یہی حال ہے- دوسری بنیادی چیز یہ ہے کہ ان بنکوں کو ایسی انتظامی مشینری فراہم ہو جائے کہ وہ سودی بنکوں کے مقابلے میں بہترین خدمات کا ثبوت بھی فراہم کر سکیں- اور بنکاری کو شرعی نقطہ نظر سے کسی پہلو سے بھی مجروح نہ ہونے دیں- اس بنیادی چیز کو فراہم کرنے کے لیے اسلامی بنکوں کی تحریک نے قبرص میں ایک ادارہ قائم کر دیا ہے- جو انشاء اللہ آئندہ قلیل عرصے کے اندر اپنے نتائج واضح کر دے گا- تیسری بنیادی چیز یہ ہے کہ اسلامی بنکوں کو جو سرمایہ فراہم ہوا ہے اسے صحیح بنیادوں پر استعمال کیا جائے- بلکہ اسے صحیح خطوط پر لگانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کیے جائیں- تاکہ نہ صرف سرمایہ قدرتی رفتار سے نمو پذیر ہو بلکہ اس کی بدولت مسلم ممالک کے اندر مختلف صنعتی' زرعی اور دیگر مفید منصوبوں کے اندر سرگرمی پیدا ہو اور مجموعی طور پر مسلمان ممالک ترقی و خوشحالی سے ہمکنار ہوں-

اس آخری چیز کو بروئے کار لانے کے لیے امیر محمد الفیصل کی جو اسکیم پچھلے دنوں پریس میں آئی ہے وہ نہایت قابل غور ہے- ریاض کے ہفت روزہ الدعوۃ کے مطابق اس اسکیم کا خلاصہ یہ ہے-

''امیر محمد الفیصل نے جو اسلامی بنکوں کے بین الاقوامی وفاق کے صدر ہیں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ آئندہ پانچ سالوں کے اندر مسلم ممالک اور غیر مسلم ممالک میں ۱۲۳ اسلامی بنک قائم کریں گے- نیز ۳۰ ایسی کمپنیاں قائم کریں گے جن کا نام کفالت کمپنیاں ہوگا- اور جو موجودہ انشورنس کمپنیوں کے مقابلے میں اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ایک متبادل نظام کی حیثیت سے وجود میں

آ ئیں گی- انہوں نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ وہ سرمایہ کاری کے لیے ۱۸ کمپنیاں جاری کریں گے- جن کے ذریعے سے بنکوں اور کفالت کمپنیوں کے سرمائے کو اسلامی اصولوں کے مطابق استعمال کیا جائے گا- امیر محمد الفیصل نے کہا ہے کہ تمام مالی ادارے دراصل ایک ایسا جامع اور مربوط نظام ہوں گے- جو عالم اسلام کی ترقی وخوشحالی کے لیے بنیادی وسائل وذرائع سے بہرہ مند ہوگا-

امیر محمد الفیصل نے اسلامی دارالمال کے نام سے ایک اسلامی ادارے کے قیام کا اعلان کردیا ہے جس کا سرمایہ آٹھ سوملین (۸۰ کروڑ) ڈالر رکھا گیا ہے- امیر نے ایک حصے کی قیمت ایک ڈالر رکھ کر اسلامی دارالمال کے حصص مسلمانوں کے اندر فروخت کے لیے کھول دیئے ہیں- انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ اسلامی دارلمال کے قیام کی تجویز ۱۹۷۰ء سے چلی آرہی ہے جسے اب عملی جامہ پہنایا جارہا ہے- انہوں نے کہا کہ اسلامی دارالمال کی حیثیت کسی مخصوص ملک اور رنگ سے وابستہ نہیں ہے- اس کی حیثیت اور اس کا دین اسلام ہے-

(الدعوۃ - ریاض ۱۸ مئی ۱۹۸۱ء)

سعودی عرب کے علماء کی سپریم کونسل کی طرف سے اسلامی دارالمال کی مکمل اسکیم اور قواعد وضوابط کا مطالعہ کرنے کے بعد اس امر کا اعلان کیا گیا ہے کہ شرعی نقطہ سے یہ اسکیم بالکل درست اور صحیح ہے- کونسل نے مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ اس اسکیم کے تحت اپنا سرمایہ لگائیں- دارالمال کا موجودہ عارضی مرکز جنیوا ہوگا جسے بعد میں آئندہ کسی مسلمان ملک کے اندر منتقل کیا جائے گا- یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دارالمال کے لیے جنیوا کو بطور مرکز کیوں منتخب کیا گیا ہے- اس کا جواب خلیج سرمایہ کاری کمپنی کے وائس چیئر مین ڈاکٹر مصطفیٰ کامل نے یہ دیا ہے کہ دارالمال کے لیے مصر کو بھی مرکز بنایا جاسکتا تھا- لیکن مصر کا موجودہ دیوانی قانون جو زیادہ تر فرانسیسی قانون سے ماخوذ ہے اور ۱۹۳۸ء سے نافذ ہے کسی کاروباری کمپنی کو نفع ونقصان کے اصول پر کاروبار کرنے کی کھلی اجازت نہیں دیتا- جب کہ سوئٹزر لینڈ کا موجودہ دیوانی قانون مجریہ ۱۹۷۰ء اس امر میں مانع نہیں ہوتا کہ سوئٹزر لینڈ میں نفع ونقصان کے اساس پر سرمایہ لگایا جائے تاہم ہمارا یہ فیصلہ کہ جنیوا دارالمال کا مرکز ہو عارضی ہے- آئندہ کسی مسلم ملک کو ہی منتخب کیا جائے گا-

(الدعوۃ - ریاض یکم جون ۱۹۸۱ء)

باب ۷

اقسام تجارت اور تجارتی اصلاحات

اس باب میں تجارت کی وہ اقسام درج کی جارہی ہیں- جن کا عہد نبویؐ میں رواج تھا- ان میں سے اکثر آج کل بھی موجود ہیں- ان کے اصطلاحی نام جو احادیث میں مذکور ہیں- انہیں سمجھنے کے لیے یہاں ان کی وضاحت کی جاتی ہے- تاکہ حدیث کا مضمون سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئے-

تجارت کی ناجائز صورتیں

(الف) سودے بازی کی وہ صورتیں جو ناجائز ہیں اور باغات یا کھیتی باڑی سے تعلق رکھتی ہیں- اور اس لیے ناجائز ہیں- کہ ان میں صرف تخمینہ سے کام لینا پڑتا ہے اور کسی ایک فریق کے لیے نقصان کا احتمال ضرور رہتا ہے-

(۱) مزابنہ: کھجور یا انگور کے باغ کا پھل پکنے سے پہلے ہی خشک کھجور یا خشک انگور (کشمش) کے ساتھ سودا چکا لینا-

(۲) محاقلہ: کھیتی کا اسکے پکنے سے پہلے ہی سودا چکا لینا-

(۳) مخابرۃ: زمین کی بٹائی کسی کو اپنی زمین کاشت کے لیے دینا اور اس سے اس کے عوض حصہ وصول کرنا (یہ پہلے منع تھا بعد میں اس کی اجازت دے دی گئی)

(۴) معاومۃ: کسی باغ کی پیداوار کا موجودہ فصل کی بجائے چند سالوں کے لیے پیشگی سودا طے کرنا-

(۵) بیع سنین: بیع سنین اور معاومہ ایک ہی چیز ہے-

(۶) ثنیا: (استثناء کرنا) کسی باغ کا سودا چکاتے وقت چند درختوں کی یا کھیتی کا معاملہ چکاتے وقت مخصوص خطہ زمین کو اپنے لیے الگ کر لینا- یعنی مستثنیٰ کر لینا-

(۷) بیع عرایا یا عریۃ: بیع عرایا اور دراصل مزابنہ کی ہی شکل ہے- لیکن مزابنہ وسیع

پیمانے پر اور تجارتی نقطہ نگاہ سے ہوتا ہے- جب کہ عرایہ معمولی پیمانے پر غریبوں مسکینوں کے ساتھ جب کہ ایک محتاط اندازہ کرلیا جائے- کہ پھل پکنے کے بعد اتنا رہ جائے گا- (اس میں رخصت ہے) بعض دفعہ کسی باغ کا مالک اپنے باغ میں سے چند ایک درختوں کا پھل یتیموں اور غریبوں کو ہبہ کردیتا تو ان لوگوں کی اس کے باغ میں اپنے درختوں کی نگہداشت کیلیے بار بار کی آمدورفت باغ کے مالک کے کام میں مخل ہوتی- جس سے باغ والا ان غریبوں سے اس کچے پھل کا خشک کھجوروں سے تخمینہ کرکے سودا کرلیتا- اور انہیں اس کے عوض اندازہ سے خشک کھجوریں دے دیتا- اس قسم کی محدود اور مشروط بیع کو بیع عرایا کہتے تھے-

اب ان کے متعلق ارشادات نبوی ﷺ ملاحظہ فرمائیے-

((عَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْمُحَاقَلَةِ وَ الْمُزَابَنَةِ وَالْمُخَابَرَةِ وَالْمُعَاوَمَةِ وَعَنِ الثُّنْيَا وَرَخَّصَ فِي الْعَرَايَا-[1]))

(حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے محاقلہ' مزابنہ' مخابرہ' معاومہ اور ثنیہ سے منع فرمایا- اور بیع عرایا میں رخصت دی-)

اس حدیث میں مندرجہ بالا سات اقسام میں سے چھ کا ذکر آ گیا ہے- اور درج ذیل حدیث میں بیع سنین یا معاومہ کا بھی ذکر موجود ہے-

((عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ عَنِ الْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ وَالْمُعَاوَمَةِ وَالْمُخَابَرَةِ قَالَ اَحَدُهُمَا بَيْعُ السِّنِيْنَ هِيَ الْمُعَاوَمَةِ وَعَنِ الثُّنيَا وَرَخَّصَ فِي الْعَرَايَا- [2]))

(حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے منع کیا رسول اللہ ﷺ نے محاقلہ' مزابنہ اور معاومہ سے- اس حدیث کے دو راویوں میں سے ایک نے کہا کہ بیع سنین ہی معاومہ ہے (چند برس کے لیے درخت کے میوہ کی بیع) اور منع کیا آپ ﷺ نے استثناء کرنے سے اور عرایا میں رخصت دی-)

---

1. صحیح مسلم کتاب البیوع باب النھی عن المحاقلة و المزابنة وعن المخابرة ۱۵۳۶/۸۵ یہ الفاظ مسلم شریف کے ہیں- صحیح بخاری کتاب المساقاة باب الرجل یکون له ممر او شرب فی حائط اوفی نخل (۲۳۸۱)
2. صحیح مسلم کتاب البیوع باب النھی عن المحاقلة و المزابنة وعن المخابرة ۱۵۳۶/۸۵ یہ الفاظ مسلم شریف کے ہیں- صحیح بخاری کتاب المساقاة باب الرجل یکون له ممر او شرب فی حائط اوفی نخل (۲۳۸۱)

اور عرایا میں جو رخصت ہے وہ پانچ وسق تک ہے یعنی اندازاً بیس من تک[1]۔

ب۔ حیوانوں سے متعلق تجارتی اصطلاحات

(۸) بیع مصراۃ: ایسے شیر دار جانور کی بیع جس کا دودھ فروخت سے کچھ عرصہ پہلے تھنوں میں روک دیا گیا ہو۔ خواہ یہ جانور اونٹ ہو یا گائے یا بکری وغیرہ ہو۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے

((اِذَا مَا اَحَدُکُمُ اشْتَرٰی لِقْحَۃً مصراۃً اَوْشَاۃً مُصَرَّاۃً فَھُوَ بِخَیْرِ النَّظَرَیْنِ بَعْدَ اَنْ یَحْلُبُھَا اِمَّا ھِیَ وَاِلَّا فَلْیَرُدُّ ھَا وَ صَاعاً مِنْ تَمرٍ۔[2]))

(جب تم میں سے کوئی اونٹنی خریدے جس کا دودھ چڑھایا گیا ہو یا ایسی بکری خریدے تو دودھ دوہنے کے بعد اسے دو باتوں میں سے کسی ایک کا اختیار ہے۔ چاہے تو اس کو رکھ لے چاہے تو پھیر دے اور ایک صاع کھجور کا بھی اس کے ساتھ دے۔)

اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ واپس کرنے کا اختیار تین دن تک ہے۔[3]

ایک صاع کھجور تین دن یا دو دن دودھ دوہنے کا عوضانہ نہیں۔ بلکہ دودھ کے عوض تو اس نے چارہ بھی ڈالا ہوگا۔ اور الخراج بالضمان کے اصول کے مطابق یہ حساب برابر ہو گیا۔ اور ایک صاع کھجور از راہ احسان یا تالیف قلب ہے۔ اور ضروری نہیں کہ یہ ایک صاع کھجور ہی ہو بلکہ یہ ہر دور میں اپنے اپنے ملکی دستور کے مطابق خوردنی غلہ یا اس کے لگ بھگ قیمت دی جا سکتی ہے۔

(۹) بیع حبل الحبلۃ: دور جاہلیت میں ایک تو یہ دستور تھا کہ لوگ حاملہ اونٹنی کے بچے کی وضع حمل سے پیشتر ہی بیع کیا کرتے تھے۔ اور دوسرا یہ تھا کہ حاملہ اونٹنی کے مادہ بچہ پیدا ہو' پھر وہ جوان ہو کر حاملہ ہو۔ تو اس کے بچے کی بیع کیا کرتے اور اس کو بیع حبل الحبلۃ کہتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں صورتوں سے منع فرمایا۔

((عَنِ ابنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ عَنْھُمَا قَالَ کَانَ اَھْلُ الْجَاھِلِیَّۃِ یَتَبَایَعُوْنَ لَحْمَ الْجَزُوْرِ اِلٰی حَبْلِ الْحَبْلَۃِ اَنْ تُنْتَجَ النَّاقَۃُ

(حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ دور جاہلیت میں لوگ حبل الحبلہ تک اونٹ کا گوشت بیچتے اور حبل الحبلہ یہ ہے کہ اونٹنی جنے

---

[1] مسلم کتاب البیوع باب تحریم بیع الرطب بالتمر الافی العرایا (۱۵۴۱/۷۱)
[2] مسلم۔ کتاب البیوع۔ باب حکم بیع المصراۃ ۱۵۲۴/۲۸
[3] مسلم۔ کتاب البیوع۔ باب حکم بیع المصراۃ ۱۵۲۴/۲۴

ثُمَّ تَحْمِلُ الَّتِي نُتِجَتْ فَنَهَاهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَنْ ذٰلِكَ-[1])) پھر اس کا بچہ حاملہ ہو اور وہ جنے- رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو اس قسم کی بیع سے منع فرمایا-)

(۱۰) **بیع الحیوان بالحیوان نسیئة**: یعنی جانور کو جانور کے عوض بیچنا- جبکہ دونوں طرف مدت ہو- مثلاً (الف) نے اپنا گھوڑا (ب) کی بھینس کے عوض بیچ دیا- اور دونوں فریق اس تبادلہ پر رضامند ہیں مگر انکے جانور ابھی تک ان کے اپنے اپنے پاس ہیں- تو اس سودا کی کچھ بھی حیثیت نہیں- جب تک یہ جانور ایک دوسرے کے قبضہ میں نہ چلے جائیں-

اسی طرح کی بیع کو جس میں دونوں طرف ادھار ہو مگر جانور کی تخصیص نہ ہو- بلکہ کوئی بھی چیز ہو بیع الدین بالدین یا بیع الکالی بالکالی بھی کہتے ہیں- مطلب سب کا ایک ہی ہے کہ دونوں طرف عوضین موجود نہ ہوں- اور اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں- سٹہ بازی میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے کہ نہ فروختنی مال موجود ہوتا ہے نہ اس کی قیمت- صرف بیعانہ پر سودا بازی ہو جاتی ہے- ایسی تمام صورتوں سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے-

((عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهٰى عَنْ بَيْعِ الْكَالِئِ بِالْكَالِئِ-[2])) (حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ادھار کی ادھار کے ساتھ بیع کرنے سے منع کیا ہے-)

(ج) دھوکے فریب والے اور اندھے سودے:

(۱۱) **منابذة**: اپنا کپڑا یا رومال وغیرہ کسی تجارتی مال پر (خصوصاً کپڑے کے تھانوں پر) پھینکنا کہ جس تھان پر رومال جا پڑے- اس کا اتنی قیمت پر سودا طے ہو گیا-

(۱۲) **ملامسة**: آنکھیں بند کر کے یا رات کے اندھیرے میں کسی تجارتی مال پر (خصوصاً کپڑے کے تھانوں پر) ہاتھ لگانا اور یہ بات پہلے طے کر لینا کہ جس مال پر ہاتھ لگے وہ اتنے کا ہوا-

(۱۳) **بیع حصاة**: کنکری پھینک کر سودا کرنا- کہ جس چیز پر کنکری جا پڑے وہ اتنی رقم کی میرے ذمہ ہے-

---

[1] مسلم- کتاب البیوع- باب تحریم بیع حبل الحبلہ ۶/۱۵۱۴ بخاری کتاب البیوع باب بیع الغرر و حبل الحبلة (۲۱۴۳)

[2] دار قطنی کتاب البیوع (۳۰۴۲، ۳۰۴۱) یہ موسیٰ بن عبیدہ الربذی کی وجہ سے ضعیف ہے- اسکی بحث پیچھے گزر چکی ہے-

(۱۴) **بیع غرر**: (دھوکہ کی بیع) عوضین[1] میں سے جب کسی ایک عوض کی بھی مقدار یا صفت یا مدت معلوم نہ ہو تو یہ بیع 'بیع غرر کہلائے گی- مثلاً ایک ماہی گیر سے یہ سودا کرنا کہ اس مرتبہ جتنی مچھلیاں جال میں آئیں وہ اتنی رقم میں میری ہوں گی- سودا کرنے والے اور ماہی گیر دونوں کو یہ معلوم نہیں کہ اس طرح جال میں کوئی مچھلی آتی بھی ہے یا نہیں یا اگر آتی ہیں تو کتنی؟ یہ غیر معلوم مقدار ہے- لہٰذا یہ بیع دھوکہ کی بیع ہے-

(۲) بیمہ کمپنی والے جب بیمہ دار سے اقساط طے کرتے ہیں تو کمپنی کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کتنی قسطیں وصول کر سکے گی- یہاں مدت نامعلوم ہے- اور ایسے ہی بیمہ دار کو معلوم نہیں ہوتا کہ اسے کچھ مل سکے گا- اور کب ملے گا پھر مجھے ملے گا یا میرے وارثوں کو- یہاں مقدار' مدت اور صفت تینوں چیزیں نامعلوم ہیں- لہٰذا یہ بیع غرر ہوئی-

(۳) اسی طرح بعض لوگ گولی پھنکوا کر مال فروخت کرتے ہیں- ایک مرتبہ گولی پھینکنے کی اجرت طے ہو جاتی ہے- اب جس چیز پر بھی گولی جا کر لگے- وہ اتنی اجرت میں مشتری کی ہو جاتی ہے اور گولی عموماً پھسلتی' پھسلتی ہر چیز کو چھوڑ کر کونے میں جا لگتی ہے- یہ مجہول الصفت کی مثال ہے- مشتری کو معلوم نہیں کہ اسے کیا مل سکے گا- لہٰذا یہ بیع بھی غلط ہوئی-

(۱۵) **بیع مضطر**: لاچار یا ضرورت مند آدمی سے سودا بازی' جو اپنی ضرورت کی وجہ سے اپنی چیز اونے پونے میں بیچنے پر مجبور ہوتا ہے-

(۱۶) **بیع نجش**: بائع کی طرف سے کچھ ایسے لوگ مقرر ہوں- جو خریدار کو دیکھ کر عین موقعہ پر آ جائیں اور سامان کی قیمت بڑھا دیں تا کہ خریدار کو زیادہ قیمت پر پھانس لے-

اب ان سے متعلق ارشادات نبوی ﷺ ملاحظہ فرمائیے-

((۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ عَنْ بَیْعِ الْحَصَاةِ وَبَیْعِ الْغَرَرِ -[2]))	(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے بیع حصاۃ (کنکریاں پھینکنے کی بیع) اور دھوکے کی بیع سے منع فرمایا-)
((۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ نَهٰی عَنْ بَیْعَتَیْنِ الْمُلَامَسَةِ وَالْمُنَابَذَةِ اَمَّا	(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمیں دو قسم کی بیع سے منع کیا گیا ایک ملامسہ اور

[1] مثلاً ایک گائے کی قیمت ہزار روپے ہے- اب گائے اور ہزار روپیہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے عوضین ہیں-

[2] صحیح مسلم کتاب البیوع- باب بطلان بیع الحصاۃ ۱۵۱۳/۴

الْمُلَامَسَةِ فَاِنْ يَلْمَسَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا ثَوْبَ صَاحِبِهٖ بِغَيْرِ تَاَمُّلٍ وَالْمُنَابَذَةُ اَنْ يَّنْبِذَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا ثَوْبَهٗ اِلَى الْاٰخِرِ وَلَمْ يَنْظُرْ وَاحِدٌ مِنْهُمَا اِلٰى ثَوْبِ صَاحِبِهٖ۔[1]))

دوسری منابذہ- ملامسہ یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک بے سوچے سمجھے دوسرے کا کپڑا دوسرے کی طرف پھینک دے- اور کوئی دوسرے کا کپڑا نہ دیکھے (اور اس طرح یہ بیع لازم ہو جائے)-

((۳) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهَى النبی ﷺ عَنْ بَيْعِ النَّجَشِ۔[2]))

(حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول نے بیع نجش سے منع فرمایا-)

((۴) عَنْ عَلِيٍّ قَالَ نَهَى النبی ﷺ عَنْ بَيْعِ الْمُضْطَرِّ وَ بَيْعِ الْغَرَرِ وَ بَيْعِ الثَّمَرَةِ قَبْلَ اَنْ تُدْرَكَ۔[3]))

(حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لاچار آدمی کو سودا بازی سے منع فرمایا' اور پھلوں کی ان کے پکنے سے پہلے بیع کرنے سے بھی منع فرمایا-)

(۱۷) بیع عربان: (سائی یا بیعانہ دینے والے سودے) کسی چیز کا سودا کر لینا اور کچھ رقم بطور بیعانہ دے کر یہ شرط کر لینا کہ اگر اتنی مدت میں رقم ادا نہ ہوئی تو بیعانہ ضبط- یا اگر بیعانہ وصول کرنے والا چیز نہ دے سکے تو بیعانہ کے ساتھ اتنی مزید رقم کا حرجانہ ادا کرے-

((عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ عَنْ بَيْعِ

(حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں

---

[1] مسلم کتاب البیوع- باب ابطال بیع الملامسة و المنابذة ۲/۱۵۱۱ بخاری کتاب البیوع- باب بیع المنابذة (۲۱۴۶)

[2] بخاری- کتاب البیوع- باب النجش (۲۱۴۲) وکتاب الحیل باب ما یکرہ من التناجش (۶۹۶۳) ابوداؤد کتاب الاجارة باب فی العربان (۳۵۰۲) ابن ماجہ کتاب التجارات باب بیع العربان (۲۱۹۲) المسند الجامع ۱۱/۱۱۵'۱۱۶ مسند احمد ۱۱/۳۳۲ (۶۷۲۳) الکامل لابن عدی ۴/۱۴۷۱ شرح السنة (۲۱۰۶) ۸/۱۳۵ التمہید ۲۴/۱۷۶ الاستذکار ۱۹/۷- الموطا کتاب البیوع باب ماجاء فی بیع العربان امام مالک نے اسے بلاغاً ایک ثقہ سے نقل کیا ہے اور وہ ثقہ موطا کی روایت میں مبہم ہے۔ اور ابن وھب کی روایت میں وہ ابن لھیعہ ہے جیسا کہ تمہید میں ہے ابن لھیعہ نے سماع کی تصریح کی ہے اور اس سے ابن وھب اور قتیبہ نے روایت کی ہے اور حارث بن عبدالرحمان بن ابی ذباب نے بیہقی وغیرہ کے ہاں اس کی متابعت کی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ روایت حسن ہے۔ اور امام بخاری نے معلق روایت (بخاری مع فتح الباری ۵/۷۵) عمر رضی اللہ تعالی عنہ سے اس بیع کے جواز کی نقل کی ہے۔ گویا عمر رضی اللہ تعالی عنہ کو یہ روایت معلوم نہ تھی واللہ اعلم رسول اللہ ﷺ کی حدیث تمام مخلوق پر حجت ہے۔

[3] ابوداؤد- کتاب البیوع- باب فی بیع المضطر (۳۳۸۲) شرح السنة (۲۱۰۴)

الْعُرْبَانِ۔ [1]) کہ نبی ﷺ نے بیع عربان سے منع فرمایا۔)

ہمارے معاشرے میں اس ''بیع عربان'' کا بہت رواج ہے۔ پلاٹوں' مکانوں اور زمینوں کے جتنے سودے ہوتے ہیں۔ اور بیعانہ کے جو اشٹام لکھے جاتے ہیں ان سب میں بیعانہ کی ضبطی والی شرط سرکاری دستاویز کا جزو لاینفک ہوتی ہے۔ یہی حال دوسرے سودوں میں بھی ہوتا ہے۔ اگر خریدار کسی مجبوری کی وجہ سے رقم بروقت مہیا نہیں کر سکا۔ تو اسکی بیعانہ کی رقم ضبط کر لینا انتہا درجہ کی سنگ دلی اور خود غرضی ہے اسی وجہ سے اس بیع کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح اگر بائع اپنی کسی مجبوری کی بناء پر چیز مہیا نہیں کر سکا۔ اور اس کے پاس مہیا نہ کر سکنے کا معقول عذر ہے۔ تو اس پر وصول کردہ بیعانہ کے ساتھ اتنی زائد رقم کا تاوان نہ پڑنا چاہیے۔

بیعانہ والے سودے مکمل نہ ہونے کی کئی صورتیں اور وجوہ ہوتی ہیں۔ مثلاً (الف) ایک جائیداد کا مالک ہے۔ (ب) اس کا خریدار ہے۔ سودا ایک لاکھ روپے میں طے پا جاتا ہے۔ اور (ب) دس ہزار روپے بطور بیعانہ (الف) کو دے دیتا ہے اور مدت ادائیگی مثلاً دو ماہ مقرر ہوتی ہے۔ اور تحریر لکھ لی جاتی ہے۔ بعد میں (ب) کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ جائیداد تو دھوکہ والی ہے یا اس کی اصل مالیت تو ۷۵ ہزار روپے سے زیادہ ہے ہی نہیں۔ لہٰذا وہ دس ہزار کی رقم چھوڑ دینا غنیمت سمجھتا ہے۔ اور بعد میں (ب) (الف) کے پاس جاتا ہی نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ سودا طے پانے کے بعد (الف) کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جائیداد تو حقیقتاً ڈیڑھ لاکھ کی تھی۔ جس کا اس نے غلطی سے ایک لاکھ میں سودا کر لیا ہے۔ لہٰذا وہ غنیمت سمجھتا ہے کہ بیعانہ کی رقم واپس موڑنے کے علاوہ دس ہزار روپے اپنے پاس سے بھی دے کر اس سودے سے جان چھڑائے اس طرح سودا مکمل نہیں ہوتا۔

ان دونوں صورتوں میں دھوکے کی بنیاد چونکہ لاعلمی ہے۔ لہٰذا علم ہو جانے کے بعد فریقین کو چاہیے اللہ سے ڈر کر نئے سرے سے سودا بازی کر لیں۔ اور اگر سمجھوتہ نہ ہو سکے تو (الف) (ب) کو اس کے بیعانہ کی رقم مبلغ دس ہزار روپے واپس کر دے۔ اسے یہ رقم ضبط کرنے کا شرعاً کوئی حق نہیں۔ ہاں اگر (ب) دس ہزار روپے میں سے کچھ رقم چھوڑنے پر یعنی نو یا آٹھ ہزار لینے پر رضامند ہو جائے تو بھی کوئی حرج نہیں اور یہ صورت بیع مصراۃ کی سی ہوگی۔ جس کا بیان

---

[1] مسند احمد ۲/۲۵۲ (۹۳۷) مساوی الاخلاق للخرائطی (۳۵۶) بیہقی ۲/۱۷ امام بغوی فرماتے ہیں۔ اسناد هذا الحدیث ضعیف۔ اس حدیث کی سند ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں شیخ من بنی تمیم مجہول راوی ہے۔

پہلے گزر چکا ہے۔

اور ایک صورت یہ کہ سودا طے پانے کے بعد (ب) کسی مجبوری کی بنا پر دو ماہ میں بقایا ۹۰ ہزار روپے فراہم کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اور اس کے پاس اس کے لیے معقول عذر بھی ہے۔ اب (الف) کے پاس بیعانہ کی رقم ضبط کرنے کی یہ دلیل ہوتی ہے۔ کہ اس دو ماہ کی مدت میں اس کے پاس فلاں یا فلاں گاہک آئے اور میرا یہ سودا فروخت ہو سکتا تھا۔ اب میرا نقصان ہو گیا ہے۔ لہٰذا میں بیعانہ کی رقم بطور ہرجانہ رکھ لینے کا حقدار ہوں۔ اس صورت میں (الف) کی دلیل شرعاً تسلیم نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ یہ معلوم نہیں کہ اس کا کسی سے سودا طے بھی پاتا یا نہ پاتا۔ اور اگر پاتا تو کتنے کو پاتا۔ لہٰذا ایسی صورت میں (الف) کو یا تو مزید مہلت دے دینا چاہیے۔ اور اس کی دلیل دور نبویؐ کا ایک واقعہ ہے۔ ایک باغ والے سے دوسرے نے کچے پھل کا سودا کر لیا اور رقم بھی دے دی۔ بعد میں کسی آفت ارضی یا سماوی سے پھل تلف ہو گیا۔ اور خریدار کو کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ اب بائع نے مشتری سے کہا کہ سال گذر چکا لہٰذا باغ کا قبضہ واپس کر دو۔ مشتری نے کہا چونکہ اس سال پھل ہی تباہ ہو گیا۔ لہٰذا مزید ایک سال قبضہ میرے پاس رہنا چاہیے۔ یہ تنازعہ رسول اللہؐ کے پاس گیا۔ تو آپ نے باغ والے سے کہا یا تو سال کی مزید مہلت دے دو۔ یا اس کی رقم واپس کر دو۔ آخر تم کس چیز کے عوض اپنے بھائی کی رقم لے رہے ہو؟ اور آئندہ کے لیے یہ فیصلہ دے دیا۔ کہ جب تک پھل پوری طرح پک نہ جائیں۔ ان کا سودا نہ کیا جائے۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ (ب) نے (الف) کو دس ہزار روپے بیعانہ ادا کر دیا۔ اور دو ماہ کے اندر اندر ہی (ب) نے (ج) سے ایک لاکھ بیس ہزار میں سودا کر کے اس سے بیعانہ لے لیا اور رجسٹری براہ راست (الف) سے (ج) کے نام کرا دی۔ اور بیس ہزار روپے مفت میں لے لیے۔ یہ صورت ہمارے ہاں مروجہ دستور کے مطابق درست سمجھی جاتی ہے۔ مگر شرعاً ناجائز ہے۔ کیونکہ جس جائیداد کا (ب) نے (ج) سے سودا کیا تھا اس پر (ب) کا ابھی قبضہ ہوا ہی نہ تھا۔ لہٰذا اس بیس ہزار روپے کی رقم کا صحیح حقدار (الف) ہی ہے۔ البتہ اسے چاہیے کہ وہ اپنی خوشی سے محنتانہ کے طور (ب) کو کچھ رقم دے دے۔ تاکہ وہ بھی خوش ہو جائے۔

اس کی درست صورت یہی ہے کہ (ب) پہلے خود جائیداد پر پوری طرح قبضہ کرے۔ اس کے بعد جتنے کو جی چاہے آگے فروخت کر دے۔

(۱۸) <u>بیع عینہ</u>: یہ ایسی بیع ہے جس میں حیلہ سازی سے سود کو بیع کی شکل دی گئی ہے اس کا بیان سود

کے باب میں گذر چکا ہے۔

تجارت کی جائز صورتیں

(۱) بیع سلم: (سلف) اس بیع میں کسی چیز کا موسم آنے سے کچھ عرصہ پہلے سودا کر لیا جاتا ہے اس سودے میں چار چیزوں کا تعین کرنا ضروری ہے (جنس' قیمت' مقدار اور مدت) اور پوری کی پوری رقم پیشگی ادا کر دی جاتی ہے۔ یہ تجارت جائز ہے۔ تاہم کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہو سکتی۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔

((عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَلْمَدِيْنَةَ وَهُمْ يُسْلِفُوْنَ فِي الثِّمَارِ السَّنَةَ وَالسَّنَتَيْنِ وَالثَّلٰثَ فَقَالَ مَنْ سَلَفَ فِيْ شَيْءٍ فَلْيُسْلِفْ فِيْ كَيْلٍ مَّعْلُوْمٍ وَوَزْنٍ مَّعْلُوْمٍ اِلٰى اَجَلٍ مَّعْلُوْمٍ۔ [1]))

(حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو لوگ پھلوں کے ایک دو یا تین سال کے لیے پیشگی سودے کر لیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جو کوئی کسی چیز میں پیشگی سودا کرے تو اسے چاہیے کہ مقررہ ماپ میں مقررہ وزن میں اور مقررہ مدت تک کے لیے سودا کرے۔)

بیع سلم میں یہ بھی شرط ہے کہ جب تک خود جنس وصول نہ کر لے۔ یہ سودا کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں کر سکتا۔ ارشاد نبوی ﷺ ملاحظہ فرمایئے۔

((مَنْ اَسْلَفَ فِيْ شَيْءٍ فَلَا يُصْرِفْهُ اِلٰى غَيْرِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّقْبِضَهٗ۔ [2]))

(جو شخص بیع سلم کرے تو مال پر قبضہ کرنے سے پہلے کسی دوسرے کی طرف یہ سودا منتقل نہ کرے۔)

بیع سلم یا سلف کے متعلق چند امور کا سمجھنا ضروری ہے۔

(۱) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سود سے ملتی جلتی شکل ہے۔ لیکن حقیقتاً معاملہ ایسا نہیں بیع

---

[1] بخاری۔ کتاب البیوع۔ باب السلم فی کیل معلوم (۲۲۳۹' ۲۲۴۰' ۲۲۴۱' ۲۲۵۳)۔ نیز مسلم کتاب المساقات باب بیع سلم (۱۲۷/۱۶۰۴)

[2] ابوداؤد۔ کتاب الاجارہ۔ باب السلف لا یحول (۳۴۶۸) ابن ماجہ کتاب التجارات باب من اسلم فی شی فلا یصرفہ الی غیرہ (۲۲۸۳) بیہقی ۶/ ۳۰۱۶ المسند الجامع ۶/ ۳۴۸' ۳۴۹ ارواء الغلیل (۱۳۷۵) اس کی سند عطیہ عوفی کی وجہ سے ضعیف ہے۔ حافظ ابن حجر وغیرہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ التلخیص الحبیر ۳/ ۲۵

سلم اور سود میں مابہ الامتیاز فرق یہ ہے کہ سود ایک ہی جنس میں طے شدہ اضافہ کا نام ہے۔ خواہ یہ بلا مدت ہو (ربا الفضل) یا مدت کے عوض ہو (ربا النسیئۃ) جبکہ بیع سلم میں جنس تبدیل ہو جاتی ہے ایک طرف نقد رقم ہے اور پیشگی دے دی جاتی ہے۔ دوسری طرف کوئی اور جنس ہے۔ جس کا بھاؤ وقت آنے پر طے شدہ بھاؤ سے کم بھی ہو سکتا ہے۔ اور زیادہ بھی۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے۔ فرض کیجئے (الف) اور (ب) میں بیع سلف کا معاہدہ ہوتا ہے اس وقت گندم کا بھاؤ ۱۰۰ روپے من ہے۔ (الف) رقم دینے والا ہے اور (ب) رقم لینے والا۔ تین ماہ بعد گندم کی نئی فصل تیار ہو گی۔ لہٰذا تین ماہ مدت طے پاتی ہے۔ اب دونوں اندازہ لگاتے ہیں کہ فصل پکنے پر گندم کا بھاؤ -/۹۰ روپے من ہو جائے گا۔ اس حساب سے (الف) پانچ من گندم کی قیمت بحساب -/۹۰ روپئے تین ماہ کی میعاد پر کل رقم -/۴۵۰ روپے (ب) کو دے دیتا ہے۔ اب گندم پکنے پر بھاؤ -/۹۰ کے بجائے -/۸۰ روپے تک آ جاتا ہے۔ اور ۵ من گندم ب کو -/۴۰۰ روپے میں مل سکتی ہے مگر وہ پابند ہے کہ -/۴۵۰ روپے میں پانچ من ہی گندم ب سے وصول کرے۔ گویا ایسی بیع میں بھی نقصان کا احتمال ہے۔ اور جس بیع میں نقصان کا احتمال موجود ہو وہ سود نہیں ہوتا۔

(۲) آج کل بڑے پیمانے پر سلف کا کاروبار نہیں ہوتا۔ زمیندار اپنی ضرورت کی رقم اپنے آڑھتی سے پیشگی لے لیتے ہیں۔ اور اس کے عوض وہ صرف اس بات کے پابند ہوتے ہیں کہ وہ اپنی جنس اسی آڑھتی کے پاس لے جائیں۔ جس سے انہوں نے ادھار لیا ہے۔ ان کی جنس موجودہ نرخ پر بکتی ہے۔ آڑھتی کا مفاد صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ اگر وہ خود جنس خریدتا ہے۔ تو فبہا ورنہ کمیشن اسے مل ہی جاتا ہے۔ اور دکان کی شہرت بھی ہوتی ہے۔ اور زمیندار یا قرض لینے والے کا بھی کچھ نقصان نہیں ہوتا۔

(۳) بیع سلم آج کل صرف چھوٹے پیمانے اور گھریلو سطح پر ہوتی ہے۔ فریقین کی ضرورت کا مسئلہ ہے۔ ضرورت والے کو پیشگی رقم مل جاتی ہے اور دینے والے کو بالعموم فائدہ ہو جاتا ہے۔ چھوٹی ضرورت والے یا غیر زمیندار آڑھتی کے پاس تو جا نہیں سکتے۔ وہ اپنی ضرورت اس طرح پوری کر لیتے ہیں۔

(۴) بیع سلم کا سودا ناقابل انتقال ہوتا ہے۔ اگر (الف) نے (ب) سے معاہدہ کیا ہے تو (ب) ہی گندم لے سکتا ہے۔ (ب) کسی دوسرے کو دلا نہیں سکتا۔ اور جب تک (ب) مال پر قبضہ

نہیں کر لیتا- اسے کسی دوسرے کے پاس فروخت بھی نہیں کر سکتا- لہٰذا بیع سلم میں ناجائز ذرائع کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں-

(۲) **ھرج**: یعنی نیلام یا بذریعہ بولی اپنی چیز کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا بیع کی یہ صورت بھی جائز ہے- بلکہ خود رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی ﷺ میں بیٹھ کر کئی بار اشیاء نیلام فرمائیں- چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں-

((عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَاعَ حِلْسًا وَقَدَحًا فَقَالَ مَنْ يَشْتَرِيْ هٰذَا الْحِلْسَ وَالْقَدَحَ؟ فَقَالَ رَجُلٌ، اَخَذْتُهُمَا بِدِرْهَمٍ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ مَنْ يَزِيْدُ عَلٰى دِرْهَمٍ فَاَعْطَاهُ رَجُلٌ دِرْهَمَيْنِ فَبَاعَهُمَا مِنْهُ- [1]))

(حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ بیچنا چاہا- فرمایا- کوئی شخص یہ ٹاٹ اور پیالہ خریدتا ہے؟ ایک شخص نے کہا میں یہ دونوں چیزیں ایک درہم میں لیتا ہوں- نبی ﷺ نے فرمایا کوئی ایک درہم سے زیادہ دیتا ہے- تو کسی نے ان دونوں چیزوں کے دو درہم دے دیئے تو آپ ﷺ نے ان کو بیچ دیا-)

اسی طرح کا ایک واقعہ ہے- ایک دفعہ ایک سائل مسجد نبوی ﷺ میں آ کر سوال کرنے لگا- حضور اکرم ﷺ نے اس سے پوچھا- ''تمہارے پاس گھر میں کچھ ہے؟ کہنے لگا- ہاں- ایک چادر ہے اور ایک رسی- آپ ﷺ نے فرمایا' دونوں چیزیں لے آؤ-

جب وہ شخص لے آیا- تو آپ ﷺ نے ان کی نیلامی شروع کی- آپ ﷺ یہ چیزیں دکھا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھنے لگے- ان کا کیا دو گے'' - ایک صحابی نے کہا ''میں ایک درہم میں خریدتا ہوں'' - آپ ﷺ نے فرمایا ''کوئی اور بولے'' - پھر ایک صحابی اسے دو درہم میں لینے پر آمادہ ہو گئے تو آپ ﷺ نے وہ اشیاء دو درہم کے عوض اس کو دے دیں-

اس رقم سے آپ ﷺ نے سائل کے لیے کلہاڑے کا پھل اور دستہ خریدا- خود اپنے

---

[1] ترمذی- ابواب البیوع- باب ماجاء فی بیع من یزید (۱۲۱۸) ابوداؤد کتاب الزکاۃ باب ماتجوز فیہ المسئلہ (۱۶۴۱) ابن ماجہ کتاب التجارات باب بیع المزایدہ (۲۱۹۸) مسند طیالسی (۱۳۲۶) ابن الجارود (۵۶۹) نسائی کتاب البیوع باب البیع فیمن یزید (۴۵۲۰) المسند الجامع ۱/۴۳۳، ۴۳۴ ارواء الغلیل (۱۲۸۹) مسند احمد ۱۹/۳۱ (۱۱۹۶۸) الاحادیث المختارہ (۲۲۶۴) ابن ابی شیبہ ۶/۵۹، ۱۲/۳۳۸ یہ روایت مذکورہ بالا کتب میں مختصر اور مطول مروی ہے اس کی سند صالح ہے۔ امام ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ بعض اہل علم نے ابوبکر الحنفی کی جہالت کی وجہ سے اسے ضعیف قرار دیا ہے لیکن ابوبکر الحنفی سے محدثین کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے اور ابن حبان و ترمذی نے اس کی توثیق کی ہے جس کی وجہ سے یہ روایت حسن ہے-

مبارک ہاتھوں سے کلہاڑا جوڑ کر سائل کے حوالے کیا اور فرمایا۔ "جنگل سے لکڑیاں لا کر بازار میں فروخت کر دیا کرو۔ اور سوال کرنے سے پرہیز کرو"۔ سائل کلہاڑا لے کر چلا گیا۔ خدا تعالیٰ نے اس کے کام میں اتنی برکت دی کہ وہ چند ہی دنوں میں خوشحال ہو گیا۔

نیلام سے متعلق درج ذیل باتیں قابل ذکر ہیں۔

(۱) جس نیلام میں بولی کے ذریعہ اگر کسی خاص آدمی کو فریب دے کر پھنسانا اور نقصان پہنچانا مقصود ہو۔ نقصان پہنچانے والا خواہ ایک فرد ہو یا چند آدمی باہمی گٹھ جوڑ سے یہ کام کریں۔ تو ایسی بولی ناجائز اور پھنسانے والے مجرم ہوتے ہیں۔ ایسی ہی بیع کو نجش کہتے ہیں۔

(۲) نیلامی برسرعام ہوتی ہے۔ اسی کی ایک صورت تحریری اور خفیہ طریق پر بھی ہے۔ جسے عام زبان میں ٹنڈر کہتے ہیں۔ ٹنڈر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کسی موجود چیز کی نشاندہی کر کے اس کے متعلق اعلان کیا جاتا ہے۔ کہ جو شخص جتنی اس کی قیمت ادا کرنا چاہتا ہے۔ وہ فلاں تاریخ تک فلاں پتہ پر لکھ کر بھیج دے۔ جو شخص اس چیز کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم کی پیش کش کرے اسے وہ چیز مل جائے گی۔ اس قسم کے ٹنڈر کو متزائد کہتے ہیں۔

دوسری صورت میں چیز مطلوب ہوتی ہے اور اعلان یہ کیا جاتا ہے کہ جو شخص فلاں تاریخ تک کم سے کم قیمت میں ایسی چیز مہیا کرے گا۔ اسی سے لی جائے گی۔ اس قسم کے ٹنڈر کو متناقص کہتے ہیں۔

یہ دونوں صورتیں ھرج ہی سے ملتی جلتی ہیں۔ اگر ان میں ناجائز ذرائع استعمال نہ کیے جائیں جیسے حیلے بہانے سے کسی غیر مستحق کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرنا وغیرہ تو یہ صورتیں شرعاً درست ہیں۔ ورنہ بیع نجش کے ضمن میں ہوں گے۔

تجارت کی پسندیدہ صورتیں

مضاربت یا مقارضت یا قراض:

مضاربت یہ ہے کہ ایک شخص کا سرمایہ یا راس المال ہو اور دوسرا اس سرمایہ سے تجارت کرے۔ نفع میں دونوں شریک ہوں۔ نفع کی نسبت کے سلسلہ میں جس بات پر فریقین کا سمجھوتہ ہو جائے۔ وہ درست ہوگا۔ تجارت کی اس قسم کی فضیلت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے۔ کہ آپ

ﷺ نے خود نبوت سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سرمایہ سے مضاربت پر کام کیا تھا۔

نیز آپ ﷺ نے فرمایا۔

((ثَلَاثٌ فِيهِنَّ الْبَرَكَةُ : اَلْبَيْعُ اِلٰى اَجَلٍ وَالْمُقَارَضَةُ وَاخْلَاطُ الْبُرِّ بِالشَّعِيْرِ لِلْبَيْتِ لَا لِلْبَيْعِ۔ [1]))

(تین چیزوں میں برکت ہے۔(۱) کاروبار میں مقررہ مدت کا پاس رکھنے میں (۲) مضاربت میں (۳) گندم اور جو کی ملاوٹ اپنے گھر کے استعمال کے لیے نہ کہ تجارت کے لیے۔)

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مضاربت ایک بابرکت کاروبار ہے۔ لیکن یہ برکت اسی صورت میں ہوگی۔ جب تک کہ فریقین میں سے کسی کی نیت میں فتور نہ آ جائے۔ اور اگر نیت میں فتور آ گیا تو سمجھئے کہ برکت ختم ہوئی۔ چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

((عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ رَفَعَهُ قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُوْلُ اَنَا ثَالِثُ الشَّرِيْكَيْنِ مَالَمْ يَخُنْ اَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ۔ فَاِذَا خَانَهُ خَرَجْتُ مِنْ بَيْنِهِمَا [2]۔ وَزَادَ رَزِيْنٌ وَجَاءَ شَيْطَانٌ۔ [3]))

(حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے مرفوعاً روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ عزوجل فرماتا ہے۔" دو شریکوں کا تیسرا میں ہوتا ہوں (یعنی ان کا مددگار ہوتا ہوں) جب تک کوئی ان میں سے اپنے ساتھی سے خیانت نہ کرے۔ پھر جب کوئی ایک خیانت کرتا ہے تو میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں۔ اور رزین نے اضافہ کیا اور (اللہ تعالیٰ کی جگہ) شیطان آ جاتا ہے۔)

یعنی جب تک شریکین نیک نیتی سے کاروبار کرتے ہیں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے اس کاروبار میں برکت یقینی ہے۔ اور جب کسی ایک کی نیت میں فتور آ گیا تو گویا اللہ تعالیٰ کی

---

[1] ابن ماجہ۔ کتاب التجارات۔ باب الشرکۃ والمضاربۃ (۲۲۸۹) المسند الجامع ۷/۵۱۸۔ اس کی سند سخت ضعیف ہے نصر بن القاسم مجہول ہے اور صالح بن صہیب مجہول الحال ہے اور عبدالرحیم مجہول بالنقل ہے اس کی روایت غیر محفوظ ہے۔ نصر بن القاسم کے بارے امام بخاری نے کہا ہے اس کی روایت موضوع ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں یہ سند مظلم اور متن باطل ہے (زوائد بوصیری اور کتاب الموضوعات لابن الجوزی وغیرھما۔

[2] ابوداؤد۔ کتاب البیوع۔ باب فی الشرکۃ۔ (۳۳۸۳) بیہقی ۶/۷۸، ۷۹ المستدرک للحاکم ۲/۵۲ اسے امام حاکم نے صحیح کہا اور امام ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔

[3] مشکوۃ۔ کتاب البیوع۔ باب الشرکۃ والوکالۃ۔ (۲۹۳۳) اس ٹکڑے کی سند کا حال مجھے معلوم نہیں۔

جگہ شیطان نے لے لی۔ اب وہ کاروبار خسارے کی نذر ہو جائے گا۔

قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دور نبوی ﷺ میں صاحب سرمایہ اور محنت کرنے والے میں نفع برابر تقسیم ہوتا تھا۔ مزارعت بھی مضاربت ہی کی طرح ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مزارعت میں سرمایہ کی جگہ زمین ہوتی ہے۔ خواہ وہ کھیت کی صورت ہو یا باغ کی۔ رسول اللہ ﷺ نے جب مہاجرین وانصار میں مواخات کا سلسلہ قائم فرمایا تو مہاجرین کے معاش کا مسئلہ یوں حل فرمایا کہ باغات انصار کے ہیں اور محنت مہاجرین کریں گے اور پیداوار میں برابر کے شریک ہوں گے۔[1]

نیز آپ ﷺ نے جب خیبر کے یہودیوں سے مزارعت کا معاملہ طے کیا تو بھی یہی فیصلہ کیا کہ یہود کو محنت کے عوض نصف پیداوار ملے گی۔[2]

امانت کے مال سے مضاربت:

دور فاروقی میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ جس سے اس مسئلہ کے کچھ پہلو سامنے آئے۔ واقعہ یہ تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دو بیٹے عبداللہ اور عبیداللہ بغرض جہاد عراق گئے۔ جب واپس آنے لگے۔ تو حاکم بصرہ ابوموسیٰ اشعری سے ملے۔ حضرت ابوموسیٰ کہنے لگے میں تمہیں کچھ فائدہ پہنچانا چاہتا ہوں۔ جس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میں بیت المال کی کچھ رقم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھیجنا چاہتا ہوں۔ وہ میں تمہیں بطور قرض دے دیتا ہوں۔ اس رقم کا مال خرید لو اور مدینہ جا کر بیچ دینا۔ نفع خود رکھ لینا اور اصل رقم امیر المؤمنین کو دے دینا۔ دونوں اس بات پر خوش ہو گئے۔ اور ابوموسیٰ نے ایک تحریر بنام امیر المؤمنین لکھ دی کہ اتنی رقم (اصل رقم) عبداللہ اور عبیداللہ سے وصول کر لیں۔

چنانچہ انہوں نے عراق سے مال خریدا اور مدینہ بیچ کر نفع حاصل کیا اور اصل زر لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حقیقت حال معلوم ہوئی۔ تو ان سے پوچھا کہ کیا ابوموسیٰ نے سب لوگوں کو اتنا اتنا روپیہ دیا تھا۔ انہوں نے کہا نہیں۔ حضرت عمرؓ کہنے لگے۔ پھر تمہیں امیر المؤمنین کا بیٹا سمجھ کر یہ روپیہ دیا ہوگا۔ اب بہتر یہ ہے کہ تم اصل اور نفع دونوں دے دو۔ عبداللہ تو چپ رہے مگر عبیداللہ کہنے لگے۔ امیر المؤمنین! اگر مال تلف ہو جاتا یا کاروبار میں نقصان ہو جاتا تو بھی ہم پوری ادائیگی کے ذمہ دار تھے۔ لہٰذا یہ ہمارا حق بنتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر تقاضا کیا

---

1. بخاری۔ کتاب الحرث والمزارعۃ (۲۳۲۵) وکتاب الشروط باب الشروط فی المعاملة (۲۷۱۹)
2. بخاری۔ کتاب الحرث والمزارعۃ۔ باب المزارعة مع الیهود (۲۳۳۱) وکتاب الحوالات باب اذا استاجر ارضا فمات احدهما (۲۲۸۵)

کہ نہیں اصل اور نفع دونوں دے دو- عبداللہ پھر چپ رہے اور عبیداللہ نے پھر وہی جواب دیا-

• حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مصاحبوں میں سے حضرت عبدالرحمن بن عوف کہنے لگے- اے امیرالمؤمنین! آپ رضی اللہ عنہ اسے مضاربت کر دیں تو بہتر ہے- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کو منظور کر لیا- اصل زر اور نصف منافع بیت المال کے لیے لے لیا- اور نصف منافع ان کو دے دیا-[1]

اس واقعہ سے تین باتیں سامنے آتی ہیں-

(۱) اس دور میں سرمایہ اور محنت کی نفع میں برابر شراکت ہوتی تھی-

(۲) مضاربت کی شکل میں سرمایہ محنت کرنے والے کے پاس بطور امانت ہوتا ہے- اگر کسی وجہ سے مال تلف ہو جائے یا سرمایہ کا نقصان ہو جائے- تو اس کا تاوان عامل (محنت کرنے والے) پر نہیں پڑتا-

(۳) قرض کی صورت میں مقروض ہر طرح کے نقصان کا ذمہ دار ہوتا ہے-

تاہم یہ ضروری نہیں کہ ہر حال میں سرمایہ اور محنت کا حصہ برابر ہو- یعنی بعض کاروبار ایسے ہوتے ہیں جن میں سرمایہ کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اور محنت کم- ایسی صورت میں محنت کا حصہ تہائی یا چوتھائی مقرر کیا جا سکتا ہے- اسی طرح جس کام کاج میں سرمایہ کی کم اور محنت کی زیادہ ضرورت ہو تو محنت کا حصہ بڑھ جائے گا- چنانچہ خلفائے راشدین کے دور میں عموماً زمینوں کی بٹائی تہائی یا چوتھائی پر ہوتی رہی ہے' یعنی زمین والے کا حصہ ۳/۱ یا ۴/۱ باقی محنت کش کا ہوتا تھا-[2]

احکام مضاربت:

مضاربت کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور قابل ذکر ہیں-

(۱) مال چوری یا تلف یا ضائع ہونے کی صورت میں اس کا تاوان رب المال پر پڑے گا اور محنت کش پر کوئی نقصان نہ پڑے گا- جیسا کہ پہلے گزر چکا-

(۲) اگر کاروبار میں نفع کے بجائے نقصان ہو گیا- تو نقصان سرمایہ والے کا ہوگا- اور عامل کی محنت ضائع گئی- لہٰذا مضاربت میں اس طرح کی شرط کرنا کہ نفع و نقصان میں دونوں شریک ہوں گے- درست نہیں-

مثلاً (۱) (الف) نے (ب) کو ایک ہزار روپے دیئے جو سال کے بعد ۱۴۰۰ ہو گئے - تو

---

[1] موطا- کتاب القراض- باب ماجاء فی القراض - اس کی سند صحیح ہے-

[2] بخاری- ماجاء فی الحرث والمزارعۃ- باب المزارعۃ بالشطر و نحوہ- ص ۴۵۹ مطبوعہ دارالسلام

(الف) کو -/۱۲۰۰ روپے اور (ب) کو -/۲۰۰ روپے ملیں گے۔ لیکن اگر سال بعد -/۹۰۰ روپے رہ جائیں تو یہ -/۹۰۰ (الف) کے ہونگے (ب) کو کچھ نہ ملے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا (الف) (ب) سے نصف نقصان یعنی -/۵۰ کا مزید مطالبہ بھی کرے۔

(۲) (الف) نے (ب) کو -/۱۰۰۰ روپے مضاربت پر دیئے۔ مگر ابتدا ہی میں -/۵۰۰ روپے کا مال چوری ہو گیا۔ باقی /۵۰۰ روپے سے (ب) نے کاروبار شروع کیا۔ جو سال بعد -/۸۰۰ روپے ہو گیا۔ اب (ب) یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس -/۸۰۰ میں سرمایہ تو صرف -/۵۰۰ روپے لگا۔ لہٰذا /۱۵۰ روپے اسے ملنا چاہیے۔ بلکہ یہ پوری رقم (الف) کو مل جائے گی۔[1]

(۳) ہاں اگر صاحب مال عامل کو پہلے سے ہدایات دے کہ تم فلاں فلاں قسم کا کام نہ کرنا۔ ورنہ نقصان کا میں ذمہ دار نہ ہوں گا۔ تو یہ شرط درست ہے۔ اس سلسلہ میں درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمایئے۔

((عَنْ حَكِيمِ بْنِ حَزَامٍ أَنَّهُ كَانَ يَشْتَرِطُ عَلَى الرَّجُلِ إِذَا أَعْطَاهُ مَالاً مُقَارَضَةً يَضْرِبُ لَهُ بِهِ أَنْ لَا تَجْعَلَ مَالِي فِي كَبِدٍ رَطْبَةٍ وَلَا تَحْمِلَهُ فِي بَحْرٍ وَلَا تَنْزِلْ بِهِ فِي بَطْنِ مَسِيلٍ فَإِنْ فَعَلْتَ شَيْئًا مِنْ ذَلِكَ فَقَدْ ضَمِنْتَ مَالِي۔[2]))

(حضرت حکیم بن حزام سے روایت ہے کہ جب وہ اپنا مال مضاربت پر دیا کرتے تو شرط طے کرتے کہ جانوروں کی بیع نہ کرنا۔ نہ بحری سفر کرنا۔ نہ میرے مال کو پانی کی گزرگاہ میں لے جانا۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بھی کام کیا تو میرے مال کی ضمانت تمہیں ادا کرنا پڑے گی۔ (دار قطنی' اس کے راوی ثقہ ہیں۔)

۲۔ شراکت

شراکت یہ ہے کہ دو شخص یا دو سے زیادہ شخص مل کر کام کریں۔ سرمایہ بھی لگائیں اور محنت بھی کریں ہر ایک کا سرمایہ کم وبیش بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں طے کرنے کی بات صرف یہ ہوتی ہے کہ سرمایہ کا کتنا حصہ ہو گا۔ اور محنت کا کتنا۔ یہ طے ہو جانے کے بعد نفع کا آسانی سے حساب کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر نقصان ہو جائے تو وہ بھی سرمایہ کی نسبت سے سرمایہ پر پڑے گا۔

ایسے تمام کاروبار جن میں دو یا زیادہ آدمی (شرعی نقطہ نظر سے دو بھائی یا زیادہ بھائی) مل

---

[1] موطا۔ کتاب القراض

[2] دار قطنی کتاب البیوع (۳۰۱۴) بیہقی ۶/۱۱۱' اسکی سند صحیح ہے۔

کر کام کریں- شریعت کی نظر میں سب پسندیدہ ہیں- خواہ یہ مضاربت کی شکل ہو یا شراکت کی یا مزارعت کی- کیونکہ مشترکہ کاروبار میں ہر ایک کو دوسرے سے ہمدردی ہونا لازمی ہوتی ہے- جب تک ان شرکاء کی نیت درست رہتی ہے تو اس کاروبار میں برکت ہوتی ہے اور اللہ ان کے ساتھ اور ان کا مددگار ہوتا ہے- لیکن جب ان کی نیت میں فتور آ جائے اور وہ خود غرضی کی طرف مائل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ درمیان سے نکل جاتا ہے اور اس کی جگہ شیطان لے لیتا ہے- برکت اٹھ جاتی ہے اور کاروبار میں خسارے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں-[1] ایسی صورت میں شریعت نے یہی ہدایت دی ہے کہ اگر ایک فریق خیانت کا مرتکب ہوتا ہے تو دوسرا یا دوسرے درگزر سے کام لیں- ہو سکتا ہے کہ آئندہ چل کر معاملہ درست ہو جائے یا ایسا خیال ہی غلط ثابت ہو- چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا-

((اَدِّ الْاَ مَانَةَ اِلٰي مَنِ ائتَمَنَکَ وَلَا تَخُنْ مَنْ خانَکَ -[2])) (جس شخص نے تیرے پاس امانت رکھی ہے اس کی امانت ادا کر- اور جو کوئی تجھ سے خیانت کرے تو اس سے خیانت نہ کر-)

شراکت کو جس قدر باعث برکت قرار دیا گیا ہے- اسی قدر ہم اس سے گریز کرتے ہیں- آج کل ہر ایک کی زبان پر یہی کلمہ ہے- "تھوڑا کر لو مگر اکیلے کرو- کیونکہ شراکت آج کل حقیقی بھائی سے بھی نہیں نبھ سکتی- آج کل شراکت کا کونسا زمانہ ہے-" اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم میں خود غرضی سے حد سے تجاوز کر چکی ہے- برداشت اور ایثار کا فقدان ہے- معمولی معمولی باتوں پر تنازعات شروع ہو جاتے ہیں- نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں فریق خیر و برکت سے محروم رہ جاتے ہیں- گویا اللہ تعالیٰ کی جگہ شیطان آ براجمان ہوتا ہے-

شراکت کی قسمیں:

شراکت کی بیشمار اقسام ہیں اور شراکت بغیر مال کے ایک قسم تو مضاربت کی ہے کہ

---

1. ابوداؤد کتاب البیوع باب فی الشرکہ (۳۳۸۳) یہ روایت پہلے گزر چکی ہے-
2. ترمذی ابواب البیوع- باب ماجاء فی النهی للمسلم - ترمذی کتاب البیوع باب نمبر ۳۸ (۱۲۶۴) ابوداؤد کتاب البیوع باب فی الرجل یأخذ حقه من تحت یده (۳۵۳۵) داری کتاب البیوع باب فی اداء الامانة فی الوزن (۲۶۰۰) المستدرک للحاکم ۲/۴۶ امام حاکم اور امام ذہبی نے اسے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے جبکہ اس کی سند میں شریک القاضی مدلس راوی ہے اور روایت عن کے ساتھ بیان کر رہا ہے اور قیس ضعیف راوی ہے-

عامل کچھ سرمایا نہیں لگاتا اور منافع میں شریک ہوتا ہے- اور ایک قسم یہ بھی ہے کہ دو یا تین یا زیادہ آدمی مل کر عہد کریں کہ جو کچھ وہ اپنے اپنے طور پر کمائیں گے- ان سب کی مجموعی آمدنی میں وہ برابر کے شریک ہوں گے- اور ایک قسم یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مثلاً ایک تاجر کسی ایک یا زیادہ آدمیوں سے یہ کہے کہ میرے مال کی اصل قیمت یہ ہے- اب جو شخص بھی جتنا مال فروخت کر سکتا ہے- وہ میرے ساتھ اس نسبت سے منافع میں شریک ہوگا- غرضیکہ اور بھی بہت سی اقسام بن سکتی ہیں ان سب سورتوں میں شرعی حکم یہی ہے کہ جو شرائط بھی آپس میں باہمی رضامندی سے طے کر لیں' بشرطیکہ کوئی شرط شریعت کے منافی نہ ہو- سب درست ہیں- اور جب تک وہ اپنی طے کردہ شرائط کے مطابق کام کریں گے- ان کے کاروبار میں برکت ہوگی اور ایسی شراکت اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے-

موجودہ دور میں شرکت کی صورتیں پہلے دور سے بہت مختلف ہیں- وسیع اور مشترکہ کاروبار کی تنظیم کی ایک صورت جائنٹ سٹاک کمپنی ہے جس میں چند آدمی مل کر ایک کاروباری کمپنی بنانے کا فیصلہ کرتے ہیں- کمپنی کے اغراض اور قواعد وضوابط مرتب کرنے کے بعد کوئی حکومت کے رجسٹرار انجمن ہائے سرمایہ مشترک سے مقررہ شرائط کے مطابق اجازت لینے کے بعد باقاعدہ کام شروع کر دیا جاتا ہے- کمپنی کے حصص تین طرح کے ہوتے ہیں-

(۱) ترجیحی حصہ:

ایسے حصہ دار کمپنی کے منافع کے سب سے پہلے دعویدار ہوتے ہیں-

(۲) عام حصہ:

ایسے حصہ داروں کو کمپنی کے نقصان کی صورت میں سب سے زیادہ نقصان اور نفع کی صورت میں سب سے زیادہ منافع ہوتا ہے-

(۳) تاخیری حصہ:

ایسے حصہ داروں کو ترجیحی اور عام حصص کے مالکوں کو منافع تقسیم کرنے کے بعد منافع ملتا ہے ہوتا یوں ہے کہ چند آدمی ایک معین رقم بطور ابتدائی سرمایہ ادا کر کے اس کے ڈائریکٹر بن جاتے ہیں- دراصل یہی لوگ کمپنی کے کرتا دھرتا ہوتے ہیں- پھر جب انہیں مزید سرمایہ کی ضرورت پیش آتی ہے تو یہ لوگ بذریعہ اعلان عام کمپنی کے حصے فروخت کرتے ہیں- اور ایک قسم کی تجارت میں حصہ داری ہوتی ہے جس کی شرح منافع تجارتی حالات کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی

ہے۔ جس کمپنی کا کاروبار زیادہ فروغ حاصل کر لے اس کے سٹاک کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ ہر قسم کے سٹاک کی خرید و فروخت عام طور پر مارکیٹ میں ایجنٹ ہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ جس کو دلالی یا کمیشن ادا کرنا پڑتی ہے۔ ایسی مارکیٹ کو سٹاک ایکس چینج کہتے ہیں۔ جائنٹ سٹاک کمپنیوں کے فروغ کے ساتھ ساتھ اس ادارہ کو بھی بہت ترقی ہوئی ہے۔

بعض اوقات چند لوگ مل کر ایک کواپریٹو سوسائٹی بنا لیتے ہیں اور معمولی اسٹور سے لے کر بڑے بڑے کارخانے اور دیگر کاروبار امداد باہمی کے اصول پر چلائے جا سکتے ہیں۔ اس قسم کی سوسائٹی کو چلانے کے لیے باقاعدہ کمیٹی مقرر کی جاتی ہے اور سوسائٹی کے حصص فروخت کر کے سرمایہ جمع کیا جاتا ہے۔ اس کے اخراجات کا باقاعدہ ہر سال آڈٹ ہوتا ہے۔ اگر سوسائٹی کو نفع ہو تو ارکان میں ان کے حصص کے حساب سے نفع تقسیم کیا جاتا ہے۔

یہ سب صورتیں ایسی ہیں جو مضاربت اور شراکت کے امتزاج سے بنتی ہیں۔ جو لوگ صرف سرمایہ لگاتے ہیں اور کاروبار میں عملاً شامل نہیں ہوتے انہیں خفیہ شریک (Sleeping Partner) کہا جاتا ہے اور ان کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو مضاربت میں صاحب سرمایہ کی ہوتی ہے۔

جواز کی شرائط:

مضاربت اور شراکت یا ان دونوں کے امتزاج سے جو شکلیں پیدا ہو چکی ہیں۔ یا آئندہ زمانہ میں ہوں گی ان میں اگر درج ذیل شرائط پائی جاتی ہوں تو یہ سب صورتیں جائز ہوں گی۔

(۱) ان میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہو۔

(۲) شرائط باہمی رضامندی سے طے پائیں یا پہلے سے طے شدہ ہوں جو سب کو معلوم ہوں۔

(۳) ان شرائط میں کوئی شرط ایسی نہ ہو جو شریعت کے منافی ہو۔

باب ۱

تجارت اور سودے بازی' مسائل واحکام

(۱) شرح منافع کیا ہو؟:

اسلام نے منافع کی کوئی شرح مقرر نہیں کی- وجہ یہ ہے کہ منافع کی شرح کا انحصار محنت پر ہے- اور محنت ہر کاروبار میں کم وبیش ہوتی ہے- مثلاً (الف) پھلوں کی منڈی سے آم کا ایک من کا ٹوکرا سو روپے میں خریدتا ہے اور وہیں منڈی کے اندر یا باہر بیٹھ کر فروخت کر دیتا ہے- تو یہ دس روپے منافع اسے بہت کافی ہے- کیونکہ وہ چاہے تو ایسے آٹھ دس ٹوکرے دن میں بیچ سکتا ہے- لیکن ایسا ہی ٹوکرا (ب) منڈی سے خرید کر کسی دوسرے شہر میں جہاں آم کی فصل نہیں یا کسی دور دراز گاؤں میں لے جاتا ہے- اور اسے بار برداری کے اخراجات بھی پڑتے ہیں- پھر یہ ٹوکرا فروخت ہونے میں پورا دن لگ جاتا ہے- اب اگر وہ ۱۰ روپے منافع رکھے تو وہ خسارہ میں رہے گا- اور اس کے لئے جائز ہوگا کہ چالیس پچاس فیصد تک نفع لے لے-

ایسے ہی حالات کے اختلاف اور محنت کی کمی بیشی کی بنا پر منافع کے لیے ایک شرح طے کرنا مشکل ہے اور اگر خدانخواستہ شریعت کوئی حد مقرر کر دیتی تو اس سے کئی طرح کے کاروبار میں سخت دشواریاں پیش آ سکتی تھیں-

تاہم اس معاملہ میں شریعت نے بالکل آزاد بھی نہیں چھوڑا- اسلام آزاد تجارت کا حامی ہے جس پر ٹیکسوں اور محصول چونگیوں کے اخراجات نہ پڑیں- صرف اس لیے کہ عام لوگوں کو اشیاء سستے داموں مہیا ہوں- اور حضرت عمرؓ تو باہر سے غلہ لانے والے کو کوئی ٹیکس لگانا تو درکنار انہیں خوش آمدید کہتے اور فرماتے کہ یہ میرے مہمان ہیں-[۱] صرف اس لئے کہ عوام کو غلہ اور دوسری ضروریات زندگی سستے داموں مہیا ہوں- ایسی ہی اغراض کی خاطر شریعت مطہرہ کا عام مزاج یہ ہے کہ منافع کم اور بکری زیادہ ہو- چنانچہ محمد بن سیرینؒ جو جلیل القدر تابعی ہیں فرمایا کرتے تھے کہ دس کا مال گیارہ میں بیچنے میں کوئی قباحت نہیں اور جو اس پر خرچہ پڑا ہے اس پر بھی یہی منافع

---

[۱] موطا- کتاب البیوع- باب الحکرۃ والتربص (۵۶) ۲/۶۵۱ یہ امام مالک کے بلاغات سے ہے-

لے سکتا ہے۔[1] جس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ عام حالات میں ۱۰ فیصد سے زیادہ منافع لینا قبیح ہے اور اخراجات' بار برداری لاگت یا اصل قیمت میں شمار ہوں گے۔

پاکستان بننے سے پیشتر ہندو تجارت پر چھایا ہوا تھا۔ اس کا عام اصول آنہ روپیہ منافع پر یعنی ۶ فیصد منافع پر کاروبار کرنا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد جب یہ میدان مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا تو اس نے کم محنت والے کاروبار میں بھی شرح منافع کو غیر معقول حد تک بڑھا دیا۔ مثلاً کپڑے کے خوردہ فروش تاجروں کو بسا اوقات ۵۰ فیصد یا اس سے بھی زیادہ منافع لیتے دیکھا جاتا ہے۔ یہ صورت حال' اور بالخصوص ایک مسلمان کے لئے انتہائی قابل افسوس ہے۔

(۲) واحد کلام یا ایک دام کی پالیسی ہی مستحسن ہے:

دوسری بات جو ہمارے کاروبار کا حصہ بن گئی ہے اور جس میں تقریباً سب پرچون فروش ملوث ہیں۔ وہ یہ ہے کہ عام طور پر دکاندار ستر اسی فیصد منافع رکھ کر اور بعض دفعہ پوری دوگنا قیمت بتا دیتے ہیں مثلاً ایک چیز کی لاگت اگر سو روپیہ ہے تو دکاندار گاہک کو اس کی قیمت دو سو روپے بتا دے گا۔ اب سودے بازی کی نوبت آتی ہے تو کسی گاہک کو دکاندار ایک سو اسی میں پھانس لے گا۔ جو جھگڑا کرنے والا ہو گا وہ ڈیڑھ سو روپے کا سودا چکائے گا۔ اور جو زیادہ جھگڑا کرے گا تو اسے وہی چیز ۱۳۰ روپے میں دے دے گا۔ اور جو گاہک اس کی قیمت ۱۱۰/- لگائے گا۔ تو دکاندار دینے سے انکار کر دے گا۔ اور جب گاہک چلا جائے گا۔

تو دکاندار پیچھے سے آواز دے کر بلا لے گا اور کہے گا۔ کہ اتنے میں یہ چیز مجھے گھر میں بھی نہیں پڑتی کچھ تو زیادہ کرو۔ بالآخر دکاندار ۱۱۰/- میں ہی مال چکا دے گا شاپنگ کرنے والی عورتوں سے تو عموماً دکاندار ایسا ہی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسی سودا بازی میں چونکہ بہت سی قباحتیں ہیں۔ اس لئے شریعت مطہرہ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

چنانچہ حضرت قیلہ ام بنی انمار رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ''میں رسول ﷺ کے پاس حاضر ہوئی آپ ﷺ اس وقت عمرہ کر رہے تھے اور مروہ پہاڑی کے پاس تھے۔ میں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ ﷺ! میں خرید و فروخت کیا کرتی ہوں اور یوں کرتی ہوں کہ مجھے کوئی چیز خریدنا مقصود ہوتی ہے اس سے کم دام لگاتی ہوں۔ پھر دام بڑھاتے بڑھاتے اس قیمت پر آ جاتی ہوں جو میرا مقصود ہوتا ہے اسی طرح جب کوئی چیز بیچتی ہوں تو جتنے کو بیچنا مقصود ہوتا ہے اس سے زیادہ دام

[1] بخاری۔ کتاب البیوع۔ باب من اجری امر الامصار

کہتی ہوں- پھر کم کرتے کرتے اپنے مقصود پر آ جاتی ہوں- آپ ﷺ نے فرمایا- قیلہ! یہ فعل اچھا نہیں جو چیز جتنے کو فروخت کرنا چاہتی ہو اتنے ہی دام کہہ دو- لینے والے کی خوشی ہو گی تو لے لے گا- ورنہ نہیں- اور جو چیز خرید و اس کی ایک قیمت کہہ دو خریدار چاہے تو لے لے ورنہ نہ لے-[1]

(۳) جس کا مال ہے قیمت وہ بتائے:

بعض دفعہ بائع اپنے مال کی قیمت اس لیے نہیں لگاتا کہ اس کے دل میں یہ چور ہوتا ہے کہ اگر میں نے زیادہ قیمت مانگ لی تو کہیں گاہک بدک ہی نہ جائے اور چیز کو فروخت کرنا بہر حال اس کا مقصود ہوتا ہے- اور یہ عموماً ایسے سودوں میں ہوتا ہے جو عام قسم کے نہیں ہوتے- لہٰذا وہ خریدار سے ہی پوچھتا ہے کہ آپ اس کا کیا دیتے ہیں؟ اب خریدار کے دل میں یہ چور ہوتا ہے کہ کہیں اتنی قیمت نہ لگا دوں جو اس کی توقع سے بڑھ کر ہو اور بائع اس سے کم قیمت پر بھی دینے کو آمادہ ہو- تاہم اس کی خواہش خریدنے کی ضرور ہوتی ہے- مثلاً ایک چیز کی موجودہ قیمت -/۱۰۰ روپے ہے جس کا بائع کو صحیح علم نہیں اور وہ دو سو روپے کہہ دیتا ہے- جبکہ خریدار کے دل میں یہ بات ہوتی ہے- کہ یہ چیز -/۵۰ روپے میں مل جائے تو لے لوں گا- ورنہ نہیں- اب وہ -/۲۰۰ روپے سن کر چلا جائیگا کہ یہ سودا میں نہیں لے سکتا- اس خطرہ کے تحت بائع قیمت لگانے سے ہچکچاتا ہے- اور خریدار سے ہی پوچھتا ہے کہ اس کا کیا دیتے ہو؟ اب خریدار کے دل میں یہ بات ہوتی ہے کہ سو روپے کی چیز کے میں -/۹۰ روپے ادا کرنے کو تیار ہوں- لیکن اگر بائع اسے -/۷۰ روپے میں بھی دینے پر رضامند ہو تو میں تو -/۲۰ روپے کے خسارے میں رہا- کیونکہ اس تکرار کی صورت عموماً اس وقت پیش آتی ہے جب بائع اور مشتری دونوں کی نیت میں فتور یا دل میں چور ہو- ایسی صورت میں شریعت نے یہ فیصلہ دیا ہے- کہ مال کی قیمت صاحب مال ہی لگانے کا زیادہ حقدار ہے[2] -سودا طے ہو یا نہ ہو-

(۴) السابق فالسابق کا اصول:

جب کسی ایک ہی چیز کے دو خریدار ہوں یا دو سے زیادہ ہوں اور اس کی یکساں یا مقررہ قیمت دینے پر تیار ہوں تو وہ چیز اس کی ہو گی جو اس غرض کے لئے پہلے پہنچا ہو یا بات کی ہو-

---

[1] ابن ماجہ- کتاب التجارات- باب السوم -(۲۲۰۴) المسند الجامع ۴۹۸/۱۰ اسکی سند میں یعلیٰ بن شبیب لین الحدیث ہے اور عبداللہ بن عثمان خثیم کا قیلہ سے سماع ثابت نہیں-

[2] بخاری- کتاب البیوع- باب صاحب السلعة احق بالسوم (۲۱۰۶)

چنانچہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ اور سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ دونوں روایت کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ دو صاحب اختیار ایک شئے کو خرید یں تو وہ چیز اسی کی ہوگی جس نے پہلے خریدی ہے۔[1] ہمارے ہاں "پہلے آئے پہلے پائے" کا جملہ یہی مفہوم ادا کرتا ہے۔

(۵) سودا فسخ کرنے کا اختیار (خیار بیع):

سودا طے ہو جانے کے بعد بھی جب تک بائع اور مشتری جدا نہ ہوں ان میں سے ہر ایک کو بیع فسخ کرنے کا اختیار رہتا ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

((اَلْمُتَبَايِعَانِ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا بِالْخِيَارِ عَلٰى صَاحِبِهِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا اِلَّا بَيْعَ الْخِيَارِ[2]))

("بیچنے والا اور خریدنے والا' دونوں سودے کو پورا کرنے یا فسخ کرنے کا اس وقت تک اختیار رکھتے ہیں جب تک کہ وہ جدا نہ ہوں۔ سوائے بیع خیار کے (جس میں معین مدت کے اندر اندر چیز واپس کرنے کی شرط ہوتی ہے۔")

ہمارے ہاں یہ غلط دستور چل نکلا ہے کہ ایک دفعہ کسی کے منہ سے بات نکل گئی۔ اور فوراً ہی اسے غلطی کا احساس ہو گیا۔ تو بھی دوسرا فریق اسے دبا لیتا ہے اور اگر وہ بات نہ مانے تو دوسروں سے دباؤ ڈلواتا ہے اور اسے مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اپنے منہ سے نکلی ہوئی بات کا پہرہ دے (خواہ اس میں اس بیچارے کو کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے) یہ بات سراسر غلط ہے۔ اور ایسی سودا بازی ناجائز ہے اس حدیث کی رو سے بھی۔ اور آیت عن تراض منکم کے حکم سے بھی ناجائز قرار پاتی ہے۔ درج ذیل حدیث اس کی مزید وضاحت کرتی ہے۔

((عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِىِّ ﷺ قَالَ لَا يَتَفَرَّقَنَّ اثْنَانِ اِلَّا عَنْ تَرَاضٍ۔[3]))

(حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے' کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ دونوں بائع اور

---

[1] ابن ماجہ کتاب التجارات۔ باب اذا باع المجيزان فهو للأول (۲۱۹۰) دارمی (۲۱۹۹) المسند الجامع (۷/ ۱۸۰' ۱۸۱) مسند احمد (۳۴/ ۲۷۶) (۲۰۰۸۵) ترمذی (۱۱۱۰) نسائی کبریٰ (۶۲۷۸) حاکم ۲/ ۱۷۵ بیہقی ۷/ ۱۴۰' ۱۴۱ ابن ابی شیبہ ۴/ ۱۳۹ نسائی کتاب البیوع۔ باب الرجل يبيع السلعة فيستحقها مستحق (۴۶۹۶) ابوداؤد کتاب النکاح باب اذا انكح الوليان (۲۰۸۸) مسند الشامیین (۲۶۴۹) حافظ ابن حجر التلخیص ۳/ ۱۶۵ میں فرماتے ہیں اس حدیث کو امام ترمذی نے حسن اور امام ابوزرعہ' ابوحاتم اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔

[2] بخاری۔ کتاب البیوع۔ باب البيعان بالخيار مالم يتفرقا (۲۱۱۱)

[3] ترمذی۔ کتاب البیوع۔ باب ماجاء في خيار المتبايعين (۱۲۴۸) ابوداؤد کتاب البیوع۔ باب فی خيار المتبايعين (۳۴۵۸) مسند احمد ۱۶/ ۵۳۷ (۱۰۹۲۲) بیہقی ۵/ ۲۷۱ اس کی سند قوی ہے۔

مشتری اس حال میں جدا نہ ہوں کہ وہ آپس
میں خوش نہ ہوں-)

لہٰذا سودا طے ہو چکنے کے بعد بھی اگر کسی فرق کی طبیعت پر ناپسندیدگی کا بار ہو- تو ایسی بیع جائز اور درست نہ ہوگی- وہ اسے جدا ہونے سے پیشتر فسخ کرنے کا پورا اختیار رکھتا ہے- ہاں جدا ہونے کے بعد بیع پکی ہو جاتی ہے-

(۲) ایسے مال کا سودا جو غائب ہو:

مثلاً (الف) نے ب سے ایک قطعہ زمین کا سودا کیا- ب نے زمین کے تمام کوائف من وعن بتلا دیے اور سودا طے پا گیا- اگر وہ قطعہ زمین بیان کردہ اوصاف کے مطابق نہ نکلے تو (الف) کو یہ اختیار ہے کہ وہ سودا فسخ کر دے- چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا-

((من اشترى شيئًا لم يره فله الخيار اذا راه [۱])) (جس نے کوئی ایسی چیز خریدی جسے اس نے دیکھا نہ ہو تو دیکھنے کے بعد اسے اختیار ہے' (کہ وہ سودا بحال رکھے یا فسخ کر دے-))

البتہ اگر وہ چیز مذکورہ اوصاف کے مطابق ہو تو سودا پکا ہوگا' چنانچہ حضرت عبداللہ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خیبر میں میرا ایک قطعہ زمین تھا- اس کا میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے سودا کر کے اس کی قیمت وصول پائی-'' [۲]

علاوہ ازیں بعض اشیاء ایسی ہوتی ہیں جن کا دیکھنا ممکن نہیں ہوتا- یا انہیں دیکھنے کی صورت میں مشقت ہوتی ہے یا نقصان ہوتا ہے- مثلاً وہ خوردنی اشیاء یا ادویات جو ڈبوں یا شیشوں میں بند ہوتی ہیں- اور محض حفاظت کی خاطر پیک کر دی جاتی ہیں- ایسی اشیاء کی خرید وفروخت عرف عام کے مطابق جائز ہے-

دوسری مثال: (الف) ایک قطعہ زمین (ب) سے خریدتا ہے- جس کی بنیادیں بھری ہوئی ہیں-

---

۱ دار قطنی کتاب البیوع (۲۷۷۹) بیہقی ۲۶۸/۵ اس کی سند میں عمر بن ابراہیم بن خالد الکردی ہے امام دار قطنی نے اسے کذاب اور خطیب بغدادی نے غیر ثقہ قرار دیا- (میزان الاعتدال ۱۸۰/۳)
امام دارقطنی فرماتے ہیں "يضع الاحاديث وهذا باطل الايصح لم يروها غيره انما يروى عن ابن سيرين موقوفاً من قوله" (۳/۵ تحت رقم (۲۷۸۱)
یہ روایات وضع کرتا تھا اور یہ روایت باطل ہے صحیح نہیں اسے اس کے علاوہ نے روایت نہیں کیا یہ ابن سیرین کا قول موقوف روایت کیا گیا ہے-
۲ دار قطنی - بیہقی - بحوالہ فقہ السنہ ج ۳ ص ۱۳۶

بنیادوں میں کس قسم کا مصالحہ لگا ہوا ہے- یہ دیکھنا بہت مشکل ہے- لہٰذا ایسے سودے بھی عرف عام کے مطابق طے کرنا درست اور جائز اور یہ سودا منعقد ہو جائے گا-

تیسری مثال- گندے انڈوں یا گندے پھلوں کی ہے-- جس کا علم انڈوں کو توڑنے پھر یا پھلوں کو کھولنے پر ہوتا ہے- عموماً عرف عام میں یہ بات شامل ہوتی ہے کہ اگر چیز گندی نکلے تو بائع یا دکاندار اس کی قیمت واپس دے دیتا ہے- تاہم ایسی چیزوں کی بیع اسی حالت میں درست اور جائز ہے-

(۷) سودا طے ہونے کے بعد کسی ایک فریق کا انکار:

اس کی دو صورتیں ہیں- ایک یہ اگر بائع انکار کرتا ہے تو مشتری اور اگر مشتری انکار کرتا ہے تو بائع کوئی گواہی پیش کرے- اس کی مثال یہ واقعہ ہے کہ ایک دفعہ رسول ﷺ نے ایک اعرابی سے ایک گھوڑے کا سودا کیا- اور قیمت ادا کرنے کے لئے اسے اپنے ساتھ لے چلے- سودا کرتے وقت گواہ کوئی بھی موجود نہ تھا- رستے میں لوگوں نے اس گنوار سے اس کے گھوڑے کی سودا بازی کی بات چیت شروع کر دی- کیونکہ انہیں علم نہیں تھا کہ یہ گھوڑا بک چکا ہے- اور خود رسول ﷺ نے خریدا ہے- نہ ہی گنوار کو یہ علم تھا کہ خریدار رسول ﷺ ہیں- یہاں تک کہ بعض لوگوں نے آپ ﷺ کی خرید سے دام بڑھا دیے- گنوار لالچ میں آ گیا اور کہنے لگا کہ گھوڑا خریدتے ہو- (یعنی رقم ابھی ادا کرتے ہو) تو خیر ورنہ میں یہ دوسرے کے ہاتھ بیچ ڈالتا ہوں-

آپ ﷺ گنوار کی یہ بات سن کر ٹھہر گئے اور اس سے پوچھا- کیا تم میرے ہاتھ یہ گھوڑا فروخت نہیں کر چکے؟ گنوار کہنے لگا! اللہ کی قسم میں نے تمہارے ہاتھ نہیں بیچا- آپ ﷺ نے فرمایا- نہیں میں تجھ سے خرید چکا ہوں- اب کچھ لوگ آپ ﷺ کے طرف دار بن گئے اور کچھ تکرار ہونے لگی- گنوار آپ ﷺ سے کہنے لگا- "اگر یہ بات ہے تو گواہ لاؤ"- گنوار نے یہ بات اس لیے کی کہ موقع پر کوئی نہیں تھا-

اتنے میں حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ اٹھے- اور گنوار سے کہنے لگے کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ تو گھوڑا بیچ چکا ہے" اس طرح گنوار کے خلاف فیصلہ ہو گیا-

بعد میں رسول اللہ ﷺ نے خزیمہ سے پوچھا کہ تم موقع پر تو موجود نہ تھے- پھر تم نے گواہی کیسے دی؟ حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے- یا رسول اللہ ﷺ! ہم تو اس واقعہ سے پہلے بہت

بڑی بڑی باتوں پر بن دیکھے آپ ﷺ کی شہادت دے چکے ہیں- یہ بات تو ان کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں- آپ ﷺ خزیمہ رضی اللہ عنہ کے اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ آئندہ خزیمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت دو گواہوں کے برابر ہوگی-‘‘[1]

یہ یاد رہے کہ حضرت خزیمہ کے بارے میں یہ حکم بس ان ہی کی ذات تک مخصوص ہے- اور اس بات کی آپ ﷺ نے صراحت کر دی ہے- اور دوسری بات جو اس واقعہ سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ شریعت نے عوام کی سہولت کی خاطر ہر سودے پر گواہ قائم کرنا لازمی قرار نہیں دیا- جیسا کہ عنوان باب سے ظاہر ہے-

اور دوسری صورت یہ ہے کہ اگر مشتری انکار کرے تو بائع کے پاس اور اگر بائع انکار کرے تو مشتری کے پاس- یعنی کسی کے پاس بھی گواہ نہ ہو- اس صورت میں بائع کی بات کا اعتبار ہوگا- اور مشتری کو اختیار ہے کہ چاہے تو بائع کی بات مان کر سودا بحال رہنے دے یا فسخ کر دے- آپ ﷺ نے فرمایا-

((اِذَا اخْتَلَفَ الْبَیِّعَانِ وَلَیْسَ بَیْنَهُمَا بَیِّنَةٌ فَهُوَ مَا یَقُوْلُ رَبُّ السِّلْعَةِ اَوْ یَتَتَارَکَانِ-[2]))

(جب بائع اور مشتری میں اختلاف ہو جائے اور ان کے درمیان کوئی شہادت یا ثبوت نہ ہو. تو بات اس شخص کی معتبر سمجھی جائے گی جو مال کا مالک ہے- یا پھر وہ سودا چھوڑ دیں-‘‘)

ترمذی کی دوسری حدیث یوں ہے-

((اِذَا اخْتَلَفَ الْبَیِّعَانِ فَالْقَوْلُ قَوْلُ

(جب بائع اور مشتری میں اختلاف ہو جائے تو

---

[1] نسائی- کتاب البیوع- باب التسهل فی ترك الاشهاد علی البیع- (۴۶۶۱) ابوداؤد کتاب الأقضیة باب اذا علم الحاکم صدق الشاهد الواحد یجوز له ان یحکم به (۳۶۰۷) المستدرک للحاکم ۲/ ۱۷‘۱۸ مسند احمد ۵/ ۲۰۵‘۲۰۶ الآحاد و المثانی (۲۰۸۵) (۲۰۸۹) طبرانی (۲۲/ ۹۴۶) بیہقی ۱۰/ ۱۴۵‘۱۴۶ المطالب العالیہ (۴۴۵۳) ابن سعد ۴/ ۳۷۸‘۳۷۹ اس کی سند صحیح ہے-

[2] ابوداؤد کتاب الاجارة- باب اذا اختلف البیعان و المبیع قائم (۳۵۱۱) نسائی کتاب البیوع- باب اختلاف المتبایعین فی الثمن (۴۶۶۲) ابن ماجہ کتاب التجارات- باب البیعان یختلفان (۲۱۸۶) مسند ابی یعلی (۴۹۸۴) دار قطنی (۲۸۲۴ تا ۲۸۴۳) بیہقی ۵/ ۳۳۲ المسند الجامع ۱۲/ ۲۰۶-۷ مسند طیالسی (۳۹۹) مسند احمد ۷/ ۴۴۰ تا ۴۴۷ دارمی کتاب البیوع- باب اذا اختلف المتبایعان (۲۵۵۲) المنتقی لابن الجارود (۶۲۵) المستدرک للحاکم ۲/ ۴۵ اس حدیث کو امام ابن الجارود‘ امام حاکم‘ امام ذہبی نے صحیح کہا ہے اور امام بیہقی فرماتے ہیں- اس کی سند حسن موصول ہے-

الْبَائِعِ وَالْمُبْتَاعُ بِالْخِيَارِ-[1])) بائع کی بات معتبر سمجھی جائے گی اور مشتری صاحب اختیار ہے۔(چاہے وہ سودا کرے یا چھوڑ دے۔))

(۸)ماپ تول کی مزدوری بائع پر ہے:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں فرمایا۔

((اِذَا بِعْتَ فَكِلْ وَاِذَا ابْتَعْتَ فَاكْتَلْ-[2])) (جب تو بیچے تو ماپ کردے اور جب خریدے تو مپوا کر لے۔)

جب کہ ہمارے ہاں یہ دستور چل نکلا ہے کہ مثلاً ٹمبر مارکیٹ میں تاجروں نے مزدور رکھے ہوتے ہیں۔ جو شہتیریاں نکال کر گاہک کو دکھاتے ہیں۔ پھر مزدور کی اجرت گاہک پر ڈال دیتے ہیں۔ اس حدیث کی رو سے مشتری سے مزدور کی مزدوری وصول کرنا ناجائز ہے۔

اسی طرح زمین کی یا مکان کی رجسٹری کے تمام مصارف مشتری پر ڈال دیے جاتے ہیں۔ یہ بات شرعاً اور قانوناً دونوں طرح درست نہیں۔ کیونکہ رجسٹری کے کاغذات بھی بائع کے نام پر ہی خریدے جاتے ہیں۔ جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قانوناً یہ اخراجات بائع کے ذمہ ہیں۔ یہی صورت زمین کی نشاندہی کے وقت پیش آتی ہے کہ اس کا خرچہ مشتری پر ڈال دیا جاتا ہے۔

یہی حال غلہ منڈیوں کا ہے کہ پلے داروں کا معاوضہ سودا ہو جانے کے بعد بائع سے وصول کیا جاتا ہے۔ جبکہ فی الواقع شرعاً وہ مشتری کے ذمے ہونا چاہیے۔

اگر یہ صورتیں فریقین میں معروف ہوں اور وہ ان پر رضامند بھی ہوں تو جواز کی صورت نکل سکتی ہے ورنہ نہیں۔ ایسے رواج کو بدلنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ واجب الاتباع بات وہی ہے۔ جو شریعت نے پیش کی ہے۔

(۹)سودا مکمل ہونے کے بعد اگر مشتری اپنا مال بائع کے پاس چھوڑ جائے:

---

[1] ترمذی کتاب البیوع۔ باب ما جاء اذا اختلف البیعان (۱۲۷۰)امام ترمذی فرماتے ہیں۔ یہ روایت مرسل ہے عون بن عبداللہ نے ابن مسعود کو نہیں پایا۔ لیکن اس کی روایت کے صحیح شواہد ہیں جیسا کہ اوپر والی حدیث ہے۔

[2] صحیح البخاری کتاب البیوع۔ باب الکیل علی البائع و المعطی ص ۳۴۰' مطبوعہ دارالسلام ریاض۔

اگر نقصان ہو جائے تو یہ نقصان مشتری کا ہوگا بائع کا نہ ہوگا- مثلاً (الف) نے (ب) سے ایک گھوڑا خریدا اور اس کی قیمت بھی ادا کر دی مگر گھوڑا اس کے پاس رہنے دیا- کہ پھر کسی وقت لے جاؤں گا- دریں اثناء وہ گھوڑا مر گیا- تو یہ نقصان (الف) کا ہوگا (ب) یعنی بائع کا نہیں ہوگا-[1]

اسی طرح زید نے ایک کپڑا فروش سے کچھ کپڑا خرید کر وہیں دکاندار کے پاس رکھ دیا کہ میں ابھی تین چار گھنٹہ بعد آ کر لے جاؤں گا- دریں اثنا کوئی اور آدمی یا گاہک آیا اور چپکے سے وہ کپڑا اڑا لے گیا- تو یہ نقصان زید کا ہوگا نہ کہ دکاندار کا-

کیونکہ ایسی صورتوں میں بائع کی حیثیت محض امین کی ہوتی ہے- اور امانت کا نقصان ہو جانے پر اس کا تاوان امین پر نہیں ہوتا-[2]

(۱۰) اگر فریقین میں سے کوئی ایک سودا مکمل ہو جانے کے بعد جھگڑا پیدا کرنے کی کوشش کرے تو وہ اللہ کے نزدیک مبغوض ہے:

((عَنْ عائشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اَبْغَضَ الرِّجَالِ اِلَی اللّٰهِ الاَ لَدُّ الْخَصِمُ-[3])) (حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا- اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ شخص وہ ہے جو سخت جھگڑالو ہے-)

لین دین کے معاملات' کاروبار اور تجارت اور شراکت وغیرہ میں بسا اوقات جھگڑے بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں- تجارت میں اگر لین دین درست نہ ہو تو بعد میں جھگڑالو آدمی خواہ مخواہ کوئی جھگڑے کی شق پیدا کر کے فائدہ اٹھا جاتے ہیں-

ایسے جھگڑالو آدمی کو پنجابی زبان میں ''رٹے خور'' کہتے ہیں- الدالخصام کا صحیح مفہوم یہ

---

[1] صحیح البخاری کتاب البیوع- باب اذا اشتری متاعا او دابة فوضعه عندالبائع او مات قبل ان یقبض-

[2] نسائی کتاب البیوع- باب الخراج بالضمان (۴۵۰۲)- ابوداؤد کتاب الاجارة- باب فیمن اشتری عبدا فاستعمله ثم وجد به عیبا (۳۵۰۸' ۳۵۰۹) ترمذی- کتاب البیوع- باب ماجاء فیمن یشتری العبد و یستغله ثم یجد به عیباً (۱۲۸۵) ابن ماجہ کتاب التجارات- باب الخروج بالضمان (۲۲۴۲) (۲۲۴۳) مسند طیالسی (۱۴۶۴) مسند علی بن جعد (۲۹۱۲' ۲۹۱۳) ابن الجارود (۶۲۷) مسند ابی یعلیٰ (۴۵۳۷' ۴۵۷۵) ابن حبان (۴۹۲۸) دارقطنی (۲۹۸۴) المستدرک للحاکم ۲/ ۱۵ بیہقی ۵/ ۳۲۱ شرح السنة (۲۱۱۹) مسند احمد ۶/ ۴۰' ۲۷۲ عبدالرزاق (۱۴۷۷۷) مسند اسحاق بن راہویہ (۷۵۰' ۷۷۵' ۷۷۶) المسند الجامع ۲۰/ ۲۳' ۲۴ یہ حدیث حسن ہے-

[3] مسلم کتاب العلم- باب فی الالدالخصم (۲۶۶۸) بخاری کتاب المظالم- باب قول اللہ تعالیٰ وھو الدالخصام (۲۴۵۷)

پنجابی لفظ رٹے خورہی ادا کر سکتا ہے- اور عام کہاوت ہے کہ ''رٹہ کا میدان کبھی خالی نہیں گیا''-
ہمارے معاشرہ میں ایسے لوگوں کا ایک گروہ پیدا ہو چکا ہے- یہ لوگ عموماً تیز طرار، زبان آور ہوتے ہیں- اور اپنی زبان آوری کی بنا پر ناحق کو حق ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں- اور دوسرے فریق کو جو فی الواقع حق پر ہوتا ہے- دبا جاتے ہیں- اور اس سے کچھ نہ کچھ وصول کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں- اور اگر معاملہ عدالت یا مصالحت کنندوں تک بھی جائے- تو بھی جیت انہی کی ہوتی ہے-

ایسے ہی ایک جھگڑا حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں بھی پیش ہوا- فریقین میں سے ایک اسی قسم کا جھگڑالو اور زبان آور تھا- آپ ﷺ نے اس کی باتوں سے متاثر ہو کر فیصلہ تو اس کے حق میں کر دیا- مگر آپ ﷺ کا اپنا ضمیر مطمئن نہیں تھا- آپ ﷺ نے فرمایا- تم میں سے بعض لوگ میرے پاس آتے ہیں- جو اپنی زبان آوری کی وجہ سے حق ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں- وہ یاد رکھیں اگر انہوں نے اپنے بھائی کا حق کھایا تو وہ جہنم کی آگ کھاتے ہیں-''[1] یعنی وہ یہ مت سمجھیں- کہ حضور ﷺ نے ان کے حق میں فیصلہ کر دیا تو اب یہ ناحق مال ان کے لئے حق ہو گیا-

یہ طبقہ لوگوں کو پریشان کرنے کے ڈھنگ بھی بخوبی جانتا ہے- پولیس اور عدالتوں میں ان کی آمدورفت اکثر رہتی ہے- جھوٹے مقدمات قائم کرنا اور رشوت دینا دلوانا خوب جانتے ہیں ان لوگوں کا موقف یہ ہوتا ہے کہ کسی بھی چیز پر، جس میں ان کا خواہ مطلق حق نہ ہو، اپنے حقوق ملکیت کا جھوٹا دعوٰی کر دیتے ہیں- اب مدعا علیہ پر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس متنازعہ چیز پر اپنا حق ثابت کرے اور مدعی کو جھوٹا ثابت کرے- اور بعض اوقات یہ طبقہ عدالت سے (stay order) بھی لے آتا ہے- اس صورت میں مدعا علیہ اور زیادہ پریشان ہو جاتا ہے- کیونکہ اس سے اس کا کام کاج بھی متاثر ہوتا ہے- ہمارے ہاں بدقسمتی سے عدالتی نظام بھی کچھ ایسا ہے- جس میں دیوانی مقدمات تو درکنار، فوجداری مقدمات بھی سالہا سال چلتے رہتے ہیں- اور فیصلہ ہونے میں نہیں آتا- ان مصائب سے مجبور ہو کر مدعا علیہ مدعی سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے- اور مدعی اس سے حسب منشا حقوق یا نقد وصول کر لیتے ہیں- عدالتوں اور تھانوں میں شرفاء کی آمدورفت اسی طبقہ کی مرہون منت ہے اس قسم کے لوگ اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ترین ہیں- ان

---

[1] بخاری- کتاب الاحکام- باب من قُضِیَ له بحق اخیه فلا یاخذه (۷۱۸۱)

ہی لوگوں کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَافِي قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ﴾ (۲:۲۰۴)

(اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جس کی بات چیت آپ کو اس دینوی زندگی میں بڑی اچھی لگتی ہے اور جو کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے (جھوٹ اور ناحق) اس پر اللہ کو گواہ بھی کرتا ہے۔ حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔)

ایسے لوگوں کی ایک حقیقت یہ بیان کی گئی ہے۔ کہ وہ خدا کی قسم اٹھا کر بھی جھوٹا بیان دیتے ہیں۔ انکا حلفیہ بیان اور گواہیاں جھوٹ ہی جھوٹ ہوتا ہے۔

ان لوگوں کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو کوئی بھی حق بات تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ بس اپنی ضد پر اڑنا جانتے ہیں۔ یا دوسروں کو تکلیف پہنچانا۔ یہ ان کی خود غرضی کی انتہا ہے۔ اور وہ اس طرح زیادہ سے زیادہ مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ایسا ہی ایک جھگڑا آپ کی خدمت میں پیش ہوا۔

ایک انصاری کے باغ میں چند کھجور کے درخت حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ بن جندب کے بھی تھے۔ وہ انصاری مع اہل وعیال اپنے باغ میں رہائش پذیر تھے۔ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ بھی باغ میں جایا کرتے تھے جس سے انصاری کے اہل وعیال کو تکلیف پہنچتی تھی۔ اس انصاری نے آنحضور ﷺ سے اس تکلیف کا ذکر کیا۔ حضور ﷺ نے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا۔ کہ وہ درخت اس انصاری کے ہاتھ فروخت کردو۔ لیکن سمرہ رضی اللہ عنہ نے یہ بات تسلیم نہ کی۔

پھر حضور اکرم ﷺ نے دوسری تجویز پیش کی۔ کہ ان کے عوض اس انصاری کو اتنے ہی اور ان جیسے کھجور کے درخت دوسری جگہ سے خرید کردے دو۔ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ نے یہ بھی تسلیم نہ کیا۔

جب سمرہ رضی اللہ عنہ نے سب تجاویز مسترد کردیں تو آنحضرت ﷺ نے اپنا فیصلہ صادر فرمادیا۔ اس انصاری سے کہا۔ جاؤ اور جا کر باغ سے سمرہ رضی اللہ عنہ کے درخت ہی کاٹ دو۔ (کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری) اور سمرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا بے شک تو ضرر پہنچانے والا شخص ہے۔[1]

حقیقتاً ایسے لوگوں کا علاج یہی ہے۔ لہٰذا لین دین کرتے وقت یا کاروبار کرتے وقت

[1] ابوداود۔ کتاب الأقضية۔ باب من القضاء (۳۶۳۶) بیہقی ۱۵۷/۶) یہ سند منقطع ہے محمد بن علی الباقر کا سمرہ بن جندب سے سماع ثابت نہیں سمرہ ۵۸ ھ میں فوت ہوئے اور محمد بن جعفر کی ولادت ۵۶ ھ یا اس کے بعد کی ہے لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔

ایسے آدمیوں سے بچنا ہی بہتر ہے۔ اور ساتھ خدا سے دعا بھی مانگتے رہنا چاہیے۔ کہ وہ ایسے لوگوں سے محفوظ رکھے جو ناحق پریشان کرتے رہتے ہیں۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا۔ کہ ایک مسلمان اور ایک یہودی کا آپس میں تنازعہ ہو گیا۔ یہودی نے مسلمان سے کہا کہ چلو تمہارے نبی ﷺ سے اس کا فیصلہ کرا لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ دونوں آپ ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے یہودی کو حق پر سمجھ کر اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ بعد میں مسلمان کہنے لگا کہ چلو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی فیصلہ کروالیں۔ اس کا خیال تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے حق میں بہت پرجوش ہیں۔ لہٰذا وہ شاید میرے ہی حق میں فیصلہ دے دیں۔ چنانچہ دونوں انکے پاس گئے اور قضیہ پیش کر چکے تو یہودی نے یہ بات بھی بتا دی کہ ہم آپ رضی اللہ عنہ کے نبی ﷺ سے پہلے فیصلہ کروا چکے ہیں اور انہوں نے میرے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر کہنے لگے کہ میں ابھی اس قضیہ کا فیصلہ کیے دیتا ہوں وہ اندر گئے اور تلوار لا کر اس مسلمان کا سر قلم کر دیا۔ جس نے آپ کے فیصلہ کے خلاف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عدالت میں اپیل کرنے کی جسارت کی تھی۔ پھر جب مقتول کے وارثوں سے دربار نبوی ﷺ میں قصاص کا مطالبہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر وارثوں کے قصاص کے مطالبہ کو رد کر دیا۔[1]

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ (الآیة) (۶۵:۴)

(تیرے پروردگار کی قسم۔ یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے تنازعات میں آپ کا حکم تسلیم نہ کرلیں۔)

یہ بھی ایک الدالخصم مسلمان کا واقعہ تھا۔

ایسا ہی ایک واقعہ دور فاروقی میں پیش آیا۔ یحییٰ بن عمارہ کہتے ہیں کہ ضحاک بن خلیفہ نے مدینہ کی ایک وادی عریض سے ایک نہر نکالی جو حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی زمین سے گزرتی تھی۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اپنی زمین میں سے نہر گزارنے سے منع کیا۔ ضحاک کہنے لگے اس میں تمہارا فائدہ ہی فائدہ ہے اپنی زمین کو کسی بھی وقت پانی دے سکو گے۔ اور تمہارا نقصان کچھ بھی نہیں۔ پھر کیوں روکتے ہو۔ لیکن محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نہ مانے۔ آخر ضحاک نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ قصہ بیان کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر کہا کہ اسے نہر گزارنے کی اجازت دے دو۔ لیکن محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نہ مانے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ تم اپنے مسلمان بھائی کو ایسی

---

[1] تفسیر ابن کثیر

بات سے منع کر رہے ہو- جس میں اس کا بھی فائدہ ہے اور تمہارا بھی فائدہ ہے- تم کسی وقت بھی پانی لے سکتے ہو اور تمہارا اس میں نقصان بھی کچھ نہیں- محمد بن مسلمہ پھر بھی نہ مانے اور کہا کہ ''واللہ! میں اجازت نہ دوں گا-'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ ہٹ دھرمی دیکھ کر کہنے لگے- ''یہ نہر گزاری جائے گی- اگرچہ تمہارے پیٹ پر سے ہو کر گزرے-'' پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ضحاک کو حکم دیا کہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی زمین سے نہر گزاریں- چنانچہ ضحاک نے ایسا ہی کیا-[1]

(۱۱) جھوٹی قسم کھا کر مال بیچنا اور پرایا مال ناحق بٹورنا:

ارشاد نبوی ﷺ ہے-

((عَنْ اَبِی اُمَامَةَ ان رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِیٍٔ مُسْلِمٍ بِيَمِيْنِهٖ فَقَدْ اَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ النَّارَ وَحَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ وَاِنْ كَانَ شَيْئًا يَسِيْراً يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ وَاِنْ قَضِيْبٌ مِنْ اِرَاکٍ-[2]))

(ابوامامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا- جو شخص قسم کھا کر کسی مسلم آدمی کا حق مار لیتا ہے تو اللہ اس کے لئے دوزخ واجب کر دیتا ہے اور جنت اس کے لئے حرام ہو جاتی ہے- ایک آدمی نے پوچھا- اگرچہ یہ حق تلفی بالکل معمولی قسم کی ہو- فرمایا- اگرچہ وہ پیلو کے درخت کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو-)

((عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَرْبَعَةٌ يُبْغِضُهُمُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اَلْبَيَّاعُ الْحَلَّافُ وَالْفَقِيْرُ الْمُخْتَالُ وَالشَّيْخُ الزَّانِیْ وَالْاِمَامُ الْجَائِرُ-[3]))

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ چار قسم کے آدمیوں سے دشمنی رکھتا ہے ایک وہ جو قسمیں کھا کھا کر سوا بازی کرتا ہو- دوسرا اکڑ باز محتاج تو تیسرا بوڑھا زانی اور چوتھا ظلم کرنے والا حاکم-)

اور ایک دفعہ یوں ارشاد فرمایا-

---

[1] موطا کتاب الاقضیۃ-باب القضاء فی المرفق (۳۳)

[2] مسلم-کتاب الایمان باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین فاجرة بالنار ۲۱۸/ ۱۳۷

[3] نسائی-کتاب الزکوٰۃ-باب الفقیر المختال (۲۵۷۵) تاریخ بغداد ۹/ ۳۵۸ صحیح الترغیب والترہیب (۱۷۹۰' ۲۱۸۶' ۲۳۹۷' ۲۹۰۷) صحیح ابن حبان ۱۲/ ۳۶۹ (۵۵۵۸) مسند الشہاب للقضاعی (۳۲۴) اس کی سند صحیح ہے-

((ثَلٰثَةٌ لَایُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَلَایَنْظُرُ اِلَیْهِمْ وَلَایُزَکِّیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ قَالَ اَبُوْذَرٍّ خَابُوْا وَخَسِرُوْا مَنْ هُمْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ اَلْمُسْبِلُ وَالْمَنَّانُ وَالْمُنْفِقُ سِلْعَتَهٗ بِالْحَلْفِ الْکَاذِبِ-[1]))

(تین شخص ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ کلام کرے گا- نہ ان کی طرف دیکھے گا- اور نہ انہیں پاک کرے گا- ان کے لئے عذاب ہے دردناک- حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا- ایسے لوگ نامراد ہوئے اور انہوں نے خسارہ اٹھایا- اے اللہ کے رسول ﷺ! وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا ایک تو وہ شخص جو اپنے پاجامہ کو ٹخنوں سے نیچے رکھتا ہے- دوسرا وہ جو احسان کر کے جتلاتا ہے تیسرا وہ جو اپنے فروختنی مال کا نکاس جھوٹی قسموں سے کرے-)

اور ایک دفعہ یوں فرمایا

((یَامَعْشَرَ التُّجَّارِ اِنَّ الْبَیْعَ یَحْضُرُهُ اللَّغْوُ وَالْحَلْفُ فَشُوْبُوْهُ بِالصَّدَقَةِ-[2]))

(اے تاجروں کے گروہ! سودے بازی میں بہت سی بیہودہ باتیں اور جھوٹی قسمیں شامل ہو جاتی ہیں لہٰذا اس کے ساتھ صدقہ بھی ملا ہو جاتی ہیں لہٰذا اس کے ساتھ صدقہ بھی ملا لیا کرو-)

(۱۲) ہبہ کردہ چیز کو خریدنا منع ہے:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک مجاہد کو اللہ کی راہ میں ایک گھوڑا دیا- لیکن اس نے اس کی پوری نگہداشت نہ کی- گھوڑا کمزور ہو گیا- اور وہ اسے فروخت کرنے بازار لایا- میں نے اس کو خرید لینے کی خواہش کی- کیونکہ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ سستے داموں فروخت

---

[1] مسلم- کتاب الایمان- باب غلظ تحریم إسبال الازار والمن بالعطیه و تنفیق السلعة بالحلف (۱۷۱/۱۰۶)

[2] ابوداؤد کتاب البیوع- باب فی التجارة یخالطها الحلف واللغو (۳۳۲۶) ترمذی کتاب البیوع- باب ماجاء فی التجارو تسمیة النبی ایاهم (۱۲۰۸) نسائی کتاب الأیمان والنذور- باب فی الحلف والکذب لمن لم یعتقد الیمین بقلبه (۳۸۰۶'۳۸۰۷'۳۸۰۸'۳۸۰۹) ابن ماجہ کتاب التجارات باب التوقی فی التجارة (۲۱۴۵) مسند طیالسی (۱۲۰۴) مسند حمیدی (۴۳۸) طبرانی ۱۸/۹۰۵'۹۰۷'۹۰۸ المسند الجامع ۱۴/۵۴۰ مسند احمد ۲۶/۵۶ (۱۶۱۳۴)
المستدرک للحاکم ۲/۵ السنن الکبریٰ للنسائی (۴۷۴۰) الآحاد والمثانی (۱۰۱۴'۱۰۱۵) ابن الجارود (۵۵۷) حلیة الأولیاء (۱۲۵/۷'۱۲۶) تاریخ بغداد ۵/۲۰۳-۲۰۴ تحفة الأخیار (۲۴۶۵'۲۴۶۶'۲۴۶۷) یہ حدیث صحیح ہے-

کرڈالے گا- میں نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا-

((لَاتَشْتَرِهِ وَاِنْ اَعْطَاكَهُ بِدِرْهَمٍ وَاحِدٍ فَاِنَّ الْعَائِدَ فِيْ صَدَقَتِهِ كَالْكَلْبِ يَعُوْدُ فِيْ قَيْئِهِ[1]))

(اسے ہرگز نہ خریدنا خواہ وہ تجھے ایک درہم میں دے کیونکہ صدقہ دے کر اسے واپس لینے والا اس کتے کی طرح ہے جو قے کر کے پھر اسے چاٹ جاتا ہے-)

(۱۳) ماپ تول میں کمی:

سودا ہو جانے کے بعد ماپ تول میں کمی بیشی کرنا گناہ کبیرہ ہے اسی گناہ کے سبب سابقہ امتوں میں سے کئی امتوں پر قہر الٰہی نازل ہوا تھا- ارشاد باری ہے-

﴿وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ-﴾ (الرحمٰن:۹) ("انصاف کے ساتھ وزن پورا کرو- اور تول میں کمی نہ کرو-")

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ o الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ o وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ o﴾ (۸۳/:۱تا۳)

(ماپ تول میں کمی کرنے والے کے لیے جہنم ہے جب وہ لوگوں سے ماپ لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور جب انہیں دیتے ہیں تو ماپ تول میں کمی کر دیتے ہیں-)

آیت بالا کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ کسی کو اس کے حق سے نہ کم دینا چاہیے نہ خود اپنے حق سے زیادہ لینا چاہیے یہ صورت صرف ماپ تول تک محدود نہیں بلکہ جہاں بھی کسی کا حق تلف کیا جائے گا وہ اسی ضمن میں آئے گا-

اور رسول ﷺ نے فرمایا-

((اِنَّكُمْ قَدْ وُلِّيْتُمْ اَمْرَيْنِ هَلَكَتْ فِيْهِ الْاُمَمُ السَّالِفَةُ قَبْلَكُمْ-[2]))

("بلاشبہ تم دو ایسے کاموں کے والی بنائے گئے ہو- کہ تم سے پہلے کئی قومیں اسی جرم کی پاداش میں ہلاک ہوئیں-")

یہ دو کام معلوم ہیں کونسے ہیں- ماپ اور تول میں کمی بیشی- یہی دو جرائم ہی تھے- جن

---

[1] بخاری- کتاب الھبہ- باب لایحل لاحد ان یرجع فی ھبتہ و صدقتہ (۲۶۲۳) وکتاب الزکاۃ باب ھل یشتری صدقتہ (۱۴۹۰)

[2] ترمذی- کتاب البیوع- باب فی المکیال و المیزان (۱۲۱۷) امام ترمذی فرماتے ہیں- اس حدیث کو ہم صرف حسین بن قیس کی حدیث سے مرفوع پہچانتے ہیں اور حسین بن قیس حدیث میں ضعیف قرار دیا گیا ہے- المستدرک للحاکم ۲/ ۳۰، ۴/ ۱۸۳ طبرانی ۱۱/ ۲۱۴، العلل المتناہیہ ۲/ ۱۰۲

کی پاداش میں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر عذاب آیا تھا۔

(۱۴) ماپ تول میں کمی کے بجائے کچھ اضافہ کرنا چاہیے:

ایک دفعہ حضور ﷺ بازار تشریف لے گئے۔ وہاں ایک تولا (وہ شخص جو کسب کے طور پر اجناس وغیرہ تولتا ہے) کوئی جنس تول رہا تھا اسے دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا۔

﴿زِنْ وَارْجِحْ﴾۔[1] (تول اور جھکتا تول (طویل حدیث کا ایک اقتباس))

ظاہر ہے کہ اس جھکتا تولنے کا فائدہ دوسرے بھائی کو ہی پہنچ سکتا ہے۔ خود تھوڑی بہت کسر کھا کر ہی دوسرے کو فائدہ پہنچانا ہی اسلامی تعلیم ہے۔ لیکن یار لوگوں نے اس معاملہ میں ایسی مہارت پیدا کر لی ہے۔ کہ دیکھنے والا یہی تصور کرتا ہے۔ کہ اسے جھکتا مل رہا ہے۔ اور گھر جا کر وزن کرے تو کبھی پورا نہیں نکلتا۔ یہی حال ماپ اور لمبائی کے پیمانوں میں ہوتا ہے۔

اب اسی ارشاد کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمایئے۔ معاشرہ جب یہ اصول اپنا لے تو کسی کو بھی کسر نہیں لگتی۔ وہ یوں کہ مثلاً یہی بائع جس کو جھکتا دینے سے کچھ کسر لگتی ہے۔ وہ جب مشتری بنے گا تو اسے بھی جھکتا ہی ملے گا۔ اسی طرح کوئی بھی خسارہ میں نہ رہے گا۔ باہمی اعتماد و ہمدردی کی فضا پیدا ہوگی اور جو اس کام پر اللہ تعالیٰ خوش ہوگا، وہ مستزاد ہے۔

(۱۴) ماپ تول کے پیمانے:

اکثر حکومتیں یہ ذمہ داری اپنے سر لیتی ہیں۔ کہ ملک میں مروجہ ماپ تول اور لمبائی کے پیمانوں کی جانچ پڑتال کے معیاری پیمانے اپنے ہاں محفوظ رکھیں۔ اگر یہ تحفظ نہ کیا جائے تو ماپ تول میں کمی بیشی کرنے والے بہت سی حدود پھلانگ جائیں۔ اسی احتیاط کی خاطر آنحضور ﷺ نے فرمایا۔

((قَالَ الْمِكْيَالُ مِكْيَالُ اَهْلِ الْمَدِيْنَةَ (تمام ملک میں ماپ کا پیمانہ تو مدینہ والوں کا

---

[1] نسائی کتاب البیوع۔ باب الرجحان فی الوزن (۴۶۰۶) ابوداؤد کتاب الاجارات۔ باب فی الرجحان فی الوزن والوزن بالأجر (۳۳۳۶، ۳۳۳۷) ترمذی کتاب البیوع۔ باب ماجاء فی الرجحان فی الوزن (۱۳۰۵) ابن ماجہ کتاب التجارات۔ باب الرجحان فی الوزن (۲۲۲۰، ۲۲۲۱) مسند طیالسی (۱۱۹۳) دارمی ۲۵۸۸ ابن حبان (۵۱۴۷) طبرانی (۷۴۰۲) المستدرک للحاکم ۱/ ۳۰، ۳۱ بیہقی ۶/ ۳۳۳۲ المسند الجامع ۷/ ۳۲۸ مسند احمد ۳۱/ ۴۴۵ (۱۹۰۹۸) الأحاد و المثانی (۱۶۶۸) ابن الجارود (۵۵۹) موضع اوہام الجمع والتفریق (۲/ ۱۵۱) یہ حدیث صحیح ہے۔

وَالْمِیْزَانُ مِیْزَانُ اَهْلِ الْمَكَّةَ-[1])) معتبر سمجھا جائیگا-اور تول کا پیمانہ مکہ والوں کا-)

(۱۵) جو چیز اپنے پاس موجود نہیں-اس کی سودابازی نہ کی جائے:

((عَنْ حَكِيْمِ ابْنِ حَزَامٍ قَالَ نَهَانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ اَبِيْعَ مَا لَيْسَ عِنْدِيْ-))

(حکیم بن حزام سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایسی چیزیں بیچنے سے منع فرمایا-جو میرے پاس موجود نہیں-)

((وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُ وَلِاَبِيْ دَاوُدَ وَ النسائى قَالَ قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ يَاْتِيْنِي الرَّجُلُ يُرِيْدُ مِنِّى الْبَيْعَ وَلَيْسَ عِنْدِيْ فَابْتَاعُ لَهُ مِنَ السُّوْقِ- قَالَ لَاتَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ-[2]))

(اور ترمذی کی ایک اور روایت جو ابوداؤد اور نسائی میں یوں مذکور ہے کہ میں (حکیم بن حزام) نے کہا-یارسول اللہ ایک شخص مجھ سے کچھ خریدنے کا ارادہ کرتا ہے-وہ چیز میرے پاس موجود نہیں ہوتی تو میں اسے بازار سے خرید کر دے دیتا ہوں-فرمایا جو چیز تیرے پاس نہیں اس کی سودے بازی مت کرو-")

کیونکہ ایسی چیز کے نہ مل سکنے کا بھی امکان ہے-اور جس نرخ پر سودا طے ہوا-بھاؤ میں کمی بیشی کا بھی امکان ہے-لہٰذا یہ صورت بھی ممنوع ہے-ہاں اگر سودابازی نہ کرے اور بازار سے بازار ہی کے نرخ پر لا کر دے دے-تو اس میں کچھ حرج نہیں-کیونکہ بازار والوں کا آپس میں لین دین ہوتا ہے-

---

[1] ابوداؤد کتاب البیوع-باب فی قول النبی ﷺ المکیال مکیال المدینة (۳۳۴۰) نسائی الزکاۃ-باب کم الصاع (۲۵۱۹) وکتاب البیوع-باب الرجحان فی الوزن (۴۶۰۸) ابن حبان (۱۱۰۵ موارد) بیہقی ۶/۳۱ بزار ۲/۸۵ (۱۲۶۲) طبرانی کبیر ۱۲/۳۹۳ (۱۳۴۴۹) حلیۃ الاولیاء ۴/۲۰ شرح السنۃ ۸/۶۹ اس حدیث کو ابن حبان' ابن الملقن' نووی دارقطنی' ابن دقیق العید وغیرہم نے صحیح قرار دیا ہے-جبکہ اس کی سند میں سفیان ثوریؒ کی تدلیس ہے-

[2] مشکوۃ کتاب البیوع-باب المنھی عنھا من البیوع (۲۸۶۷) ترمذی کتاب البیوع-باب ماجاء فی کراھیة بیع مالیس عندك (۱۲۳۳)(۱۲۳۲) ابوداؤد کتاب البیوع-باب فی الرجل یبیع مالیس عنده (۳۵۰۳) نسائی کتاب البیوع-باب بیع مالیس عندالبائع (۴۶۱۳) ابن ماجہ کتاب التجارات-باب النھی عن بیع مالیس عندك و عن ربح مالم یضمن (۲۱۸۷) مسند شافعی ۲/۱۴۳ طبرانی کبیر' (۳۰۹۷'۳۱۰۵) المسند الجامع ۵/۲۱۶'۲۱۷ عبدالرزاق (۱۴۲۱۴) مسند طیالسی (۱۳۱۸) ابن الجارود (۲۰۲) ابن حبان (۴۹۸۳) بیہقی ۵/۳۱۳ دارقطنی ۲۷۹۶'۲۷۹۸ مسند احمد ۲۴/۲۶ (۱۵۳۱۱) اس کی سند حسن ہے-اور کئی طرق سے مروی ہے-

(۱۶) مال منڈی میں پہنچنے سے پیشتر راستہ میں ہی قافلہ روک کر سودا بازی نہ کی جائے:

((عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى أَنْ يُتَلَقَّى السَّلَعَ حَتّٰى تَبْلُغَ الْأَسْوَاقَ۔[1]))

(حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے تجارتی مال کا آگے جا کر سودا کرنے سے منع کیا۔حتی کہ وہ منڈی میں اتارا جائے۔)

((وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَا تَلَقُّوا لْجَلَبَ فَمَنْ تَلَقّٰى فَاشْتَرٰى مِنْهُ فَاِذَا اَتٰى سَيِّدُهُ السُّوْقَ فَهُوَ بِالْخِيَارِ۔[2]))

(ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔''غلہ وغیرہ کے قافلوں کو آگے سے جا کر مت ملو۔ جو کوئی اس سے آگے سے مل کر مال خرید لے اور بعد میں مال کا مالک منڈی میں آئے تو اسے سودا فسخ کرنے کا اختیار ہے۔)

ایسی صورت میں بائع کے استحصال کے پورا امکان موجود ہے۔اس لیے بائع کو یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ ایسی صورت میں بازار پہنچ کر صحیح نرخ دریافت کرنے کے بعد یہ سودا فسخ کرسکتا ہے۔

(۱۶) ماپ تول کے بغیر کسی ڈھیر کا سودا کرنا ممنوع ہے:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

((نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الصَّبْرَةِ مِنَ التَّمْرِ لَا يُعْلَمُ مَكِيْلُهَا بِالْكَيْلِ الْمُسَمّٰى مِنَ التَّمْرِ۔[3]))

(رسول اللہ ﷺ نے کھجور کے ایسے ڈھیر کی سودا بازی سے منع فرمایا جس کا کھجور کے ماپنے کے معروف پیمانہ سے ماپ معلوم نہ ہو۔)

گویا کسی غلہ یا جنس کے ڈھیر کا بالمقطع سودا کرنا ممنوع ہے۔اگر وہ تول کر لینے کی چیز

---

[1] مسلم کتاب البیوع۔باب تحریم تلقی الجلب ۱۴/۱۵۱۷ اواللفظ لہ بخاری کتاب البیوع۔باب النہی عن تلقی الرکبان (۲۱۶۵)

[2] مسلم کتاب البیوع۔باب تحریم تلقی الجلب (۱۵۱۹/۱۷)

[3] مسلم۔کتاب البیوع۔باب تحریم بیع صبرۃ التمر المجهولة (۱۵۳۰/۴۲)

ہے تو تول کر اور ماپنے کی چیز ہے تو ماپ کر اس کا سودا کیا جائیگا - اور اس بارے میں اس جگہ یا ملک کے دستور کو ملحوظ رکھا جائے گا -

دور صحابہ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص نے دوسرے سے ادھار غلہ خریدنا چاہا - بائع مشتری کو بازار لے گیا - اور اسے بورے دکھا کر کہنے لگا - کون سا غلہ میں تمہارے واسطے خریدوں؟ مشتری نے کہا - کیا تو میرے ہاتھ اس چیز کو بیچتا ہے - جو تیرے پاس موجود نہیں ہے - پھر بائع اور مشتری دونوں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور آپ سے یہ معاملہ بیان کیا - حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے مشتری سے کہا - ایسی چیز مت خرید جو بائع کے پاس نہیں - اور بائع سے کہا - وہ چیز مت بیچ جو تیرے پاس موجود نہیں -[1]

(۱۸) جب تک خرید کردہ مال اپنے قبضہ میں نہ کر لیا جائے - اس کا آگے سودا نہ کیا جائے:

((عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانُوْا يَتَبَاعُوْنَ الطَّعَامَ فِيْ اَعْلَى السُّوْقِ فَيَبِيْعُوْنَهُ فِيْ مَكَانِهِ فَنَهَاهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بيعه فِيْ مَكَانِهِ حَتّٰى يَنْقِلُوْهُ -[2]))

(ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگ بازار کے بالائی حصہ میں سودا کرتے ہیں پھر وہیں بیچ دیتے ہے سو رسول اللہ ﷺ نے اسی مقام پر بیچنے سے منع فرمایا - یہاں تک کہ اس غلہ کو منتقل نہ کیا جائے (یعنی قبضہ میں نہ کر لیا جائے))

ذیل کی حدیث پہلی سے زیادہ واضح ہے -

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے بازار میں زیتون کا سودا کیا - جب سودا مکمل ہو گیا - تو مجھے ایسا آدمی ملا - جو مجھے اس پر معقول منافع دینے پر تیار تھا - میں نے ارادہ کیا کہ اسے اس کے ہاتھ بیچ دوں - اتنے میں ایک شخص نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا - میں نے مڑ کر دیکھا - وہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے - انہوں نے کہا اسے اسی مقام پر مت بیچو - جہاں تم نے خریدا ہے - تا آنکہ اسے اپنے ٹھکانے پر منتقل نہ کر لو - کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے منع کیا ہے کہ سامان اسی جگہ فروخت نہ کیا جائے جہاں خریدا ہے - تا آنکہ تاجر لوگ اسے

---

1. موطا - کتاب البیوع - باب بیع الطعام قبل ان یستوفی
2. مشکوۃ کتاب البیوع - باب المنهی عنها من البیوع (۲۸۴۳) ابوداؤد کتاب الاجارۃ - باب فی بیع الطعام قبل ان یستوفی (۳۴۹۴) بخاری کتاب البیوع - باب منتهی التلقی (۲۱۶۷) نسائی کتاب البیوع - باب بیع مایشتری من الطعام جزافاقبل أن ینقل من مکانه (۴۶۲۰)

اپنے ٹکانے پر نہ لے جائیں[1]

ہمارے ہاں یہ عام دستور ہے کہ منڈی میں سودا خرید کر انہی گوداموں میں پڑا رہنے دیتے ہیں- اور گودام کا کرایہ ادا کرتے ہیں اور پھر اسی جگہ اس کو فروخت کر دیتے ہیں- نہ اسے کسی دوسری جگہ منتقل کرتے ہیں- نہ اس پر قبضہ کرتے ہیں- اور نہ ماپ تول کر دیکھنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں- شرعاً اس قسم کی سودا بازی ممنوع ہے-

قابل سزا جرم:

ماپ تول کے بغیر غلہ کے ڈھیر کا سودا کرنا اور ایسے ہی وہاں اسے فروخت کر دینا کتنا بڑا جرم ہے اس کا اندازہ درج ذیل حدیث سے لگایا جا سکتا ہے-

حضرت سالم اپنے باپ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ-

((رَأَيْتُ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ الطَّعَامَ مُجَازَفَةً يُضْرَبُوْنَ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِنْ يَبِيْعُوْهُ حَتّٰى يُؤْوُهُ اِلٰى رِحَالِهِمْ-[2]))

(میں نے دیکھا ہے- جو لوگ اناج کے ڈھیر بن ماپے تولے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں خرید لیتے تھے- ان کو مار پڑتی تھی اس لئے کہ جب تک وہ اپنے ٹھکانے پر نہ لے جائیں نہ بیچیں-)

گویا خرید کردہ مال کی جب تک خود ماپ تول کر وہاں سے منتقل نہ کیا جائے اس کا آگے سودا نہیں کیا جا سکتا- اس سلسلہ میں درج ذیل حدیث بہت واضح ہے-

((مَنِ ابْتَاعَ طَعَامًا فَلَا يَبِعْهُ حَتّٰى يَسْتَوْفِيَهُ- وَفِيْ رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ حَتّٰى يَكْتَالَهُ-[3]))

(جو شخص غلہ خریدے- تو جب تک اس کے پورا ہونے کی تسلی نہ کر لے اس کی فروخت نہ کرے اور ابن عباس کی روایت میں ہے کہ جب تک اسے ماپ نہ لے-)

---

[1] ابوداؤد کتاب الاجارة- باب فی بیع الطعام قبل ان یستوفی (۳۴۹۹) صحیح ابن حبان (۱۱۲۰) المستدرک ۲/۴۰ مسند احمد ۵۲۲/۳۵ (۲۱۶۶۸) طبرانی (۴۷۸۲) بیہقی ۳۱۴/۵ دارقطنی (۲۸۰۵' ۲۸۰۶' ۲۸۰۷) اس کی سند حسن ہے-

[2] صحیح بخاری کتاب البیوع- باب مایذکر فی بیع الطعام و الحکرة (۲۱۳۱)

[3] صحیح البخاری- کتاب البیوع- باب بیع الطعام قبل أن یقبض و بیع مالیس عندك (۲۱۳۶) وباب الکیل علی البائع والمعطی (۲۱۲۶) ابن عباس کی روایت میں "حتی یکتالہ" کے الفاظ صحیح مسلم کتاب البیوع- باب بطلان بیع المبیع قبل القبض ۳۱/۱۵۲۵ میں ہیں-

سوچنے کی بات ہے کہ اگر کسی شخص نے کھجور یا کسی اور غلہ کا کوئی ڈھیر پچاس من سمجھ کر خریدا- اور پھر اسے تولے بغیر ۵۰ من ہی سمجھ کر آگے فروخت کر دیا- تو اس میں نہ کوئی داؤ ہے نہ جھوٹ- آخر اس میں کونسی شرعی قباحت ہے- اور کیوں لازماً اسے ماپ تول کرنے کے بعد ہی آگے فروخت کرنے کی ہدایت کی گئی ہے-

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا امکان موجود ہے- کہ ڈھیر ۵۰ من نہ ہو- بلکہ وزن کم نکلے- اور مشتری کو داؤ لگ گیا ہو- اگر ایسی صورت ہے تو شریعت آپ سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ آپ اس داؤ کو اپنے تک ہی محدود رکھیں- اور آگے آگے منتقل نہ کریں-

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک ڈھیر نرخ طے کر کے خرید لیا- ڈھیر وہیں پڑا تھا- کہ ایک اور گاہک آ گیا- اب خریدار (یا منڈی والے نے) بائع بن کر نئے گاہک سے کچھ نفع پر سودا کر لیا- اور ڈھیر کا بعد میں وزن ہوا- پہلے خریدار (منڈی والے کا) پر وزن کی کمی بیشی کا کوئی حرف ہی نہیں آتا مگر وہ صرف سودا کرنے میں منافع کا حق دار بن جاتا ہے تو ایسی صورت میں شریعت آپ سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ ایسا نفع جو وہیں کھڑے کھڑے ہوگا- اس کا اصل حقدار وہ پہلا بائع ہے نہ کہ منڈی والا- اسی طرح وزن کی کمی بیشی کا بھی اصل مالک ہی ذمہ دار ہوگا- ہمارے ہاں منڈیوں میں اس قسم کے کاروبار کا بھی بڑا رواج ہو چکا ہے-

(۱۹) ملاوٹ والی چیز یا ملی جلی جنس اگر الگ الگ ہو سکتی ہو تو الگ الگ کرنے کے بعد انہیں الگ الگ ہی بیچا جائے:

((عَنْ فُضَالَةَ ابْنِ عُبَيْدٍ قَالَ اشْتَرَيْتُ يَوْمَ خَيْبَرَ قِلَادَةً بِاثْنَيْ عَشَرَ دِينَارًا فِيهَا ذَهَبٌ وَخَرَزٌ فَفَصَّلْتُهَا فَوَجَدْتُ فِيهَا أَكْثَرَ مِنْ اثْنَيْ عَشَرَ دِينَارًا فَذَكَرْتُ ذَالِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ لَا تُبَاعُ حَتَّى يَتَفَصَّلَ-[1]))

(فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے خیبر کے دن ایک ہار بارہ دینار میں خریدا- جس میں سونا اور نگینے تھے- میں نے ان کو الگ الگ کیا- تو سونا ہی بارہ دینار سے زیادہ مالیت کا پایا- پس میں نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا- آپ ﷺ نے فرمایا- اسے جب تک الگ الگ نہ کر لیا جائے- فروخت نہ کیا جائے-)

جیسا کہ متن حدیث سے ہی ظاہر ہو رہا ہے- مخلوط جنس بیچنے سے یا بائع کو نقصان ہو گیا

[1] مسلم- کتاب البیوع- باب بیع القلادۃ فیھا خرز و ذھب (۱۵۹۱/۹۰)

مشتری کو یعنی وہ ایک دھوکا والی چیز بن جاتی ہے۔

(۲۰) جب کسی شخص کے ساتھ سودا ہو رہا ہو تو درمیان میں کوئی تیسرا آدمی اسی سودے بازی کی کوشش مت کرے:

((عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَایَبِیْعُ الرَّجُلُ عَلٰی بَیْعِ اَخِیْهِ وَلَا یَخْطُبُ عَلٰی خِطْبَةِ اَخِیْهِ اِلَّا اَنْ یَّاْذَنَ لَهٗ۔[1]))

(حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ کوئی شخص اپنے بھائی کے سودے پر سودا نہ کرے۔ نہ اپنے بھائی کی منگنی کی بات کے درمیان منگنی کرے۔ ہاں اس کی اجازت سے ایسا کر سکتا ہے۔)

(۲۱) طے شدہ سودے کو کوئی تیسرا آدمی خراب بھی نہ کرے:

((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ لَایَسِمُ الرَّجُلُ عَلٰی سَوْمِ اَخِیْهِ۔[2]))

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کے چکائے ہوئے سودے پر سودا نہ چکائے۔ (یعنی زیادہ رقم کا لالچ دے کر اپنے بھائی کا سودا خراب نہ کرے۔))

ہمارے ہاں ایسا جوڑ توڑ بھی بکثرت چل رہا ہے۔ پیسہ کے لالچ میں سب اخلاقی اصول بے دریغ پس پشت ڈال دیئے جاتے ہیں۔

(۲۲) دوسروں کو نقصان پہنچانے کی خاطر مال کم قیمت پر بیچنا:

یہ دراصل مقابلے کی شکل ہے جس سے اپنے حریف تاجر کو بھگایا جاتا ہے۔ بعض دفعہ لوگ اپنی دکان کی مشہوری کی خاطر بھی ایسا کرتے ہیں۔ جس سے دوسروں کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ ایسے کاروبار کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ناجائز قرار دیا۔ حضرت سعید بن المسیّب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب' حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے۔ جو بازار میں مارکیٹ ریٹ سے ارزاں قیمت پر منقی بیچ رہے تھے۔ آپ نے یہ صورت دیکھ کر حضرت حاطب رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔

---

[1] مسلم کتاب النکاح۔باب تحریم الخطبة علی خطبة اخیه حتی یاذن اویترك (۱۴۱۲/۵۰)
[2] مسلم کتاب النکاح۔باب تحریم الخطبة علی خطبة اخیه حتی یاذن اویترك (۱۴۱۳/۵۱)

اِمَّا اَنْ تَزِيْدَ فِي السَّعْرِ وَ اِمَّا اَنْ تَرْفَعَ مِنْ سُوْقِنَا-[1])) (یا تو تم نرخ بڑھاؤ- یا پھر ہمارے بازار سے اٹھ جاؤ-)

تاہم بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ چیز کے مالک کو اپنی چیز لاگت سے کم داموں پر بیچنے کا ہر طرح اختیار ہے[2] بشرطیکہ اس سے دوسروں کو نقصان پہنچانا مقصود نہ ہو-

(۲۳) کسی کی مجبوری سے فائدہ نہ اٹھایا جائے:

((وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قد نَهَى النبي ﷺ عَنْ بَيْعِ الْمُضْطَرِّ وَ بَيْعِ الْغَرَرِ وَ بَيْعِ الثَّمَرَةِ قَبْلَ اَنْ تُدْرِكَ-[3])) (حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لاچار آدمی سے سودا کرنے' بیع غرر اور پھلوں کے پکنے سے قبل ان کا سودا کرنے سے منع فرمایا- (بیع غرر کا بیان پہلے گذر چکا ہے' اور پھلوں کی سودا بازی کا بیان بعد میں آئے گا) نیز فرمایا-)

((عَنْ اَبِي حَرَّةَ الرَّقَاشِيِّ عَنْ عَمِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَلَا لَا تَظْلِمُوْا: اَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ-[4])) ("ابی حرہ رقاشی اپنے چچا سے بیان کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا خبردار مت ظلم کرو- خبردار کسی شخص کا مال دوسرے کے لیے اس کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں-")

موجودہ دور میں یہ دستور چل نکلا ہے- کہ لوگ اس تاک میں رہتے ہیں کہ کون ضرورت اور مجبوری کے تحت اپنا مال سستے داموں فروخت کر رہا ہے- پھر اس کی مجبوری کا پورا اندازہ کر کے اس سے سودا بازی کرتے ہیں- تاکہ زیادہ سے زیادہ قیمت گھٹا سکیں- اس طرح کسی کی مجبوری سے

---

[1] تا [2] موطا- کتاب البیوع- باب الحکرۃ و التربص (۵۷)۲/۱۴۶

[3] ابوداؤد- کتاب البیوع- باب فی بیع المضطر (۳۳۸۲) اس کی سند ضعیف ہے اس میں شیخ من بنی تمیم مجہول ہے یہ روایت پہلے گزر چکی ہے-

[4] شعب الایمان بیہقی ۴/۳۸۷ (۵۴۹۲) دارقطنی کتاب البیوع (۲۸۶۳) السنن الکبری بیہقی ۱۸۲/۸ اس کی سند علی بن زید بن جدعان کی وجہ سے ضعیف ہے۔ ہمارے پاس بیہقی اور دارقطنی کے موجود نسخوں میں اس روایت میں الالا تظلموا کے الفاظ نہیں ہیں۔ البتہ اس کے کئی ایک صحیح شواہد موجود ہیں جن میں سے عمرو بن یثربی الضمریؓ کی روایت میں ہے کہ منی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ میں موجود تھا۔ آپؐ نے اپنے خطبہ میں کہا' لایحل لامرئ من مال أخيه إلا ما طابت به نفسه" کسی آدمی کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی کے مال میں سے کوئی چیز لے مگر اس کی رضامندی کے ساتھ۔ مسند احمد ۲۴/۲۳۹ (۱۵۴۸۱) الآحاد و المثانی (۹۷۹) بیہقی ۶/۹۷ المعرفة والتاریخ للفسوی ۱/۳۳۲ دارقطنی (۲۸۶۰)(۲۸۶۱)

فائدہ اٹھانا حرام اور ایسی سودا بازی ممنوع ہے- الا یہ کہ بائع بطیّب خاطر کچھ کمی کر دے- لیکن مشتری اسے مجبور نہ کرے- اس صورت میں یہ بیع جائز تو ہوگی لیکن مستحسن پھر بھی نہ ہوگی-

ہمارے ہاں یہ حال ہے کہ مشتری خود بسا اوقات ایسے حالات پیدا کر دیتا ہے- کہ بائع خود اس کے ہاں اپنا مال کم سے کم قیمت پر فروخت کرنے پر مجبور ہو جائے- اور یہ سب کام کمال ہوشیاری' جھوٹ' فریب اور بددیانتی سے انجام دیا جاتا ہے- ایسی سودا بازی کلیتًا حرام ہے-

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور کا ایک واقعہ ہے- ایک صحابی کو کچھ ضرورت لاحق ہوئی- تو انہوں نے دوسرے صحابی کو اپنا گھوڑا ۵۰۰ درہم کے عوض فروخت کرنا چاہا- مشتری نے گھوڑے کی سواری کر کے اندازہ لگایا- کہ گھوڑا کم از کم ۸۰۰ درہم کا ہے- مشتری نے بائع سے کہا- اگر میں اسکا ۶۰۰ درہم دے دوں تو پھر- بائع بڑا خوش ہوا اور بولا- سبحان اللہ! پھر مجھے اور کیا چاہیے- وہ بولے اگر ۷۰۰ درہم دے دوں تو پھر- بائع اور خوش ہو گیا- اس طرح وہ اضافہ کرتے گئے- اور بائع ہر بار بڑا خوش ہوتا- آخر مشتری بولا- تمہارا گھوڑا تو ۸۰۰ درہم کی مالیت کا ہے- تم آخر اسے اتنا سستا کیوں بیچنا چاہتے ہو؟ بائع نے کہا- میں اپنی ضرورت سے مجبور تھا- میں اپنی لڑکی کو رخصت کرنا چاہتا تھا-'' مشتری نے کہا- لڑکی کو رخصت کرنے کے لئے تنگ ہو کر خرچ کرنے کا شرعی طور پر کوئی جواز نہیں- شریعت نے ہمیں ایسی تقریبات نہایت سادگی سے انجام دینے کا سبق دیا ہے- دوسرے یہ کہ شریعت نے ہمیں مال خریدنے کی اجازت دی ہے لوگوں کی ضرورتیں خریدنے کی اجازت نہیں دی-[1] (جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم گھوڑا نہ بیچو تو بہتر ہے) پھر جب دیکھا کہ بہر حال وہ گھوڑا بیچنا ہی چاہتا ہے- تو اس کو پوری رقم ادا کر دی-

مجبور لوگوں کی ضرورت کی سودا بازی کا نام ہی بیع مضطر ہے- جو ناجائز ہے-

(۲۴) قرض لینے کے بعد سودا بازی نہ کی جائے:

(۲۵) جس مال پر قبضہ نہیں ہوا' اس کا نفع جائز نہیں:

((عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ - لَا يَحِلُّ سَلَفٌ وَلَا بَيْعٌ وَلَا شَرْطَانِ فِيْ بَيْعٍ - وَلَا

(حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے وہ اپنے دادے سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا- (۱) پیشگی دیا ہوا قرض اور بیع جائز نہیں (۲) ایک بیع میں

[1] فتح الباری- زیر حدیث النصح لکل مسلم

رِبحَ مَالَم يُضمَنْ وَلاَ بَيْعٌ مَالَيسَ عِندَكَ-[1]))

دو شرطیں حلال نہیں- (نقد قیمت کم اور ادھار زیادہ اس کا بیان آگے آئے گا) (۳) جس چیز پر تمہارا قبضہ نہیں ہوا اس کا نفع حلال نہیں- (۴) جو چیز تمہارے پاس موجود نہیں- اس کا سودا بھی مت کرو-)

(قرض اور بیع جائز نہیں) اس سے مراد- اگر بائع پہلے ہی مشتری کا مقروض ہے- تو سودا بازی کے وقت مشتری ضرور کم قیمت لگانے کی کوشش کرے گا- اور بائع لحاظ کرنے پر مجبور ہو گا- ایسی صورت میں یہ بیع درست نہ ہو گی-

جس مال پر قبضہ نہیں ہوا- اس کا نفع حلال نہیں سے مراد یہ ہے کہ اس میں اگر نفع ہو جائے تو وہ پہلے بائع کا ہو گا- (جو اس کا پہلا مالک ہے) اور مشتری جس نے اس سے وہ مال خرید کر آگے فروخت کیا ہے- چونکہ ابھی اس مال پر اس کا قبضہ نہیں ہوا تھا- اس لئے یہ موجودہ نفع اسے نہیں بلکہ پہلے بائع کو ملے گا-

(۲) بیع شدہ چیز جب تک (بطور ضمان) بائع کے پاس رہے- یعنی خریدار نے نہ رقم ادا کی اور نہ مال اٹھایا- اس کے نفع اور نقصان کا وہی ذمہ دار ہے- جب تک کہ مشتری اسے اپنے قبضہ میں نہیں کر لیتا- اگر وہ کوئی جانور ہے اور اس مدت میں وہ بچہ جنے تو بائع ہی کا ہو گا- اور اگر مر گیا تو بھی اسکا نقصان ہے- ذیل کی حدیث بھی اس پر شاہد ہے-

((عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ان الْخَرَاجُ بِالضَّمَانِ-[2]))

(حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ صادر فرمایا- ''انتفاع باعتبار ضمان کے ہے-'')

---

[1] ابوداؤد کتاب الاجارۃ- باب فی الرجل یبیع مالیس عندہ (۳۵۰۴) ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فی کراھیۃ مالیس عندك (۱۲۳۴) نسائی کتاب البیوع- باب بیع مالیس عندالبائع (۴۶۲۵) ابن ماجہ کتاب التجارات باب النھی عن بیع مالیس عندك و عن ربح مالم یضمن (۲۱۸۸) مختصر أمسند الدارمی (۲۶۰۲) صحیح ابن حبان (۴۳۲۱) شرح معانی الاثار ۴/۴۶ الکامل لابن عدی ۵/۳۶۱۷ ادار قطنی (۳۰۵۴) مسند احمد ۱۱/۲۰۳ (۶۶۲۸) بیہقی ۵/۳۴۰ المنتقی لابن لجارود (۶۶) المستدرک للحاکم ۲/۱۷ اس حدیث کو امام ترمذی نے حسن صحیح اور امام حاکم و امام ذہبی نے صحیح کہا ہے اور ان کا فیصلہ درست ہے-

[2] نسائی- کتاب البیوع- باب الخراج بالضمان (۴۵۰۲) ابوداؤد کتاب الاجارۃ باب فیمن اشتری عبدا فاستعملہ ثم وجدبہ عیباً (۳۵۰۸'۳۵۰۹) ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فیمن یشتری العبد و یستغلہ ثم یجدبہ عیبا (۱۲۸۵) ابن ماجہ کتاب التجارات باب الخراج بالضمان (۲۲۴۲) مسند الشافعی ۲/۱۴۳' ۱۴۴' مسند طیالسی (۱۴۶۴) مسند علی بن جعد (۲۹۱۲' ۲۹۱۳) المنتقی لابن الجارود

یعنی جو نقصان کا ذمہ وار ہے- نفع بھی اس کا ہے- اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص نے بکری خریدی- اس نے مشتری کے ہاں بچہ دیا- اس نے اس کے دودھ وغیرہ سے بھی فائدہ اٹھایا اب اگر اس بکری میں کوئی ایسا عیب نکل آیا ہے جو بائع کے ہاں بھی موجود تھا- تو اب مشتری اسے پہلے داموں پر واپس کر سکتا ہے- باقی رہے وہ منافع جو خریدنے والے کو حاصل ہوئے تو فرمایا یہ اس کا حق ہے- کیونکہ اگر بکری مر جاتی تو بھی یہ نقصان اس (مشتری) کا ہی ہوتا-

(۲۶) صاف گوئی سے کام نہ لینا بہت بڑا گناہ ہے:

ارشاد نبوی ﷺ ہے-

((اَلْبَیِّعَانِ بِالْخِیَارِ مَالَمْ یَتَفَرَّقَا فَاِنْ صَدَقَا وَبَیَّنَا بُوْرِکَ لَھُمَا فِیْ بَیْعِھِمَا وَاِنْ کَذِبَا وَکَتَمَا فَمُحِقَتْ بَرَکَةُ بَیْعِھِمَا-[1]))

(بائع اور مشتری دونوں مختار ہیں (سودا طے کرنے یا فسخ کرنے کے) جب تک کہ علیحدہ نہ ہوں- پھر اگر انہوں نے صاف گوئی سے کام لیا اور مال کے عیب کی وضاحت کر دی تو ان کے سودا میں برکت دی جاتی ہے اور کچھ عیب وغیرہ چھپا گئے یا جھوٹ سے کام لیا تو ان کی بیع سے برکت اٹھالی جاتی ہے-)

ہمارے ہاں اکثر کاروبار میں بائع اور مشتری کے علاوہ ایک تیسرا شخص بھی آ داخل ہوتا ہے- جسے دلال یا کمیشن ایجنٹ کہا جاتا ہے- ان دلالوں کی طرفین سے طے شدہ کمیشن ہوتی ہے یہاں تک تو معاملہ گوارا ہے- اب دلال یہ کام کرتا ہے کہ بائع سے در پردہ الگ معاملہ طے کرتا ہے کہ میں خواہ کتنی قیمت پر بیچوں تم (بائع) اتنی رقم کے حق دار ہو- یا خود بائع ہی دلال سے کہہ دیتا ہے- کہ مجھے بہر حال اتنی رقم ملنی چاہیے- اگر تم زائد رقم وصول کر سکو تو وہ تمہاری ہے اور اس معاملہ کو مشتری سے صیغہ راز میں رکھا جاتا ہے- دلال اب مشتری کو سبز باغ دکھا کر کافی زیادہ رقم بٹور لیتا ہے- اور جب معاملہ طے ہو جائے- تو وہ یہ زائد (خفیہ) رقم بائع سے وصول کر لیتا ہے اور دونوں

(بقیہ پچھلا صفحہ) (۶۲۷) مسند ابی یعلی (۴۵۳۷' ۴۵۷۵) ابن حبان (۴۹۲۸) المستدرک للحاکم ۲/ ۱۵ بیہقی ۵/ ۳۲۱ دار قطنی (۲۹۸۴' ۲۹۸۴) مسند احمد ۴۰/ ۲۷۲ (۲۴۲۲۴) التمہید ۱۸/ ۲۰۶' ۲۰۷ عبد الرزاق (۱۴۷۷۷) مسند اسحاق بن راھویہ (۷۵۰' ۷۷۵' ۷۷۶) شرح السنۃ (۲۱۱۹) مخلد بن خفاف جمہور محدثین کے ہاں ثقہ ہے اس کی وجہ سے یہ حدیث حسن ہے-

[1] صحیح البخاری کتاب البیوع- باب البیعان بالخیار مالم یتفرقا (۲۱۱۰)

طرف سے کمیشن بھی لے لیتا ہے۔ یہ بیع ناجائز ہے۔ کیونکہ اگر مشتری کو اصل حالات کا علم ہو جائے۔ تو وہ یقیناً بیع فسخ کردے اور زائد خفیہ رقم جو دلال ہضم کر جاتے ہیں وہ یقیناً حرام ہے۔ اس بارے میں مزید احادیث بھی ملاحظہ فرمائیے۔

(۲۷) مال کا عیب چھپانا:

((عَنْ وَاثِلَةَ ابْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنْ بَاعَ عَيْبًا لَمْ يَتَنَبَّهُ لَمْ يَزَلْ فِيْ مَقْتِ اللّٰهِ اَوْلَمْ تَزَلِ الْمَلٰئِكَةُ تَلْعَنُهُ۔[1]))

(واثلہ بن الاسقع سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا۔ جس شخص نے اپنی عیب دار چیز بتائے بغیر بیچی۔ وہ اللہ کے غضب میں رہے گا یا فرشتے اس پر ہمیشہ لعنت کرتے رہیں گے۔")

آج کل عیب دار مال کو اچھے مال میں اس طرح چھپا دینا کہ مشتری سے اسکا عیب مخفی رہے۔ ایک باقاعدہ فن کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اور جو شخص اس کام میں ماہر ہو بہت سمجھدار تصور کیا جاتا ہے یا اگر کوئی جانور فروخت کرنا ہو تو اس کے اصل مالک کو اس کے متعلق جو کچھ معلوم ہوتا ہے۔ مشتری اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس طرح بائع عیب بتائے بغیر چیز کی صحیح قیمت وصول کر لیتا ہے۔ یہ صریح فریب کاری ہے اور ایسی بیع حرام ہے۔ درج ذیل حدیث اس کی مزید وضاحت کر رہی ہے۔

((عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَرَّ عَلٰى صُبْرَةِ طَعَامٍ فَاَدْخَلَ يَدَهٗ فِيْهَا

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا غلہ کے ڈھیر پر گزر ہوا آپ

---

[1] مشکوٰۃ۔ کتاب البیوع۔ باب المنھی عنھا من البیوع۔ فصل ثالث (۲۸۷۴) ابن ماجہ التجارات باب من باع عیباً فلیبینه (۲۲۴۷) المسند الجامع ۵/۶۶۱ (۱۲۰۴۲) اس کی سند میں بقیہ بن الولید مدلس ہے اور اس نے عن کے ساتھ اسے بیان کیا ہے اور سماع کی تصریح نہیں کی اسی طرح اس کا استاد معاویہ بن یحییٰ الصدفی ضعیف ہے۔ یہ روایت ابو سباع از واثلہ مسند احمد ۲۵/۳۹۴، ۳۹۵ (۱۶۰۱۳) میں بھی مروی ہے۔ اور اس میں ایک قصہ بھی ہے لیکن اس کی سند میں ابو سباع مجہول اور ابو جعفر الرازی عیسیٰ بن ابی عیسیٰ عبداللہ بن ماہان صدوق سیئ الحفظ ہے۔
البتہ اس مسئلہ کے بارے عقبہ بن عامر سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے ہوئے سنا۔ "المسلم اخو المسلم ولا یحل لمسلم باع من اخیه بیعاً فیه عیب الا بینه له" "مسلم مسلم کا بھائی ہے اور کسی مسلم کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو عیب والی چیز فروخت کرے سوائے اس کے کہ وہ عیب اس کے لیے بیان کردے۔ (سنن ابن ماجہ کتاب التجارات باب من باع عیباً فلیبینه (۲۲۴۶) المستدرک للحاکم ۲/۸، بیہقی ۵/۳۲۰، المسند الجامع ۱۳/۳۰، مسند احمد ۲۸/۶۵۳ (۱۷۴۵۱) طبرانی اوسط (۲۲۲) طبرانی کبیر ۱۷ (۸۷۷)

فَـنَـالَـتْ اَصَـابِـعَـهُ بللاً فَقَـالَ مَـا هٰـذَا يَـا صَـاحِـبَ الـطَّعَامِ قال أصَابَتْهُ السَّمَاءُ يَـارَسُـوْلَ الـلّـٰهِ قَـالَ اَفَلا جَعَلْتَهُ فَوْقَ الـطَّعَامِ كَىْ يَرَاهُ النَّاسُ مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّىْ ۔[1]))

ﷺ نے اس میں ہاتھ داخل کیا تو انگلیوں کو نمی محسوس ہوئی ۔فرمایا ۔اے غلے والے ۔یہ کیا؟ کہنے لگا ۔یا رسول اللہ ﷺ بارش ہوگئی تھی ۔آپ ﷺ نے فرمایا ۔''تو نے (اس نم دار غلے کو) ڈھیر کے اوپر کیوں نہ کردیا ۔تاکہ لوگ دیکھ سکتے ۔ پھر فرمایا جس نے دھوکہ دیا مجھ سے نہیں ۔'')

ایسے فریب کار آدمی سے آنحضور ﷺ کس قدر بے زاری کا اظہار فرمارہے ہیں ۔کہ ایسے شخص کو مجھ سے کوئی تعلق نہیں ۔لہٰذا ایسی فریب کاریوں سے پرہیز کیجئے یا پھر حضور اکرم ﷺ سے لاتعلقی گوارا کرلیجئے ۔

(۲۸) چوری کے مال کی بیع:

مسروقہ مال کی خرید وفروخت قطعاً حرام ہے ارشاد نبوی ﷺ ہے ۔

((مَـنْ وَجَـدَ عَـيْـنَ مَـالِـهِ عِنْدَ رَجُلٍ فَهُوَ أَحَـقُّ بِـهِ وَيَتَّبِـعُ الْبَيِّـعَ مَنْ بَـاعَـهُ ۔[2]))

(جس شخص نے اپنا مال بعینہٖ کسی دوسرے آدمی کے پاس پالیا تو وہ اس کا زیادہ حقدار ہے ۔اور مسروقہ مال خریدنے والا اس شخص کو ڈھونڈے جس نے اس کے پاس یہ مال بیچا تھا ۔)

معلوم ہو کہ جو دکاندار مسروقہ مال اونے پونے میں خرید لیتے ہیں ۔اور انہیں اصل حقیقت کا علم ہوتا ہے ۔شرعی نقطہ نظر سے (ارتکاب گناہ کے علاوہ) رقم ادا کردینے کے باوجود ان کا اس مال پر کچھ حق نہیں ہوتا ۔اگر صاحب مال کو معلوم ہوجائے کہ اس کا مال فلاں شخص کے پاس موجود ہے تو وہ بے روک ٹوک لے جاسکتا ہے ۔رہی مشتری دکاندار کی رقم جو وہ چور کو ادا کرچکا ہے تو اس کی یہی صورت ہے کہ وہ چور کو تلاش کرکے اس سے اپنی رقم واپس لے ۔ورنہ اس کی رقم ضائع

---

[1] مسلم ۔کتاب الایمان ۔باب قول النبی من غش فلیس منا (۱۰۲)

[2] مشکوۃ ۔کتاب البیوع (۲۹۴۹) ابوداؤد کتاب البیوع ۔باب فی الرجل یجد عین مالہ عند رجل (۳۵۳۱) نسائی کتاب البیوع ۔باب الرجل یبیع السلعۃ فیستحقھا مستحق (۴۶۹۵) مسند احمد ۳۳/۳۲۳ (۲۰۱۴۸) دارقطنی (۲۸۷۳، ۲۸۷۶) بیہقی ۶/ ۵۱، ۱۰۰، ۱۰۱ المنتقی الابن الجارود (۱۰۲۶) طبرانی کبیر (۶۸۶۰، ۶۸۶۱) یہ روایت قتادہ کی تدلیس کی وجہ سے معلول ہے ۔

ہوگئی-

چوری شدہ مال خریدنا دراصل اللہ تعالیٰ کے اس حکم لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ کی صریح خلاف ورزی ہے- چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا-

((من اشترى سرقة وهو يعلم انها سرقة فقد اشترك فى عارها واثمها-[1])) (جس نے چوری کا مال خریدا اور وہ جانتا تھا کہ وہ چوری کا مال ہے وہ چوری کے گناہ اور اس کی عار میں برابر کا شریک ہے-)

(۲۹) بیع ایک شکلیں دو:

یعنی بیعین فی بیعۃ اس کا بیان سود کے باب میں پہلے تفصیل سے گزر چکا ہے-

(۳۰) سودا واپس موڑ لینا کارثواب ہے:

((عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَنْ اَقَالَ مُسْلِمًا اَقَالَهُ اللهُ عَثْرَتَهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ-[2])) (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا- جو بائع کسی مسلمان کا سودا واپس کر لے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے گناہ موڑ دے گا- (یعنی سودا مکمل ہو جانے کے بعد پھر مشتری کی خواہش پر سودا واپس لے کر اس کی قیمت اسے دیدے- اللہ اس کے گناہ معاف فرمادے گا-)

اور ہمارے ہاں اکثر دکانوں پر لکھا ہوتا ہے- کہ ''خریدا ہوا مال واپس نہیں ہوگا''- اس واپس نہ کرنے میں جو کچھ مضمر ہے اس سے سب آگاہ ہیں- ذیل کی حدیث میں اسکی صراحت بھی موجود ہے-

---

[1] بیہقی ۵/۳۳۶ المستدرک للحاکم ۲/۳۵ اتحاف الخیرۃ المہرۃ ۴/۶۷۱ شعب الایمان ۴/۳۸۹ (۵۵۰۰) اس کی سند مسلم بن خالد الزنجی اور شرحبیل مولی الانصار کی وجہ سے ضعیف ہے- اس کا ایک شاہد المطالب العالیہ (۱۲۸۲) میں ایک مبہم راوی سے ہے-

[2] ابوداود- کتاب الاجارۃ- باب فی فضل الاقالۃ (۳۴۶۰) ابن ماجہ کتاب التجارات باب الاقالہ (۲۱۹۹) ابن حبان (۵۰۲۹' ۵۰۳۰) المستدرک للحاکم ۲/۴۵ حلیۃ الاولیاء ۶/۳۴۵ تاریخ بغداد ۸/۱۹۸ بیہقی ۶/۲۷ المسند الجامع ۱۷/۵۵۳ مسند احمد ۱۲/۴۰۱ (۷۴۳۱) المعجم لابی یعلی (۳۲۶) شعب الایمان (۸۳۱۰) المنتقی (۱۷۰) مسند شہاب (۴۵۳' ۴۵۴) اس حدیث کو امام حاکم ذہبی' امام ابن حزم اور ابن دقیق العید نے صحیح کہا ہے-

((عَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰه قَالَ الْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَالَمْ يَتَفَرَّقَا اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ صفقة خِيَارٍ وَلَا يَحِلُّ لَهٗ اَنْ يُّفَارِقَ صَاحِبَهٗ خَشْيَةَ اَنْ يَّسْتَقِيْلَهٗ۔[1]))

(حضرت عمرو بن شعیب اپنے سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا بائع اور مشتری جب تک جدا نہ ہوں سودے کے متعلق مختار ہیں۔ الا یہ کہ اختیار کی شرط بھی کر لی جائے اور دونوں میں سے کسی کے لئے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ اس خوف سے جلد جدا ہونے کی کوشش کرے کہ کہیں سودا واپس نہ ہو جائے۔)

(۳۱) مساجد میں خرید وفروخت ممنوع ہے:

مساجد اللہ تعالیٰ کے ذکر' نماز اور دینی تعلیم کے حصول کا مرکز ہیں۔ اور بازار میں کاروباری دھندوں کی گہما گہمی ہوتی ہے۔ ان دنیوی اشغال سے کچھ وقت بے تعلق ہونے اور اللہ کی یاد میں مشغول ہو کر روحانی غذا حاصل کرنے کرنے کے لئے مسجد میں پانچ وقت کی حاضری لازمی قرار دی گئی ہے تاکہ خدا تعالیٰ کے احکام کی ہر دم یاد تازہ ہوتی رہے۔ گویا مساجد اور بازار دونوں ایک دوسرے کی عین ضد ہیں۔ اسی لئے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

((اِنَّ اَحَبَّ الْبِلَادِ اِلَى اللّٰهِ تعالٰى مَسَاجِدُهَا وَاَبْغَضُ الْبِلَادِ اِلَى اللّٰهِ اَسْوَاقُهَا۔[2]))

(اللہ کے نزدیک پسندیدہ ترین جگہیں مساجد اور ناپسندیدہ ترین بازار اور منڈیاں ہیں۔)

اسی بنا پر مساجد میں کاروباری بات چیت کرنے سے منع فرما دیا گیا اور خرید وفروخت کرنے کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا رَاَيْتُمْ مَنْ يَّبِيْعُ اَوْ يَبْتَاعُ فِى الْمَسْجِدِ فَقُوْلُوْا لَا اَرْبَحَ اللّٰهُ تِجَارَتَكَ وَاِذَا رَاَيْتُمْ مَنْ يَّنْشُدُ فِيْهِ ضَالَّةً فَقُوْلُوْا لَا

(جب تم کسی کو مسجد میں کچھ فروخت کرتا یا خریدتا دیکھو تو کہہ دو اللہ تمہاری تجارت میں نفع نہ دے۔ اور جب تم کسی کو مسجد میں کوئی

[1] ترمذی۔ کتاب البیوع۔ باب البیعان بالخیار مالم یتفرقا۔ (۱۲۴۷) ابوداؤد کتاب البیوع۔ باب فی خیار المتبایعین (۳۴۵۶) نسائی کتاب البیوع۔ باب وجوب الخیار للمتبایعین قبل افتراقهما بابدانهما (۴۴۸۳) مسند احمد ۲/۳۲۹' ۳۳۰ (۶۷۲۱) بیہقی ۵/۲۷۱ دار قطنی (۲۹۷۸) المنتقی ابن الجارود (۶۲۰) یہ حدیث حسن ہے۔

[2] مسلم۔ کتاب المساجد۔ باب فضل الجلوس فی مصلاه الصبح و فضل المساجد ۲۸۶/۲۷۰

رَدَّ اللّٰهُ عَلَيْکَ[1])) گمشدہ چیز ڈھونڈتے دیکھو تو کہہ دو اللہ اسے تمہاری طرف نہ پھیرے-)

نیز جب جمعہ کی اذان ہو جائے تو سودا بازی یا کسی دوسرے کام میں مشغول ہونا جس سے خطبہ جمعہ میں خلل واقع ہو حرام ہے- یہی صورت عام نمازوں کے لیے بھی ہے-

کاروبار کے لئے مفید اصول

اب ہم دو ایسی چیزوں کا ذکر کریں گے- جن کا تعلق صرف تجارت سے خاص نہیں- تاہم تجارت کے بھی فروغ سے ان کا گہرا تعلق ہے- ان میں سے ایک تو وعدہ کی پابندی ہے- جس کی تاکید قرآن میں کئی مقامات پر آئی ہے- کاروبار میں اکثر لین دین میں ادھار ہو جاتا ہے- لہٰذا جو شخص جس حد تک اپنے وعدے کا پابند ہوگا- اسی حد تک اسکی ساکھ قائم ہوگی اور ساکھ ہی دراصل کاروبار کے فروغ کے لئے روح رواں کی حیثیت رکھتی ہے-

اور دوسری بات اپنی غرض کو بالائے طاق رکھ کر کوئی کاروباری مشورہ پوچھنے والے کو صحیح مشورہ دینا ہے- آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ[2] جس سے مشورہ کیا جائے اس کی حیثیت امین کی سی ہوتی ہے- لہٰذا اسے مشورہ خلوص اور دیانتداری سے دینا چاہیے- ہمارے ہاں یہ مرض بہت عام ہے- اگر آپ نے عمارت کا کچھ کام کرانا ہو- اور راج مستری سے مشورہ کریں تو وہ یقیناً آپ کو ایسا مشورہ دے گا- جس میں اس کا اپنا مفاد مضمر ہوگا- زیادہ کام کو تھوڑا اور زیادہ لاگت کو کم کر کے بتائے گا- جس سے اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ایک دفعہ کام شروع ہو جائے تو مالک پھنس کر آئندہ سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور ہو جائے- لہٰذا وہ ایسی باتوں سے مالک کو پھانس کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا

---

[1] ترمذی- ابواب البیوع- باب النهي عن البيع في المسجد (۱۳۲۱) ابن خزیمہ (۱۳۰۵) دارمی کتاب الصلاۃ- باب النهي عن استنشاد الضالة في المسجد (۱۴۴۱) ابن حبان ۱۶۵۰) موارد الظمآن (۳۱۳) عمل اليوم والليلة للنسائی (۱۷۶) المنتقی ابن الجارود (۵۶۲) بیہقی ۲/ ۴۴۷ المستدرک للحاکم ۲/ ۵۶ اس حدیث کو امام ترمذی نے حسن اور امام حاکم وامام ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے-

[2] تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۴۲ ابوداؤد کتاب الادب- باب في المشورة (۵۱۲۸) ترمذی کتاب الاستئذان باب ما جاء ان المستشار مؤتمن (۲۸۲۲ ‘۲۸۲۳) ابن ماجہ کتاب الادب باب المستشار مؤتمن (۳۷۴۵) الادب المفرد (۲۵۶) المستدرک للحاکم ۴/ ۱۳۱ بیہقی ۱۰/ ۱۱۲ شعب الایمان (۴۶۰۴) المسند الجامع ۱۸/ ۸۶- ۸۸ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کے کئی ایک شواہد بھی ہیں-

ہے- آپ کو معاشرہ کے ہر طبقہ اور زندگی کے ہر پہلو میں بسا اوقات ایسے ہی مشورے ملیں گے- کوئی سودا بازی کی بات ہو- برادری کا معاملہ ہو- صحیح مشیر کم ہی ملیں گے- الا ماشاءاللہ-

کاروباری لحاظ سے صحیح مشورہ کا بھی وہی فائدہ ہے جو وعدہ کی پابندی کا ہے جب کسی کے متعلق لوگوں کو یہ علم ہو جائے کہ فلاں شخص صحیح مشورہ دیتا ہے تو اس کے لئے رزق کی کئی راہیں کھل جاتی ہیں- جن کا اسے گمان بھی نہیں ہوتا-

کھیتی اور باغ سے متعلقہ مسائل واحکام

تجارتی اصطلاحات کے باب میں گزر چکا ہے کہ مرابنہ' محاقلة' مخابرة ' معاومة اور بیع ثنیا کیا ہیں- نیز یہ کہ یہ سب ممنوع قسم کی بیع ہیں- البتہ مزابنہ میں بیع عریہ یا عرایا کی رخصت ہے- ان کے علاوہ کھیتی اور باغات سے متعلق مندرجہ ذیل مسائل سے واقفیت ضروری ہے-

(۱) میوہ دار درخت لگانا اس لحاظ سے کار ثواب ہے کہ اس میں سے جو کچھ کوئی پرندہ یا جانور یا آدمی کھالے تو اس سے مالک کو صدقے کا ثواب ملتا ہے- یہی صورت حال کھیتی کی بھی ہے-[1]

(۲) اگر کوئی شخص میوہ دار درخت بیچے اور پھل لگ چکا ہو- خواہ یہ پھل کچا ہو' یا پک چکا ہو- وہ بائع کا ہوگا- الا یہ کہ مشتری اس کی شرط طے کرلے-[2] یہی صورت حال کھیتی کی ہوگی-

(۳) اگر کوئی شخص صرف درخت کا پھل فروخت کرنا چاہے- تو اس کا سودا صرف اس وقت کیا جائے- جب پھل پک چکا ہو کچے پھل کی بیع ممنوع ہے-

دور نبوی ﷺ میں ایک واقعہ ہوا- ایک شخص نے اپنا باغ ایک سال کے لئے بیچا- اور اس کی رقم لے لی- اتفاق کی بات ہے کہ اس باغ کا پھل کسی ارضی یا سماوی آفت کی وجہ سے تلف ہو گیا- اور مشتری کو کچھ ہاتھ نہ لگا- اب بائع نے مشتری سے کہا کہ سال گزر چکا ہے- لہٰذا قبضہ اٹھا لو- مشتری نے کہا کہ اس سال تو پھل ہی تباہ ہو گیا- لہٰذا میں مزید ایک سال تک قبضہ نہ چھوڑوں گا- یہ تنازعہ لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے- تو آپ ﷺ نے بائع (باغ کے مالک) سے کہا آخر تو کس حساب سے اپنے بھائی کی رقم لیتا ہے- یا تو باغ ایک سال کے لئے مزید اس کے پاس رہنے دے یا اس کی رقم واپس کر دے- پھر ایک عام اصول بیان فرمایا- کہ باغ کا

---

[1] بخاری کتاب فی الحرث والمزارعة- باب فضل الزرع و الفرس اذا اکل منه (۲۳۲۰)

[2] بخاری- کتاب البیوع- باب بیع النخل باصلة (۲۲۰۶) وباب من باغ نخلا قد أبرت أو ارضا مزروعة او باجارة (۲۲۰۳)

پھل جب تک پوری طرح پک نہ جائے اس کا سودا نہ کیا جائے یہ واقعہ اجمالاً یا مفصلاً ابن ماجہ کتب صحاح میں موجود ہے- البتہ آپ ﷺ کا بیان کردہ اصول سب کتب میں موجود ہے- کسی روایت میں قبل ان تدرک کسی میں قبل ان تزھو کسی میں قبل ان تصفر اور کسی میں قبل ان تحمر اور کسی میں قبل ان یبدو وصلاحھا کے الفاظ آئے ہیں[1]

(۴) اگر بھوک لگی ہو تو گرا پڑا پھل اٹھا کر کھا لینا جائز ہے- چنانچہ رافع بن عمرو غفاری خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں انصار کی کھجوروں کے درختوں پر ڈھیلے مارا کرتا تھا- وہ لوگ مجھے پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے- آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا- ''رافع! تو ان لوگوں کی کھجوروں پر ڈھیلے کیوں مارتا ہے؟ میں نے جواب دیا- اے اللہ کے رسول ﷺ! بھوک کی وجہ سے- آپ ﷺ نے فرمایا-

((لَا تَرْمِ وَكُلْ مَاوَقَعَ اَشْبَعَكَ اللّٰهُ وَاَرْوَاكَ-[2])) (اللہ تجھے سیر کرے اور آسودہ کرے- ڈھیلے نہ مارا کرو اور جو گر پڑا ہو وہ کھا لیا کرو-)

اتنی اجازت تو رسول اللہ ﷺ نے دے دی- مگر آج کل ہوس اور خود غرضی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ مالک اور مالی بھوکے کو بھی گرا پڑا پھل اٹھانے کی اجازت نہیں دیتے- چہ جائیکہ وہ درخت سے اتار کر کھالے- جس کی شرعاً بھوکے کو اجازت بھی ہے- اسے ممانعت صرف یہ ہے کہ اپنے ساتھ نہ لے جائے[3] کیونکہ یہ چوری تصور ہو گی اور اگر یہ پھل چوری کے نصاب کی حد تک پہنچ جائے تو اس پر حد بھی لگ سکتی ہے-

حیوانات سے متعلق مسائل و احکام

(۱ تا ۳) تجارتی اصطلاحات میں پہلے گزر چکا ہے کہ بیع مصراۃ دودھ روکے ہوئے شیر دار جانور

---

[1] بخاری- کتاب البیوع- باب بیع الثمار- قبل ان یبدو صلاحھا (۲۱۹۴ تا ۲۱۹۶) وباب اذا باع الثمار قبل ان یبدو صلاحھا ثم اصابته عاھة فھو من البائع (۲۱۹۸)

[2] ترمذی- ابواب البیوع- رخصة فی اکل الثمرة للمار بھا (۱۲۸۹) ابوداؤد کتاب الجھاد- باب من قال إنه یاکل مما سقط (۲۶۲۲) ابن ماجہ کتاب التجارات- باب من مرعلی ماشیة قوم او حائط ھل یصیب منه؟ (۲۲۹۹) مسند احمد ۳۳/۴۵۲ (۲۰۳۴۳) الآحاد والمثانی (۱۰۲۰) طبرانی کبیر (۴۴۵۹) المستدرک للحاکم ۳/۴۴۳ بیہقی ۱۰/۲'۳ اس کی سند میں ابن ابی الحکم الغفاری مستور راوی ہے البتہ اس مسئلہ میں عبداللہ بن عمروؓ سے مسند احمد ۱۱/۲۶۵ (۷۰۹۴) (۶۶۸۳'۶۶۴۶'۶۸۹۱'۶۹۳۶) میں اور عبداللہ بن عمروؓ سے ترمذی (۱۲۸۷) ابن ماجہ (۲۳۰۱) وغیرہ میں روایات موجود ہیں-

[3] ترمذی- ابواب البیوع- رخصة فی اکل التمر للمار بھا (۱۲۸۹) یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے-

کی بیع، بیع حبل الحبلہ اوربیع الحیوان بالحیوان بالنسیئۃ (جانور کی جانور سے ادھار بیع) ممنوع ہیں۔ ان کی تفصیل بھی گزر چکی ہے۔ ان کے علاوہ حیوانات سے متعلق درج ذیل مسائل قابل ذکر ہیں۔

(۴) اگر کوئی جانور دن کے وقت کسی کی کھیتی یا باغ اجاڑ دے تو اس کا کچھ تاوان نہیں۔ کیونکہ دن کو کھیتی یا باغ کی حفاظت اس کے مالک کے ذمہ ہے اور اگر رات کو اجاڑے تو جانور کے مالک کو اس کا تاوان ادا کرنا ہوگا۔ کہ اس نے رات کو اپنے جانور کی حفاظت کیوں نہیں کی۔ دور نبوی ﷺ میں ایک واقعہ ہوا۔ حضرت براء بن عازب کی اونٹنی ایک باغ میں گھس گئی۔ اور اس کو خراب کیا۔ پس نبی ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ۔

((عَلٰی اَھْلِ الْحَوَائِطِ حِفْظُھَا بِالنَّھَارِ وَاَنَّ مَا اَفْسَدَتِ الْمَوَاشِیُ بِاللَّیْلِ ضَامِنٌ عَلٰی اَھْلِھَا۔[1]))

(دن کو باغوں کی نگہبانی باغ والوں کے ذمہ ہے اور رات کو جو مویشی خراب کریں تو ان کے مالک اس کا ہرجانہ دیں۔)

(۵) مالک کی اجازت کے بغیر کسی شیر دار جانور کا دودھ دوہنا ممنوع ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''کوئی شخص کسی دوسرے کا جانور اس کی اجازت کے بغیر نہ دوہے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ کوئی اس کے خزانہ کے پاس آئے۔ اسے توڑے اور غلہ اٹھا لے جائے شیر دار جانوروں کے تھن بھی طعام کے محفوظ خزانے ہیں۔[2]

(۶) اگر کوئی مویشی کسی کو (اپنے سینگوں وغیرہ سے) زخمی کردے یا ہلاک کردے۔ تو اس کا نہ قصاص ہے اور نہ تاوان۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

((اَلْمَعْدِنُ جَبَارٌ وَالْبِئْرُ جَبَارٌ وَالْعُجَمَآءُ جَبَّارٌ فِی الرِّکَازِ الْخُمُسُ۔[3]))

(کانوں میں مرنے والے کا۔ کنوئیں میں گر کر مرنے والے کا۔ اور جانور سے مرنے والے کا کوئی تاوان نہیں۔ اور دفینے میں پانچواں حصہ زکوٰۃ ہے۔)

---

[1] مشکوۃ۔ کتاب البیوع۔ باب البیوع الغصب والعاریۃ۔ فصل ثانی۔ (۲۹۵۱) المؤطا کتاب الاقضیۃ باب القضاء فی الضواری ابو دائود کتاب البیوع باب المواشی تفسد زرع قوم (۳۵۶۹) ابن ماجہ کتاب الاحکام باب الحکم فیما افسدت المواشی (۲۳۳۲) بیہقی ۸/۳۴۱، ۳۴۲ دار قطنی (۳۲۸۳ تا ۳۳۸۹) یہ حدیث حسن ہے۔

[2] مسلم کتاب اللقطۃ باب تحریم حلب الماشیۃ بغیر اذن مالکھا ۱۳/۱۷۲۶

[3] بخاری۔ کتاب المساقات۔ باب من حفر بئر افی ملکہ لم یضمن (۲۳۵۵)

(۷) بھیڑ بکریاں پالنا اور چرانا بڑا معزز پیشہ ہے- رسول اللہ ﷺ نے خود بھی مکہ میں اپنے بچپن میں حقیر سے معاوضہ پر لوگوں کی بکریاں چرائی ہیں- آپ ﷺ سے جب اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی نبی ایسا نہیں گزرا- جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں-[1] اور ابن ماجہ کی روایت کے مطابق آپ ﷺ ایک قیراط فی بکری کے حساب پر بکریاں چرایا کرتے تھے-

[1] بخاری- کتاب الاجارۃ -باب رعی الغنم علی قراریط (۲۲۶۲)

باب:۹

زمین اور اس کے متعلق مسائل

سرمایہ کی طرح زمین بھی چونکہ عامل پیداوار ہے۔ لہٰذا زمین سے متعلق مسائل بھی تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ جو درج ذیل ہیں۔

دوسرے کی زمین پر قبضہ:

دوسرے کی زمین پر قبضہ کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

((۱) مَنْ ظَلَمَ قِيدَ شِبْرٍ مِنَ الْأَرْضِ طُوِّقَهُ مِنْ سَبْعِ أَرَضِينَ۔[۱])) (جو شخص کسی کی بالشت بھر زمین ظلم سے لے لے گا۔ اس کو سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔)

((۲) مَنْ أَخَذَ مِنَ الْأَرْضِ شَيْئًا بِغَيْرِ حَقِّهِ خُسِفَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَى سَبْعِ أَرَضِينَ۔[۲])) (جو شخص کسی کی ذرہ سی زمین بھی ناحق لے لے۔ وہ قیامت کے دن سات زمینوں میں دھنسایا جائے گا۔)

ان احادیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام زمین کے حق ملکیت کو تسلیم کرتا ہے جبکہ آج مسلمانوں سے کچھ لوگ ہیں جو کمیونزم سے متاثر ہیں۔ زمین کے حق ملکیت کے قائل نہیں ہیں۔

زمین پر قبضہ کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً ایک یہ ہے کہ (الف) نے مکان بنانے کے لیے زمین کا ٹکڑا یا پلاٹ خریدا۔ مگر مالی کمزوری کی وجہ سے کچھ عرصہ اس پر قبضہ نہ کر سکا۔ اور ب نے اس کی زمین پر قبضہ کر لیا۔ اس کی رجسٹری بھی کروالی یا مکان بھی تعمیر کر لیا۔ ایسی غصب کی صورتیں آج کل عام ہیں۔ بلکہ بدکردار لوگوں نے اسے آج کل پیشہ بنا رکھا ہے۔

دوسری صورت یہ کہ ب الف سے طاقتور ہے۔ اور وہ اس سے زمین یا مکان وغیرہ خریدنا چاہتا ہے اور قیمت بھی موجودہ نرخ پر دینے کو تیار ہے۔ مگر (الف) وہ جگہ دینے پر رضامند

[۱تا۲] بخاری کتاب المظالم۔ باب اثم من ظلم شيئا من الارض (۲۴۵۳، ۲۴۵۴)

نہیں اور (ب) اپنے اثر و رسوخ سے وہ جگہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایسی بیع بھی ناجائز ہے۔ کیونکہ یہ قرآن کے اصول عن تراض منکم کی صریح خلاف ورزی ہے۔

اس کی مثال دور فاروقی کا ایک واقعہ ہے۔ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کی توسیع کے لیے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا مکان خریدنا چاہا۔ جو مسجد کے ساتھ تھا۔ اور توسیع میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جائز قیمت لے کر مکان دے دیں۔ لیکن حضرت عباسؓ اس بات پر رضامند نہ ہوئے اور تنازعہ کی شکل پیدا ہوگئی۔ آخر فریقین نے (جن میں ایک طرف حکومت وقت تھی اور دوسری طرف حضرت عباس رضی اللہ عنہ) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو اپنا حکم (ثالث یا جج) منظور کر لیا۔ اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے مقدمہ سن کر فیصلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف دے دیا۔[1]

جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے مقدمہ جیت لیا تو انہوں نے یہ مکان بلا قیمت ہی مسجد کی توسیع کے لیے دے دیا۔

اب دیکھیے مکان حاصل کرنے کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد کتنا پاکیزہ تھا۔ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی اس معاملہ میں بہت فراخ دل ثابت ہوئے۔ اس تنازعہ سے حضرت عباس کا مقصد صرف یہ تھا کہ لوگوں کو علم ہو جائے کہ شریعت میں حقوق ملکیت کا اس قدر تحفظ موجود ہے کہ حکومت وقت بھی کسی سے اس کا یہ حق چھین نہیں سکتی۔

اور تیسری صورت یہ ہے کہ حکومت وقت مالک زمین سے اس کی مرضی کے بغیر زمین اس طرح چھین لے کہ اس کی پوری قیمت بھی ادا نہ کرے اور جو کچھ ادا کرے وہ بھی نقد ادا نہ کرے بلکہ سالہا سال کی اقساط میں اس حقیر رقم کا بھی ستیاناس کر دے۔

اس کی مثال ہر بڑے شہر میں قائم شدہ ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے ادارے ہیں۔ کہیں L.D.A ہے تو کہیں K.D.A اور کہیں F.D.A وغیرہ۔ یہ سب ادارے ترقیاتی منصوبوں کے نام پر حکومت کی سرپرستی میں چل رہے ہیں۔ مالکان زمین سے زمینیں زبردستی (AQUIR) کر لی جاتی ہیں اور عوام بے بس ہیں۔ ان کی قیمت مروجہ نرخ سے بہت کم لگائی جاتی ہے تو اس زبردستی پر بھی عوام بے بس ہیں۔ قیمت نقد ادا کرنے کی بجائے سالہا سال کی اقساط میں بانڈوں کی شکل میں کی جاتی ہے تو بھی عوام بے بس ہیں اگر مالکان کو کل زمین کا 30% دیا جاتا ہے تو یہ بھی حکومت

---

[1] الفاروق۔ شبلی نعمانی۔ ص ۲۷۵

کا یکطرفہ فیصلہ ہوتا ہے اس محکمے کی پوری کی پوری کاروائی کو شرعاً کیسے جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟

(۲) دوسرے کی زمین میں کھیتی بو دینا:

یہ بھی غصب ہی کی ابتدائی صورت ہے۔ جس کے ذریعہ پوری طرح غصب کی راہ ہموار کی جاتی ہے۔ اس بارے میں آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا۔

((مَنْ زَرَعَ فِی اَرْضِ قَوْمٍ بِغَیْرِ اِذْنِهِمْ فَلَیْسَ لَهُ مِنَ الزَّرْعِ شَیْءٌ وَلَهُ نَفَقَتُهُ۔[1])) (اگر کسی نے دوسرے کی زمین میں کاشت کی تو اس کا کھیتی میں کچھ حصہ نہیں۔ البتہ اس کا خرچہ اسے دے دیا جائے۔)

اور دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

((وَلَیْسَ لِعِرْقِ ظَالِمٍ حَقٌّ۔[2])) (اور ظالم کی محنت کا اس میں کوئی حق نہیں۔)

یہ صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی کی زمین پر کوئی تعمیر کر لے۔ اور یہ تعمیر معمولی قسم کی ہو۔ جیسے چاردیواری سے قبضہ کر لیا گیا ہو۔ تو اس کی مثال کھیتی کی سی ہے۔ غاصب کو لاگت ادا کی جائے۔ اور اگر زمین کی قیمت سے تعمیر کی قیمت بڑھ گئی ہے تو یا تو غاصب زمین کی موجودہ قیمت ادا کرے یا پھر اصل مالک تعمیر کا خرچہ دے دے۔ یہ تنازعہ ختم کرنے کی صورت ہے۔ غصب کا گناہ اس وقت تک معاف نہ ہوگا۔ جب تک کہ اس کا مالک معاف نہ کر دے۔

(۳) بنجر زمین کی آبادکاری:

بنجر زمین کی آبادکاری کے سلسلہ میں اسلام نے ایک سادہ اور فطری سا اصول بتایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

---

[1] ترمذی۔ ابواب الاحکام باب من زرع فی ارض قوم بغیر اذنهم۔ (۱۳۶۶) ابوداؤد کتاب البیوع باب فی زرع الأرض بغیر اذن صاحبها (۳۴۰۳) ابن ماجہ کتاب الرھون باب من زرع فی ارض قوم بغیر اذنهم (۲۴۶۶) مسند احمد ۲۵/۱۳۸ (۱۵۸۲۱) کتاب الخراج یحیی بن آدم (۲۹۵) مسند طیالسی (۹۶۰) کتاب الأموال لأبی عبید (۱۰۵۷) العلل الکبیر ۱/۵۶۳ طبرانی کبیر (۴۴۳۷) الکامل لابن عدی ۴/۱۳۳۴ بیہقی ۶/۱۳۶ اسکی سند میں انقطاع ہے عطاء بن ابی رباح کا رافع بن خدیج سے سماع ثابت نہیں اور بھی اسمیں علل ہیں۔ البتہ اس کی تائید متصل صحیح سند کے ساتھ رافع بن خدیج کی دوسری حدیث سے ہوتی ہے جیسے ابوداؤد (۳۳۹۹)، نسائی (۳۸۹۸)، طبرانی کبیر (۴۲۶۷)، بیہقی (۶/۱۳۶ وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

[2] ترمذی کتاب الاحکام باب ماذکر فی احیاء ارض الموات (۱۳۷۸) ابوداؤد کتاب الخراج والامارة والفیء باب فی احیاء الموات (۳۰۷۳) مسند احمد ۲۳/۱۳۶ (۱۳۸۳۹) بلفظ مختلف اس کی سند حسن ہے۔

((۱) مَنْ اَحْيٰى اَرْضًا مَيْتَةً فَهِيَ لَهُ۔[۱])) (جب کسی نے مردہ (بیکار پڑی ہوئی بنجر) زمین کو آباد کیا۔ وہ اسی کی ہے۔)

((۲) مَنْ اَعْمَرَ اَرْضًا لَيْسَتْ لِاَحَدٍ فَهُوَ اَحَقُّ ۔[۲])) (جس کسی نے ایسی زمین کو آباد کیا جو کسی دوسرے کی ملکیت نہ ہو تو۔ وہی اس کا حقدار ہے۔)

((۳) مَنْ اَحَاطَ حَائِطًا عَلٰی اَرْضٍ فَهِيَ لَهُ۔[۳])) (جس کسی نے (افتادہ) زمین پر احاطہ کھینچ لیا تو وہ اسی کی ہے۔)

(۴) رسول اللہ ﷺ نے مزنیہ اور جہینہ قبیلہ کے لوگوں کو آبادکاری کے لیے زمین عطا کی جسے انہوں نے آباد نہ کیا۔ پھر اور لوگوں نے آکر اس زمین کو آباد کرلیا۔ اب مزنی اور جہینہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب کی عدالت میں اپنا دعوٰی لائے۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اگر یہ جاگیریں میں نے یا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عطا کی ہوتیں تو تمہیں واپس کرادیتا۔ لیکن یہ رسول اللہ ﷺ کی عطا کردہ ہے۔ پھر فرمایا۔ "جو کوئی تین سال تک زمین کو آباد نہ کرے۔ پھر دوسرے لوگ آباد کرلیں تو وہ اس کے زیادہ حقدار ہیں۔[۴]

احادیث بالا سے بنجر زمین کی آبادی کے درج ذیل اصول معلوم ہوئے۔

آبادکاری کے اصول:

(۱) جس افتادہ زمین پر کوئی شخص کاشت کے ذریعہ قبضہ کرلے اور اس پر پہلے سے کسی کا قبضہ نہ ہو تو وہ اس کی ملکیت ہوگی۔

---

۱ اسکی تخریج کے لیے پچھلی حدیث ملاحظہ ہو۔
۲ بخاری کتاب الحرث والمزارعۃ۔ باب من احیاء ارضاً مواتاً۔ (۲۳۳۵)
۳ ابوداؤد۔ کتاب الخراج والفئی والامارۃ۔ باب فی احیاء الموات (۳۰۷۷) المنتقی الابن الجارود (۱۰۱۵) مسند طیالسی (۹۰۶) طبرانی کبیر (۶۸۶۳/۷) مسند الشامین (۲۶۲۸) بیہقی ۱۴۸/۶ اسکی سند میں قتادہ مدلس ہیں۔ لیکن اس کے معنوی شواہد بہت ہیں جیسا کہ پیچھے ذکر کردہ احادیث اس کے مفہوم پر دال ہیں۔
۴ فقہ السنۃ ۱۸۰/۳ مطبوعہ دارالکتاب العربی بیروت
☆ یہ اس دور کی بات ہے جب زمین کی قدر و قیمت بہت کم تھی اور بنجر اور افتادہ زمینوں کی پیمائش و مساحت میں حکومتیں کچھ توجہ نہ کرتی تھیں۔ آج اس مسئلہ کی صورت یہ ہوگی کہ جن زمینوں کا سرکاری طور پر سروے ہو چکا ہے۔ وہ حکومت کی ہیں یا مالکان کی۔ ان میں سے اگر کچھ زمین حکومت کی ہو۔ تو اس سے اجازت اور معاہدہ ضروری ہے۔ البتہ ایسی دور افتادہ زمینیں جن کا سرکاری طور پر سروے ہی نہ ہوا ہو۔ وہاں اگر کوئی شخص زمین آباد کرتا ہے۔ تو حکومت کو چاہیے کہ وہ اس کے حق ملکیت کو تسلیم کرلے۔

(۲) اگر ایسی زمین پر قبضہ کیا جائے- جو آبادی سے دور ہو تو ایسی زمین پر کاشت کرنے کے لیے حکومت سے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں- بلکہ حکومت اس بات کی پابند ہے کے اس زمین پر کاشتکار کا حق تسلیم کرے- البتہ اگر ایسی زمین آبادی کے نزدیک ہو تو پھر حکومت سے اجازت حاصل کر لینا بہتر ہے-[1]

(۳) ایک شخص بہت سی افتادہ زمین پر خط کھینچ کر یا دیوار کر کے یا کسی اور طرح سے حد بندی کر کے زمین کو گھیر کر اس پر اس خیال سے قبضہ کر لیتا ہے کہ وہ اس کو آباد کرے گا- مگر وہ تین سال تک اس زمین کو یا اس کے کچھ حصہ کو آباد نہیں کر سکا تو حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ زمین جسے وہ آباد نہیں کر سکا اس سے واپس لے لے-

زمین کی آبادکاری کا مسئلہ محض افراد ہی کا مسئلہ نہیں حکومت کا بھی ہے- حکومتیں اس معاملہ میں خاصی دلچسپی لیتی ہیں اور ہر وہ ذریعہ اختیار کرتی ہیں جس سے زمین جلد آباد ہو- اس سلسلہ میں کاشتکاروں کو بالکل مفت زمین اس شرط پر دے دیتی ہیں- کہ اتنے سال کے اندر اندر زمین کی آبادکاری لازمی ہے- کبھی برائے نام قیمت لے کر بلکہ کبھی اپنے پاس سے قرضے دے کر ہر حکومت حاجتمندوں کو آسان شرائط کے تحت آبادکاری کے لیے افتادہ زمین مہیا کرتی ہے- اس طرح افراد اور حکومت دونوں ہی اس آبادکاری سے مستفید ہوتے ہیں-

(۴) غیر آباد جاگیروں کی واپسی:

اگر کوئی شخص افتادہ زمین پر قبضہ کرنے کے بعد تین سال تک اسے آباد نہ کر سکے- تو حکومت اس سے زمین واپس لے سکتی ہے- بالکل یہی صورت ان جاگیروں کی بھی ہے- جنہیں حکومت نے بعض افراد کو عطا کیا ہو- درج ذیل حدیث میں دونوں صورتوں میں زمین کو واپس لینے کی صراحت موجود ہے- آپ ﷺ نے فرمایا-

((عَادِيُّ الاَرْضِ لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ ثُمَّ لَكُمْ مِنْ بَعْدُ فَمَنْ اَحْيَا اَرْضًا مَيْتَةً فَهِيَ لَهُ وَلَيْسَ لِمُحْتَجِرٍ حَقٌّ بَعْدَ ثَلٰثِ سِنِيْنَ-[2]))

(بنجر زمین اللہ اور اس کے رسول کی ہے- پھر اس کے بعد وہ تمہارے لیے ہے- پس جو کوئی مردہ زمین آباد کرے وہ اسی کی ہے- اور بے کار روک رکھنے والے کے

---

[1] فقہ السنہ ۳/۱۷۸

[2] فقہ السنہ ۳/۱۷۹ البیہقی ۶/۱۴۳ کتاب الاموال لابی عبید (۶۷۴) مسند شافعی (۱۳۴۹) کتاب الخراج ص

لیے تین سال کے بعد کوئی حق نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ بن حارث مزنی کو مکہ اور مدینہ کے درمیان عقیق نامی وادی میں ایک وسیع جاگیر عطا فرمائی تھی وہ اس سارے ٹکڑے کو آباد نہ کر سکے اور تین سال سے زائد مدت گزر گئی۔ تا آنکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دور آ گیا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ جتنی زمین تمہاری قوت کاشت سے زیادہ ہے وہ ہمارے حوالے کردو۔ تاکہ اسے مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہنے لگے "جو قطعہ زمین مجھے خود رسول اللہ ﷺ نے عطا کیا ہے وہ آپ واپس کیسے لے سکتے ہیں؟ میں ہرگز واپس نہ کروں گا"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا "واللہ! تجھے یہ کام کرنا پڑے گا"۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زائد زمین واپس لے کر اسے مسلمانوں میں بانٹ دیا۔[1]

تحدید ملکیت کی شرائط:

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ زمین کے بڑے ٹکڑے (خواہ یہ کسی کی زرخرید جائیداد کی صورت میں ہوں یا حکومت کے عطا کردہ ہوں) جب معدودے چند افراد کے قبضہ میں آ جائیں۔ جس سے ملکی معیشت یا استحکام میں خطرہ پیدا ہو جائے یا یہ چیز طبقاتی تقسیم کو فروغ دینے لگے تو حکومت ایسی جاگیروں کی ملکی مصالح کی خاطر تحدید کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ مالکان زمین سے لی ہوئی زمین کی موجودہ نرخ کے حساب سے پوری قیمت ادا کر دے اور بعدہ اپنی نئی پالیسی کو تشکیل دے۔ لیکن حکومت کو قطعاً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مالکان زمین سے ان کی مرضی کے بغیر زبردستی چھین لے۔ پھر اس پر پلاٹ بنا کر ۳۰ فیصد مالکان کو دے اور باقی زمین کا موجودہ نرخ اگر تین ہزار روپے ہو تو وہ ایک سو یا اس کے لگ بھگ قیمت ادا کرے اور اگر خود زمین فروخت کرنا ہو تو موجودہ قیمت سے ڈبل نرخ پر فروخت کر کے عوام اور زمیندار دونوں کی جیبوں پر ترقیاتی منصوبوں کے نام پر ڈاکے ڈالے۔ پھر اس ترقیاتی منصوبے کے نام پر دفتروں کے اندر یا باہر رشوت کا بازار گرم کرے۔ ان تمام کاموں سے ایک ایک بات شریعت کی

(بقیہ پچھلا صفحہ) ۶۵ یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ ضعیف ہے یہ طاؤس تابعیؒ کی مرسل ہے اور طاؤس تک اس کی سند صحیح ہے شیخ البانی نے ارواء الغلیل (۱۵۴۹) اور سلسلہ ضعیفہ (۵۵۳) ۲/۲۹ میں اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

[1] کتاب الخراج از یحییٰ بن آدم۔ طبع مصر، ص ۹۳ رقم (۲۹۴) کنز العمال مطبوعہ دکن ج ۲، ص ۱۹۱ بیہقی دکن ج ۲، ص ۱۳۸ یہ روایت عبد اللہ بن ابی بکر کی مرسل ہے۔

نگاہ میں حرام اور گناہ کبیرہ ہے- حیرت کی بات ہے کہ جس بات کا حکومت کو شرعی نکتہ نگاہ سے حق حاصل ہے وہ تو کرتی نہیں- غداریوں کے عوض جاگیریں حاصل کرنے ہوالے جاگیردار بدستور ان پر قابض اور اسی کے بل بوتے پر دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے ہیں اور جن باتوں کو شریعت جرم قرار دیتی ہے' بڑے بڑے شہروں کے تمام ترقیاتی ادارے حکومت کی سرپرستی میں ایسے تمام کام بڑی سرگرمی سے بجالا رہے ہیں-

(۵) مخابرہ یا مزارعت:

تجارتی اصطلاحات کے باب میں پہلے گزر چکا ہے کہ مخابرہ پہلے ممنوع تھا- بعد میں اس کی اجازت دے دی گئی- اس مسئلہ میں چونکہ بعض لوگوں نے اختلاف کیا ہے اور وہ مزارعت کو حرام سمجھتے ہیں لہٰذا اس مسئلہ کو تفصیل سے پیش کیا جائے گا- اسی سلسلہ میں میرا ایک مضمون سہ ماہی مجلّہ منہاج جولائی ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا تھا- جو بعینہٖ یہاں درج کیا جارہا ہے-

مزارعت سے متعلق تین روایات مروی ہیں- ایک ایسی روایات جو مزارعت کو جائز قرار دیتی ہیں- دوسرے وہ جو مزارعت کرنا جائز قرار دیتی ہیں اور تیسرے وہ جو عدم جواز کی توجیہ بیان کرنے کے بعد جواز مزارعت کی توثیق کرتی ہیں- ان تینوں قسم کی روایات کا اجمالی ذکر درج ذیل ہے-

جواز مزارعت والی روایات

پیشتر اس کے کہ جواز مزارعت یا عدم جواز مزارعت کی روایات کا ذکر کیا جائے- ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے استفادہ کی مختلف شکلوں کی وضاحت کر دی جائے اور یہ ممکنہ صورتیں درج ذیل ہیں-

زمین سے استفادہ کی مختلف صورتیں:

(ا) بٹائی: بٹائی سے مراد مزروعہ کھیت کی پیداوار میں سے ہی پیداوار کا مخصوص حصہ جو فریقین (یعنی مالک زمین اور کاشتکار) کی باہمی رضامندی سے زمین کے کرایہ کے طور پر طے پایا ہے- یہ حصہ چوتھا بھی ہوسکتا ہے تیسرا بھی نصف بھی اور اس سے کم بھی مزارعت کے لفظ کا اطلاق عموماً اسی قسم پر ہوتا ہے- نیز اسی قسم کے لیے دور نبوی ﷺ میں مخابرہ کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی-

(ب) ٹھیکہ بہ شکل پیداوار: مثلاً مالک زمین کاشتکار سے یہ طے کرے کہ کھیت سے پیداوار خواہ آٹھ من ہو یا دس من تین من ضرور لے لوں گا۔ اسے عربی زبان میں محاقلہ کہتے ہیں۔

(ج) ٹھیکہ بہ شکل نقدی: مثلاً مالک زمین یہ کہے کہ کھیت میں جو کچھ بھی پیداوار ہو۔ اور جتنی بھی ہو۔ میں اس کے عوض پانچ ہزار روپیہ یا دس من گندم یا اتنی کھجور یا فلاں جنس لوں گا۔ یہ ٹھیکہ ایک ہی فصل کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ ایک سال کے لئے بھی اور زیادہ عرصہ کے لیے بھی۔ اس شکل کو ہماری زبان میں مستاجری کہتے ہیں۔ اور یہ عموماً نقدی کی شکل ہی میں طے کی جاتی ہے۔

(د) مخصوص شرائط پر: مثلاً مالک زمین یہ کہے کہ مزروعہ کھیت کی شمالی تہائی جانب کی پیداوار میری ہوگی۔ یا نالیوں کے ساتھ ساتھ والی زمین کی پیداوار میری ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ

ایسی شرائط میں چونکہ دھوکے کا احتمال ہے۔ لہٰذا اس قسم کی مزارعت بالاتفاق ناجائز ہے۔ اگر جواز یا عدم جواز کی بحث ہے تو مندرجہ بالا تین اقسام میں ہی ہے۔

اس وضاحت کے بعد ہم ایسی احادیث درج کرتے ہیں جن سے بٹائی کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

(۱) جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین کے معاشی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مواخات کا سلسلہ قائم کر دیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ اسی سلسلہ میں:

((قالت الانصار للنبی صلی الله علیه وسلم اقسم بیناو بین اخواننا النخیل قال "لا" فقال تکفوننا المؤنة ونشرککم فی الثمرة۔ فقالوا سمعنا واطعنا۔[1]))

(انصار نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہمارے نخلستان ہم میں اور ہمارے بھائیوں میں تقسیم فرما دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ نہیں۔" پھر انصار نے مہاجرین کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ ان میں محنت کریں۔ ہم آپ کو پیداوار میں شریک کرتے ہیں۔ مہاجرین نے جواب دیا۔ سمعنا واطعنا یعنی ہمیں منظور ہے۔)

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ خیبر والوں پر غالب

[1] بخاری۔ کتاب الشروط باب الشروط فی المعاملة۔ (۲۷۱۹) کتاب الحرث والمزارعة (۲۳۲۵)

ہوئے تو وہاں کی ساری زمین اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کی ہو گئی۔ آپ ﷺ نے چاہا کہ یہودیوں کو وہاں سے نکال دیں۔ لیکن انہوں نے آپ ﷺ سے یہ درخواست کی کہ

((لِيُقِرَّهُمْ بِهَا أَنْ يَكْفُوا عَمَلَهَا وَلَهُمْ نصف الثمر۔ فقال لهم رسول ﷺ نُقِرُّكُمْ بِهَا عَلٰى ذٰلِكَ مَاشِئْنَا فَقَرُّوا بِهَا حَتّٰى أَجْلَاهُمْ عُمَرُ إِلٰى تَيْمَاءَ وَأَرِيْحَا۔[1]))

(آپ ﷺ ان (یہود) کو خیبر میں رہنے دیں وہ کھیتی باڑی کا سارا کام کریں۔ اور پیداوار میں سے نصف حصہ لیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا۔ ''جب تک ہم چاہیں گے تم کو اس کام پر رکھیں گے۔'' پھر اس پر عہد فاروقی تک عملدر آمد ہوتا رہا۔ تا آنکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں (اپنی خلافت میں) تیماء اور اریحاء کی طرف جلا وطن کر دیا۔)

(۳) تعامل امت۔ امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ قیس بن مسلم نے ابو جعفر سے روایت کی کہ مدینہ میں کوئی ایسا مہاجر نہ تھا جو تہائی اور چوتھائی پر کاشت کاری نہ کرتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ حضرت سعد بن مالک رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ۔ حضرت قاسم رضی اللہ عنہ۔ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ۔ اولاد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ۔ اولاد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور اولاد حضرت علی رضی اللہ عنہ سب نے کھیتی باڑی کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے اس شرط پر کام کرایا کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیج دیں تو پیداوار میں آدھ لیں گے۔ اور اگر وہ خود اپنی تخم ریزی کریں تو اتنا لیں گے۔[2]

(۴) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ (جو بعد میں عدم جواز مزارعت کے قائل ہو گئے تھے) کا تعامل امت کے متعلق اعتراف۔

نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ عہد نبوی ﷺ 'عہد صدیقی' فاروقی' عہد عثمانی اور خلافت معاویہ میں اپنی مزروعہ زمینیں کرایہ پر دیا کرتے تھے۔ یہاں تک خلافت معاویہ کے آخر میں انہیں یہ روایت پہنچی کہ رافع رضی اللہ عنہ بن خدیج رسول اللہ ﷺ سے اس کی ممانعت بیان کرتے ہیں۔ وہ ان کے پاس گئے۔ میں بھی ان کیساتھ تھا۔ عبداللہ عمر رضی اللہ عنہ نے رافع سے پوچھا تو رافع نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے زمین کو کرایہ پر دینے سے منع فرمایا ہے۔ یہ سن کر عبداللہ بن عمر

---

1 بخاری کتاب الحرث والمزارعۃ۔ باب اذا قال رب الارض (۲۳۳۸)

2 بخاری کتاب ماجاء فی الحرث والارض۔ باب المزارعۃ بالشطر نحوہ

رضی اللہ عنہ نے زمین کو کرایہ پر دینا چھوڑ دیا- بعدازاں جب کوئی آپ سے پوچھتا تو کہتے کہ خدیج کے بیٹے نے یہ کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے-[1]

عدم جواز مزارعت کی احادیث

ایسی احادیث کی تعداد جو صحاح ستہ میں موجود ہے- بہت زیادہ ہے- ہم یہاں بغرض اختصار صحیح مسلم کو بنیاد بنا کر اسی کی روایات بیان کریں گے- کیونکہ ایک تو اس کا شمار صحیحین میں ہوتا ہے- دوسرے اس میں اس موضوع کی کافی احادیث مندرج ہیں- تاہم ہم نے صرف ان میں سے حسب ضرورت احادیث درج کی ہیں- جن میں الفاظ یا معانی کا کچھ نہ کچھ اختلاف تھا- البتہ اگر کسی حدیث کا بخاری سے حوالہ مل گیا تو اسے بھی درج کر دیا گیا ہے-

عدم جواز مزارعت کو روایت کرنے والے مندرجہ ذیل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں-

(۱) حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ (م ۷۴ھ بعمر ۹۴ سال) ان کی مرویات سب سے زیادہ ہیں-

(۲) حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ (م ۷۴ھ بعمر ۸۴ سال)

عدم مزارعت کے باب میں سب سے زیادہ آپ ہی کا نام سامنے آتا ہے- وہ یہ ہے کہ آپ کی زمینیں بہت تھیں- جنہیں آپ مزارعت یا کرائے پر دیا کرتے تھے- پھر آپ ہی نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے آخری دور میں عدم جواز مزارعت کا خوب چرچا کیا- اور اس لحاظ سے کہ آپ بہت بڑے زمیندار بھی تھے اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مزارعت کے مسئلہ کی تحقیق کے لیے آپ کے پاس ہی آتے رہے-

(۳) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (م ۵۰ھ بعمر)

(۴) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ (م ۷۴ھ بعمر ۸۴ سال)

(۵) حضرت ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ (م ۶۴ھ بعمر ۸۴ سال)

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کی مرویات:

((عن جابر بن عبد اللّٰه رضی اللّٰه (حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

[1] مسلم کتاب البیوع باب کراء ۱۰۹/ ۱۵۴۷- بخاری- کتاب الحرث والارض- باب ما کان من اصحاب النبیؐ (۲۳۴۳)

عنھما انَّ رَسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نہٰی عَنْ کراء الْاَرض۔[1])) (کہ رسول اللہ ﷺ نے زمین کو کرایہ پر دینے سے منع فرمایا ہے۔)

واضح رہے کہ زمین کے کرائے سے مراد صرف ٹھیکہ یا نقدی نہیں بلکہ اس سے مذکورہ بالا چاروں صورتیں مروجہ ہیں۔

(۲) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

((مَنْ کانت لہٗ اَرضٌ فَلْیَزْرَعھا فَاِنْ لم یَزْرَعْھا فلیزرِعْھا اخاہ۔[2])) (اگر کسی کے پاس زمین ہے تو وہ اسے خود کاشت کرے ورنہ کاشت لے لیے اپنے بھائی کو دے دے۔)

(۳) یہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

((کَانَ لِرجالٍ فُضُول ارضین من اصحاب رسول اللّٰہ ﷺ فقال رَسول اللّٰہ ﷺ لَہٗ فضل أرض فَلْیَزْرَعھا اَوِ لْیَمْنَحھا اخاہُ فَاِنْ اَبیٰ فَلْیُمْسِکْ اَرْضَہٗ۔[3])) (بعض اصحاب رسول اللہ ﷺ کے پاس ضرورت سے زائد زمینیں تھیں تو آپ ﷺ نے فرمایا جس کہ پاس ضرورت سے زیادہ زمین ہو وہ اس میں کھیتی کرے یا احسان کے طور پر اپنے بھائی کو کاشت کے لیے دے دے۔ اور اگر ایسا نہ کر سکے تو پھر زمین کو رکھ چھوڑے۔)

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کرایہ کی کوئی شکل بھی اسلام کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہے۔

(۴) یہی جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

((نَہٰی رَسُول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اَنْ تُوْخَذِ الارض اَجْرًا اَوْحظًا۔[4])) (منع فرمایا رسول اللہ ﷺ زمین کا کرایہ یا کسی بھی طرح کا دوسرا فائدہ اٹھانے سے۔)

(۵) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

((من کانت لَہٗ ارضاً فلیزرعھا (جس کے پاس زمین ہو وہ اس پر خود

---

[1] تا [2] مسلم۔ کتاب البیوع۔ باب کراء الارض ۸۸-۹۹/۱۵۳۶

[3] مسلم۔ کتاب البیوع۔ باب کراء الارض ۸۹/۱۵۳۶

[4] مسلم کتاب البیوع باب کراء الارض ۹۰/۱۵۳۶۔ (بخاری کتاب المزارعۃ۔ باب ما کان من اصحاب النبیؐ ......)

أو ليزرعَها اخاهُ وَلا يُكرِيَها۔ [1])) (کاشت کرے یا پھر اپنے بھائی کو دے دے اور کرایہ نہ لے۔)

(٦) یہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

((ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم نہٰی عن المخابرۃ۔ [2])) (رسول اللہ ﷺ نے (مخابرہ) بٹائی سے منع فرمایا۔)

(٧) یہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا۔

((من كانت لهٗ ارضا فليَهِبَها اَوْلَيُعِرها۔ [3])) (جس کے پاس زمین ہو وہ اس کو ہبہ کر دے۔ یا عاریتاً دے دے۔)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مسلم میں اور بھی بہت سی احادیث مروی ہیں۔لیکن حصول مطلب کے لیے اتنی احادیث بھی کافی ہیں۔ان احادیث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زمین سے فائدہ اٹھانے کی ان چاروں اقسام میں سے جو اوپر مذکور ہوئیں کوئی قسم بھی جائز نہیں۔

رافع رضی اللہ عنہ بن خدیج کی مرویات:

(۲) رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

((کنا نحاقل الارض علی عھد رسول اللّٰہ ﷺ فنکریھا بالثلث وَالربع والطعام المسمٰی فَجاءَ نَایوم ذات رجل من عمومتی فقالَ نھانا رسُول اللّٰہ ﷺ عن امر کان لنانافعاً وَطَوَاعیة اللّٰہ ورسولہٖ انفع لنا نھانا ان نحاقل بالأرض اان یزرعھا اویُزرِعَھا وَکرِہ کِرَاءَ ھَاوما سوٰی ذٰلِکَ۔ [4]))

(ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں محاقلہ کیا کرتے تھے تو اپنی زمین کو تیسرا حصہ یا چوتھا (حصہ بٹائی) پر یا معین اناج کے عوض کرایہ پر چلاتے تھے۔ایک روز ہمارے پاس میرے چچاؤں میں کوئی صاحب آئے اور کہنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایسے کام سے منع کر دیا۔جس میں ہمارا فائدہ تھا۔لیکن اللہ اور اس کے رسول کی خوشی میں ہمیں زیادہ فائدے ہیں۔ آپ ﷺ نے ہمیں بٹائی سے منع فرمادیا۔اور کہا کہ مالک زمین یا تو خود کاشت کرے یا دوسرے کو دے دے اور آپ نے

[1] مسلم کتاب البیوع ۱۵۳۶/۹۲ [2] مسلم ۱۵۳۶/۹۳ [3] مسلم ۱۵۳۶/۹۷
[4] مسلم۔ایضاً ۱۵۴۸/۱۱۳

زمین کے کرایہ یا کسی بھی دوسری صورت کو ناپسند فرمایا-)

(۲) رافع بن خدیج کہتے ہیں کہ میرے چچا ظہیر بن رافع نے کہا کہ-

((لقد نهانا رسول الله ﷺ عن امرٍ كان بنا رافقا قلت ما قال رسول الله ﷺ فهو حقٌ- قال دعاني رَسول الله ﷺ وقال ماتصنعون بمحا قلكم؟ قلتُ نؤاجرها على الربع وعلى الاوسق من التمر والشعير قال لاتفعلوا لازرعوها اوازرعوها اواَمسكوها قال رافع قلت سمعاً وطاعةً- [1]))

(ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ایسی بات سے منع کر دیا جس میں ہمارا فائدہ تھا- میں نے (یعنی رافع نے) کہا جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا- وہی حق ہے-ظہیر کہتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے بلایا اور پوچھا- تم اپنے کھیتوں کا کیا کرتے ہو میں نے کہا- چوتھائی پیداوار پر بھی دیتے ہیں اور کھجور یا جو کی معین مقدار پر بھی- آپ ﷺ نے فرمایا ایسا مت کرو اپنی کھیتی خود کاشت کرو یا کراؤ- یا خالی پڑی رہنے دو میں نے کہ آپ ﷺ کا ارشاد سن لیا اور مان لیا-)

مندرجہ بالا احادیث اگرچہ وہی ہیں- تاہم ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے کرائے یا زمین سے فائدہ اٹھانے کی کوئی بھی ایسی قسم نہیں-جس سے آپ ﷺ نے منع نہ فرمایا-

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرویات:

(۱) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا-

((مَنْ كانت لهٗ ارضا فليزرعهَا اَوِ ليمنحهَا اخاه فان اَبىٰ فليمسكَ اَرضَهٗ- [2]))

(جس کے پاس زمین ہو وہ اس میں کھیتی کرے یا اپنے بھائی کو احساناً دے دے اور اگر وہ نہ لے تو اپنی زمین پڑی رہنے دے-)

سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

((نهٰى رسول اللّٰه عن المحا قَلَة

(رسول اللہ ﷺ نے محاقلہ (طے شدہ پیداوار بطور کرایہ) اور مزابنہ (کھجور کے

[1] بخاری- کتاب الحرث والمزارعة- باب ما کان اصحاب النبیؐ (۲۳۳۹)
[2] بخاری کتاب الحرث والمزارعہ باب ما کان اصحاب النبیؐ (۲۳۴۱)

وَالمزابنة-[1])) درخت کا محاقلہ کی طرح کرایہ طے کرنا) سے منع فرمایا-)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ

((نھی رَسول اللہ ﷺ من المزابنة والمحاقلة والمزابنة اشتراء التمر فی رؤس النحل والمحاقلة کراء الارض-[2])) (رسول اللہ ﷺ نے مزابنہ اور محاقلہ سے منع فرمایا ہے-مزابنہ کھجور کا بیچنا ہے درخت پر اور محاقلہ زمین کو کرایہ پر چلانا-)

عبداللہ بن معقل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ سے مزارعت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ

((نھی رسول اللہ عن المزارعة-[3])) (رسول اللہ ﷺ نے مزارعت سے منع فرمایا ہے-)

عدم جواز سے متعلق سیدنا رافع بن خدیج کے یا دوسرے مسؤلین کے مختلف جوابات

(۱) نافع کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنی زمین کو کرایہ پر دیا کرتے تھے-عہد نبوی ﷺ' صدیقی' فاروقی' عثمانی اور شروع معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں تا آنکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اخیر خلافت میں ان کو خبر پہنچی کہ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ اس کی رسول اللہ ﷺ سے ممانعت بیان کرتے ہیں-تو وہ رافع کے پاس گئے- میں بھی ان کے ساتھ تھا- اوران سے یہ مسئلہ پوچھا تو حضرت رافع رضی اللہ عنہ نے کہا کہ

((کان رسول اللہ ﷺ ینھی عَن کراء المزارع-[4])) (رسول اللہ ....نے زمین کو کریہ پر دینے سے منع کیا ہے-)

یہ سن کر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے سالم یوں بیان فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنی زمینوں کو کرایہ پر دیا کرتے تھے- یہاں تک کہ ان کو خبر پہنچی کہ

---

[1] بخاری-ایضاً [2] ایضاً [3] مسلم-ایضاً [4] مسلم ایضا

رافع بن خدیج انصاری رضی اللہ عنہ اس سے منع کرتے تھے- حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ رافع خدیج سے ملے اور کہا کہ تم کراء الارض سے متعلق رسول اللہ ﷺ سے کیا حدیث بیان کرتے ہو- رافع نے کہا میں نے اپنے دونوں چچاؤں سے جو بدر میں شریک تھے سنا- وہ گھر والوں سے حدیث بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے زمین کو کرایہ پر دینے سے منع فرمایا ہے- حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں جانتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں زمین کرایہ پر دی جاتی تھی- پھر عبداللہ رضی اللہ عنہ ڈرے- ایسا نہ ہو کہ اس بات میں رسول اللہ ﷺ نے کوئی نیا حکم دیا ہو جس کی انہیں خبر نہ ہوئی ہو تو انہوں نے زمین کرایہ پر دینا چھوڑ دیا-[1]

(۲) حنظلہ زرقی کہتے ہیں کہ میں نے رافع بن خدیج کو یہ کہتے سنا کہ

تمام انصار میں ہمارے یہاں محاقلہ زیادہ تھا- ہم یہ کہہ کر زمین کرایہ پر دیتے کہ یہاں کی پیداوار ہم لیں گے اور یہاں کی تم لینا- کبھی یہاں اگتا وہاں نہ اگتا- تو رسول اللہ ﷺ نے ہم کو منع کیا اس سے- لیکن چاندی کے بدل کرایہ پر دینا تو اس سے منع نہیں کیا-[2]

(۳) حنظلہ بن قیس کہتے ہیں- کہ میں نے رافع بن خدیج سے کراء الارض سے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ

((نھی رسول اللّٰہ عن کراء الارض قال فقلت بالذھب والورق ؟ قال اما بالذھب والورق فلا باس بہ-[3]))

(رسول اللہ ﷺ نے زمین کو کرایہ پر دینے سے منع کیا- میں نے کہا- کیا سونے چاندی کی صورت میں بھی کرایہ پر دینا منع ہے- رافع نے کہا- سونے اور چاندی کے بدل تو کوئی حرج نہیں-)

(۴) حنظلہ بن قیس انصاری کہتے ہیں کہ میں نے رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے سنا وہ کہتے تھے کہ

((کنا اکثر اھل المدینۃ مزرعاً وکنا نکری الارض بالناحیۃ مِنھَا مسمی لسید الْارضَ قال فَمِمَّا یصاب ذلک وتسلم الارض ومما یصاب الارض ویسلم ذلکَ فنھینا وَامَّا الذھب

(سب اہل مدینہ سے ہماری کھیتی زیادہ تھی اور ہم زمین اس شرط پر دیتے تھے کہ زمین کے فلاں حصے کی پیداوار ہم لیں گے تو کبھی ایسا ہوتا کہ اس حصے کی پیداوار خراب ہو جاتی اور کبھی ساری زمین خراب ہو جاتی اور اس حصے

---

[1] مسلم- ایضاً [2] بخاری- کتاب المزارعت- ما یکرہ من الشروحات
[3] مسلم- حوالہ ایضاً- کراء الارض بالذھب والفضۃ

والورق فلم یکُن یومئذٍ-[1]))

(کی بچی رہتی اس وجہ سے ہمیں اس سے روکا گیا- رہا سونے چاندی نقدی کے عوض زمین دینا تو اس کا ان دنوں رواج ہی نہ تھا-)

(۵) عبداللہ بن سائب کہتے ہیں کہ ہم عبدالرحمٰن بن معقل کے پاس گئے اور ان سے بٹائی کے متعلق پوچھا انہوں نے کہا-

((زعم ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ نھیٰ عَنِ المزارعة وَ اَمَرَ بالمواجَرة وقال لاباس بھا-[2]))

(ثابت رضی اللہ عنہ کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بٹائی سے تو منع کیا اور مواجرت (نقدی) پر دینے کا حکم فرمایا اور فرمایا اس میں کچھ حرج نہیں)

عدم جواز مزارعت کی توجیہات

توجیہ ا: ناجائز شرط:

خلافت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں جب عدم جواز مزارعت کا چرچا ہونے لگا- تو لوگ صحیح صورت کی تحقیق کے لیے رافع بن خدیج اور دوسرے عدم جواز کے راویوں کی طرف رجوع کرنے لگے- رافع بن خدیج کے پاس پہنچنے والوں میں حنظلہ بن قیس' حنظلہ الزرقی اور رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی اسید بن ظہیر ہیں- ان تینوں کی روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ رافع بن خدیج نے عدم جواز مزارعت کی روایت کی وضاحت یہ فرمائی کہ اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ مالک زمین نہروں اور کھالیوں کے کناروں کی زمین یا ایسی زمین جہاں پانی ازخود پہنچ جاتا تھا کی پیداوار اپنے لیے مخصوص کر لیتے تھے- علاوہ ازیں بعض مالک زمین یہ شرط بھی کر لیتے تھے کہ بھوسہ سارا ان کا ہوگا- اور بعض دفعہ یہ شرط بھی ہوتی تھی- کہ گانٹھیں یا گھنڈیاں (پہلی دفعہ گاہنے کے بعد سٹوں میں جو دانے بچ جاتے ہیں) مالک کی ہوں گی- یہ شرطیں سب ہی ایسی تھیں جن سے کسی ایک فریق کا فائدہ یا دوسرے کا نقصان یقینی ہو جاتا تھا- چونکہ یہ دھوکے کی بیع تھی- لہٰذا آپ ﷺ نے اس سے منع فرمادیا- رہا نقد کرایہ کی ادائیگی- تو ایک روایت میں ہے کہ چاندی سے کرایہ کے تعین سے رسول اللہ ﷺ نے منع نہیں کیا- (مسلم کتاب البیوع باب کراء الارض) اور

---

[1] بخاری- کتاب المزارعة- باب بلا عنوان   [2] مسلم- ایضاً

دوسری روایت میں ہے کہ ان دنوں سونے یا چاندی سے زمین کے کرایہ کی ادائیگی کا دستور ہی نہ تھا۔[1]

تیسری روایت کے مطابق آپ اپنا خیال پیش فرماتے ہیں کہ جہاں تک سونے چاندی سے کرایہ کی ادائیگی کا تعلق ہے۔تو اس میں کوئی حرج نہیں۔[2]

اور چوتھی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے مزارعت سے منع کیا اور مواجرۃ (یعنی روپے نقدی کی صورت میں کرایہ) پر دینے کا حکم دیا۔[3]

تنقید:

مندرجہ بالا روایات اگرچہ صحیح ہیں تاہم معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب تحقیق کی نوبت آئی تو حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ مختلف حضرات کو مختلف جواب دیتے رہے ہیں۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نافع کے پاس گئے تھے۔اگر رافع بن خدیج انہیں بھی ایسی توجیہ بتا دیتے کہ اس عدم جواز کا اصل سبب ناجائز قسم کی شرائط ہیں نہ کہ فعل مزارعت اصلاً ناجائز ہے تو شاید عبداللہ بن عمر اپنی زمینوں کو کرایہ پر دینا کبھی نہ چھوڑتے۔

رافع بن خدیج کی روایت تو یہ تھی کہ ان کے چچا ان کے گھر آئے اور انہوں نے کہا کہ ہمیں رسول اللہ نے ایسے کام سے روک دیا۔جس میں ہمارا فائدہ تھا تاہم اللہ اور اس کے رسول کا حکم ماننے میں ہمیں زیادہ فائدہ ہے۔اب اگر ان ناجائز شرائط ہی کی بات تھی۔تو ان غلط شرائط کو ترک کرنے کے بعد زمین سے بٹائی (مخابرہ) اور کرایہ (محاقلہ) دونوں صورتوں میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔پھر انہوں نے یہ فائدہ کیوں چھوڑا تھا؟

توجیہ ۲: مزارعت میں جھگڑا:

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ خود تو مخابرہ یعنی بٹائی کے عدم جواز کے قائل ہیں (ابو داؤد) مگر حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کے عدم جواز کی توجیہ پیش فرماتے ہوئے کہتے ہیں۔

((یغفر اللّٰہُ لِرَافِعِ ابْنِ خُدَیْجٍ اَنَا وَاللّٰہِ اَعْلَمُ بِالْحَدِیْثِ مِنْہُ اِنَّمَا جَآءَ النَّبِیَّ ﷺ (اللہ تعالیٰ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کو معاف فرمائے۔واللہ میں اس حدیث کو ان سے

---

[1] بخاری کتاب المزارعۃ
[2] بخاری کتاب الحرث والمزارعہ باب کراء الارض بالذهب و الفضة
[3] مسلم۔ایضاً

رَجُلَانِ مِنَ الْاَنْصَارِ قَدِاقْتَتَلَا فَقَالَ اِنْ كَانَ هٰذَا شَانُكُمْ فَلَا تُكْرُوا الْمَزَارِعَ فَسَمِعَ رَافِعٌ قَوْلَهٗ فَلَا تُكْرُوا الْمَزَارِعَ۔[1])

بہتر جانتا ہوں۔ واقعہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس دو انصار آدمی لڑتے جھگڑتے آئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر تمہارا یہ حال ہے تو زمین کرایہ پر نہ دیا کرو۔ رافع نے رسول اللہ ﷺ کا (یہی آخری) قول کہ زمین کو کرایہ پر نہ دیا کرو سن لیا یعنی آخری قول بیان کرنا شروع کر دیا۔)

تنقید:

یہ توجیہ اس لحاظ سے محل نظر ہے کہ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ زمین کو کرایہ پر دینے (محاقلہ) کے قائل ہیں۔ جیسا کہ توجیہ نمبر ا کی چوتھی شق میں واضح کیا گیا ہے اور یہ روایت کرایہ پر دینے کو ہی ناجائز بتا رہی ہے۔

غرضیکہ عدم جواز مزارعت (مخابرہ اور محاقلہ) کی روایات کی توجیہ کے متعلق تین روایات آئی ہیں۔ ان میں ایسی ہی شرائط مذکور ہیں۔ جو فی الواقع شرعی لحاظ سے نادرست ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ عدم جواز کی کثیر التعداد روایات مزارعت سے علی الاطلاق منع کر رہی ہیں۔ لہٰذا ان دونوں قسم کی روایات آمنے سامنے رکھنے سے بھی ذہن پوری طرح صاف نہیں ہوتا۔

ان توجیہات کے بعد اب ہم دونوں قسم کی روایات میں تطبیق کی صورت پر غور کریں گے۔

تطبیقات

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تطبیق:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تطبیق نے ان دونوں قسم کی روایات کی تطبیق کی

---

[1] ابوداود۔ کتاب البیوع باب فی المزارعة (۳۳۹۰) ابن ابی شیبہ ۶/۳۴۲ نسائی کتاب الایمان باب ذکر الاحادیث المختلفه فی النهی عن کراء لارض بالثلث و الربع (۳۹۳۷) ابن ماجہ کتاب الرهون باب مایکره من المزارعة (۲۴۶۱) المسند الجامع ۵/۵۳۱ مسند احمد ۳۵/۴۶۴ (۲۱۵۸۸) طبرانی (۴۸۲۲) عبدالرزاق (۱۴۴۶۵) شرح معانی الاثار ۴/۱۱۰ شرح مشکل الاثار (۶۲۹۰) بیہقی ۶/۱۳۴ اس کی سند میں ابوعبید کو ابن معین وغیرہ نے ثقہ قرار دیا ہے اور ولید بن ابی الولید کو ابوزرعہ، عجلی، ابن شاہین وغیرہ ہم نے ثقہ کہا ہے لہذا یہ حدیث حسن ہے۔

صورت یوں بیان فرمائی کہ

((لَمَّا سَمِعَ اَكْثَرَ النَّاسِ فِي كِرَاءِ الْاَرْضِ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ اِنَّمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَاَنْ مَنَحَهَا اَحَدُكُمْ اَخَاهُ (اَیْ قَالَهُ تَحْرِيْضًا لِلنَّاسِ عَلَى الْاِحْسَانِ) وَلَمْ يَنْهَ عَنْ كِرَائِهَا۔[1]))

(جب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے زمین کے کرائے کے سلسلہ میں اکثر لوگوں کی چہ میگوئیاں سنیں تو فرمایا۔ سبحان اللہ۔ رسول اللہ ﷺ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ تمہارا کوئی شخص اپنے بھائی کو کرائے کے بجائے مفت زمین کیوں نہیں دے دیتا۔ (یعنی آپ لوگوں کو احسان کی ترغیب دینا چاہتے تھے) آپ نے زمین کرایہ پر دینے سے منع نہیں فرمایا تھا۔)

اسی مضمون سے ملتی جلتی روایات ترمذی میں اس طرح ہے۔

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمْ يُحَرِّمِ الْمُزَارَعَةَ وَلٰكِنْ اَمَرَ اَنْ يَرْفُقَ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ۔[2]))

(حضرت ابن عباس... سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کھیتی کو بٹائی پر دینے کو حرام نہیں کیا ہاں آپ نے یہ ضرور حکم فرمایا ہے کہ ایک شخص دوسرے سے نرمی کا برتاؤ کرے۔)

گویا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ عدم جواز مزارعت کی تمام روایات میں مذکورہ نہی کو نہی تحریمی نہیں بلکہ تنزیہی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ کی اس تطبیق کو امت کی اکثریت نے قبول کر لیا۔ آپ کے مایہ ناز شاگرد اور نامور فقیہ حضرت طاؤس' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی اسی تطبیق کو قبول کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

حضرت عمرو بن دینار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت طاؤس رحمہ اللہ سے کہا۔ کاش! تم بھی کھیتی کو بٹائی پر دینا چھوڑ دو۔ کیونکہ لوگوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کھیتی کو بٹائی پر دینے سے منع فرمایا ہے۔ تو حضرت طاؤس کہنے لگے کہ "لوگوں میں میں سب سے زیادہ جاننے والے (یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ) نے مجھے خبر دی ہے کہ آپ ﷺ نے کھیتی کو بٹائی پر دینے سے منع نہیں فرمایا۔ بلکہ آپ نے یہ فرمایا ہے کہ اگر کوئی اپنے بھائی کو زمین ہدیہ پر دے دے تو یہ بات اس

---

[1] ابوداؤد کتاب البیوع باب فی المزارعة (۳۳۸۹) نسائی (۳۹۲۶) ابن ماجہ کتاب الرھون باب المزارعة فی الثلث والربع (۲۴۵۰) یہ حدیث صحیح ہے۔

[2] الترمذی۔ ابواب الاحکام۔ باب ماجاء فی المزارعة (۱۳۸۵) امام ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔

کے لیے اجرت پر دینے سے بہتر ہے۔[1]

اس تطبیق سے متعلق مختلف روایات درج کرنے کے بعد امام ابن تیمیہ منتقی الاخبار کتاب المساقات والمزارعۃ کے آخر میں فرماتے ہیں کہ:

((وَبِالْاِجْمَاعِ تَجُوْزُ الْاِجَارَۃ وَلَا تَجِبُ الْاِعَارَۃ فَعُلِمَ اَنَّهٗ اَرَادَ النَّدْبَ۔)) (کرائے پر زمین دینا بالاجماع جائز ہے اور عاریتاً دینا بالاتفاق واجب نہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کا ارادہ استحباب کا تھا۔)

ہمیں اس نتیجہ سے تھوڑا سا اختلاف ہے اور وہ یہ ہے کہ جواز مزارعت پر اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں بلکہ یہ جمہور کا مذہب ہے اور اجماع اور جمہور میں جو فرق ہے وہ بالکل واضح ہے۔ صحابہ میں بھی یہ اختلاف موجود تھا۔ بعد میں ظاہریہ عدم جواز کے قائل رہے ہیں۔ (نیل الاوطار۔ ج ۴ ص ۱۰) فقہاء اربعہ[2] میں سے کچھ مخابرہ کو جائز سمجھتے ہیں اور کچھ محاقلہ کو ان حالات میں مزارعت کے جواز پر اجماع کے دعویٰ کو کیسے درست قرار دیا جا سکتا ہے؟

مزارعت کے قائلین اور منکرین کے دلائل کا موازنہ

(۱) قائلین مزارعت کی سب سے بڑی دلیل خود رسول اللہ ﷺ کا خیبر کی زمین کو بٹائی پر دینا ہے اور چونکہ آپ ﷺ کی آخری عمر تک بلکہ دور فاروقی تک خیبر کی زمین بٹائی پر رہی ہے لہٰذا قائلین مزارعت یہ کہتے ہیں کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ کی آخری زندگی تک یہی سنت جاری رہی ہے۔ لہٰذا عدم جواز مزارعت والی تمام روایات منسوخ قرار پاتی ہیں۔

اس کے جواب میں منکرین مزارعت یہ کہتے ہیں کہ خیبر کا معاملہ بٹائی کا معاملہ تھا ہی نہیں۔ کیونکہ خیبر کو رسول اللہ ﷺ نے بزور شمشیر فتح کیا تھا۔ لہٰذا خیبر کے یہود مسلمانوں کے غلام تھے۔ اس لحاظ سے خیبر کی زمین کی پیداوار کا جو حصہ آپ وصول کرتے تھے۔ وہ بھی آپ کا ہی تھا۔ اور جو کچھ یہود کے پاس چھوڑ دیتے تھے۔ وہ بھی آپ ہی کا تھا۔ حاوی کہتے ہیں کہ یہ مذہب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ، اسید بن صغیر رضی اللہ عنہ، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور نافع رضی اللہ عنہ کا ہے۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور کوفیین میں سے امام ابوحنیفہؒ اسی طرف گئے ہیں۔
(نیل الاوطار ج ۴ صفحہ ۱۰)

---

[1] بخاری۔ کتاب الوکالۃ۔ باب المزارعۃ بالشطر ونحوہ۔ نیز مسلم کتاب البیوع۔ باب کراء الارض

[2] ترمذی۔ ابواب الاحکام۔ باب ماجاء فی المزارعۃ

منکرین مزارعت کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خیبر کی زمین خراجی تھی- لہٰذا اس کے متعلق جو بھی معاملہ طے کرلیا جاتا وہ درست تھا-

یہ دلیل اس لحاظ سے درست نہیں کہ خیبر کا کچھ حصہ تو بزور شمشیر فتح کیا گیا تھا اور کچھ حصہ بغیر جنگ کے فتح ہوگیا تھا- اسی لیے خیبر کی آدھی زمین تو بطورِ مال فے اسلامی مملکت کی تحویل میں آ گئی- باقی آدھی زمین مجاہدین میں تقسیم ہوگئی- اسے کسی صورت میں بھی خراجی قرار نہیں دیا جا سکتا- باقی رہا مزارعت کا معاملہ تو وہ خراجی زمین تھی یا غیر خراجی سب کا معاملہ بٹائی پر ہی ہوا تھا-

منکرین مزارعت کی طرف سے خیبر کی بٹائی کے معاملہ پر کچھ اور بھی اعتراض کر کے اسے بٹائی کے معاملہ سے ہی خارج کرنے کی کوشش کی جاتی ہے- مگر ایسے اعتراض چونکہ محض ''اعتراض برائے اعتراض'' ہیں- لہٰذا مختصر مقالہ میں ان کا ذکر بھی مشکل ہے-

(۲) قائلین مزارعت کی طرف سے جواز مزارعت کی دوسری دلیل مواخات کے سلسلہ میں مہاجرین کا نصف پیداوار پر کام کرنا ہے- اس دلیل کا منکرین مزارعت یہ جواب دیتے ہیں کہ عدم جواز مزارعت کا اصل مقصد مسلمانوں کا آپس میں ذاتی خودغرضی اور طمع کے بجائے ایثار و رفاقت سے کام لینا ہے- اور سلسلہ مواخات میں یہ مقصد پہلے ہی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے- یعنی انصار تو اس بات پر بھی تیار تھے کہ اپنی زمین مزارعت یا بٹائی پر دینے کے بجائے مہاجرین کو آدھی زمین کا مالک بنا دیں- لیکن مہاجرین کی خودداری نے انصار کے اتنے بڑے ایثار و قربانی کو قبول نہ کیا- تو اب اس کی دوسری صورت یہی باقی رہ جاتی تھی کہ انصار کی زمین یا نخلستان میں مہاجرین و انصار کا یہ معاہدہ اگرچہ اپنی ظاہری شکل میں مزارعت ہی نظر آتا ہے- لیکن مقصد کے لحاظ سے بالکل مختلف ہے لہٰذا اس واقعہ کو بٹائی کے جواز کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا-

(۳) منکرین مزارعت کی طرف سے اپنے موقف کی صحت کی تائید میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بٹائی سے رجوع کے واقعہ کو بھی پیش کیا جاتا ہے- اس کا جواب قائلین کی طرف سے دیا جاتا ہے کہ

(i) یہ تو واضح ہے کہ دور نبوی ﷺ میں آپ کے سامنے بٹائی کا کاروبار ہوتا رہا ہے اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جنہیں خود رسول اللہ ﷺ نے رجل صالح فرمایا تھا' بھی یہ کاروبار کرتے رہے ہیں- اگر یہ بٹائی کا معاملہ فی الواقع حرام ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کو سختی سے بند کر دینا چاہیے تھا- جیسا کہ آپ ﷺ نے سود اور شراب وغیرہ کے سلسلہ میں کیا-

(ii) آپ خود بھی فقیہ تھے اور ایسے مدبر خلیفۃ المسلمین کے بیٹے تھے۔ جنہوں نے دس گیارہ سال تک اسلامی مملکت کا نظم و نسق چلایا اور یہ ناممکن ہے کہ زندگی کے ایک نہایت اہم گوشہ سے تعلق رکھنے والا یہ مسئلہ ان کی نظروں سے اوجھل رہ گیا ہو۔ یا اس کے متعلق انہیں پورا پورا اور صحیح علم نہ ہو سکا ہو۔ اس وضاحت کے بعد قائلین مزارعت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے رجوع کی وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ آپ ... کے رجوع کی اصل وجہ یہ نہ تھی کہ آپ کو بٹائی کی صحت کے متعلق غلطی ظاہر ہو گئی تھی۔ بلکہ اس کی اصل وجہ زہد و ورع کے سلسلہ میں آپ کی شدت احتیاط تھی جو آخری عمر میں وہم کے درجہ تک پہنچ گئی تھی۔ آپ آخری عمر میں وضو میں اس قدر مبالغہ کرنے لگے تھے کہ آنکھوں کا اندرونی حصہ بھی دھوتے تھے۔ جس کی وجہ سے آپ کی بینائی بھی جاتی رہی تھی۔ آپ اپنے بچوں سے پیار کرتے تو پھر کلی کیے بغیر نماز نہ پڑھتے اسی طرح اگر دوران نماز امام کے ساتھ شامل ہوتے تو بعد میں صرف چھوٹی ہوئی نماز ہی ادا نہ کرتے تھے بلکہ سجدہ سہو بھی کرتے تھے۔[1]

مندرجہ بالا تصریحات سے معاملہ زیر بحث کے بہت سے پہلو سامنے آ گئے ہیں۔ یہ تسلیم ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ زہد و ورع کے معاملہ میں حد درجہ محتاط اور متشدد تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ جس قدر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سخت تھے اسی قدر عبداللہ بن عباس نرم تھے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ مزارعت کو علی الاطلاق جائز قرار دیتے اور نہی کو درجہ استحباب پر لے آتے ہیں۔ پھر یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہی ہیں جو عورتوں کے پردہ کے معاملہ میں درونِ خانہ کی حد تک چہرہ اور ہاتھوں کو پردہ سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ اور یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہی ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعہ کو قابلِ حد جرم قرار دینے کے بعد بھی اس کے جواز کے قائل رہے اور فرمایا کہ متعہ اللہ کی طرف سے رحمت تھی جسے عمر رضی اللہ عنہ نے روک دیا اگر وہ باقی رہتی تو مسلمان کبھی زنا نہ کرتے۔[2]

---

[1] زاد المعاد ج ا ص ۲۲۶ بحوالہ مسئلہ ملکیت زمین ص ۶۷

[2] تفسیر مظہری زیر آیت متعلقہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اسے اضطراری کیفیت میں حلال سمجھتے تھے جیسا کہ مردار اور خنزیر اضطراری صورت میں بقدر ضرورت حلال ہو جاتا ہے۔ حافظ بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ روایات ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں دیکھیں فتح الباری ۹/۱۷۲ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے رجوع کے بارے ایک روایت ترمذی (۱۱۲۲) میں موجود ہے جس کے بارے علامہ حازمی فرماتے ہیں۔ یہ سند صحیح ہے اگر موسیٰ بن عبیدہ الربذی ربذہ میں سکونت نہ کرتا۔ (تحفۃ الاحوذی ۴/۲۹۰)

ہمارے اس خیال کی تائید علامہ ابن خلدون کے درج ذیل اقتباس سے بھی ہو جاتی ہے- آپ فرماتے ہیں-

''اور (اموی خلیفہ ابوجعفر) منصور کا علم دین میں جو مرتبہ قبل از خلافت اور بعد از خلافت رہا ہے وہ مخفی نہیں- چنانچہ اسی نے حضرت امام مالک کو موطا تصنیف کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا- کہ اے ابوعبداللہ! (امام مالکؒ کی کنیت) اس وقت سطح زمین پر مجھ سے اور تم سے زیادہ کوئی عالم دین نہیں میں تو خلافت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا ہوں- تم لوگوں کے لیے ایسی کتاب لکھو جس سے وہ فائدہ اٹھائیں- نہ اس میں عبداللہ بن عباس کی نرمیاں ہوں- نہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی سختیاں- اور جو لوگوں کے لیے تصنیف و تالیف کی راہ کھول دے- حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ قسم بخدا! مجھے ابوجعفر نے آج تصنیف کا فن سکھا دیا-''[1]

تطبیق کی نئی صورتیں:

ہمارے خیال میں عدم جواز مزارعت کی احادیث نہ تو منسوخ ہیں اور نہ ہی محض استحباب کے درجہ پر ہیں- بلکہ ان دونوں کی طرح احادیث میں تضاد کی اصل وجہ حالات کا اختلاف ہے- اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اسی طرح کا ایک اختلافی مسئلہ یہ ہے کہ مس ذکر سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ ایک روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا-

((مَنْ مَسَّ ذَكَرَهُ فَلَا يُصَلِّ حَتّٰى يَتَوَضَّأَ-[2])) (جس شخص نے اپنے ذکر کو چھوا تو وہ وضو کیے بغیر نماز نہ پڑھے-)

اور طلق بن علی کی حدیث کے مطابق (جسے ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' احمد اور دارقطنی نے روایت کیا ہے) آپ نے فرمایا-

((إِنَّمَا هُوَ بِضْعَةٌ مِنْكَ-[3])) (وہ بھی تو تمہارے جسم کا ایک ٹکڑا ہے-)

---

[1] مقدمہ ابن خلدون- ترجمہ اردو ص ۴۱' مطبوعہ نور محمد کراچی-

[2] ترمذی ابواب الطہارۃ باب الوضوء من مس الذکر (۸۲) ابوداؤد کتاب الطہارۃ باب الوضوء من مس الذکر (۱۸۱) نسائی' ابن ماجہ' ابن حبان' بیہقی' دارقطنی' طبرانی کبیر' ابن خزیمہ (۳۳) مسند احمد ۲/۲۲۳' ۶/۴۰۶ امام بخاری فرماتے ہیں اس مسئلہ میں یہ سب سے زیادہ صحیح حدیث ہے' بلوغ المرام (۶۷)

[3] ترمذی ابواب الطہارۃ باب ماجاء فی ترک الوضوء من مس الذکر (۸۵) ابوداؤد (۱۸۲' ۱۸۳) نسائی' ابن ماجہ' ابن حبان' مسند احمد ۴/۲۳' بلوغ المرام (۶۶)

ان دونوں قسم کی متضاد روایات میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ پہلی روایات میں ایک عام اصول بیان کیا گیا ہے- جبکہ دوسرا ارشاد صرف اس (پوچھنے والے جیسے) بوڑھے سے متعلق ہے جس کی شہوت ختم ہو چکی ہو- اس طرح یہ دونوں احادیث حالات کے متعلق ہو کر قابل عمل رہتی ہیں- تو جس طرح اس مثال میں بالکل متضاد حکم مختلف حالات میں درست اور قابل عمل رہتے ہیں- یہی صورت مزارعت کے سلسلہ میں بھی پیش آ سکتی ہے- اب یہ تو ظاہر ہے کہ کاشت کاری صرف تنومند اور طاقتور آدمی ہی کر سکتے ہیں- جبکہ زمین کے مالک قانون وراثت کی رو سے بچے' بوڑھے عورتیں' کمزور اور ناتواں بھی ہو سکتے ہیں اور مفلس و نادار بھی- بچے' بوڑھے اور کمزوروں کے مالک زمین ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ دوسروں سے کاشت کرانے کی اجازت ضروری ہو اور مفلس و نادار ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں اس کا کچھ صلہ بھی ضرور ملنا چاہیے- لہٰذا ہمارے خیال میں:

(۱) اگر مالک زمین مفلس و تنگدست ہے تو وہ اپنی زمین بٹائی پر بھی دے سکتا ہے اور ٹھیکہ یا نقد کرایہ پر بھی- شرط صرف یہ ہے کہ ان میں بٹائی کی یا کرایہ طے کرنے کے سلسلہ میں کوئی شرط ایسی نہ ہو جو شرعاً درست نہ ہو-

(۲) اگر مالک زمین صاحب حیثیت ہے اور کاشت کار مفلس و قلاش ہے تو بٹائی اور ٹھیکہ سب کچھ ناجائز ہوگا- اس صورت میں مالک زمین کے لیے لازم ہے کہ ہدیتاً اپنے مسلمان بھائی کو زمین کاشت کرنے کے لیے دے دے اور کرایہ یا حصہ کچھ بھی نہ لے-

(۳) اگر مالک زمین بھی حاجتمند اور مفلس ہو اور کاشت کار بھی- یا اس کے برعکس مالک زمین بھی کھاتا پیتا آدمی ہے اور کاشت کار بھی تو اس صورت میں استحباب یہ ہے کہ کاشت کار کو زمین مفت دی جائے اگر مالک زمین ایسا نہ کر سکے اور بٹائی یا کرایہ وصول کرنا چاہے تو بھی جائز ہے-

(۴) اگر کوئی شخص اپنی زمین خود کاشت نہیں کر سکتا اور دوسرے کو بھی مفت برائے کاشت نہیں دیتا- اس کی وجہ خواہ یہ ہو کہ وہ اپنے آپ میں اتنا ایثار کا جذبہ نہ رکھتا ہو یا کاشت کار کے زمین پر قبضہ جما بیٹھنے کا خطرہ ہو یا کوئی اور وجہ ہو- تو پھر احادیث میں تیسری صورت کی دو شکلیں بیان کی گئی ہیں-

(ا) فَلْيُمْسِكْ اَرْضَهٗ: (بخاری-مسلم) یعنی مالک زمین اپنی زمین کو پڑا رہنے دے اس پڑا رہنے دینے میں بھی زمین میں کچھ نہ کچھ ضرور پیدا ہوگا- مثلاً گھاس' جھاڑیاں' جڑی بوٹیاں اور ایندھن یا درخت وغیرہ- ان کا بھی انسانوں یا حیوانوں کو فائدہ پہنچے گا- اور اگر مالک زمین کو کچھ

نقد وصول نہیں ہوتا تو کم از کم اس کی طرف سے صدقہ تو ضرور شمار ہوگا۔ علاوہ ازیں ایسی پڑی ہوئی زمین اگلے سال زیادہ فصل اگانے کے قابل بن جائے گی۔

(ب) فَلْيَدَعْهَا: (مسلم کتاب البیوع' باب کراء الارض) یعنی مالک اس زمین کو چھوڑ دے یا بالفاظ دیگر ایسی زمین سے دستبردار ہو جائے۔ جس کی صورت ہمارے خیال میں مناسب یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر تین سال تک زمین پڑتی رہتی ہے اور اس کو آباد کرنے کی کوئی صورت اس کے سامنے نہیں آتی تو اسے ایسی زمین کی ملکیت سے ہی دستبردار ہو جانا چاہیے۔ خواہ فروخت کر دے[1]۔ خواہ ہدیتاً کسی مسلمان بھائی کو دے دے۔ بصورت دیگر حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ ایسی زمین مالکِ زمین (جسے حکومت نے زمین عطا کی ہو) سے زبردستی واپس لے لے۔

ایک اہم سوال؟

اس مسئلہ پر ایک اور پہلو سے بھی غور کرنا ضروری ہے۔ یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عہد نبوی ﷺ صدیقی رضی اللہ عنہ' فاروقی رضی اللہ عنہ اور عثمانی رضی اللہ عنہ میں بٹائی کا سلسلہ بھی چل رہا تھا۔ اور زمین کو کرایہ پر دینے کا بھی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ عدم جواز مزارعت کا مسئلہ یک لخت کیوں اٹھ کھڑا ہوا؟ اور اٹھا بھی اس شدت سے کہ اکثر لوگ اس مسئلہ پر چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ حالانکہ احادیث بھی وہی تھیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے خود سنی تھیں یا ایک آدھ واسطہ سے سنیں تھی۔ یہ جو رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ' جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ' حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ وغیرہ دور معاویہ رضی اللہ عنہ میں عدم جواز مزارعت کی حدیثیں سنانے لگے تھے۔ انہوں نے اس سے پیشتر دور نبوی ﷺ یا صدیقی رضی اللہ عنہ' یا فاروقی رضی اللہ عنہ یا عثمانی رضی اللہ عنہ کیوں نہ حدیثیں نشر کیں؟

جہاں تک میں نے اس مسئلہ پر غور کیا مجھے یہی معلوم ہوا کہ دور نبوی' صدیقی اور فاروقی میں ایسی عدم جواز مزارعت کی احادیث گاہے گاہے بیاں ضرورت ہوتی ہوں گی۔ مگر ان کے چرچا کی ضرورت پیش ہی نہیں آئی۔ ان ادوار میں مسلمانوں میں ایثار کا جذبہ موجود تھا۔ لوگ اگر اپنی فاضلہ زمین بٹائی یا کرایہ پر دیتے تھے تو ایسے بھی موجود تھے جو اپنے بھائی کو مفت زمین دے دیتے

[1] ابو رافع بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم نے ان کے خاندان کو ایک زمین عطا کی تھی جسے وہ آباد نہ کر سکے تو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ۸ ہزار دینار میں فروخت کر دیا۔ (مسئلہ ملکیت زمین' ص ۴۵)

تھے۔مسلمانوں میں افراط زر کا مسئلہ دور عثمانی رضی اللہ عنہ میں پیدا ہوا۔اس دور میں جب مسلمانوں میں وافر دولت آ گئی تو فاضلہ دولت میں سے مسلمانوں نے دھڑا دھڑ زمینیں خرید نا شروع کر دیں۔اس طرح جہاں ایک طرف جاگیرداری میں اضافہ ہوا وہاں دوسری طرف مسلمانوں نے جواز کا سہارا لے کر محتاج و مفلس کاشتکاروں کو بھی اپنی زمین مفت دینا یکسر بند کر دیا اس دوہرے عمل نے جب طبقاتی تقسیم کو اور بھی جلابخشی اور زمین کی قیمت کے ساتھ ساتھ غلہ کی قیمت بھی آسمان سے باتیں کرنے لگی اور محتاج و نادار کو غلہ خرید کر اپنے کنبہ کی پرورش کرنا بھی مشکل ہو گا۔تو ہمارے خیال میں یہی عین مناسب تھا۔کہ عدم جواز مزارعت کی احادیث کو پوری قوت کے ساتھ نشر کیا جاتا۔لہٰذا عین مناسب وقت پر پانچ سات بزرگ صحابہ نے حق بات لوگوں تک پہنچا دی اور صرف ایسی حدیث کا پرچار کیا۔جو بالکل درست اور موقع کے لحاظ سے وہی قابل عمل تھیں۔مگر چونکہ مزارعت کو یکسر حرام نہیں کیا گیا تھا۔اس لیے عدم جواز مزارعت کی توجیہات تلاش کی جانے لگیں۔اور ان توجیہات سے امت کی اکثریت نے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا۔مسلمان ایثار اور عزیمت کے افضل اور بلند تر سطح سے نیچے اتر آیا اور جواز کا سہارا لے کر ہمیشہ کے لیے اسی پر قناعت کر لی۔چنانچہ آج تک یہی دستور چلا آ رہا ہے۔

باب:۱۰

آجر اور اجیر یا مالک اور مزدور کے مسائل

عربی زبان کا لفظ اجارہ بڑے وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے- مثلاً زمین کو ٹھیکہ پر دینا اجارہ ہے- مکان یا دکان کو کرایہ پر چڑھانا بھی اجارہ ہے- کوئی جانور مثلاً گھوڑا یا سائیکل یا کوئی گاڑی کرایہ پر لینا بھی اجارہ ہے- ریلوں' بسوں اور ٹرانسپورٹ کا کرایہ بھی اجارہ ہے اور کسی کو ایک دن یا معینہ مدت کے لیے مزدور رکھنا بھی اجارہ ہے-

زمین کو ٹھیکہ پر دینے کا مسئلہ مزارعت کے باب میں تفصیل سے آ چکا ہے- مکان یا دکان کرایہ پر دینا بھی درست ہے-

مکان کا کرایہ:

دورِ فاروقی میں مکہ میں جیل خانہ بنانے کی ضرورت پیش آئی- اس غرض کے لیے نافع بن حارث نے صفوان بن امیہ سے ایک عمارت پر سودا بازی کی- اور قبضہ لے لیا- اور شرط یہ طے ہوئی کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ عمارت قید خانہ کے لیے پسند کر لی تو سودا پکا ہو جائے گا- ورنہ جواب آنے تک کی مدت کے لیے صفوان بن امیہ کو چار سو دینار بطور کرایہ مل جائیں گے-[1]

حضرت امام احمد بن حنبل نے اپنی مملوکہ دکانیں کرایہ پر چڑھا رکھی تھیں- جن کی وہ باقاعدہ زکوٰۃ ادا کیا کرتے تھے- یعنی سالانہ آمدنی پر چالیسواں حصہ زکوٰۃ نکالتے تھے-[2]

دستور کے مطابق اشیاء کو کرایہ پر لینا اور دینا بھی جائز اور درست ہے اور کسی آدمی کا دوسرے کو مزدوری پر لگانا بھی- اگر کام بھی معروف ہو اور اجرت بھی تو اجرت طے کیے بغیر مزدور کو کام پر لگانا درست ہے اور اگر مالک یا مزدور معروف نرخ سے کم یا زیادہ اجرت دینا یا لینا چاہیں- تو بات پہلے طے کر لینا ضروری ہے-

مالک اور مزدور کے مسائل نے موجودہ دور میں چونکہ خاصی پیچیدگی اختیار کر لی ہے لہٰذا

---

1. بخاری- کتاب الخصومات- باب الربط والحبس فی الحرم ص ۳۷۹ مطبوعہ دارالسلام
2. المغنی ج ۱' ص ۶۲۱ مطبوعہ بیروت ۱۳۹۲ھ

اس مسئلہ پر ہم ذرا تفصیل سے لکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

ا- مالک اور مزدور

اقدار کی تبدیلی:

ایک وقت تھا جب مزدور کو مظلوم تصور کیا جاتا تھا- کیونکہ وہ کمزور اور ضرورت مند تھا لہٰذا اس کا استحصال کیا جاتا اور سرمایہ دار کو ظالم سمجھا جاتا تھا- مگر انقلابِ روس کے بعد یہ صورت حال بدل گئی- مزدوروں نے عالمی سطح پر منظم ہونا شروع کیا اور ایک چھوٹے سے کاروباری یونٹ سے لے کر بڑے کارخانہ تک اپنی مزدور انجمنیں تشکیل دے لیں اور اس اجتماعی طاقت کے بل بوتے پر انہوں نے سرمایہ داروں یعنی کارخانہ داروں اور مل مالکوں کو ناک چنے چبوائے اور بعض اوقات ان کے کروڑوں کے کاروبار کو پیوند خاک کر کے بھی دکھایا- جس کی وجہ پرانے مظالم کا بدلہ تھا-

دوسری طرف ردعمل کے طور پر سرمایہ داروں (اصل داروں) نے بھی اپنی انجمنیں تشکیل دیں- اور معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ مزدور اپنی یونین کے ذریعے اپنے مطالبات منوانے کے لیے ہڑتال کرتے ہیں تو کارخانہ دار تالہ بندی کا حربہ استعمال کرتے ہیں- جس کے نتیجہ میں کارخانوں کی چمنیوں سے دھواں نکلنا بند ہو جاتا ہے' کاروبار ٹھپ ہو جاتا ہے- پیداوار رک جاتی ہے- بازار میں مصنوعی قلت کا دور دورہ ہوتا ہے- قیمتیں چڑھ جاتی ہیں اور یوں دو منہ زور گھوڑوں کی مستیوں کی سزا ان غریب صارفین کو ملتی ہے جو نہ بے جا ہڑتال کا منصوبہ بناتے ہیں نہ ظالمانہ تالہ بندی کا اعلان کرتے ہیں-

اس غیر مناسب صورت کا علاج کرنے اور سرمایہ و محنت کے تنازعہ کا حل نکالنے اور آجر و اجیر کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے انسانی بستی کے داناؤں' جن میں ماہرین معاشیات اور حکمران بھی شامل ہوتے ہیں' نے مل کر کئی بار بہترین دماغی صلاحیتوں کو کھپا کر کوششیں کی ہیں- عالمی سطح پر بھی اس تنازعہ کی سنگینی کو محسوس کر کے کوششیں کی گئی ہیں- جن کی واضح صورت اقوام متحدہ کی زیر نگرانی عالمی ادارہ محنت (International Labour Organization) کا قیام ہے جس کے تیار کردہ قوانین محنت اس وقت تمام دنیا کے ممالک' مسلم اور غیر مسلم میں نہ صرف رواج پذیر ہیں بلکہ انہیں قانونی درجہ بھی حاصل ہے-

مگر ع ---- مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کے مصداق ان تمام کوششوں نے سرمایہ اور محنت کے تنازعہ کو مزید الجھایا۔ اور اس آویزش کی آنچ کو تیزتر کیا۔ اس کی اصل وجہ چارہ گر کی وہ نادانی ہے جو دل کے درد کا علاج پنڈلی پر پٹی باندھ کر کرنا چاہتا ہے۔

اسلام ---- دین فطرت کا قانون محنت و اجرت جسے اللہ کریم نے آجر و مزدور کے تعلقات کو محبت، انسانی برادری اور برابری پر استوار کرنے کے لیے اتارا۔ آج بھی محنت اور سرمایہ کے تنازعہ کا حل اخوت اور بھائی چارہ کی بنیاد پر کرتا ہے۔ آیئے اب ہم اس عادلانہ قانون کے ان مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔ جن کی مدد سے اس تنازعہ کا حل کیا جا سکتا ہے۔ مگر پہلے ہم یہ تو دیکھیں کہ سرمایہ دار اور مزدور کے تنازعہ کی اصل وجہ کیا ہے؟

سرمایہ دار اور مزدور کے تنازعہ کی اصل وجہ:

اگر شمار کرنا چاہیں اور بالخصوص جبکہ سرمایہ دار اپنی معاشی فکر میں پلے اور بڑھے۔ ماہرین معاشیات جنہیں علاج سے زیادہ مرض سے دلچسپی ہوتی ہے، بھی ہمارے شریک کار ہوں، تو ہم سرمایہ اور محنت کے تنازعہ کی وجوہ کی ایک لمبی فہرست تیار کر سکتے ہیں۔ مگر بنظر عمیق جائزہ لیں تو یہ تمام وجوہ اور ان سے پیدہ شدہ اثرات صرف ایک ہی وجہ پر مبنی ہیں اور وہ ہے خیر خواہی کے جذبہ سے عاری اور خودغرضی سے لبریز ذہنیت جو سرمایہ دار اور مزدور دونوں میں موجود ہے۔ سرمایہ دار چاہتا ہے کہ مزدور سے کام زیادہ لے اور پیداوار زیادہ کرلے اور اپنا زیادہ سے زیادہ نفع یقینی بنائے جبکہ مزدور چاہتا ہے کہ کام چوری کرے۔ کارخانہ دار کی پیداوار نہ ہو مگر اسے اجرت زیادہ سے زیادہ یقینی طور پر ملے۔ بس یہی وہ خودغرضانہ ذہنیت ہے جس نے سرمایہ دار کو ظالمانہ استحصال پر لگا دیا ہے اور مزدور کو انتقامانہ بغاوت پر ابھار دیا ہے۔

اسلام نے آقا اور مزدور کے درمیان تعلقات کی خوشگواری کے لیے مندرجہ ذیل ہدایات واحکام دیئے ہیں۔

(۱) مزدور کے حقوق:

آقا اور غلام، مالک اور مزدور، زمیندار اور جاگیردار اور کسان یا مزارع ان سب انواع میں قدر مشترک یہ پائی جاتی ہے کہ آقا یا مالک اپنے آپ کو برتر اور فریق ثانی کو کہتر مخلوق سمجھتا ہے۔ یہی تصور اسے فریق ثانی پر طرح طرح کی زیادتیوں پر دلیر بنا دیتا ہے اور جب تک یہ تصور

موجود ہے' ان طبقوں میں تعلقات کی خوشگواری ناممکن ہوتی ہے۔ اسلام نے اسی برتری کے تصور پر کاری ضرب لگائی۔ اور ان کے حقوق کو متعین کیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

((اِخْوَانُکُم خَوَلُکُمْ[1] جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَيْدِيْكُمْ فَمَنْ كَانَ اَخُوْهُ تَحْتَ يَدِهٖ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تُكَلِّفُوْهُمْ مَّا يَغْلِبُهُمْ فَاِنْ كَلَّفْتُمُوْهُمْ فَاَعِيْنُوْهُمْ۔[2]))

(تمہارے خادم' ملازم' مزدور اور غلام تمہارے بھائی ہیں۔ لہٰذا تم میں سے جس کے قبضے میں اس کا کوئی بھائی ہو تو اس کو ویسا ہی کھلائے اور پہنائے جیسا وہ خود کھاتا اور پہنتا ہے۔ اور اس کو کوئی ایسا کام کرنے کو نہ کہے جس کو وہ کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو اور کبھی ایسا کام کرنے کو کہے تو خود بھی اس کا ہاتھ بٹائے۔)

اس ارشاد نبوی سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) معاشرتی مساوات اور آقائی کے تصور کا خاتمہ:

فریق ثانی ہرگز کہتر مخلوق نہیں۔ بلکہ وہ معاشرتی لحاظ سے آقا و مالک کے برابر کا درجہ رکھتے ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ مزدور و مالک آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ لہٰذا آقا یا مالک کو اپنے خادم یا مزدور کے ساتھ صرف برابری کا نہیں بلکہ بھائیوں کا سا سلوک کرنا چاہیے۔

اس حدیث کے ابتدائی الفاظ میں اخوانکم کا لفظ خولکم سے پہلے لانے سے اس جملہ کو نہایت بلیغ انداز میں پیش کیا گیا ہے جس میں یہ تاکید از خود پیدا ہو جاتی ہے کہ تمہارے خادم فی الحقیقت تمہارے بھائی ہی ہیں۔

(۲) معاشی استحصال کی ممانعت:

ارشاد نبوی ﷺ یہ ہے کہ مالک جو کچھ کھاتا اور پہنتا ہے وہی کچھ اپنے مزدور کو کھانے اور پہننے کو دے۔ جس سے از خود یہ اصول مستنبط ہوتا ہے۔ کہ نہ تو آقا یا مالک کو عیاشانہ اور امیرانہ زندگی بسر کرنے کی اجازت ہے اور نہ ہی مزدور کو صرف اتنا معاوضہ دینے کی جس سے وہ بمشکل

[1] خول کا لفظ ہر اس شخص کے لیے آتا ہے جو کسی کے ماتحت ہو کر کام کرے خواہ وہ مزدور ہو یا ملازم ہو یا غلام ہو یا خادم ہو۔
[2] بخاری کتاب الایمان۔ باب المعاصی من امور الجاھلیة۔

اپنی زندگی برقرار رکھ سکے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ مالک اپنی خوراک و پوشاک کو اس سطح تک نیچے لائے۔ جس سطح تک وہ مزدور کی خوراک و پوشاک کی سطح کو بلند کر سکتا ہو۔ تاکہ آقا کی معاشی برتری کا تصور ختم ہو سکے اور مزدور کا بھی معاشی استحصال نہ ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس حدیث کی رو سے بھائی چارہ کے رشتہ کا لحاظ رکھتے ہوئے درست طور پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مالک کو اپنے مزدور کو اتنا معاوضہ ضرور دینا چاہیے کہ اگر وہ عیالدار ہے تو معروف طریقہ پر اس کی گزر بسر ہو سکے۔

(۳) تکلیف مالا یطاق کی ممانعت:

تیسری بات آپ نے یہ ارشاد فرمائی کہ مزدور کو ایسا کام کرنے کو نہ کہے جس کی وہ استطاعت نہ رکھتا ہو۔ یہیں سے مزدور کے اوقات کار کی تعیین کا اصول مستنبط ہوتا ہے کہ ایک عام انسان ایک دن میں یا ایک ہفتہ میں کس حد تک یا کتنے گھنٹے کام کر سکتا ہے۔ جو اس کی صحت پر اثر انداز نہ ہو۔ استطاعت کا یہی مفہوم ہے۔ نیز بیماری کی صورت میں کام سے چھٹی یا رخصت بھی اسی ضمن میں آتی ہے۔

علاوہ ازیں ہر انسان طبعی طور پر تفریح کا بھی دلدادہ ہوتا ہے۔ نیز اپنے لواحقین کی شادی غمی میں شمولیت بھی اس کی ایک اہم ضرورت بلکہ مجبوری ہے۔ لہٰذا ایسے موقعوں پر ملازم کو چھٹی نہ دینا بھی تکلیف مالا یطاق اور استطاعت کے منافی ہوگا۔ یہیں سے اس کا اتفاقی اور اضطراری چھٹیوں کے جواز کا اصول مستنبط ہوتا ہے۔

(۴) زائد محنت کا معاوضہ:

چوتھی بات آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمائی کہ اگر مزدور سے کوئی ایسا کام کرانا ضروری ہو جس کی وہ استطاعت نہیں رکھتا۔ تو خود بھی اس معاملہ میں اس کی مدد کرے۔ اس سے دو اصول مستنبط ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر وہ کام ایک عام انسان کے بجائے دو یا تین آدمی مل کر ہی کر سکتے ہیں۔ تو خود بھی اس میں مزدور کا ہاتھ بٹائے۔ اور یہ بلند تر درجہ ہے۔ تاکہ اس کی بالادستی اور برتری کے تصور کا بھی کسی حد تک علاج ہو سکے اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو کم از کم اتنا ضرور کرے کہ اس کے ساتھ حسب ضرورت ایک دو آدمی مزید لگا دے۔

اور دوسرا اصول یہ نکلتا ہے کہ مزدور کے دن بھر کام کرنے کے بعد بھی اگر کام کی نوعیت کا

کا تقاضا یہی ہو کہ وہ بہرصورت اسی دن سرانجام پائے تو اس پر دوسرا مزدور لگائے یا اگر پہلا مزدور کام کرنے پر رضامند اور اتنی استطاعت رکھتا ہو کہ وہ کام کو جاری رکھ کر سرانجام دے سکے تو اسے اس کا الگ معاوضہ ملنا چاہیے۔ یہ معاوضہ کتنا ہو؟ برابر ہو یا زیادہ یا دگنا۔ یہ بات فریقین کے باہمی سمجھوتے سے طے ہو سکتی ہے۔ تاہم مزدور کو اس کے زائد وقت (Over Time) کا معاوضہ ضرور ملنا چاہیے۔

۲۔ مزدور کے حقوق کا تحفظ

(۱) مزدور کی عزتِ نفس:

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ جس پایہ کے صحابی تھے وہ سب جانتے ہیں۔ آپ السابقون الاولون میں سے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ رضی اللہ عنہ سے خصوصی محبت اور پیار تھا۔ آپ انتہا درجے کے قناعت پسند اور زائد از ضرورت مال اپنے پاس رکھنا حرام سمجھتے تھے۔ حضرت معرور بیان کرتے ہیں کہ میں ربذہ میں ابو ذر رضی اللہ عنہ سے ملا۔ وہ ایک جوڑا پہنے ہوئے تھے اور ان کا غلام بھی ویسا ہی جوڑا پہنے ہوئے تھا۔ میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ "میں نے ایک شخص[1] سے گالی گلوچ کی۔ اور اس کو ماں کی گالی دی۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔

((يَا اَبَاذَرٍّ عَيَّرْتَهُ بِاُمِّهِ اِنَّكَ امْرَءٌ فِيْكَ اَمْرُ الجَاهِلِيَّةِ۔[2]))

(اے ابو ذر! تو نے اسے (حضرت بلال..... کو) اس کی ماں سے عار دلائی ہے تو ایسا شخص ہے جس میں ابھی تک جاہلیت باقی ہے۔)

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے غلاموں کے متعلق وہی کچھ ارشاد فرمایا۔ جو ہم ابتدا میں درج شدہ حدیث میں بیان کر چکے ہیں۔ غور فرمایئے کہ عزت نفس

---

[1] یہ شخص حضرت بلالؓ تھے اور حضرت ابوذرؓ نے جو ماں کی گالی دی وہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے کہا تھا۔ اے کالی ماں کے کالے بیٹے۔ اور جب آنحضورؐ نے عتاب فرمایا تو آپؓ نے حضرت بلالؓ سے معافی مانگی اور اپنا گال زمین پر رکھ کر کہنے لگے کہ اس وقت تک گال نہ اٹھاؤں گا جب تک بلالؓ اپنے پاؤں سے نہ روندیں۔ (وحید الزماں)

[2] بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب المعاصی من امر الجاهلية

کے حق کی اس قدر پاسداری' اور وہ بھی غلاموں اور مزدوروں کے لیے' اسلامی معاشرہ کے علاوہ کسی اور معاشرہ میں مل سکتی ہے۔

(۲) معاشی حقوق کا تحفظ:

رسول اللہ ﷺ کا درج ذیل ارشاد مبارک اتنا مشہور ہے کہ ہر مزدور کو اگر اس کے عربی کے الفاظ یاد نہ ہوں تو بھی مفہوم ضرور یاد ہوتا ہے۔

((اُعْطُوا الاَ جِيرَ الاَ جْرَ قَبْلَ اَنْ يَّجِفَّ عَرَقُهٗ۔[1])) (مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔)

اور یہ ارشاد مبارک' اکثر کارخانوں اور فرموں میں آویزاں بھی ہوتا ہے۔

مزدوری ادا نہ کرنے کا گناہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

((ثَلٰثَةٌ اَنَا خَصمُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ رَجُلٌ اَعْطٰى بِیْ ثُمَّ غَدَرَ وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا ثُمَّ اَكَلَ ثَمَنَهٗ وَرَجُلٌ اِسْتَاجَرَ اَجِيْرًا فَاسْتَوْفٰى مِنْهُ وَلَمْ يُوْتِهٖ اَجْرَهٗ۔[2])) (قیامت کے دن میں تین آدمیوں کی طرف سے خود مدعی بنوں گا۔ ایک وہ شخص جس نے میرا نام لے کر عہد کیا پھر فریب کیا۔ دوسرے وہ شخص جس نے کسی آزاد کو بیچ کھایا اور تیسرے وہ جس نے مزدور سے محنت تو پوری لے لی مگر اس کی مزدوری نہ دی۔)

دیکھئے یہ حدیث قدسی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے مزدور کی حمایت میں خود مدعی بن رہے ہیں۔ جس کو اس کی محنت کا معاوضہ نہ دیا گیا ہو۔ اس سے بڑھ کر مزدور کا معاشی تحفظ کیا ہو سکتا ہے؟

مزدور کی اجرت کیا ہو؟

مزدور کی اجرت کی تعیین کے بارے میں پہلے حدیث گزر چکی ہے کہ جس سے اس کی ضروریات بآسانی پوری ہو سکیں۔ اور بہتر یہ ہے کہ ان ضروریات کا معیار وہی ہو جو خود مالک کا ہے۔

---

[1] ابن ماجہ۔ کتاب الرهون۔ باب اجر الأجراء (۲۴۴۳) لأموال لحمید بن زنجویہ (۲۰۹۱) مسند شہاب القضاعی (۷۴۴) المسند الجامع (۴۷۲/۱۰) یہ روایت حسن ہے۔

[2] بخاری۔ کتاب الاجارات۔ باب اثم من منع اجر الأجیر

تصویر کا دوسرا رخ - مزدور کی ذمہ داریاں

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ﴾ (۲۸:۲۶) (بہتر مزدور جو تو رکھے وہ ہے جو طاقتور بھی ہو اور امین بھی۔)

گویا ایک اچھے مزدور میں دو صفات ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ وہ طاقت ور یا جو کام اس سے مالک لینا چاہتا ہے اس کا اہل ہو اور دوسرے یہ کہ وہ مالک کے مفادات کا امین ہو جس مزدور میں یہ صفات نہ ہوں وہ اچھا مزدور نہیں۔

علاوہ ازیں اسلام نے اگر مالک و مزدور کی معاشرتی سطح کو برابر کرنے۔ مالک کو مزدور کی عزتِ نفس کا خیال رکھنے' اس کے مالی حقوق کی نگہداشت اور استحصال سے ممانعت اور معاوضہ کی بروقت ادائیگی کے لیے احکامات صادر فرمائے ہیں۔ تو دوسری طرف اس مزدور یا ملازم طبقہ کے لیے بھی کچھ احکامات وارشادات موجود ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(۱) مالک کا احترام:

آقا و غلام یا مالک و مزدور اور غلام کی معاشرتی سطح برابر کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسلام نے فرق مراتب کو ہی ختم کر دیا ہے۔ مراتب کا فرق بہرحال بدستور باقی رہے گا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ والدین اور اولاد کی معاشرتی سطح تو پہلے ہی ایک ہوتی ہے۔ پھر والدین کو اپنی اولاد سے حسنِ سلوک کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب والدین اور اولاد ہر لحاظ سے ایک سطح پر آ گئے ہیں۔ بلکہ دوسری طرف اسلام نے اولاد کو اپنے والدین کے ادب و احترام' ان کی خدمت اور ان سے حسن سلوک کی انتہائی تاکید فرمائی۔ یہی صورتِ حال ہمارے زیر بحث مسئلہ میں بھی ہے۔ فرق مراتب کا لحاظ رکھنے سے متعلق اسلام نے ایک عام اصول دیا ہے جو یہ ہے کہ:

﴿مَنْ لَّمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا وَیَرْحَمْ صَغِیْرَنَا فَلَیْسَ مِنَّا۔[1]﴾ (جس شخص نے ہمارے بڑے کی عزت نہ کی یا جس نے ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کی تو ایسے لوگوں کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔)

[1] الادب المفرد' باب اجلال الکبیر (۳۵۸) صحیح الجامع الصغیر (۶۵۴۰) یہ حدیث اپنے مختلف طرق کی بنا پر

اور یہ واضح ہے کہ آقا و غلام یا مالک و مزدور میں پہلے طبقہ آقا و مالک کا مرتبہ بلند ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر آقا و مالک کو اپنے غلام یا ملازم یا مزدور سے حسن سلوک اور شفقت کرنے کا حکم ہے۔ تو دوسرے طبقہ پر بھی لازم ہے کہ اپنے آقا و مالک کی عزت و توقیر کا خیال رکھے۔ مالک اگر مزدور کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہے تو مزدور بھی اپنے مالک کو بڑا بھائی سمجھ کر اس سے اچھا سلوک کرے اور اس کی عزت و تکریم کرے۔

(۲) مالک کے احسان کا اعتراف:

اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر انسان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

﴿اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ﴾ (۱۴:۳۱) (میرا بھی شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا بھی۔)

اور دوسرے مقام پر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

﴿وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا کَمَا رَبَّیَانِیْ صَغِیْرًا﴾ (۲۴:۱۷) (اور (انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے والدین کے حق میں دعا کرتے ہوئے) کہے کہ اے میرے پروردگار میرے والدین پر رحم فرما۔ کیونکہ انہوں نے بچپنے میں میری تربیت کی۔)

اب دیکھئے کہ حقیقی پروردگار تو اللہ تعالیٰ ہے جس کا ابتدا میں ذکر ہوا۔ پھر دوسرے نمبر پر تربیت کنندگان والدین ہیں۔ جن کا بعد میں ذکر ہوا۔ اسی ترتیب سے شکریہ بھی ادا کیا جانا چاہیے پہلے اللہ تعالیٰ کا پھر والدین کا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بعد والدین تربیت کے لیے واسطہ بنے ہیں۔

اب اس سے آگے چلیے۔ تیسرے نمبر پر مالک مزدور وغیرہ کی تربیت کا واسطہ بنتا ہے۔ جس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ملازم یا مزدور کو اللہ تعالیٰ اور والدین کے بعد اسی تربیت سے مالک کا شکریہ بھی ادا کرتے رہنا چاہیے اور اس کا یہ احسان سمجھنا چاہیے کہ اس کے واسطہ سے اسے روزی مل رہی ہے۔ واضح رہے کہ شکر کا لفظ کسی احسان کے صلہ کے طور پر ہی استعمال ہوتا ہے۔

(۳) مالک کے مفادات کا تحفظ:

رسول اللہ ﷺ نے معاشرہ کے افراد کے حقوق و فرائض کا تعین کرتے ہوئے فرمایا کہ

(بقیہ پچھلا صفحہ) صحیح ہے۔ صحیح جامع صغیر میں الفاظ اس طرح ہیں "من لم یرحم صغیرنا و یعرف حق کبیرنا فلیس منا" اور الادب المفرد میں "لیس منا من لم یرحم صغیرنا و یو قر کبیرنا" اور صحیح جامع صغیر (۵۴۴۵) میں بھی اسی طرح کے الفاظ ہیں۔

((کُلُّکُم راعٍ وَکُلُّکُم مَسئُولٌ فَالِاَمَامُ رَاعٍ وَھُوَ مَسئُولٌ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰی اَھلِہٖ وَھُوَ مَسئُولٌ وَالمَرأَۃُ رَاعِیَۃٌ عَلٰی بَیتِ زَوجِھَا وَھِیَ مَسئُولَۃٌ وَالعَبدُ رَاعٍ عَلٰی مَالِ سَیِّدِہٖ وَھُوَ مَسئُولٌ اَلَا کُلُّکُم رَاعٍ وَکُلُّکُم مَسئُولٌ۔[1]))

(تم میں سے ہر کوئی مختار و نگران ہے۔ تو جو چیز کسی کے حلقہ اختیار میں ہے اس کے متعلق وہ ذمہ دار اور مسئول ہے۔ بادشاہ نگران ہے اور اس سے باز پرس ہوگی۔ اور ہر شخص اپنے گھر والوں پر نگران ہے وہ بھی عنداللہ مسئول ہے اور عورت اپنے خاوند کے گھر کی محافظ ہے۔ اس سے بھی باز پرس ہوگی غلام اور مزدور اپنے مالک کے مال کا نگران ہے اس سے بھی باز پرس ہوگی۔ یاد رکھو! تم میں سے ہر کوئی نگران و محافظ ہے اور ہر ایک سے قیامت کے دن باز پرس ہوگی۔)

اس حدیث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ جو مزدور اپنے مالک کا خیرخواہ نہیں اور اسے کسی نہ کسی طرح نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے خواہ یہ نقصان اوقات کار میں غیر حاضر رہنے سے ہو یا کام چوری سے یا املاک کو خورد برد کرنے یا نقصان پہنچانے سے ہو یا کسی دوسرے ذریعہ سے ہو تو بھی وہ اسی طرح خائن اور مجرم ہے۔ جس طرح ایک بیوی اپنے میاں کا مال خورد برد کرنے پر خائن اور مجرم ٹھہرتی ہے اور قیامت کے دن ایسے لوگوں سے پوری پوری باز پرس ہوگی۔

(۴) کام چوری اور سینہ زوری سے اجتناب:

جس طرح طے شدہ معاوضہ کے مقابلہ میں کام چوری گناہ اور زیادتی کا کام ہے۔ بالکل اسی طرح محنت کے مقابلہ میں مالک سے زیادہ اجرت کا مطالبہ کرنا اور اسے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے پر مجبور کرنا بھی زیادتی ہے۔ دورِ فاروقی کا ایک واقعہ ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا ایک غلام ابولؤلؤ فیروز نامی تھا۔ جو ایک ماہر صناع تھا۔ اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اپنا مقدمہ پیش کیا کہ میرے مالک (حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ) نے مجھ پر یومیہ ادائیگی زیادہ عائد کر رکھی ہے۔ آپ کم کرا دیجیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ تمہاری یومیہ ادائیگی کیا ہے۔ اس نے جواب دیا "دو درہم روزانہ" پھر آپ نے پوچھا کہ "تم کیا کچھ کام جانتے ہو؟" اس نے کہا "نجاری، نقاشی اور آہن گری۔" آپ نے فرمایا تمہاری مہارت کے مقابلہ میں یہ ادائیگی کچھ زیادہ

[1] بخاری۔ کتاب النکاح۔ باب قوا انفسکم و اھلیکم نارا۔

نہیں- اور اس کا مقدمہ خارج کر دیا-[1]

اگر چہ مذکورہ واقعہ میں مہارت کے مقابلہ میں کم ادائیگی کرنے کا مطالبہ ہے اور ہمارا مسئلہ محنت کے مقابلہ میں اجرت کا مطالبہ ہے- لیکن ماحصل دونوں کا ایک ہے اور دونوں میں عدوان کا پہلو پایا جاتا ہے- جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے کہ-

﴿لَا تَعَاوَنُوا عَلَى الاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (۲:۵) (گناہ اور زیادتی کے کام پر ہرگز ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو-)

لیکن اتفاق کی بات یہ ہے کہ یونین کا مقصد اور اتحاد ہی اس بات پر ہوتا ہے کہ کام تو کم سے کم کیا جائے اور مالک سے سینہ زوری کے ذریعہ معاوضہ زیادہ وصول کیا جائے-

آج کے دور میں ہر مزدور اور ہر ملازم اپنے اپنے کام کا چور بن چکا ہے- اجرت پوری وصول کرتا ہے- مگر کام نیک نیتی سے نہیں کرتا- ٹھیکہ پر کام کرتا ہے تو ٹھیک نہیں کرتا- اور اگر اجرت پر لگائیں تو کام کم کرے گا- دفتروں کے اکثر ملازم کام چور ہیں- نہ پورا وقت دیتے ہیں نہ کام دیانت داری سے کرتے ہیں- پھر اس بددیانتی پر مطمئن اور خوش ہیں کہ دفتر میں بڑا عیش ہے- اپنی مرضی سے جتنا چاہا کام کیا- کوئی پوچھنے والا نہیں- انہیں کیا معلوم کہ یہ عیش اللہ کے نزدیک کتنا بڑا ظلم ہے- جب وہ ایک طے شدہ معاہدے کے مطابق تنخواہ پوری وصول پا لیتے ہیں- تو پھر یہ انتہا درجہ کی بددیانتی نہیں تو اور کیا ہے؟

یہ کام چوری ملازمین اور مزدوروں تک محدود نہیں- معاشرہ کا تقریباً ہر محنت کرنے والا اس لعنت میں گرفتار ہے- مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک تفسیر کی کتاب بغرض صحت کسی مصحح (پروف ریڈر) کے حوالے کی گئی- جب وہ تفسیر پڑھنے کے بعد واپس آئی- تو سخت حیرت بھی ہوئی اور دکھ بھی- مصحح نے اکثر مقامات پر اعراب خود بلیڈ سے صاف کر کے پھر وہاں غلطی لگا دی تھی- سرسری نظر دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا' کہ انہوں نے بڑی محنت سے کام کیا ہے- مگر جب بغور دیکھا گیا تو ان کی حرکت واضح ہو گئی (کہ انہوں نے اپنی کارکردگی کو نمایاں کرنے کی خاطر کئی صحیح اعراب اور حروف بلیڈ سے مٹائے اور پھر وہاں غلطی لگا دی) ان کے اس کارنامہ کی اطلاع منیجر صاحب کو دی گئی انہوں نے جواب دیا- کہ ہمیں بھی اس مصحح کی یہ حرکت معلوم ہو چکی ہے اور اس کو جواب دے دیا گیا ہے- یہ فقط ایک مثال ہے ورنہ آپ جدھر نظر اٹھائیں یہی کچھ نظر آئے گا- اس طرح ہر

---

[1] الفاروق شبلی نعمانی- ص ۱۷۷ مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

شخص اپنی حلال کمائی میں حرام کی آمیزش کر رہا ہے۔ اپنا حق تو پورا وصول کرتا ہے۔ مگر دیتے وقت خیانت کر جاتا ہے۔

مزدوروں کے مسائل اور یونین سازی:

اگر مزدور یونین کا مقصد اپنی محنت کے مقابلہ میں جائز حد تک اپنے حقوق کا مطالبہ ہو۔ تو بالکل درست اور جائز ہے۔ لیکن اگر یونین سازی کا مقصد چوری اور سینہ زوری ہو۔ کہ اس اتحاد اور ہڑتالوں کے ذریعہ مالک کو اس بات پر مجبور کر دیا جائے کہ انکا معاوضہ بڑھائے اور انہیں ملازمت سے جواب بھی نہ دے سکے۔ تو ایسی یونین سازی کی اسلام قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ اور ایسا اتحاد نیکی کے بجائے بدی پر اتحاد سمجھا جائیگا۔

موجودہ دور کی حکومتوں نے مزدوروں کی اس زیادتی کے مقابلہ میں مالکوں کو تالہ بندی' (Lock out) کا حق دیا ہے جس کے ذریعے وہ ملازمتوں اور مزدوروں کو کچھ عرصہ کے لیے بے روزگار بنا سکتا یا پریشان کر سکتا ہے۔ مگر اس سے بھی مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ فریقین میں مقدمہ بازی کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جس میں کبھی مزدور جیت جاتے ہیں اور کبھی مالک۔ تاہم فریقین میں جو باہمی کشیدگی باقی رہ جاتی ہے وہ باہمی تعلقات کی خوشگواری میں رکاوٹ بنی رہتی ہے۔ جس سے صنعت اور کاروبار سخت متاثر ہوتا ہے اور بعض دفعہ تو صنعت کار یہ دھندا ہی ختم کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

مستقل حل:

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔ محض قانون کے بل بوتے پر مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ مزید مسائل پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا اصل حل وہی ہے۔ جو اسلام نے اختیار کیا ہے۔ یعنی مسائل کے حل کا زیادہ تر انحصار اخلاقیات پر رکھا ہے۔ وہ قانون کا سہارا صرف اس وقت لیتا ہے جب لاتوں کے بھوت کسی بات پر نہیں آتے۔ اخلاق کی پاکیزگی اور عمدگی کے لیے تقویٰ کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی تعلیمات کو عام کر کے اور لوگوں کو ان کا پابند بنا کر ان میں تقویٰ پیدا کیا جائے۔ جو ہر طرح کے دنیوی اور اخروی مسائل کا واحد حل ہے۔

باب: ۱۱

قرض، رہن، دیوالیہ اور قرقی کے احکام

۱- قرض

کاروبار تجارت میں اکثر قرضہ کی ضرورت پڑتی رہتی ہے- سودی قرضہ کا دروازہ تو اسلام نے قطعی طور پر بند کر دیا ہے- لیکن قرض بلاسود کے دروازے کھلے ہیں- شخصی ضروریات کے علاوہ کاروباری لوگوں کو دستی ادھار لینے کی بھی ضرورت پیش آتی رہتی ہے- جہاں سے مال خریدتے ہیں- وہاں کچھ رقم نقد ادا کر دی جاتی ہے- باقی ادھار کر لیا- یا اپنے گاہک کو مال چکاتے وقت پوری رقم وصول نہ ہوئی تو ادھار ہو گیا- یا بائع کے پاس مشتری نے رقم پیشگی جمع کرا دی- غرض کاروبار میں ادہار قرض اور لین دین کی اکثر ضرورت پیش آتی رہتی ہے- لہٰذا اس سلسلہ میں درج ذیل ہدایات پر پورا عمل کیا جائے-

قرض حسن کیا ہے؟

عام طور پر قرض بلاسود کو قرض حسن کہہ دیا جاتا ہے- حالانکہ قرض حسن کے لیے بلاسود کے علاوہ چند شرائط اور بھی ہیں- مثلاً

(۱) قرض صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے دیا جائے-

(۲) قرض دے کر مقروض کو احسان نہ جتلایا جائے- نہ اس سے بیگار لی جائے- نہ کوئی اور فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے-

(۳) اگر مقروض شکریہ کے طور پر کسی وقت کوئی ہدیہ پیش کرے تو حتی الوسع اس سے اجتناب کیا جائے- الا یہ کہ اس قرضہ سے پہلے بھی ان دونوں کے درمیان تحفہ تحائف کا سلسلہ چلتا رہتا ہے-

(۴) قرض دینے کے بعد اس سے کوئی ایسی سودا بازی نہ کی جائے کہ وہ قرض کے احسان کی وجہ سے کم قیمت پر بھی مال دینے پر رضا مند ہو جائے- (یہ سب شکلیں غیر شعوری طور پر سود کی مد میں آجاتی ہیں اور ان کا بیان سود کے باب میں گزر چکا ہے)

(۵) اگر مقروض فی الواقع تنگ دست ہے اور اپنے وعدہ پر قرضہ بے باق نہیں کر سکا۔ تو اسے اس کی فراغت کی مہلت دی جائے اور یہ بہت بڑا ثواب کا کام ہے۔ اور اگر اس کی محتاجی کو مد نظر رکھ کر معاف ہی کر دیا جائے تو یہ اور بھی بہتر ہے۔

یہ ہے وہ قرضہ جس کی اللہ تعالیٰ نے بار بار تاکید فرمائی ہے۔ ﴿وَاَنْ تَصَدَّقُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ یہ اور اس مضمون کی آیات قرآن کریم میں بے شمار ہیں۔

قرآن کریم میں جس قدر قرض حسن کی تاکید کی گئی ہے۔ اتنا ہی یہ ہمارے معاشرے سے ناپید ہو گیا ہے۔ اگر کوئی کسی کو قرضہ دے بیٹھے تو سمجھ لیجئے کہ وہ رقم ہی ڈوب گئی۔ اب آپ کی خوش قسمتی ہے کہ وہ رقم آپ کو واپس مل جائے۔ عدالت کی طرف رجوع کیا جائے تو طویل مقدمات کے بعد بھی کچھ حاصل وصول ہونا مشکل ہے۔ اور اگر وصولی ہو بھی جائے تو قرض خواہ اس پر لمبی پریشانی کے عوض بسا اوقات اپنی رقم پر فاتحہ پڑھ لینا گوارا کر جاتا ہے۔ آج کل جس طرح اسلام کی دوسری اخلاقی اقدار بدل گئی ہیں۔ اسی طرح اس قرضہ حسن کی مٹی بھی پلید ہو رہی ہے۔ قوم کا مزاج کچھ ایسا بگڑ چکا ہے کہ وہ خود بھی قرضہ حسنہ کے بجائے سود لینا پسند کرتے ہیں۔ صاحب استطاعت لوگ اگر نیکی کا کام کرنا چاہیں بھی تو معاشرہ کی نادہندگی کی وجہ سے اور پریشانی سے بچنے کی خاطر انکار کر دیتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات ان حالات میں جھوٹ سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہماری حکومتیں اور عدالتیں قرض حسن کے سلسلہ میں انتہا درجہ کی حوصلہ شکنی کرتی ہیں۔ اور سود جیسی لعنت کی سرپرستی کرتی ہیں ان عدالتوں کی نگاہ میں قرض حسن اگر گناہ نہیں تو معیوب ضرور ہے۔ دوسری طرف اسلام نے اگر قرض حسنہ دینے کو بہت بڑی نیکی قرار دیا ہے تو ساتھ ہی قرض بلا ضرورت لینے کو اگر گناہ نہیں تو معیوب ضرور قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ آنحضور ﷺ مقروض آدمی کا جنازہ تک پڑھنے سے انکار کر دیا کرتے تھے۔ تا آنکہ اس کی ادائیگی کی کوئی صورت نہ نکل آئے۔ اب اس سلسلہ میں ارشادات نبوی ﷺ ملاحظہ فرمائیے۔

مقروض کے لیے ہدایات

مقروض کے لیے سب سے ضروری بات وعدہ کی پابندی ہے۔ اور اگر ہو سکے تو وعدے سے پہلے ہی ادا کرے۔ یہ صورت بڑی مستحسن ہے۔ ورنہ اپنے وعدہ پر ضرور ادائیگی کرے۔ اور اگر حالات سے مجبور ہے تو کم از کم قرض خواہ کے پاس جا کر اسے حالات سے مطلع تو کرے اور اس

معذرت کرے۔ ارشاد ربانی ہے۔

﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾ (۱۷:۳۴) (اور اپنے عہد پورے کرو۔ عہد کے متعلق یقیناً (قیامت) کو باز پرس ہوگی۔)

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عزوجل فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز میں ایسے شخص پر خود مدعی بنوں گا۔ جس نے مجھے درمیان میں لاکر عہد کیا پھر پورا نہ کیا۔[1]

اگر مقروض ان تینوں باتوں میں سے کوئی بھی پوری نہ کرے تو شریعت نے قرض دار کو یہ حق دیا ہے کہ وہ آ کر مقروض سے سختی سے مطالبہ کرے اور اسے سخت سست کہہ لے۔ بلکہ اگر قرض خواہ کو ضرورت پیش آئے تو وہ وعدے سے پہلے بھی پوچھنے کا حق رکھتا ہے۔ لہٰذا قرض کے سلسلہ میں وعدہ کا پورا پورا لحاظ رکھنا چاہیے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

((نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهِ حَتّٰى يُقْضٰى عَنْهُ۔[2])) (مومن کی روح اس کے قرضہ کے سبب سے معلق رہتی ہے تا آنکہ قرضہ کی ادائیگی ہو جائے۔)

قرض ناقابل معافی گناہ ہے:

((وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ يُغْفَرُ لِلشَّهِيْدِ كُلُّ ذَنْبٍ اِلَّا الدَّيْنَ۔[3])) حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ شہید کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ مگر قرض (کی بخشش نہیں)

شہادت جیسا بلند مرتبہ عمل جس کے متعلق ارشاد ہے کہ خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی شہید جنت کا حقدار بن جاتا ہے۔ تو یہاں بھی قرض جیسی لعنت آڑے آ سکتی ہے۔ لہٰذا قرض سے حتی الوسع اجتناب ضروری ہے۔

درج ذیل حدیث اس سے بھی واضح تر ہے۔

---

1. بخاری۔ کتاب الاجارات۔ باب اثم من منع اجر الاجیر
2. ترتیب مسند الامام الشافعی (۶۷۸) ترمذی کتاب الجنائز باب ماجاء عن النبی أنه قال نفس المؤمن ...... (۱۰۷۸، ۱۰۷۹) ابن ماجہ کتاب الصدقات۔ باب التشدید فی الدین (۲۴۱۳) دارمی کتاب البیوع باب ماجاء فی التشدید فی الدین مسند امام احمد ۱۵/۴۲۵ (۹۶۷۹) بیہقی ۶/۷۶ حلیۃ الاولیاء ۹/۱۴۔۱۵ شرح السنۃ (۲۱۴۷) ابن حبان (۳۰۶۱) مسند طیالسی (۲۳۹۰) مسند ابی یعلیٰ (۵۸۹۸) حاکم ۲/۲۶ المسند الجامع ۱۷/۳۱۲ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کے کئی ایک شواہد بھی ہیں۔
3. مسلم۔ کتاب الامارات۔ باب ماوعده الله تعالیٰ للمجاهد فی الجنة

((عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ- يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ صَابِراً مُحْتَسِبًا مُقْبِلًا غَيْرَ مُدْبِرٍ يُكَفِّرُ اللّٰهُ عَنِّیْ خَطَايَایَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَعَمْ فَلَمَّا اَدْبَرَ نَادَاهُ فَقَالَ "نَعَمْ اِلَّا الدَّيْنَ- كَذَالِكَ قَالَ جِبْرِيْلُ-"[1]))

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے سوال کیا- یارسول اللہ ﷺ بتائیے کہ اگر میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں- اس حالت میں کہ میں صبر کرنے والا ثواب کی نیت رکھنے والا- آگے بڑھنے والا اور پیٹھ نہ پھیرنے والا ہوں- تو کیا اللہ میرے سب گناہ معاف کر دے گا- فرمایا "ہاں" وہ چلا گیا- آپ ﷺ نے اسے پھر آواز دے کر بلایا اور فرمایا "ہاں! مگر قرضہ معاف نہ ہوگا"- حضرت جبرئیل نے مجھے اسی طرح بتایا-)

یعنی سائل کے سوال پر رسول اللہ ﷺ نے تو بخشش کی بشارت دے دی- مگر خداوند تعالیٰ نے اسی وقت وحی بھیج کر اس "بشارت" میں ترمیم فرما دی-

ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ نے جن بڑے بڑے گناہوں سے منع فرمایا ہے- ان کے بعد سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی فوت ہو اور اس کے ذمہ قرض ہو- مگر ادائیگی کے لیے کچھ نہ چھوڑ جائے"-[2]

قرض سے پناہ مانگنا:

حتیٰ کہ خود رسول اللہ ﷺ نماز میں دعا فرماتے تو قرضہ سے پناہ مانگا کرتے تھے- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں آپ ﷺ نماز میں یوں کہا کرتے "یا اللہ! میں گناہ سے اور قرض داری سے تیری پناہ مانگتا ہوں-" میں نے پوچھا یارسول اللہ ﷺ! "کیا وجہ ہے کہ آپ قرض داری سے بہت پناہ مانگا کرتے ہیں-" آپ ﷺ نے فرمایا آدمی جب قرض دار ہوتا ہے تو بات کہتا ہے تو جھوٹ اور وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کرتا ہے-[3]

---

1. مسلم- کتاب الامارات- باب ماوعده الله تعالىٰ للمجاهد فى الجنة
2. ابوداؤد کتاب البیوع- باب فی التشديد فی الدین (۳۳۴۲) مسند احمد ۳۲/۲۴۶ (۱۹۴۹۵) تاریخ کبیر للبخاری ۹/۵۳ شعب الایمان بیہقی (۵۵۴۲) (۵۴۴۱) اس کی سند ابوعبداللہ القرشی کی جہالت کی وجہ سے ضعیف ہے- لیکن اس مسئلہ کے بارے کئی ایک صحیح احادیث ہیں جیسا کہ ابن عمرؓ سے مسند احمد (۵۳۸۵) وغیرہ میں ہے کہ آپ نے فرمایا: "من مات و عليه دين فليس بالدينار ولا بالدرهم ولكنها الحسنات والسّيات -" وغیرها
3. بخاری کتاب فی الاستقراض- باب من استعاذ من الدين

یتیموں کی پرورش سے قرضہ کی ادائیگی زیادہ ضروری ہے:

سعد بن اطول کہتے ہیں کہ میرا بھائی فوت ہو گیا- اور تین سو دینار قرض بھی چھوڑ گیا اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی- میں نے چاہا کہ میں اپنی طرف سے ان بچوں کی پرورش پر خرچ کروں- رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا- ''تیرا بھائی اپنے قرض میں مقید ہے اس کی طرف سے اس کا قرض ادا کرو[1]''

مقروض کا جنازہ:

حضور ﷺ مقروض آدمی کا نماز جنازہ پڑھنے سے اجتناب فرماتے تھے- حدیث ملاحظہ ہو-

((عَنْ سَلْمَةَ ابْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ كُنَّا جُلُوْسًا عِنْدَا لنَّبِيِّ ﷺ اِذَا اُتِيَ بِجَنَازَةٍ فَقَالُوْا صَلِّ عَلَيْهَا فَقَالَ هَلْ عَلَيْهِ دَيْنٌ قِيْلَ لَا، فَصَلّٰى عَلَيْهَا- ثُمَّ اُتِيَ بِجَنَازَةٍ اُخْرٰى فَقَالَ هَلْ عَلَيْهِ دَيْنٌ قِيْلَ نَعَمْ قَالَ هَلْ تَرَكَ شَيْئًا قَالُوْا ثَلٰثَةُ دَنَانِيْرِ- ثُمَّ اُتِيَ بِالثَّالِثَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَيْهِ دَيْنٌ؟ قَالُوْا ثَلٰثَةِ دَنَانِيْرِ قَالَ هَلْ تَرَكَ شَيْئًا؟ قَالُوا لَا قَالَ صَلُّوْا عَلٰى صَاحِبِكُمْ قَالَ اَبُوْ قَتَادَةَ صَلِّ عَلَيْهِ يَارَسُوْلَ وَعَلَيَّ دَيْنُهُ- فَصَلّٰى عَلَيْهِ-[2]))

(سلمہ بن اکوع سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے- کہ ایک جنازہ لایا گیا- صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے کہا اس کی نماز جنازہ پڑھایئے- آپ نے پوچھا اس پر کوئی قرضہ ہے- عرض کیا نہیں- تو آپ ﷺ نے اس کی نماز پڑھا دی- پھر دوسرا جنازہ لایا گیا- فرمایا اس پر کچھ قرض ہے کہا گیا ہاں- فرمایا کیا وہ کچھ چھوڑ گیا ہے صحابہ نے کہا تین دینار چھوڑے ہیں- پس آپ نے اس کی نماز پڑھائی- پھر تیسرا جنازہ لایا گیا پس پوچھا اس پر کچھ قرض ہے عرض کیا تین دینار کا مقروض ہے فرمایا کیا چھوڑا ہے؟ ہم نے عرض کیا کچھ نہیں- آپ ﷺ نے فرمایا خود ہی اپنے ساتھی پر نماز پڑھ لو- ابوقتادہ کہنے لگے یارسول اللہ! آپ ﷺ نماز پڑھایئے اس کا قرضہ میرے ذمہ ہوا- تو آپ ﷺ نے نماز پڑھا دی-)

یہ وہ دور تھا جب مملکت اسلامیہ تہی دست تھی- لیکن فتح مکہ کے بعد جب بیت المال

---

1. مسند احمد ۴/۱۳۶ (۲۰۰۷۶) طبقات ابن سعد ۷/۵۷ ابن ماجہ (۲۴۳۳) بیہقی ۱۰/۱۴۲ معجم الصحابۃ لابن قانع ۲۵۵-۲۵۶ التمہید ۲۳/۲۳۶ مسند عبد بن حمید (۳۰۵) المسند الجامع ۶/۴۸ یہ حدیث صحیح ہے-
2. بخاری- کتاب الحوالات- باب ان أحال دین المیت.........

میں قومی فنڈ جمع رہنے لگا۔ تو رسول اللہ ﷺ ان غریب مسلمانوں کے قرضے جو فوت ہو جاتے۔ اور قرض باقی چھوڑ جاتے۔ اپنے ذمہ ڈال لیتے تھے۔ اور آپ ﷺ کا امت پر بڑا احسان ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

((عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُؤْتٰى بِالرَّجُلِ الْمُتَوَفّٰى عَلَيْهِ الدَّيْنُ فَيَسْئَلُ هَلْ تَرَكَ لِدَيْنِهٖ قَضَاءً؟ فَاِنْ حُدِّثَ اَنَّهٗ تَرَكَ وَفَاءً صَلّٰى وَاِلَّا قَالَ لِلْمُسْلِمِيْنَ صَلُّوْا عَلٰى صَاحِبِكُمْ فَلَمَّا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْفُتُوْحَ قَامَ فَقَالَ اَنَا اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ فَمَنْ تُوُفِّىَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَتَرَكَ دَيْنًا فَعَلَىَّ قَضَاءُهٗ وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَهُوَ لِوَرَثَتِهٖ[1]))

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب کوئی میت لائی جاتی تو آپ ﷺ پوچھتے۔ کیا اس نے قرض کی ادائیگی کے لیے کچھ چھوڑا ہے۔ اگر بتایا جاتا کہ ہاں اتنا مال چھوڑ گیا۔ تو آپ ﷺ اس کی نماز پڑھا دیتے۔ وگرنہ مسلمانوں سے کہتے اپنے بھائی کی نماز تم خود ہی پڑھ لو۔ پھر جب اللہ نے آپ ﷺ پر فتوحات کا دروازہ کھولا۔ تو آپ ﷺ (منبر پر) کھڑے ہوئے اور فرمایا میں مومنوں کا ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ خیر خواہ ہوں۔ تو جو کوئی فوت ہو جائے اور اس پر قرضہ ہو تو اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی۔ اور جو مال چھوڑ جائے تو وہ مال اس کے ورثاء کے لیے ہے۔)

حدیث مذکورہ سے ہی فقہاء نے یہ حکم اخذ کیا ہے کہ وہ شخص جو قرض چھوڑ کر مرے اور اس کی ادائیگی کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔ تو اسلامی حکومت سرکاری خزانے سے اس کا قرض ادا کرے۔ بخاری کی ایک دوسری روایت میں تَرَكَ دَيْنًا کے بجائے تَرَكَ كَلًّا[2] کے الفاظ ہیں۔ یعنی قرض کے علاوہ اگر چھوٹے بچے بھی ہوں تو ان کی ذمہ داری بھی ہم پر ہے۔

نادہندگی

مقروض کی نیت کا پھل اسے مل کر رہتا ہے:

1. بخاری۔ کتاب فی الاستقراض۔ باب الصلوٰۃ علی من ترک دیناً
2. بخاری۔ کتاب فی الاستقراض۔ باب الصلوٰۃ علی من ترک دیناً

((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ مَنْ اَخَذَ اَمْوَالَ النَّاسِ یُرِیْدُ اَدَائَهَا اَدَّی اللّٰهُ عَنْهُ وَمَنْ اَخَذَ یُرِیْدُ اِتْلَافَهَا اَتْلَفَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ۔[1]))

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص لوگوں سے قرض لے اور ادائیگی کی نیت رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اسے ادائیگی کرنے کی توفیق دیگا اور جو کوئی تلف کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اللہ خود اسے تلف کر دے گا۔)

جو شخص فی الواقع قرض ادا کرنے کی نیت رکھتا ہو اللہ اس کی کیسے مدد کرتا ہے۔ اس ضمن میں بخاری میں ایک عجیب واقعہ مذکور ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص نے دوسرے سے ہزار اشرفیاں قرض مانگیں۔ اس نے کہا گواہ لاؤ تاکہ میں ان کے سامنے تمہیں ادائیگی کروں۔ قرض لینے والے نے کہا "اللہ ہی کافی گواہ ہے"۔ پھر قرض دینے والے نے کہا۔ "اچھا ضمانت دو" اس نے کہا۔ "اللہ کی ضمانت ہی کافی ہے۔" قرض دینے والا کہنے لگا "بات تو تم نے ٹھیک ہی کی ہے" اور یہ کہہ کر ہزار اشرفیاں اس کے حوالہ کر دیں۔

قرض لینے والا دراصل تاجر تھا جو بیرونی ممالک سے مال درآمد برآمد کرتا تھا۔ اس نے سمندری سفر اختیار کیا۔ پھر اپنا کام پورا کر کے چاہا کہ جہاز پر سوار ہو کر اپنے وعدہ پر پہنچ جائے۔ (تاکہ بروقت قرض کی ادائیگی کر سکے) لیکن اسے کوئی جہاز نہ ملا۔ آخر مایوس ہو کر اس نے ایک لکڑی کریدی اور اس میں ہزار اشرفیاں اور ایک خط رکھ کر اس کا منہ بند کر دیا۔ اور سمندر کے کنارے چلا آیا۔ اور کہنے لگا۔ یا اللہ! تو جانتا ہے میں نے فلاں شخص سے ہزار اشرفیاں قرض لی تھیں۔ اور جب اس نے ضمانت طلب کی تو میں نے کہا کہ اللہ کی ضمانت کافی ہے اور وہ اس پر مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ سے گواہ بھی مانگے جس کے جواب میں میں نے کہا تھا کہ اللہ ہی کافی گواہ ہے۔ اس نے یہ بات بھی مان لی تھی۔ اب میں نے بہت کوشش کی کہ کوئی جہاز ملے تو جا کر بروقت اس کے قرض کی ادائیگی کر دوں۔ لیکن جہاز نہیں مل رہا۔ اب میں یہ مال تیرے سپرد کر رہا ہوں۔ کیونکہ تو ہی ضامن ہے اور تو ہے اسے پہنچانے والا ہے یہ کہہ کر اس نے وہ لکڑی سمندر میں ڈال دی۔ لکڑی ڈوب گئی اور وہ واپس لوٹ آیا۔

اب جس شخص نے قرض لینا تھا۔ اسے بھی معینہ تاریخ کا انتظار تھا۔ اور وہ فکر مند بھی تھا کہ نہ کوئی ضامن نہ گواہ فقط اللہ توکل اتنی کثیر رقم بطور قرض دے دی تھی۔ وہ اس خیال سے ساحلِ

---

[1] بخاری۔ کتاب المساقات۔ من اخذ اموال الناس........

سمندر پر چلا گیا کہ شاید کوئی جہاز آ جائے اور اس سے مقروض آدمی بھی اترے۔ اور اس کی رقم اسے وصول ہو جائے۔ اتنے میں ایک لکڑی دکھائی دے جسے جلانے کے لیے اس نے اٹھا لیا۔ جب گھر جا کر اسے چیر پھاڑ کیا تو اس میں سے اشرفیاں بھی نکل آئیں اور خط بھی مل گیا۔

چند دن کے بعد مقروض بھی واپس آ گیا۔ اس نے اشرفیاں لکڑی میں رکھ کر سمندر میں ڈال کر فقط اپنے دل کے اضطراب کو دور کیا تھا۔ کہ اللہ کو ضامن اور گواہ بنا کر اللہ کے ہاں میں وعدہ خلاف اور جھوٹا نہ رہوں۔ ورنہ اسے یہ گمان تک نہ تھا کہ اشرفیاں حقدار کو مل چکی ہیں۔ کاروبار میں اسے معقول منافع ہوا تھا۔ لہٰذا وہ مزید ایک ہزار اشرفیاں لے کر قرض خواہ کے پاس گیا اور لگا معذرت کرنے کہ واللہ مجھے اس سے پہلے جہاز ہی نہ مل سکا کہ میں بروقت پہنچ کر تمہارا حساب چکاتا اور اب میں وہ رقم لے کر حاضر ہوا ہوں۔

یہ سن کر قرض خواہ کہنے لگا تم نے پہلے سے کچھ میرے پاس بھیجا تھا؟ مقروض کہنے لگا کیوں کیا بات ہے؟ اس کا بھی ماتھا ٹھنکا۔ پھر اس نے اشرفیاں لکڑی میں رکھ کر سمندر میں ڈال دینے کا واقعہ بیان کیا۔ قرض خواہ کہنے لگا۔ اللہ نے وہ تمہاری بھیجی ہوئی اشرفیاں مجھے پہنچا دیں اور اللہ ہی ضامن تھا۔ چنانچہ مقروض اپنی اشرفیاں لے کر اطمینان کے ساتھ واپس لوٹ گیا۔[1]

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اللہ کو ضامن سمجھے فی الواقع اللہ اس کا ضامن بن جاتا ہے اور جو شخص فی الواقع قرض کی بروقت ادائیگی کی نیت رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس کی ضرور مدد فرماتا ہے۔

صاحب توفیق کا ادائیگی میں تاخیر کرنا ظلم ہے:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

((مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ فَإِذَا أُتْبِعَ أَحَدُكُمْ عَلَى مَلِيٍّ فَلْيَتْبَعْ۔[2]))

(صاحبِ توفیق کا (ادائیگی میں) تاخیر کرنا ظلم ہے اور جب تم میں سے کوئی شخص صاحب توفیق کے حوالہ کیا جائے تو اس غنی کو چاہیے کہ حوالہ قبول کرے۔)

ہمارے معاشرہ میں یہ قباحت بھی عام ہے کہ صاحبِ حق کو بلا وجہ چکر ڈلوانا ایک

[1] بخاری۔ کتاب الکفالۃ فی القرض۔ نیز کتاب الشروط فی القرض

[2] بخاری۔ کتاب فی الاستقراض۔ باب مطل الغنی ظلم۔ نیز مسلم کتاب المساقات باب تحریم مطل الغنی

معمول سا بن گیا ہے۔ مجھے ایک واقعہ کا ذاتی طور پر علم ہے۔ منڈیوں میں آڑھتیوں کے ہاں مزدور بوریاں اٹھانے کا کام کرتے ہیں اور شام کو اپنا حساب چکا لیتے ہیں۔ ایک آڑھتی کے ہاں ایک مزدور کا دو تین دن کا حساب ہو گیا۔ وہ شام کو پیسے لینے آیا۔ تو آڑھتی کہنے لگا۔ کل لے لینا۔ چنانچہ مزدور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے آڑھتی سے جو میرا دوست تھا۔ پوچھا کہ جب تمہارے پاس پیسے موجود ہیں تو پھر اس بیچارے کو کل پر کیوں ڈال دیا ہے؟ وہ کہنے لگا "اس لیے کہ انہیں معلوم ہو کہ پیسہ قدر والی چیز ہے۔"

اس جواب میں جو سرمایہ پرستانہ ذہنیت جھلک رہی ہے۔ اسلام اسی کا استیصال کرنا چاہتا ہے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ توفیق ہونے اور وعدہ گزر جانے کے باوجود قرض خواہ کو قرض ادا نہ کیا جائے اور ٹال مٹول سے کام لیا جائے۔ اس میں بھی وہی سرمایہ پرستانہ ذہنیت ٹپکتی ہے۔ کہ جو چار دن رقم پاس رہے اور اس سے کاروباری فائدہ حاصل کر لیا جائے' وہی بہتر ہے۔ یہ باتیں شرعی نقطہ نظر سے بہت مذموم ہیں۔ اور کاروباری حضرات میں عموماً پائی جاتی ہیں۔

اس ارشاد نبویؐ میں دوسری بات بتائی گئی ہے۔ کہ مثلاً (الف) مقروض ہے اور نادار ہے اور وعدہ کے وقت پر ادائیگی کرنے کے قابل نہیں۔ اور (ب) قرض خواہ ہے جو وعدہ کے مطابق تقاضا کر رہا ہے اب ایک تیسرا شخص (ج) جو (الف) اور (ب) دونوں کا واقف بھی ہے اور صاحب حیثیت بھی ہے (الف) (ج) سے کہتا ہے کہ آپ اس کو قرض ادا کریں یا ضمانت دے دیں۔ میں آپ کو ادا کر دوں گا (اسی کا نام حوالہ ہے) تو (ج) کو ایسا حوالہ قبول کر لینا چاہیے۔ اس صورت میں (الف) اور (ب) دونوں سے ہمدردی ہو جائے گی۔

اسلام نے جو اصول سکھائے وہ دراصل ہمدردی' اخوت اور ایثار پر مبنی ہیں۔ مگر آج چونکہ نیتوں میں فتور آ چکا ہے۔ لہٰذا ایسی اعلیٰ اقدار کو قبول کرنے پر لوگ کم ہی آمادہ ہوتے ہیں۔

نادہندگی قابل تعزیر جرم ہے:

آپ ﷺ نے فرمایا۔

((لَیُّ الْوَاجِدِ یُحِلُّ عِرْضَهٗ وَ عُقُوْبَتَهٗ قَالَ ابْنُ الْمُبَارَکِ یُحِلُّ عِرْضَهٗ یَغْلُظُ لَهٗ وَعُقُوْبَتُهٗ اَنْ یُحْبَسَ لَهٗ۔[1]))

(ادائیگی کر سکنے والے کی نادہندگی۔ اس کی بے عزتی اور سزا کو جائز کر دیتی ہے۔ ابن مبارک نے کہا۔ بے عزتی یہ ہے کہ اسے برا بھلا کہا

[1] بخاری۔ کتاب فی الاستقراض۔ باب لصاحب الحق مقال

جائے اور سزا یہ ہے کہ اسے قید کر دیا جائے۔)

ایک دفعہ آپ ﷺ نے کسی یہودی سے ادھار لیا۔ یہودی وعدہ سے پہلے ہی مسجد نبوی ﷺ میں آ کر تقاضا کرنے اور سخت سست کہنے لگا۔ صحابہ کرام ؓ نے پہلے تو برداشت کیا لیکن بعد میں پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ صحابہ ؓ نے اس پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ سے فرمایا۔

((دَعُوْهُ فَاِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالَ۔[1])) (اسے چھوڑ دو صاحب حق ایسی باتیں کر سکتا ہے)

بخاری میں یہ واقعہ اتنا ہی مذکور ہے۔ جبکہ بعض دوسری روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر ؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ جب تک تم خاموش رہے۔ تو فرشتے اس یہودی کو جواب دیتے رہے۔ جب تم نے جواب دینا شروع کیا تو فرشتے رخصت ہو گئے۔ اب جو تم لوگوں نے اس قرض خواہ کی بے عزتی کی ہے۔ اس کا بدلہ یہ ہے کہ ابھی اس کا قرض چکا دو اور ایک دو صاع زیادہ بھی دو۔

وہ یہودی دراصل اپنا قرضہ لینے نہیں آیا تھا۔ بلکہ آپ ﷺ کا امتحان لینے آیا تھا۔ آیا اس نبی ﷺ کے جو اوصاف تورات میں مذکور ہیں۔ وہ ان میں پائے بھی جاتے ہیں یا نہیں؟ جب اس نے آپ ﷺ کی یہ باتیں سنیں تو مسلمان ہو گیا۔

بالکل ایسی ہی ایک حدیث حسنِ ادائیگی کے تحت بھی آ رہی ہے جو اونٹ کے قرض سے متعلق ہے۔ اور بخاری و مسلم دونوں میں موجود ہے۔

حسن ادائیگی

اگر مقروض سے میسر ہو سکے تو اصل رقم سے کچھ زیادہ دے دے۔ اور یہ چیز بطور شکریہ ہو گی۔ نہ کہ بطور سود (سود جب ہے کہ قرض خواہ مطالبہ کرے) بلکہ یہ ادائیگی کی بہترین صورت ہے اور اگر وہ اصل چیز سے کچھ بہتر ادا کر سکے۔ تو یہ بھی ادائیگی کی احسن صورت ہے۔ اور آپ ﷺ نے اپنے عمل سے یہ بات ثابت فرمائی۔ چنانچہ درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیے۔

(((۱)عَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ لِیْ عَلَى النَّبِیِّ ﷺ دَيْنٌ فَقَضَى لِیْ وَزَادَنِیْ۔[2])) (حضرت جابر ؓ سے مروی ہے کہ میں نے نبی ﷺ سے قرض لینا تھا۔ سو آپ ﷺ نے

---

[1] بخاری۔ کتاب فی الاستقراض۔ باب لصاحب الحق مقال

[2] مسلم کتاب المساقات والمزارعت۔ باب بیع البعیر۔ بخاری۔ کتاب فی الاستقراض۔ باب حسن القضاء

حساب چکا دیا اور مجھے کچھ زیادہ بھی دیا-)

((-(۲) وَعَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ اِسْتَسْلَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَکْرًا فَجَاءَ تْهُ اِبِلٌ مِنَ الصَّدَقَةِ قَالَ اَبُوْرَافِعٍ فَاَمَرَنِیْ اَنْ اَقْضِیَ الرَّجُلَ بَکْرَهٗ فَقُلْتُ لَا اَجِدُ اِلَّا جَمَلًا خِیَارًا رُبَاعِیًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَعْطِهِ اِیَّاهُ فَاِنَّ خَیْرَ النَّاسِ اَحْسَنُهُمْ قَضَاءً-[1]))

(حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جوان اونٹ قرض لیا- پھر آپ ﷺ کے پاس زکوٰۃ کے اونٹ آئے- ابو رافع کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مجھے اس آدمی کا اونٹ ادا کرنے کا حکم دیا- میں نے کہا اس مال میں تو اس سے بہتر اونٹ (چھ سات برس کے) چار دانت والے موجود ہیں- آپ ﷺ نے فرمایا وہی دے دو- کیونکہ لوگوں میں بہترین آدمی وہ ہے جو ادائیگی میں اچھا ہے-)

(۳) آپ ﷺ نے ایک چیز کے عوض اس سے بہتر چیز واپس کی اور امت کے لیے ایک عام اصول بھی ارشاد فرمایا- کہ تم میں سے بہتر وہ ہے جو ادائیگی میں بہتر ہے یہ بھی حسن ادائیگی کی ایک شکل ہے اور اگر چیز اچھی ادا نہیں کر سکتا تو پھر ادائیگی کے وقت شکریہ ضرور ادا کرے-

((عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ اَبِیْ رَبِیْعَةَ قَالَ اِسْتَقْرَضَ مِنِّیَ النَّبِیُّ ﷺ اَرْبَعِیْنَ اَلْفًا فَجَاءَ مَالٌ فَدَفَعَهٗ اِلَیَّ فَقَالَ: بَارَکَ اللّٰهُ تَعَالٰی فِیْ اَهْلِکَ وَمَالِکَ اِنَّمَا جَزَاءُ السَّلْفِ الْحَمْدُ وَالْاَدَاءُ-[2]))

(حضرت عبداللہ بن ابی ربیعہ سے روایت ہے کہ مجھ سے نبی ﷺ نے چالیس ہزار درہم قرض لیے- پھر جب مال آیا تو آپ ﷺ نے وہ رقم مجھے لوٹا دی اور فرمایا اللہ تعالیٰ تیرے اہل اور مال میں برکت عطا فرمائے- پھر فرمایا قرض دینے کا بدلہ حسن ادائیگی اور شکریہ ادا کرنا ہی تو ہے-)

اس قسم کے جو قرضے رسول اللہ ﷺ لیا کرتے تھے ریاستی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہوتے تھے- اور یہ قرضہ آپ ﷺ نے عبداللہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے فتح مکہ کے بعد لیا- جب یکدم جنگ حنین کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا-

(۴) مقروض نے اگر وقت پر ادائیگی نہیں کی- اور قرض خواہ آ کر تقاضا کرتے وقت کچھ

---

[1] بخاری کتاب الوکالۃ- باب الوکالۃ فی قضاء الدیون
مسلم- کتاب المساقات والمزارعت- باب جواز استقراض الحیوان-

[2] نسائی کتاب البیوع- باب الاستقراض (۴۶۹۷) عمل الیوم واللیلۃ للنسائی مایقول اذا أقرض (۳۷۲) ابن ماجہ کتاب الصدقات- باب حسن القضاء (۲۴۲۴) المسند الجامع ۸/۲۵۶ مسند احمد ۲۶/۳۳۶ یہ حدیث صحیح ہے-

سخت سست بات کرے۔ تو مقروض اسے تحمل سے برداشت کرے۔

((وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ تَقَاضَى رَجُلٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَاَغْلَظَ لَهُ۔ فَهَمَّ اَصْحَابُهُ۔ فَقَالَ دَعُوْهُ فَاِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالاً وَاشْتَرُوْلَهُ بَعِيْرًا فَاَعْطُوْهُ اِيَّاهُ قَالُوْا: لَانَجِدُ اِلَّا اَفْضَلَ مِنْ سِنِّهٖ قَالَ اشْتَرُوْهُ فَاَعْطُوْهُ فَاِنَّ خَيْرَكُمْ اَحْسَنُكُمْ قَضَآءًا۔[1]))

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہا ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے قرض کا تقاضا کیا۔ اور آپ ﷺ کو سخت سست کہنے لگا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کو ایذا دینے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے کچھ نہ کہو حق والے کو باتیں کرنے کا حق ہے اس کے لیے اونٹ خریدو اور اسے دیدو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ہمیں اس کے اونٹ جیسا اونٹ نہیں مل رہا۔ اس سے بہتر ملتا ہے آپ نے فرمایا وہی دے دو۔ کیونکہ تم میں سے بہتر وہ ہے جو ادائیگی میں اچھا ہو)

قرض خواہ کے لئے احکام وہدایات

قرض خواہ سے سفارش:

قرض دینے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ یوں ہدایت فرماتے ہیں۔

﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ۔﴾ (۲:۲۸۰)

(اگر مقروض تنگدست ہو تو اسے فراغت تک مہلت دو۔ اور اگر اسے معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔)

اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

((مَنْ كَانَ لَهُ عَلٰى رَجُلٍ حَقٌّ فَمَنْ اَخَّرَهُ كَانَ لَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ۔[2]))

(جس شخص کے ذمہ کسی کا قرض ہو اور مقروض ادائیگی میں تاخیر کرے تو قرض خواہ کے لیے ہر دن کے عوض صدقہ ہے۔)

---

[1] بخاری۔ کتاب الوکالة باب الوکالة فی قضاء الدیون۔ مسلم کتاب المساقات۔ باب جواز اقتراض الحیوان

[2] مسند احمد ۳۳/۱۸۸ (۱۹۹۷۷) طبرانی کبیر ۱۸/(۶۰۳) اس کی سند ضعیف ہے اس میں ابوداؤد نفیع بن الحارث متروک ہے لیکن بریدہؓ سے بسند صحیح مسند احمد (۲۳۰۴۶) ۳۸/۱۵۳ حاکم ۲/۲۹ جامع المسانید ۱/۱۲۸ اخبار اصبہان ۲/۲۸۶ بیہقی ۵/۳۵۷ شعب الایمان (۱۱۲۶۱) وغیرھا میں مروی ہے کہ جو آدمی کسی تنگ دست کو مہلت دے تو اس کے لئے ہر دن اس کے عوض میں اس کی دو مثل صدقہ ہے۔

مقروض سے نرمی اختیار کرنا:

((وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یُنْجِیَهُ اللّٰهُ مِنْ كُرَبِ یَوْمِ الْقِیَامَةِ فَلْیُنَفِّسْ عَنْ مُعْسِرٍ اَوْیَضَعْ عَنْهُ۔[1]))

(حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کو یہ بات محبوب ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے قیامت کی سختیوں سے نجات دے تو اسے چاہیے کہ تنگدست کو مہلت دے یا پھر اسے معاف کر دے۔)

اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث ملاحظہ فرمایئے۔

((وَعَنْ اَبِی الْیَسِیْرِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْهُ اَظَلَّهُ اللّٰهُ فِیْ ظِلِّهٖ۔[2]))

(ابی الیسیر سے روایت ہے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے۔ جو شخص تنگ دست کو مہلت دے یا اسے معاف کر دے تو خدا تعالیٰ اسے اپنے سایہ میں جگہ دے گا۔)

بخاری میں بنی اسرائیل کے حالات میں ایک طویل حدیث مذکور ہے جس کا کچھ حصہ ایک تاجر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا تم سے پہلے لوگوں میں سے ایک شخص کے پاس جب موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے آیا تو پوچھا "کیا تو نے کوئی نیکی بھی کی ہے؟" وہ کہنے لگا۔ یہ تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ میں دنیا میں لین دین کے معاملات کرتا تھا۔ تقاضا کرتے وقت اگر کوئی مالدار بھی مجھ سے مہلت مانگتا تو میں اسے مہلت دے دیتا اور اگر کوئی نادار مفلس ہوتا تو اس کو قرضہ معاف کر دیتا۔ اس کے اس عمل کے بدلے اللہ تعالیٰ نے اسے جنت میں داخل کر دیا۔[3]

دوسرے کے قرض کی ادائیگی:

دوسروں کی طرف سے قرض ادا کر دینا باعث مغفرت اور بڑے ثواب کا کام ہے۔

((وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ اُتِیَ

(حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی

1۔ مسلم۔ کتاب المساقات والمزارعت۔ باب فضل انظار المعسر

2۔ ترمذی ابواب البیوع۔ باب ماجاء فی انظار المعسر و الرفق به (۱۳۰۶) امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

نوٹ: ترمذی میں یہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ اس کے الفاظ ہیں "من انظر معسر او وضع له اظله الله یوم القیامة تحت ظل عرشه، یوم لا ظل الا ظله۔" مسند احمد ۱۴/۳۲۹ (۸۷۱۱) شرح السنۃ (۲۱۴۱)

3۔ بخاری۔ کتاب بدء الخلق۔ باب ماذکر عن بنی اسرائیل

النَّبِيُّ ﷺ بِجَنَازَةٍ لِيُصَلِّيَ عَلَيْهِ فَقَالَ هَلْ عَلٰى صَاحِبِكُمْ دَيْنٌ؟ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ هَلْ تَرَكَ لَهٗ مِنْ وَفَاءٍ قَالُوْا لَا قَالَ صَلُّوْا عَلٰى صَاحِبِكُمْ قَالَ عَلِيُّ ابْنُ اَبِيْ طَالِبٍ عَلَيَّ دَيْنُهٗ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَتَقَدَّمَ فَصَلّٰى عَلَيْهِ-))

کریم ﷺ کے پاس ایک جنازہ لایا گیا- تا کہ آپ ﷺ اس کی نماز پڑھائیں- فرمایا "کیا تمہارے ساتھی پر کچھ قرض ہے- بولے ہاں! فرمایا اس نے قرض کی ادائیگی کے لیے کچھ چھوڑا ہے- عرض کیا' نہیں- فرمایا تو پھر اپنے دوست پر خود ہی نماز پڑھ لو- حضرت علی رضی اللہ عنہ ابن ابی طالب نے عرض کیا "یا رسول اللہ! اس کا قرضہ میرے ذمہ ہوا" تو آگے بڑھے اور اس کی نماز پڑھائی-)

((وَفِيْ رِوَايَةٍ مَعْنَاهُ وَقَالَ فَكَّ اللّٰهُ رِهَانَكَ عَنِ النَّارِ كَمَا فَكَكْتَ رِهَانَ اَخِيْكَ الْمُسْلِمِ لَيْسَ مِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ يُقْضِيْ عَنْ اَخِيْهِ دَيْنَهٗ اِلَّا فَكَّ اللّٰهُ رِهَانَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ- [1]))

(اور اسی مضمون کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا- جس طرح تو نے اپنے مسلمان بھائی کی گردن آگ سے آزاد کی ہے اسی طرح اللہ تجھے نار جہنم سے آزاد کرے- پھر فرمایا جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کا قرضہ ادا کرتا ہے اللہ تعالیٰ روز قیامت اس کے نفس کو آزاد فرمائے گا-)

قرضہ کا کچھ حصہ چھوڑ دینا:

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو حدرد رضی اللہ عنہ سے کچھ قرضہ لینا تھا- حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں ہی حضرت ابو حدرد رضی اللہ عنہ سے تقاضا شروع کر دیا- تا آنکہ ان دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں- رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں تشریف فرما تھے ان کی آوازیں سن کر اپنے حجرہ سے مسجد میں آ گئے- معاملہ تو آپ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہو ہی چکا تھا- آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب (قرضخواہ) سے مخاطب ہو کر فرمایا- کیا نصف قرضہ چھوڑتے ہو؟ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے کہا- آپ کا حکم سر آنکھوں پر- اب آپ . . . . نے ابو حدرد کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ اٹھ اور اس کا قرضہ ادا کر- [2]

---

[1] شرح السنۃ- کتاب البیوع- باب وجوب الحق ضمان الدین (۲۱۵۵) ۸/۲۱۳، ۲۱۴ دار قطنی ۲/۳۲۲ بیہقی ۶/۷۳ اس کی سند میں عطیہ عوفی ضعیف راوی ہے- حافظ ابن حجر التلخیص الحبیر میں فرماتے ہیں- اس روایت کی اسانید ضعیف ہیں- ۳/۴۷

[2] بخاری- کتاب فی الخصومات- باب کلام الخصوم بعضهم فی بعض

ایک دوسری روایت میں یہ زیادہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ابوحدرد سے کہا کہ چل اور قرضہ ادا کر- تو وہ کہنے لگے یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس ادا کرنے کو کچھ نہیں ہے- آپ ﷺ نے اسے منع فرمایا- کہ یہ نہ ہوگا- اگر کعب رضی اللہ عنہ نے آدھا قرضہ معاف کیا ہے- تو باقی آدھا فوراً ادا کر اور جہاں سے جی چاہے حاصل کرو-

۲- رہن

لین دین کرتے وقت یا قرض لیتے وقت بعض اوقات کوئی چیز رہن رکھنے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے- خصوصاً جب لین دین کرنے والوں میں پہلے اعتماد قائم نہ ہو- ایسی ہی ایک صورت کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے-

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَقْبُوْضَةٌ -﴾ (۲:۲۸۳)

(اور اگر تم سفر میں ہو اور تحریر لکھنے والا نہ مل سکے تو کوئی چیز باقبضہ رہن رکھ کر قرضہ لے لو-)

خود رسول اللہ ﷺ نے جب وفات پائی تو اس وقت آپ ﷺ نے تیس صاع جو کے بدلہ اپنی زرہ ایک یہودی ابوشحم کے پاس رہن رکھی ہوئی تھی- اور یہ غلہ آپ ﷺ نے گھریلو اخراجات کے سلسلہ میں لیا ہوا تھا-[۱]

اب رہن سے متعلق احکام ملاحظہ فرمایئے-

(۱) مرہونہ چیز کا نفع ونقصان:

((-(۱) عَنْ سَعِيْدِ ابْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: لَا يَغْلَقُ الرَّهْنُ مِنْ صَاحِبِهِ الَّذِيْ رَهَنَهُ لَهُ غُنْمُهُ وَعَلَيْهِ غُرَامَةُ-[۲]))

(حضرت سعید بن المسیب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا- گرو رکھنا' کسی گرو رکھی ہوئی چیز کو اس کے اصل مالک سے نہیں روک سکتا اس کا فائدہ بھی اسی کے لیے ہے- اور اس کا تاوان بھی اسی پر ہے-)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مرہونہ چیز کے نفع ونقصان کا ذمہ دار اصل مالک

---

۱ بخاری- کتاب الرہن- باب من رہن ذرعہ.........

۲ ترتیب مسند الامام الشافعی کتاب الرہن (۵۶۷-۵۶۹) بیہقی ۶/۳۹ یہ روایت تو سعید بن المسیبؒ کی مرسل ہے جبکہ دار قطنی ۳/۳۲ ابن حبان- (۵۹۳۴) حاکم ۲/۵۱ میں ابوہریرہؓ سے موصولاً بھی مروی ہے جبکہ اس روایت کا مرسل ہونا ہی راجح ہے شیخ البانی نے ارواء الغلیل (۱۴۰۶) میں اسے مرسل ہی قرار دیا ہے-

(راہن) ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی مرہونہ جانور مر گیا۔ تو یہ نقصان اصل مالک (مقروض) کا ہے۔ مرتہن کا نہیں۔ اسی طرح اگر جانور نے بچہ جنا تو وہ بھی اصل مالک کا ہوگا۔ گویا راہن کی حیثیت امین کی ہوتی ہے۔ جس طرح امانت کے نقصان کا امین ذمہ دار نہیں ہوتا۔ اسی طرح مرتہن بھی ذمہ دار نہ ہوگا۔ فرق صرف یہ ہے کہ امانت میں نقصان ہی کا پہلو ہوتا ہے۔ جبکہ مرہونہ چیز میں فائدہ کا پہلو بھی ہوتا ہے۔

(۲) رہن کی شرط:

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ قرض مرہونہ چیز کی مالیت سے کم ہی دیا جاتا ہے۔ مثلاً (الف) نے (ب) سے سو روپے قرض لینا ہے۔ تو وہ ڈیڑھ سو کی مالیت کا زیور رہن رکھتا ہے اور قرضہ کی ادائیگی کی ایک مدت طے ہو جاتی ہے۔ اب اگر (الف)، (ب) سے یہ کہے کہ اگر اتنی مدت تک زیور نہ چھڑاؤں تو یہ مال تیرا ہو جائے گا۔ یہ شرط باطل ہے۔ اگر (الف) ایسا کہے بھی تو (الف) جب سو روپے ادا کرے مرتہن کو وہ مال دینا پڑے گا۔ اور یہ شرط لغو ہو جائے گی۔[1]

ہاں ایسی شرط کی جا سکتی ہے۔ کہ معینہ مدت گزر جانے کے بعد (ب) اس مال کو (الف) کی موجودگی میں فروخت کر دے گا۔ جو اس کی رقم ہوگی وہ خود رکھ لے گا۔ باقی (الف) کو ادا کر دے گا۔ تاہم اس سلسلہ میں جہاں تک ممکن ہو نرمی کا پہلو ہی اختیار کرنا چاہیے۔

(۳) مرہونہ چیز سے فائدہ اٹھانا:

ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

((اَلظَّهْرُ يُرْكَبُ بِنَفَقَتِهِ إِذَا كَانَ مَرْهُونًا وَلَبَنُ الدَّرِّ يُشْرَبُ بِنَفَقَتِهِ إِذَا كَانَ مَرْهُونًا وَعَلَى الَّذِي يَرْكَبُ وَيَشْرَبُ النَّفَقَةُ۔[2]))

(مرہونہ جانور کی پیٹھ سواری کے لیے اور شیر دار مرہونہ جانور کا دودھ پینے کے لیے اس کے اخراجات کے عوض جائز ہے۔ اور جو شخص سواری کرتا یا دودھ پیتا ہے۔ اس کے ذمہ اس کا خرچہ ہے۔)

یعنی شیر دار جانور کا دودھ اس کی خوراک کے عوض اور سواری والے جانور کی سواری اس کی خوراک کے عوض مرتہن کے لیے جائز ہے۔ مگر جانوروں کے علاوہ دوسری مرہونہ اشیاء سے

---

[1] موطا۔ کتاب الرہن۔ باب مالا یجوز من الرهن
[2] بخاری۔ کتاب الرہن۔ باب الرهن مرکوبٌ و محلوب

فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ اگر کچھ فائدہ ہو تو وہ رہن رکھنے والے کا ہوگا۔ مثلاً کسی نے مکان کو رہن رکھا ہے تو اگر مرتہن اس کا کرایہ وصول کرے۔ تو وہ رقم راہن کی ہوگی۔ جو کہ اصل مالک ہے۔ نہ کہ مرتہن کی اور اگر وہ خود اس میں رہتا ہے تو اسے مناسب کرایہ راہن کے حساب سے وضع کرنا ہوگا۔ اسی طرح مرمت مکان کا خرچہ بھی اصل مالک کے کھاتہ میں جائے گا۔

یہی صورت زمین کی ہے۔ مرتہن اگر خود کاشت کرے۔ تو بحیثیت کاشتکار وہ اپنے حصہ کا مستحق ہے۔ زمین کا حصہ اس کے اصل مالک کے کھاتہ میں وضع ہوگا۔ اور اگر کسی کو کاشت کے لیے دے دے تو بھی زمین کا حصہ اصل مالک (راہن) ہی کا حق ہے۔ جو کہ اس کے قرضہ سے وضع کیا جائے گا۔

اس کے علاوہ وہ چیزیں بھی جن کے رکھنے پر کوئی خرچ نہیں آتا۔ اور بآسانی سنبھالی جاسکتی ہیں مثلاً زیور، مشین وغیرہ۔ ان سے استفادہ کرنے کو مرتہن کو کوئی حق نہیں وہ اس کے پاس امانت ہیں۔

۳۔ دیوالیہ اور قرقی

بعض دفعہ مقروض آدمی کسی ناگہانی آفت یا خسارے کی وجہ سے اس قابل نہیں رہتا کہ وہ آئندہ کسی وقت بھی اپنے قرض خواہوں کی ادائیگی کر سکے اسے شرعی اصطلاح میں مفلس اور ہماری زبان میں ''دیوالیہ'' کہتے ہیں۔ اس کے متعلق بھی ارشادات نبوی ملاحظہ فرمائیے۔

مفلس کا مال اور قرض خواہ:

((اَيُّمَا رَجُلٍ اَفْلَسَ فَاَدْرَكَ رَجُلٌ مَالَهُ بِعَيْنِهِ فَهُوَ اَحَقُّ بِهِ مِنْ غَيْرِهِ۔ [1])) (جو شخص مفلس ہو جائے اور کوئی آدمی اپنا مال بعینہٖ اس کے پاس پالے۔ تو وہ اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے۔)

مثلاً (الف) سے (ب) نے ایک گائے ایک ہزار روپے میں خریدی اور قیمت بھی ادا نہ کی تھی کہ مفلس ہوگیا۔ اور گائے اس کے پاس بعینہٖ موجود ہے۔ تو (الف) کو یہ حق ہے کہ دوسرے قرض خواہوں سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنی گائے لے لے۔ اور اگر (ب) مرگیا اور

[1] بخاری۔ کتاب فی الاستقراض۔ باب من وجد ماله عند مفلس مسلم۔ کتاب المساقات والمزارعت باب من ادرك ماله۔

اس کے مرنے پر دیوالیہ کا اعلان ہوا- تو اب وہ اپنی گائے کا حقدار نہ ہوگا- بلکہ دوسرے قرضخواہوں کے حساب سے ہی اسے ادائیگی ہوگی-[1]

(۲) دیوالیہ آدمی کا مال قرضخواہوں میں قرض کی نسبت سے تقسیم ہوگا-

((عَنْ اَبِی سَعِیْدٍ قَالَ اُصِیْبَ رَجُلٌ فِیْ عَهْدِ النَّبِیِّ ﷺ ثِمَاراً ابْتَاعَهَا فَكَثُرَ دَیْنُهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَتَصَدَّقَ النَّاسُ عَلَیْهِ فَلَمْ یَبْلُغْ ذٰلِكَ وَفَاءَ دَیْنِهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِغُرَمَاءِهٖ خُذُوْا مَا وَجَدْتُمْ وَلَیْسَ لَكُمْ اِلَّا ذٰلِكَ-[2]))

(حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے عہد میں ایک شخص نے پھل خریدا جسے نقصان پہنچ گیا- اور اس کا قرضہ بہت بڑھ گیا- تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے کہا- اس پر صدقہ کرو- لوگوں نے صدقہ کیا- پھر بھی اتنی رقم نہ ہو سکی- جو قرضے پورے کر سکے آپ نے قرض خواہوں سے فرمایا- جو کچھ نسبت کے ساتھ تمہیں ملتا ہے لے لو- اور تمہارے لیے یہی کچھ ہے-)

یعنی اگر ایک آدمی کا قرضہ اس کے اثاثہ سے تین گنا ہے تو ہر ایک قرضخواہ کو اس کی رقم کا صرف ایک تہائی ملے گا- ہاں ایسا قرضخواہ جس کا مال ابھی اس کے پاس بعینہ پڑا ہے- تو وہ قرض خواہ اپنا مال لے لے گا- باقی قرض خواہ بقایا اثاثہ کو مناسبت سے تقسیم کریں گے- اور آئندہ بھی کچھ توقع نہ رکھنی چاہیے-

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ (الف) نے (ب) سے ایک بھینس دو ہزار روپے کی ادھار لی- (الف) دیوالیہ ہو گیا ہے- اس کا مجموعی قرض پندرہ ہزار ہو گیا- اور اس کا کل اثاثہ اس بھینس سمیت صرف پانچ ہزار روپے ہے- اصولاً تو اب ہر قرض خواہ کو تیسرا حصہ ملنا چاہیے- مگر (ب) جا کر اپنی بھینس واپس لے سکتا ہے- اب بقایا قرضہ تیرہ ہزار رہ گیا اور اس کا اثاثہ باقی تین ہزار- تو اب یہ اس نسبت سے قرضخواہوں میں تقسیم ہوگا- اور اگر (ب) بھینس کی قیمت سے کچھ رقم مثلاً ایک ہزار وصول کر چکا ہے- اور بھینس بعینہٖ موجود ہے- تو اب (ب) یہ بھینس نہیں لے سکتا- بلکہ باقی قرضخواہوں کی نسبت سے ہی اسے حصہ ملے گا[3]- کیونکہ یہ سودا بعینہٖ نہیں رہا-

---

[1] موطا- کتاب البیوع- باب ماجاء فی الافلاس

[2] مسلم- کتاب المساقات والمزارعت- باب وضع الحوائع

[3] ابن ماجہ کتاب الاحکام- باب من وجد متاعه بعینه عند رجل قد افلس (۲۳۵۸) طیالسی (۲۵۰۷) عبدالرزاق (۱۵۱۶۰) مسند حمیدی (۱۰۳۶) ابن ابی شیبہ ۶/ ۳۵-۳۶ ابوداؤد (۳۵۱۹) ترمذی (۱۲۶۲- ۳۵۲۲) المنتقی ابن الجارود (۶۳۰) مسند ابی یعلی (۶۴۷۰) (۵۰۳۶، ۵۰۳۷) بیہقی ۶/ ۴۴، ۴۵ شرح السنۃ (۲۱۳۳) المسند الجامع ۱۷/ ۳۰۰، ۳۰۱ اس کی سند صحیح ہے-

اور ایک صورت یہ ہے کہ اس دوران بھینس نے بچہ جنا- تو یہ بچہ بھی (ب) کا ہوگا- ہاں اگر قرض خواہ اسے بھینس کی پوری قیمت دے کر رضا مند کر لیں تو وہ بھینس اور بچہ دونوں رکھ سکتے ہیں-[1]

دوسری چیز جو اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے- وہ یہ ہے کہ مفلس آدمی صدقات و خیرات کا حق دار ہوتا ہے- لہٰذا عام مسلمانوں کو اس طرف توجہ کرنا ضروری ہے-

((وَعَنْ عبدالرَّحمٰن بِنْ كَعبِ بْنِ مَالِك قَالَ كَانَ مَعَاذُ ابْنُ جَبَلٍ شَابًا سَخِيًا وَكَانَ لَايُمْسِكُ شَيْئًا فَلَمْ يَزِلْ يُدَانُ حتى اَغْرَقَ مَالَهُ كُلَّهُ فِي الدَّيْنِ فَاَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَكَلَّمَهُ لِيُكَلِّمَ غُرَمَاءَهُ- فَلَوْ تَرَكُوْا لِاَحَدٍ لَتَرَكُوْ الْمُعَاذِ لِاَجْلِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَبَاعَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَهُمْ مَالَهُ حَتّٰى قَامَ مُعَاذُ بِغَيْرِ شَئٍ-[2]))

(حضرت عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت معاذ بن جبل ایک سخی جوان تھے کوئی چیز ان کے پاس نہ ٹھہرتی- اور وہ ہمیشہ مقروض رہتے یہاں تک کہ اپنا سارا مال قرض میں ڈبو دیا پھر وہ نبی ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ میرے قرض خواہوں سے بات چیت کریں قرض خواہ اگر کچھ چھوڑنے والے ہوتے تو رسول اللہ ﷺ کی خاطر حضرت معاذ کو ضرور چھوڑ دیتے (مگر وہ اس بات پر آمادہ نہ ہوئے) آخر آپ ﷺ نے حضرت معاذ کا سارا سامان بیچ کر قرضخواہوں کو دے دلا کر رخصت کر دیا- اور حضرت کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہا-)

حدیث بالا سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے-

(۱) قرض لینا ایک مذموم فعل ہے خواہ قرض لے کر صدقہ ہی کیوں کر دیا جائے- لہٰذا حتی الوسع قرض سے اجتناب ہی بہتر ہے-

(۲) انسان کے پاس خواہ کچھ بھی نہ بچے- تب بھی قرض ادا کرنا مقدم ہے-

(۳) ایک دوسری حدیث میں یہ تفصیل بھی موجود ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ کے قرض خواہوں سے بات چیت کر لی- تو پھر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو ان کے اثاثہ میں کسی طرح

---

[1] موطا کتاب البیوع باب ماجاء فی افلاس الغریم-۲/۱۶۴ صحیح البخاری (۲۴۰۲) صحیح مسلم ۲۴/۱۱۹۴

[2] مشکوٰۃ- کتاب البیوع- باب الافلاس و الانظار- الفصل الثانی (۲۹۱۸) رواہ سعید فی سننه مرسلاً اسے طبرانی وغیرہ نے موصول بھی بیان کیا ہے- لیکن شیخ البانی فرماتے ہیں ارجح اس کا مرسل ہونا ہی ہے- دیکھیں ارواء الغلیل (۱۴۳۵)

کا تصرف کرنے سے آپ نے منع فرما دیا۔ پھر سب کچھ بیچ کر قرض خواہوں کو ادائیگی کر دی۔ اور وہ روایت یہ ہے۔

قرقی کے احکام:

((عَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ حَجَرَ عَلٰى مَعَاذٍ مَالَهُ وَبَاعَهُ فِيْ دَيْنٍ كَانَ عَلَيْهِ۔[1]))

(حضرت کعب بن مالک اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ کو اپنے مال میں تصرف کرنے سے روک دیا تھا اور وہ مال ان کے قرض کی ادائیگی کے لیے فروخت کیا گیا۔)

جب کوئی شخص دیوالیہ ہو جائے۔ تو پھر وہ مال جو اس کے پاس موجود ہے وہ اس کا نہیں رہتا لہٰذا اس کو خرد برد کرنے یا اس میں تصرف کرنے کا اسے اختیار نہیں رہتا۔ ورنہ یہ امانت میں خیانت تصور ہوگی۔

تصرف سے روکنے کے عمل کو عربی میں حجر اور ہماری زبان میں قرقی کرنا کہتے ہیں۔ یہ حق حکومت عدالت یا پنچایت کو ہوتا ہے۔ (جیسی بھی صورت ہو) حضور اکرمؐ نے یہ کام اولی الامر کی حیثیت سے کیا تھا۔

عدالت جب کسی کی قرقی کرے تو درج ذیل اشیاء قرقی سے مستثنیٰ کی جائیں گی۔

(۱) مفلس کے رہنے کا مکان۔ (۲) اس کے یا اس کے گھر والوں کے پہننے کے کپڑے۔ (۳) اگر تاجر ہے تو باردانہ اور اگر محنت کش ہے تو اس کے کام کرنے والے اوزار۔ (۴) اس کے اور اس کے اہل خانے کے کھانے پینے کا سامان اور گھر کے برتن وغیرہ۔[2]

گویا قرقی صرف ایسا سامان ہی کیا جا سکتا ہے جس کے بغیر مفلس کی گزر بسر ہو سکے۔

---

[1] دار قطنی کتاب فی الا قضیة والاحکام و غیر ذلك (۴۵۰۵) بیہقی ۴۸/۶ اس کی سند حسن درجے کی ہے

[2] فقہ السنہ ج ۳ ص ۲۰۸

باب ۱۲:

لین دین کی دیگر متفرق اقسام

ہمارے روزمرہ کے لین دین اور تجارت میں ہمیں کبھی کسی سے کچھ عاریتاً لینا پڑتا ہے۔ کبھی دستی ادھار ہوتا ہے۔ کبھی کسی کے پاس کچھ امانت رکھنا پڑتی ہے۔ کبھی خود امانت سنبھالنا پڑتی ہے اور کبھی ضمانت کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ کبھی کوئی گری پڑی چیز مل جاتی ہے کبھی کوئی شخص کوئی چیز دوسرے کو ہبہ کر دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب انتقال مال اور لین دین ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ لہٰذا ان کے متعلق بھی واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔

۱۔ عاریت

اگر کوئی شخص کسی دوسرے سے کوئی استعمال کی چیز عاریتاً طلب کرے تو اسے ضرور دینا چاہیے۔ کیونکہ ہر شخص کے لیے گھریلو استعمال کی سب چیزیں رکھنا مشکل ہوتا ہے اور یہ ایثار نہیں بلکہ عام استعمال کی چیز مانگنے پر نہ دینا ناپسندیدہ بات ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ o وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ o﴾ (۱۰۷:۴تا۷)

(اور نماز پڑھنے والوں کے لیے ہلاکت ہے جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ جو لوگ دکھلاوا کرتے ہیں۔ اور مانگی ہوئی چیز بھی نہیں دیتے۔)

عاریت کے احکام

عاریت (مانگی ہوئی چیز) کی واپسی لازم ہے:

مانگی ہوئی چیز مانگنے والے کے پاس بطور ضمانت ہوتی ہے جس کو واپس کرنا لازم ہے۔ اور وہ اس کے نقصان کا (بطور ضمانت) ذمہ دار ہوتا ہے۔ ارشاد نبوی ملاحظہ ہو۔

((عَلَى الْيَدِ مَا اَخَذَتْ حَتّٰى تُؤَدِّيَهُ۔[1])) (جس ہاتھ نے جو کچھ لیا ہو اس پر اس کا ادا کرنا

[1] ابوداؤد۔ کتاب البیوع۔ باب فی تضمین العاریة (۳۵۶۱) ترمذی کتاب البیوع۔ باب ماجاء فی ان العاریة

واجب ہے۔ (خواہ یہ نقد رقم ہو یا کوئی اور چیز)

اگر مانگی ہوئی چیز کا نقصان ہو جائے تو:

((عَنْ اَنَسٍ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ عِنْدَ بَعْضِ نِسَائِهِ فَاَرْسَلَتْ اِحْدٰى اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِصَحْفَةٍ فِيْهَا طَعَامٌ فَضَرَبَتِ الَّتِيْ النَّبِيُّ ﷺ فِيْ بَيْتِهَا يَدَ الْخَادِمِ فَسَقَطَتِ الصَّحْفَةُ فَانْفَلَقَتْ فَجَمَعَ النَّبِيُّ ﷺ فِلَقَ الصَّحْفَةِ ثُمَّ جَعَلَ يَجْمَعُ فِيْهَا الطَّعَامَ الَّذِيْ كَانَ فِي الصَّحْفَةِ وَيَقُوْلُ غَارَتْ اُمُّكُمْ ثُمَّ حَبَسَ الْخَادِمَ حَتّٰى اُتِيَ بِصَحْفَةٍ مِنْ عِنْدِ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا فَدَفَعَ الصَّحْفَةَ الصَّحِيْحَةَ اِلَى الَّتِيْ كُسِرَتْ صَحْفَتُهَا وَاَمْسَكَ الْمَكْسُوْرَةَ فِيْ بَيْتِ الَّتِيْ كَسَرَتْ۔[1]))

(حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اپنی کسی بیوی کے ہاں قیام پذیر تھے کسی دوسری بیوی نے کھانے کی رکابی بھیجی تو اس بیوی نے (جس کے ہاں آپ قیام پذیر تھے) خادم کے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ رکابی گر گئی اور ٹوٹ گئی۔ نبی ﷺ رکابی کے ٹکڑے اور وہ کھانا جو اس میں جمع جمع کرنے لگے اور فرمایا "تمہاری ماں کو غیرت آ گئی" (بوجہ رقابت) پھر خادم کو ٹھہرایا۔ اور اس بیوی سے (جس کے ہاں رکابی ٹوٹی تھی) ایک دوسری سالم رکابی لے کر اس بیوی کے ہاں بھجوادی جس نے بھیجی تھی اور یہ ٹوٹی ہوئی رکابی اسی گھر میں رکھ لی جہاں ٹوٹی تھی۔)

خطبہ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے ان امور کا ذکر کیا جو دین میں خاص اہمیت کے حامل تھے۔ اسی خطبہ میں آپ ﷺ نے یہ ارشاد بھی فرمایا۔

((اَلْعَارِيَةُ مُؤَدَّاةٌ وَالزَّعِيْمُ غَارِمٌ وَالدَّيْنُ مَقْضِيٌّ۔[2]))

(مانگی ہوئی چیز واپس کی جائے گی اور ضامن کو تاوان دینا ضروری ہے اور قرض کی ادائیگی ضروری ہے۔)

(بقیہ پچھلا صفحہ) مؤداۃ (۱۲۶۶) ابن ماجہ کتاب الصدقات۔ باب العاریۃ (۲۴۰۰) حاکم ۲/ ۴۷ بیہقی ۶/ ۹۰ المسند الجامع ۷/ ۱۱۹۰ المنتقی ابن الجارود (۱۰۲۴) التمہید ۱۲/ ۴۲ یہ روایت قتادہ کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔

1. بخاری۔ کتاب المظالم۔ باب اذا کسر قصعۃ او شیعًا الغیرہ

2. ترمذی۔ ابواب البیوع۔ باب ان العاریۃ مواداۃ (۱۲۶۵) ابوداؤد کتاب البیوع۔ باب فی تضمین العاریۃ (۳۵۶۵) ابن ماجہ کتاب الصدقات۔ باب الکفالۃ (۲۴۰۵) مسند احمد ۳۶/ ۶۲۸ مسند طیالسی (۱۱۲۷، ۱۱۲۸) عبدالرزاق (۷۶۷۷) سنن سعید بن منصور (۴۲۷) المنتقی ابن الجارود (۱۰۲۳) طبرانی کبیر (۷۶۱۵) مسند الشامیین (۵۴۱) اخبار اصبہان ۲/ ۲۲۸ مسند شہاب القضاعی (۵۴) شرح السنۃ (۱۶۹۶، ۲۱۶۲) یہ حدیث حسن ہے۔

رمضان ۸ ھ میں جب مکہ فتح ہو گیا تو اس بات سے طائف کے ثقفی سرداروں کو بہت دکھ ہوا- یہ لوگ بڑے جنگ جو بہادر اور مغرور تھے اور اسلام کی بالادستی میں اپنی توہین سمجھتے تھے- چنانچہ یہ لوگ فوری طور پر تیار ہو کر مقابلہ پر اتر آئے- اس بات کے نتیجہ میں معرکہ حنین پیش آیا- اس وقت مسلمان اور خود رسول اللہ ﷺ نے صفوان بن امیہ سے جو اس وقت کافر تھے- کچھ زرہیں اور اونٹ عاریتاً مانگے تو وہ کہنے لگا- اَغَصَبٌ يَا مُحَمَّدُ؟ (کیا یہ غصب ہے؟) جو بعد میں آپ واپس نہ کریں گے؟ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا- لَا بَلْ عَارِيَةٌ مَضْمُوْنَةٌ - (نہیں بلکہ یہ عاریت ہے جس کی ہم ضمانت دیں گے)

آپ ﷺ نے صفوان سے ۳۰ اونٹ اور ۳۰ سے ۴۰ زرہیں عاریتاً مانگیں تھی- جتنی بھی میسر ہوں- صفوان نے یہ بات تسلیم کر لی- پھر جب وہ دینے لگا پھر سوال کیا- اعارِيَةٌ مضمونَةٌ اَو عَارِيَةٌ مودا ةٌ؟ یعنی اگر ان میں سے کچھ کم ہو جائیں تو ان کا آپ تاوان دیں گے یا پوری کی پوری واپس کریں گے؟ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ بل مؤدا ة- یعنی سب واپس کریں گے-

پھر جب مشرکوں کو شکست ہو گئی- تو صفوان کی زرہیں اکٹھی کی جانے لگیں تو ان میں سے کچھ مفقود تھیں- لہٰذا آپ ﷺ نے صفوان سے کہا کہ تمہاری چند زرہیں نہیں مل رہیں ہم ان کا تاوان ادا کیے دیتے ہیں- صفوان کہنے لگا- نہیں آپ ﷺ تاوان نہ دیجئے کیونکہ میرا دل وہ دل نہیں رہا- جو اس وقت تھا- جب آپ ﷺ سے معاملہ ہوا تھا-[1] (یعنی اس وقت تک صفوان مائل بہ اسلام ہو چکے تھے)-

اسی موقعہ پر آپ کو نقد رقم کی بھی ضرورت درپیش تھی- چنانچہ آپ نے عبداللہ بن ابی ربیعہ سے چالیس ہزار درہم دستی ادھار لیا- اور فتح حنین کے بعد آپ ﷺ نے یہ ادھار واپس کر دیا اسے دعا دی اور ان الفاظ میں شکریہ ادا کیا-

((بَارَکَ اللّٰهُ لَکَ فِیْ اَهْلِکَ وَمَالِکَ اِنَّمَا جَزَاءُ السَّلَفِ الْحَمْدُ وَالْاَدَاءُ-[2])) (اللہ تمہارے گھر بار اور مال میں برکت عطا فرمائے تمہارے ادھار دینے کا بدل تو ادائیگی اور شکریہ ہی ہو سکتا ہے-)

---

[1] ابوداؤد- کتاب البیوع- باب فی تضمین العاریة (۳۵۶۳) ابن ابی شیبہ ۲/۱۴۳، ۱۴۴ بیہقی ۶/۸۹ اس کی سند مرسل ہونے کے ساتھ ضعیف ہے اس میں "اناس" یعنی کچھ لوگ مجہول ہیں-

[2] نسائی- کتاب البیوع- باب الاستقراض- یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے-

مندرجہ بالا احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) مانگی چیز کا اگر نقصان ہو جائے یا گم ہو جائے یا تلف ہو جائے تو لینے والے کو ئی چیز لے کر ادا کرنا پڑتی ہے اور اگر ادا نہ کی جائے تو مالک اس کا تقاضا کر سکتا ہے۔

(۲) مانگی ہوئی چیز بطور امانت بھی ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ یہ بات پہلے سے طے ہو جائے۔ اس صورت میں نقصان کا بار اصل مالک پر ہوگا۔ وہ مطالبہ نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر لینے والا ادا کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

موجودہ دور میں جہاں دوسری اخلاقی اقدار بدل گئی ہیں۔ عاریتاً چیز لینے دینے کا رواج بھی جو باہمی ہمدردی و تعاون کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کلیتاً معدوم ہو رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لوگ مانگی چیز واپس کرنے کا نام ہی نہیں لیتے نہ ہی کوئی ایسی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں۔ اور حد یہ ہے کہ اگر مالک مانگ لے تو اسے برا محسوس کرتے ہیں اور اسے خسیس یا بخیل انسان سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں اپنی چیز مانگنا شرافت سے بعید ہے۔ اس ذہن کا ردعمل یہ ہوا کہ اب کوئی شخص عاریتاً دینے کا نام ہی نہیں لیتا اور بسا اوقات چیز پاس ہونے سے ہی انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ تاکیدی حکم معاشرہ سے ختم ہو رہا ہے۔

۲۔ امانت

امانت عندالطلب واجب الادا ہوتی ہے۔ یہ استعمال نہیں کرنی چاہیے۔ اگر نقدی کی شکل میں ہو تو اس صورت میں استعمال کرے کہ عندالطلب فوری ادائیگی کر سکے۔ تو اس میں کچھ حرج بھی نہیں۔ تاہم احتیاط یہی ہے کہ استعمال نہ کی جائے۔ امانت میں کسی طرح کی بھی خیانت کرنا گناہ کبیرہ ہے ارشاد خداوندی ہے۔

امانت میں خیانت:

﴿فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ﴾ (۲۸۳:۲)

جو شخص امین بنایا گیا ہے اسے امانت ادا کرنا چاہیے اور اللہ سے جو اس کا رب ہے ڈرتا رہے (یعنی اس میں کسی قسم کی خیانت نہ کرے)

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

((لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ))[1] (جس میں امانت نہیں اس میں ایمان بھی

[1] صحیح جامع الصغیر ج ۲ حدیث نمبر (۷۱۷۹) شعب الایمان بیہقی (۴۳۵۴)

نہیں-)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں-

((اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ-[1])) جب بات کہے تو جھوٹ بولے اور وعدہ کرے تو ایفا نہ کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھیں تو خیانت کرے-

اور جو روایت عبداللہ بن عمر بن عاص رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہیں اس میں منافق کی چار نشانیاں بیان ہوئی ہیں- کہ جس میں یہ چار باتیں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے اور اگر ان میں سے کوئی بات ہے تو نفاق کی ایک خصلت ہوگی تاکہ آئندہ چھوڑ نہ دے اور وہ نشانیاں یہ ہیں-

((اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ-[2])) (جب اس کے پاس امانت رکھیں تو خیانت کرے اور بات کرے تو جھوٹ بولے اور عہد کرے تو دغا دے اور جب جھگڑا کرے تو کجروی اختیار کرے-)

امانت کے مال کا نقصان:

اگر امانت میں امین کے ہاں کچھ نقصان ہو جائے یا وہ چیز گم ہو جائے- یا چوری ہو جائے یا کسی اور صورت میں ضائع ہو جائے (جس میں امین کے اختیار کو کچھ دخل نہ ہو) تو اس کا بار امین پر نہیں ہوتا بلکہ وہ اصل مالک کا ہی نقصان ہوگا- ارشاد نبویؐ ہے-

((مَنْ اُوْدِعَ وَدِيْعَةً فَلَيْسَ عَلَيْهِ ضَمَانٌ-[3])) (جس کے پاس امانت رکھی جاتی ہے وہ ضامن نہیں ہوتا-)

امانت کی کئی صورتیں ہیں- مثلاً ایک یہ کہ کسی شخص سے کچھ سامان یا جانور خریدا اور اس کو بائع ہی کے پاس رکھوایا- اب وہ سامان چوری ہو جائے یا تلف ہو جائے یا جانور مر جائے تو یہ نقصان خریدار کا ہوگا- بائع کا نہ ہوگا-[4]

---

[1] بخاری- کتاب الایمان- باب علامۃ المنافق
[2] بخاری- کتاب الایمان- باب علامۃ المنافق
[3] ابن ماجہ کتاب الصدقات- باب الودیعۃ (۲۴۰۱) المسند الجامع ۱۱/۱۶۰ ارواء الغلیل ۱۵۴۷ اس کی سند میں المثنی بن الصباح ضعیف راوی ہے اور اس کی متابعات بھی ضعیف ہیں-
[4] بخاری- کتاب البیوع- باب اذا اشتریٰ غلاماً او دابۃ فوضعہ عند البائع........

اسی طرح اگر ایک شخص ایک دکاندار سے کچھ کپڑا خرید کر اس کے پاس رکھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تین چار گھنٹے بعد آ کر لے لوں گا۔ دریں اثنا کوئی آدمی یا گاہک دکاندار کو مصروف دیکھ کر وہ کپڑا اڑا لے جاتا ہے تو یہ نقصان دکاندار کا نہ ہوگا۔ بلکہ خریدار کا ہوگا۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ مثلاً (الف) (ب) کو سو روپے دیتا ہے اور کہتا ہے مجھے بازار سے فلاں چیز جتنے کی آئے لا دو۔ اب (ب) راستہ میں لٹ جاتا ہے تو یہ نقصان (الف) کا یعنی رقم دینے والے کا ہوگا۔ کیونکہ (ب) کی حیثیت محض امین کی تھی۔ اور (ب) کی امانت یہ ہے کہ اگر وہ چیز اسّی روپے کی آئے ہے تو ایمانداری کے ساتھ وہ چیز اور بقایا/۲۰ روپے لا کر (الف) کے حوالہ کر دے۔

ایک دفعہ رسول ﷺ نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ بارقی کو ایک دینار دیا۔ اور فرمایا کہ اس کی بازار سے ایک بکری خرید لاؤ۔ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے اس ایک دینار سے دو بکریاں خریدیں۔ پھر ان میں سے ایک بکری ایک دینار میں کسی کے ہاتھ فروخت کر دی اور آ کر رسول اللہ ﷺ کو ایک بکری بھی دے دی اور دینار بھی دے دیا۔ آپ ﷺ اس صحابی کی اس ایماندار اور سودا بازی پر اتنے خوش ہوئے کہ اس کے حق میں دعا فرمائی کہ اے اللہ اس کی تجارت میں برکت دے۔ اس دعا کا یہ اثر ہوا کہ عروہ بارقی خود کہتے ہیں کہ اگر میں مٹی بھی خریدتا تو مجھے اس میں بھی فائدہ ہوتا۔[1]

گویا یہاں دو باتیں جمع ہوگئیں ایک عروہ بارقی رضی اللہ عنہ حد درجہ کے امین تھے اور دوسرے رسول اللہ ﷺ کی دعا کی برکت شامل ہوگئی۔

البتہ اگر امانت نقدی کی شکل میں ہو اور امین اسے کسی وقت اپنے ذاتی مصرف میں لا چکا ہو تو پھر وہ اس کے نقصان کا ذمہ دار ہوگا۔

۳۔ ضمانت

جب دو شخصوں کے دمیان لین دینا کا معاملہ ہو۔ اور لینے والے یا حق دار کو دینے والے پر اعتبار نہ ہو۔ تو ضمانت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ درمیان میں تیسرا آدمی جو حق دار کو حق دلوانے کی ضمانت اٹھاتا ہے وہ ضامن کہلاتا ہے۔

---

[1] ابوداؤد۔ کتاب البیوع۔ باب فی المضارب (۳۳۸۴) ترمذی ابواب البیوع باب الشراء والبیع الموقوفین (۱۲۵۸) ابن ماجہ کتاب الصدقات۔ باب الامین یتجر فیہ فیربح (۲۴۰۲) مسند حمیدی (۸۴۳) یہ حدیث صحیح ہے۔

ضامن کی ذمہ داری:

اگر ضامن حق دار کو حق نہ دلوا سکے- تو لینے والے کے حق کی ادائیگی کی ذمہ داری ضامن پر آ پڑتی ہے- جو بہر صورت اسے ادا کرنا ہوگی- خواہ لوگوں سے مانگ کرے- ارشاد نبوی ﷺ ہے-

((اَلْعَارِيَةُ مُؤَدَّاةٌ وَالْمِنْحَةُ مَرْدُوْدَةٌ وَالدَّيْنُ مُقْضِيٌّ وَالزَّعِيْمُ غَارِمٌ-[1])) (مانگی ہوئی چیز قابل واپسی ہے- اور شیر دار جانور بھی قابل واپسی ہے اور قرضہ کہ ادائیگی ضروری ہے اور ضامن کو تاوان ادا کرنا ہوگا-)

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ادھار لینے والا بذات خود نیک نیت اور ادائیگی کا اہل ہوتا ہے- مگر دینے والے کو ان باتوں کا علم نہیں ہوتا- ایسے وقت میں کسی کا ضامن بن جانا بڑا نیکی کا کام ہے-

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں- ایک دفعہ ایک شخص نے کسی کے بیس دینار دینا تھے- اور لینے والا سختی سے مطالبہ کر رہا تھا کہ یا تو ادائیگی کرو یا کوئی ضامن دو یہ صورتِ حال دیکھ کر خود رسول اللہ ﷺ نے بار ضمانت اٹھالیا- اور ایک وعدہ مقرر ہوگیا- وعدہ کے اختتام تک اللہ نے اس شخص کی مدد فرمائی اور وہ سونا لے کر آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوگیا- جس سے آپ ﷺ نے بروقت ادائیگی کر دی-[2]

ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مثلاً (الف) قرض خواہ ہے اور (ب) مقروض یا دیندار ہے اور (ج) نے بار ضمانت اٹھایا ہے- اب نہ تو (ب) بروقت ادائیگی کر سکا ہے یا اس قابل ہی نہیں رہا کہ ادائیگی کر سکے- اور (ج) اس قابل ہے کہ اپنے پاس سے ادائیگی کر سکے اس صورت میں ادائیگی تو بہر حال (ج) کے ذمہ ہوگی- لہٰذا وہ اس رقم کی حد تک لوگوں سے سوال کر سکتا ہے- ایسے شخص کو زکوٰۃ بھی دی جا سکتی ہے اور نفلی صدقات و خیرات بھی- اور اس کی دلیل حضرت قبیصہ بن مخارق کا ایک واقعہ ہے وہ خود راوی ہیں کہ میں دو قبیلوں کی اصلاح یا کسی دوسرے

---

[1] ترمذی- ابوداؤد- بحوالہ مشکوٰۃ- کتاب البیوع- باب الغصب والعاریۃ- فصل ثانی- یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے-

[2] ابوداؤد- کتاب البیوع- باب فی استخراج المعاون (۳۳۲۸) ابن ماجہ کتاب الصدقات- باب الکفالۃ (۲۴۰۶) مسند عبد بن حمید (۵۹۶) طبرانی (۱۱۵۴۷) حاکم ۲/۱۰، ۱۱، ۲۹، ۳۰ بیہقی ۶/۷۴ المسند الجامع ۹/۲۲۷، ۲۲۸ یہ حدیث صحیح ہے-

امرِ خیر کے سلسلہ میں ایک بھاری رقم کا مقروض ہو گیا تھا- میں آپ ﷺ کے پاس آیا اور صورت حال بیان کی- آپ ﷺ نے فرمایا یہاں ٹھہر- کچھ صدقات کا مال آتا ہے تو تمہیں دے دیا جائے گا- پھر آپ ﷺ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا- قبیصہ تین شخصوں کے علاوہ کسی کو سوال کرنا جائز نہیں- ایک وہ شخص جس پر ضمانت یا قرضے کا بوجھ پڑ گیا ہو اور اس کی ادائیگی سے معذور ہو- وہ مانگ لے تا آنکہ اس کی رقم پوری ہو جائے- پھر رک جائے (جیسا کہ قبیصہ ؓ خود تھے)

دوسرے وہ شخص جس کا مال یا کھیتی کسی ناگہانی آفت کی نذر ہو جائے اور وہ محتاج ہو جائے وہ بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے تک مانگ سکتا ہے-

اور تیسرے وہ فاقہ زدہ آدمی جس کے متعلق اس کے محلّہ یا قوم کے تین معتبر آدمی اس کی ایسی محتاجی پر گواہی دیں-

ان کے سوا دوسروں کو سوال کرنا حرام ہے اور اگر کوئی سوال کرتا ہے تو حرام کھاتا ہے-[1]

ہاں اگر ضامن یعنی (ج) دریں اثنا مر جاتا ہے- تو اب (الف) قرضخواہ (ب) سے اپنے قرضہ کا مطالبہ کر سکتا ہے-[2]

۴- لقطہ

لقطہ میں گری پڑی چیز بھی شامل ہے- اور گم شدہ جانور بھی-

ایک شخص (سوید بلال) نے رسول اللہ ﷺ سے لقطہ کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا- ایسا کر سال بھر تک اس کے بارے خبر کرتا رہ- اس کا ظرف اور سر بندھن پہچان رکھ اس کے بعد اسکو خرچ کر ڈال- اب اگر اس کا مالک آ جائے تو اسے ادا کر دے- اس نے پوچھا یا رسول اللہ! بھولی بھٹکی بکری کا کیا کریں-'' آپ ﷺ نے فرمایا اس کو پکڑ لے- وہ تیری ہے تیرے بھائی کی یا بھیڑیئے کی-'' پھر اس نے کہا- ''بھولے بھٹکے اونٹ کے متعلق کیا حکم ہے؟ اس سوال پر آپ ﷺ کو غصہ آ گیا اور آپ ﷺ کا چہرہ سرخ ہو گیا- آپ ﷺ نے فرمایا- اونٹ سے تجھے کیا سرو کار؟ اس کے ساتھ تو اس کا موزہ ہے- مشکیزہ ہے اس کا مالک جب آئے گا لے لے گا-[3]

---

[1] مسلم- کتاب الزکوٰۃ- باب من لا تحل له المسئلة

[2] موطا کتاب الاقضیۃ- باب فی الحمالة و الحول

[3] بخاری- کتاب اللقطہ

اس حدیث سے تین باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) گری پڑی چیز اٹھانے والے کے پاس بطور امانت ہوتی ہے۔ ایک سال تک اعلان کرنے پر بھی اگر مالک نہیں آتا۔ تو اٹھانے والا اسے خرچ تو کر سکتا ہے۔ لیکن اگر بعد میں مالک آ جائے جو صحیح صحیح نشانیاں بتا دے۔ تو وہ چیز اسے ادا کرنا ہوگی۔

(۲) بکری اگر ریوڑ سے بچھڑ گئی ہو۔ تو اسے اپنے گھر لے آنا چاہیے۔ ورنہ یا تو اسے کوئی دوسرا شخص لے جائے گا۔ یا کوئی بھیڑیا پھاڑ کھائے گا۔ لیکن گھر لانے کے بعد اس کا اعلان بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ مسلم میں یہ حدیث موجود ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔

((مَنْ اٰوٰى ضَالَّةً فَهُوَ ضَالٌّ مَالَمْ يُعَرِّفْهَا۔[1])) (جس نے بھی گم شدہ چیز کو اپنے ہاں رکھا وہ خود گمراہ ہے جب تک اس کا اعلان نہ کرے۔)

اس حدیث میں ضالۃ کا لفظ صرف گمشدہ بکری سے مخصوص نہیں۔ کوئی بھی چیز یا جانور ہو سکتا ہے۔ بکری کے معاملہ میں یہ رعایت ہے کہ اگر اعلان کے بعد بھی اس کا مالک نہیں آتا۔ تو اسے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ اور اگر آ جائے تو اسے واپس کر دے۔

(۳) اونٹ گم شدہ ہو تو اسے کچھ خطرہ نہیں ہوتا۔ اسے بھیڑیا یا کوئی دوسرا درندہ اٹھا کر نہ لے جا سکتا ہے۔ نہ پھاڑ کھا سکتا ہے۔ وہ خود کفیل ہوتا ہے۔ درختوں کے پتے کھا کر گزر اوقات کر لیتا ہے اور چند دن پانی یا خوراک نہ بھی ملے تو اس کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ لہٰذا اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اگر مالک کو اسے تلاش کرنے میں چند روز لگ بھی جائیں تو کوئی حرج نہیں۔

لقطہ کے دوسرے مسائل:

اس حدیث کے علاوہ دوسری احادیث سے لقطہ کے متعلق جو مسائل ملتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) اگر لقطہ کم قیمت اور حقیری چیز ہو۔ جیسے لاٹھی، رسی، کاپی نوٹ بک وغیرہ وغیرہ۔ تو ایسی چیز اٹھا لینے اور استعمال کر لینے سے کوئی ذمہ داری[2] نہیں پڑتی۔ ذمہ داری قیمتی چیز کی ہوتی ہے۔

(۲) اگر چیز بہت زیادہ قیمتی ہو۔ تو اس کا تین سال تک اعلان کرنا اور مالک کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جیسے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو ایک مرتبہ ایک تھیلی ملی جس میں سو دینار تھے۔ (یعنی ۳۰ تولے کے لگ بھگ سونا) آپ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔

---

[1] مسلم۔ کتاب اللقطہ [2] بخاری۔

سال تک اس کا اعلان کرتا رہ- سال بعد پھر پوچھا- آپ ﷺ نے وہی جواب دیا- دو سال کے بعد پھر پوچھا پھر آپ نے وہی جواب دیا- چوتھی بار پوچھنے پر یعنی چوتھے سال آپ ﷺ نے یہ فرمایا- کہ اب اسے خرچ کر سکتا ہے-[1] لیکن خرچ کر چکنے کے بعد بھی اگر مالک آ جائے تو اسے ادا کرنا ہوگی-

(۳) مکہ سے گری پڑی چیز کو اٹھانا یکسر منع ہے-[2] کیونکہ وہ حرام ہے- اس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ میں چونکہ ہر سال اور ہر وقت ہی حج اور عمرہ کرنے والوں کی بکثرت آمد و رفت رہتی ہے اور وہاں کے حالات کے مطابق بہتری اسی بات میں ہے- کہ کسی کی گری پڑی چیز کو مطلق نہ اٹھایا جائے تا کہ جب بھی اس کا مالک آ جائے وہ اپنی چیز اٹھائے- اور مسلم میں یہ وضاحت موجود ہے- کہ حاجیوں کی چیز اٹھانے سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے-[3]

(۴) ایسی چیز جو جلد خراب ہو جانے والی ہو- جیسے کوئی پھل یا سبزی اٹھا لینا ہی بہتر ہے- ورنہ وہ خراب یا بے کار ہو جائے گی- اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی کے استعمال میں آ جائے رسول اللہ ﷺ کو خود ایک بار ایک کھجور گری پڑی ملی- تو آپ ﷺ نے فرمایا- اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ یہ صدقہ کی ہے تو میں اسے کھا لیتا-[4]

(۵) حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک دفعہ ایک دینار گرا پڑا مل گیا- اس کی کوئی خاص علامت بھی نہیں ہو سکتی اور علامت بتائے بغیر مالک کا تعین نہیں ہو سکتا- اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا- آپ ﷺ نے فرمایا یہ اللہ کا رزق ہے چنانچہ اس میں سے آپ ﷺ نے بھی کھایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بھی- بعد میں ایک عورت اس دینار کو ڈھونڈتی ہوئی آ گئی- تو آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا- اے علی رضی اللہ عنہ! اسے دینار دے دو-[5]

آج کل اعلان کے طریقے اس دور سے مختلف ہیں- سب سے آسان طریقہ کسی معروف اخبار میں اعلان گمشدہ کے تحت اشتہار شائع کروا دینا ہے- اور ایسے اعلان بلا معاوضہ ہی اخبار والے قبول کر لیتے ہیں- دوسرا ذریعہ ریڈیو پر اعلان کروانا ہے- علاوہ ازیں بعض شہروں میں بالخصوص مکہ میں ایسے مراکز قائم ہیں- جہاں ایسی گمشدہ اشیاء جمع کرا دی جاتی ہیں- اور مالک وہاں

---

[1] تا [2] بخاری- [3] مسلم- کتاب اللقطہ
[4] بخاری- کتاب اللقطہ
[5] ابوداؤد کتاب اللقطۃ (۱۷۱۴) بیہقی ۶/۱۹۴ یہ حدیث حسن ہے-

پہنچ کر کسی بھی وقت علامات بتا کر اپنی گمشدہ چیز حاصل کر سکتا ہے۔

اسی طرح آج کل لقطہ کی صورتیں بھی بدل چکی ہیں۔ مثلاً کسی بس یا ریل میں کسی مسافر کا جلدی میں سامان رہ گیا۔ خواہ وہ کوئی بیگ ہو یا گٹھڑی یا بریف کیس وغیرہ یا جیب سے بٹوہ گر گیا ان میں نقد رقم کے علاوہ ضروری کاغذات اور دستاویزات بھی ہوتے ہیں۔ اس دور میں معاشرہ کی اکثریت ایسی ہے کہ اگر بیگ یا بٹوے میں نقد رقم بھی ہو تو اس کے ساتھ ضروری کاغذات سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے ہیں اور ان کا سراغ لگنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ ہاں اگر نقد رقم نہ ہو اور صرف ایسے کاغذات ہوں جو دوسروں کے لیے بے کار ہوں۔ تو اس صورت میں بازیابی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ تاہم دنیا آج بھی متقی لوگوں سے بالکل خالی نہیں ہوگئی۔ اندریں صورت یہ احتیاط بہت ضروری ہے کہ اس قسم کے سامان کے ساتھ آپ کا مکمل پتہ یا شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی ہو تو اس صورت میں بازیابی کی زیادہ توقع کی جا سکتی ہے۔

۵۔ ہبہ اور عطایا

ہبہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی مملوکہ چیز کسی دوسرے کو بلا معاوضہ عطیہ کے طور پر دے دے ہبہ، تحفہ، ہدیہ، عطیہ سب قریباً قریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ یہ بھی صدقہ ہی کی ایک قسم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہبہ ہر شخص کو کیا جا سکتا ہے۔ خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔ نوجوان طاقتور ہو یا بچہ ہو، یا بوڑھا و ناتواں ہو۔ نیز میاں بیوی کو ہبہ کر سکتا ہے اور بیوی میاں کو۔ باپ اپنی زیر کفالت اولاد کو بھی ہبہ کر سکتا ہے۔ غرضیکہ اس پر صدقات کے لین دین کی قسم کی کوئی پابندی یا شرط نہیں۔ البتہ اس کے اپنے چند احکام ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(۱) ہبہ کی ہوئی چیز واپس نہیں لی جا سکتی۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

((اَلَّذِیْ یَعُوْدُ فِیْ هِبَتِهٖ كَالْكَلْبِ یَرْجِعُ فِیْ قَیْئِهٖ۔[1])) (جو شخص اپنی ہبہ کردہ چیز واپس لے لیتا ہے اس کی مثال اس کتے کی سی ہے جو دوبارہ اپنے قے کردہ چیز کھا جاتا ہے۔)

اور ظاہر ہے کہ قے کردہ چیز کو کھانا حرام ہے۔

(۲) ہبہ کی ہوئی چیز قیمتاً بھی واپس نہیں لی جا سکتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب نے ایک

---

[1] بخاری۔ کتاب الهبه۔ باب لا یحل لاحد ان یرجع فی هبته وصدقته

گھوڑا ایک مجاہد کو ہبہ کر دیا- اس مجاہد نے اس گھوڑے کے چارہ دانہ کا خیال نہ رکھا اور اسے نڈھال اور ناتواں کر دیا- اور بازار میں فروخت کرنے کے لیے لے آیا- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ گھوڑا پہچان لیا- اور انہیں بہت رنج ہوا- انہوں نے چاہا کہ وہ گھوڑا اس مجاہد سے خرید لیں اور انہیں سستے داموں مل جائے- پھر انہیں خیال آیا- کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے پوچھ لینا چاہیے- چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- ''اگر وہ گھوڑا تمہیں ایک درہم میں بھی ملے تو بھی نہ لینا- کیونکہ صدقہ دے کر پھر لوٹانے والا کتے کی طرح ہے جو قے کرکے پھر چاٹ جاتا ہے-''[1]

دیکھئے اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہبہ کی جگہ صدقہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے- کیونکہ ہبہ بھی صدقہ کی ہی ایک قسم ہے- حالانکہ صدقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال نہیں تھا- جبکہ ہدیہ تحفہ وغیرہ حلال تھا-

(۳) اس قانون میں استثناء یہ ہے کہ والد اگر بیٹے کو کوئی چیز ہبہ کرے تو وہ اسے واپس لے سکتا ہے-[2] جس کی وجہ یہ ہے کہ بیٹا اور اس کا مال سب کچھ اس کے والد کا ہوتا ہے-

(۴) اگر باپ اپنی اولاد کو ہبہ کرنا چاہے- تو اسے چاہیے کہ سب کو ایک جیسا ہبہ کرے اور یکساں سلوک کرے- ورنہ نہ کرے- عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک واقعہ ہوا- حضرت بشیر بن سعد نے عمرہ بنت رواحہ سے شادی کی اور اس کے بطن سے نعمان پیدا ہوئے- عمرہ نے حضرت بشیر اپنے خاوند کو تقاضا کرکے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ایک غلام نعمان کو ہبہ کرے اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنائے- حضرت بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ نے اس بیٹے کو ایک غلام ہبہ کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنانے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بشیر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا تم نے اپنے سب بیٹوں کو ایک غلام ہبہ کیا ہے؟ حضرت بشیر رضی اللہ عنہ کہنے لگے نہیں- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ تمہاری ساری اولاد تم سے اچھا اور ایک جیسا سلوک کرے؟ حضرت بشیر رضی اللہ عنہ کہنے لگے' ہاں- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پھر تم بھی سب سے ایک جیسا سلوک کرو- پھر فرمایا کسی اور کو جا کر گواہ بناؤ- میں ظلم پر گواہ نہیں بننے کا- میں صرف حق کا گواہ بن سکتا ہوں-[4] حضرت نعمان کہتے ہیں کہ یہ سن کر میرا باپ لوٹ گیا- اور اپنی دی ہوئی چیز پھیر لی-[5]

---

1 تا 2 بخاری- کتاب الھبہ- باب لایحل لاحدان یرجع فی ھبتہ وصدقتہ
3 بخاری- کتاب الھبۃ- باب الھبۃ لولد
4 تا 5 بخاری- کتاب الھبہ- باب الھبہ لولد نیز- باب الاشتھار فی الھبۃ

(۵) اگر موہوبہ چیز کوئی قیمتی چیز ہو تو اس پر گواہ بنانا ضروری ہے۔ مثلاً اگر جائیداد وغیرہ ہو تو اسے ضبط تحریر میں لانا چاہیے۔ جس پر گواہ ہوں۔ جیسا کہ مذکورہ واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت بشیر رسول اللہ ﷺ گواہ بنانا چاہتے تھے۔[1]

(۶) سرکاری ملازمین یا قاضیوں کو ہرگز کوئی ہدیہ یا تحفہ نہ دینا چاہیے۔ نہ ہی انہیں یہ قبول کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ ہدایا رشوت ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص عبداللہ بن الاتیہ کو زکوٰۃ کا عامل مقرر کیا۔ جب وہ زکوٰۃ کا مال لے کر آیا تو کہنے لگے۔ کہ یہ تو زکوٰۃ کا مال ہے اور یہ چیز اور یہ چیز لوگوں نے مجھے ہدیہ دی ہے۔ اس بات پر آپ ﷺ کو غصہ آ گیا اور آپ ﷺ نے اسے فرمایا۔ اگر تو اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھا رہتا تو ہم دیکھتے کہ کون تجھے تحفہ دیتا ہے؟ قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جو کوئی زکوٰۃ کے مال سے کچھ چرا رکھے وہ قیامت کے دن اسے اپنی گردن پر لادے ہوئے آئے گا۔[2]

اسی طرح جس قاضی یا ثالث کے پاس مقدمہ ہو۔ اسے کسی فریق سے کوئی ہدیہ یا تحفہ قبول نہ کرنا چاہیے۔ الا یہ کہ ان کا پہلے سے ہی تحائف کے لین دین کا سلسلہ چلتا ہو۔

(۷) آپ ﷺ نے ایک دوسرے کو ہدایا اور تحفہ وغیرہ بھیجتے رہنے کی بہت ترغیب دلائی ہے۔ چنانچہ فرمایا!

((تَهَادُوْا فَاِنَّ الْهَدِيَّةَ تذهَبُ وَحَرَ الصَّدْرِ وَلَا تَحْقِرَنَّ جَارَةٌ لِجَارَتِهَا وَلَوْ شِقَّ فِرْسَنَ شَاةٍ۔[3])) (آپس میں ہدیہ بھیجو کیونکہ ہدیہ دل کی خفگی کو دور کرتا ہے۔ اور اگر کوئی عورت اپنی ہمسائی کو بکری کے کھر کا ٹکڑا بھی بھیجے تو وہ اسے حقیر نہ سمجھے۔)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی معمولی سی چیز بھی بھیجے تو بھی اس کی قدر کرنا چاہیے۔ اس پر باتیں بنانا اسے ناپسند کر دینا یا اسے واپس لوٹا دینا بہت بری بات ہے۔ ان باتوں سے ہدیہ دینے والے کی دل شکنی ہوتی ہے۔

(۸) تحائف وہدایا کا بدل بھی دینا چاہیے۔ چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

((مَنْ اَعْطٰى عَطَاءً فَوَجَدَ فَلْيُجْزِ بِهٖ (اگر کسی کو تحفہ دیا جائے اور وہ اس کے بدلہ کی

---

[1] بخاری۔ کتاب الهبه۔ باب الهبه لولد نیز۔ باب الاشتهار فی الهبة

[2] بخاری۔ کتاب الهبة۔ باب من لم یقبل الهدیة لعلة

[3] ترمذی۔ ابواب الولاء والهبة۔ نیز بخاری کتاب الهبة باب فضلها و التحریض علیها

وَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيُثْنِ فَإِنَّ مَنْ أَثْنَى فَقَدْ شَكَرَ وَمَنْ كَتَمَ فَقَدْ كَفَرَ۔[1]))

طاقت رکھتا ہو تو اس کا بدلہ دے اور اگر نہیں رکھتا تو دینے والے کی اچھائی بیان کرے کیونکہ جس نے محسن کی تعریف کی اس نے شکر کیا اور جس نے احسان چھپایا اس نے کفرانِ نعمت کیا۔)

نیز آپ ﷺ نے فرمایا۔

((مَنْ صُنِعَ إِلَيْهِ مَعْرُوفٌ فَقَالَ لِفَاعِلِهِ جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْراً فَقَدْ أَبْلَغَ فِي الثَّنَاءِ۔[2]))

(جس شخص سے کوئی بھلائی کی جائے اور وہ کرنے والے کو جزاک اللہ کہے تو اس نے ثنا کا پورا حق ادا کر دیا۔)

نیز فرمایا۔

((مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهِ۔[3]))

(جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا اللہ کا کب کرے گا۔)

(۹) ہدیہ کافر و مشرک کو بھی دیا جا سکتا ہے اور ان سے لیا بھی جا سکتا ہے۔ چنانچہ جنگ تبوک کے موقعہ پر آپ ﷺ تبوک تشریف لے گئے اور وہاں مقام پذیر رہے تو ایلہ کے حاکم نے آپ ﷺ کو ایک سفید خچر تحفہ کے طور پر بھیجی۔ جس کے جواب میں آپ ﷺ نے اسے ایک چادر بطور تحفہ بھیجی نیز رومہ کے حاکم کیدار نے آپ ﷺ کو تحفہ بھیجا جو آپ ﷺ نے قبول فرمایا۔[4] ایسے اور بھی کئی واقعات ہیں۔

---

[1] ترمذی کتاب البر والصلۃ۔ باب ماجاء فی المتشبع بمالم یعطه (۲۰۲۴) ابوداؤد کتاب الادب۔ باب فی شکر المعروف (۴۸۱۳) بیہقی ۱۸۲/۲ اس کی سند ضعیف ہے اس میں شرحبیل بن سعد الانصاری ضعیف ہے جیسا کہ علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد ۱۱۵/۴ میں کہا ہے۔ اس روایت کے کئی ایک شواہد ہیں شیخ البانی نے اس روایت کو سلسلہ الاحادیث الصحیحہ (۶۱۷) میں ذکر کیا ہے۔

[2] ترمذی کتاب البر والصلۃ۔ باب ماجاء فی المتشبع عالم یعطه (۲۰۳۵) عمل الیوم واللیلۃ للنسائی (۱۸۰) العلل الکبیر للترمذی ۸۰۳/۲ کتاب الغیلانیات لابی بکر الشافعی (۱۴۷) الاحادیث المختارہ ۱۱۰/۴، ۱۱۱ رقم (۱۳۲۲) طبرانی صغیر ۱۱۴۸/۲ البحر الزخار ۵۴/۷ یہ حدیث حسن ہے عجالۃ الراغب المتمنی للشیخ سلیم الھلالی ۳۳۰/۱

[3] بخاری۔ کتاب الھبہ۔ باب الھدیۃ للمشرکین۔

[4] بخاری۔ کتاب الھبۃ۔ باب الھدیۃ للمشرکین

٦- وقف اور اس کے ضوابط

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر میں ایک قطعہ زمین ملا- جسے وہ صدقہ کرنا چاہتے تھے- لہٰذا وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس مشورہ کے لیے آئے- اور کہا اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے خیبر میں ایک قطعہ زمین ملا ہے جس سے بڑھ کر عمدہ مال میں نے کبھی نہیں پایا اس سلسلہ میں آپ مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں- آپ ﷺ نے فرمایا-

((اِنْ شِئْتَ حَبَّسْتَ اَصْلَهَا وَتَصَدَّقْتَ بِهَا-)) (اگر چاہو تو اصل زمین وقف کر دو اور اس کی آمدنی خیرات ہوتی رہے-)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ پھر حضرت عمرؓ نے اس زمین کو ان شرائط پر وقف کیا-

((۱) اَنَّهُ لَا يُبَاعُ وَلَا يُوْهَبُ وَلَا يُوْرَثُ-)) (یہ زمین نہ بیع ہو سکے گی- نہ ہبہ ہوگی- اور نہ ترکے میں ملے گی-)

((۲) وَتَصَدَّقَ بِهَا فِی الْفُقَرَاءِ وَفِی الْقُرْبٰی وَفِی الرِّقَابِ وَفِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وابْنِ السَّبِيْلِ والضَّيْفِ-)) (اور اس کی آمدنی محتاجوں' رشتہ داروں' غلاموں کی آزادی' مجاہدین کی خدمت اور مسافروں اور مہمانوں پر خرچ کی جائے گی-)

((۳) لَاجُنَاحَ عَلٰی مَنْ وَلِيَهَا اَنْ يَاْكُلَ مِنْهَا بِالْمَعْرُوْفِ وَيُطْعِمَ غَيْرَ مُتَمَوِّلٍ-[1])) (اور جو اس زمین کا متولی ہو وہ اس سے دستور کے موافق کھائے اور کھلائے- مگر دولت اکٹھی کرنا نہ شروع کر دے-)

مندرجہ بالا شرائط میں سے پہلی شرط لازمی ہے- جو دراصل رسول اللہ ﷺ کے اصل الفاظ حَبَّسْتَ اَصْلَهَا کی تشریح ہے- یعنی وقف کی زمین یا عمارت یا باغ جو کچھ بھی کوئی وقف کرے اسے نہ فروخت کیا جا سکتا ہے- اور نہ ہی یہ وراثت میں منتقل ہو سکتا ہے متولی اس کا مالک نہیں ہوتا- بلکہ صرف منتظم اور نگران ہوتا ہے-

آج کل وقف کے لیے انگریزی لفظ ٹرسٹ (Trust) زیادہ مشہور ہو چکا ہے- وقف کرنے والا کوئی ایک شخص بھی ہو سکتا ہے اور بہت سے اشخاص بھی جن کی وہ جائیداد مشترکہ ہو یا سرمایہ مشترکہ طور پر فراہم کر کے ایسی جائیداد بنائیں-

---

[1] بخاری- کتاب الشروط- باب الشروط فی الوقف

شرط نمبر۲ میں جو مقاصد بیان کئے گئے ہیں- وہ نہایت پاکیزہ اور کتاب و سنت کے مطابق ہیں- تاہم ان میں تبدیلی ہوسکتی ہے- اور یہ تبدیلی وقف کرنے والے یا والوں کی مرضی پر منحصر ہے جیسے اوقاف کے ہسپتال اور بعض دوسرے ادارے ہوتے ہیں-

متولی یا منتظمین کے لیے معروف کا تعین بھی اس کی انجمن کے باہمی مشورہ سے ہوتا ہے ہاں اگر متولی صرف ایک فرد ہو- تو اس کے لیے معروف چیز یا تو ایک متوسط درجہ کے گھرانہ کا خرچ ہوسکتا ہے- یا معروف یہ ہے کہ اگر وہ یہ کام چھوڑ کر کوئی دوسرا ایسا کام اختیار کرتا جس کا وہ اہل ہے- تو اسے کیا کچھ آمدنی ہوسکتی تھی؟

متولی کے لیے سب سے بہتر راہ یہی ہے کہ وہ قرآن کے اس اصول ﴿وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ﴾- (۴:۵) (یعنی اگر وہ کھاتا پیتا ہے تو کچھ بھی نہ لے) پر عمل پیرا ہو-

۷- عمریٰ اور رقبیٰ

احادیث کی کتابوں میں عمریٰ اور رقبیٰ کا بھی ذکر آتا ہے- عمریٰ یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے سے کہے کہ میں نے اپنا فلاں گھر تمہیں عمر بھر (تازیست) رہنے کے لیے دیا- اور رقبیٰ کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً دو شخص ایک گھر میں رہتے ہیں اور وہ یہ عہد کریں کہ ہم میں سے جو کوئی بعد میں زندہ رہے یہ گھر اس کا ہوگا- گویا عمریٰ اور رقبیٰ دونوں کا تعلق سکونت یا گھر سے ہوتا ہے-

عمریٰ اور رقبیٰ دراصل دونوں ہبہ ہی کی اقسام ہیں- لہٰذا یہاں دو متضاد پہلو سامنے آجاتے ہیں- ہبہ کے احکام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مکان عمریٰ کرنے والے کی طرف واپس نہ ہو جبکہ شرط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ واپس ہونا چاہیے- اور یہ شرط بھی ایسی نہیں جسے شریعت نے باطل قرار دیا ہے لہٰذا ان میں دونوں طرح کے احکام احادیث میں مذکور ہیں- مثلاً

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا-

((مَنْ اَعْمَرَ عُمْرىٰ لَهُ وَلِعَقِبِهِ فَاِنَّهَا لِلَّذِىْ هُوَ يُعْطِيْهَا لَاتَرْجِعُ اِلَى الَّذِىْ اَعْطَاهَا لِاَنَّهُ اَعْطٰى عَطَآءً وَقَعَتْ فِيْهِ الْمَوَارِيْثُ-[1]))

(جس شخص نے کسی دوسرے کو عمریٰ دیا وہ اس کے اور اس کی اولاد کے لیے ہے کیونکہ وہ اسی کا ہوجاتا ہے جسے اس نے دیا وہ کبھی دینے والے کی طرف لوٹ نہیں سکتا- کیونکہ اس نے ایسی چیز دی جس میں وراثت واقع ہوتی ہے-)

---

[1] موطا امام مالک- کتاب الاقضیة- باب القضاء فی العمریٰ ۲/ ۲۱۸

آپ ﷺ کا یہ ارشاد بالکل ہبہ کے حکم کے مطابق ہے۔ اب اس کے مقابل یہ حدیث ملاحظہ فرمائیے۔

(۲) حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ام المومنین حضرت حفصہ جب فوت ہوئیں تو ان کے بھائی عبداللہ بن عمر وارث ہوئے۔ حضرت حفصہ اپنا گھر زید بن خطاب کی بیٹی (اپنی چچیری بہن) کو زندگی بھر رہنے کو دے گئی تھیں۔ جب یہ (چچیری بہن) فوت ہوئیں۔ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس مکان کو اپنا سمجھ کر اس پر قبضہ کر لیا۔[1]

اس واقعہ میں عمریٰ کی شرط کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

(۳) عبدالرحمٰن بن قاسم کہتے ہیں کہ مکحول نے میرے باپ قاسم سے پوچھا کہ عمریٰ کے متعلق لوگوں کے کیا اقوال ہیں؟ وہ کہنے لگے۔ میں نے تو لوگوں کو اپنے مالوں میں اپنی شرطیں پوری کرتے ہوئے پایا ہے۔ جو کچھ وہ دیتے اسے پورا بھی کرتے تھے۔[2]

یہ تینوں احادیث موطا امام مالک کی ہیں اور ان کا فتویٰ بھی یہی ہے۔ کہ جب وہ شخص مر جائے جسے عمریٰ دیا گیا تھا وہ مکان وغیرہ عمریٰ دینے والے کا ہوگا۔ بشرطیکہ اس نے یہ طے کر لیا ہو کہ یہ مکان اس کی زندگی تک اس کے پاس رہے گا۔ وارثوں کو نہ ملے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ وارثوں کو نہ ملنے کی تصریح تو فقط تاکید مزید کے طور پر ہے ورنہ عمریٰ تو کہتے ہی اسے ہیں جو کسی کو اس کی اپنی زندگی تک کے لیے دیا جائے۔ ورنہ وہ مکمل طور پر ہبہ ہوگا۔ عمریٰ نہ رہے گا۔

اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے عمریٰ اور رقبیٰ کو طے شدہ شروط کے مطابق جائز قرار دیا ہے۔[3] اور یہ بھی فرمایا کہ اگر عمریٰ دینے والا یوں کہے کہ

((هِيَ لَكَ مَا عِشْتَ فَإِنَّهَا تَرْجِعُ إِلَى صَاحِبِهَا۔[4])) (جب تک تو زندہ رہے یہ تیرے لئے ہے تو ایسا عمریٰ اپنے مالک کی طرف لوٹ آئے گا۔)

تاہم معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی رغبت اس بات کی طرف تھی کہ جو شخص عمریٰ دیتا ہے وہ واپس نہ لے چنانچہ بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ نے فرمایا۔

---

[1] تا [2] موطا امام مالک۔ کتاب الاقضیۃ۔ باب القضاء فی العمریٰ ۲/۲۱۸

[3] ابوداؤد کتاب الاجارۃ۔ باب فی العمری (۳۵۴۸) صحیح البخاری (۲۶۲۶)

[4] ابوداؤد (۳۵۵۵) بیہقی ۶/۱۷۲ مسلم (۱۶۲۵)

((لَا تَرقَبُوا وَلَا تَعمَرُوا فَمَنْ اُرقِبَ شَيْئًا اَوْ اُعْمِرَ فَهُوَ لِوَرَثَتِهٖ-[1]))

(رقبیٰ اور عمریٰ نہ کیا کرو- پھر جو شخص کوئی چیز رقبی یا عمریٰ کرے تو اس کے وارثوں کی ہوگی-)

انہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بخاری میں جو روایت آئی ہے وہ یوں ہے-

((قَضَى النَّبِيُّ ﷺ بِالْعُمْرٰى اَنَّهَا لِمَنْ وُّهِبَتْ لَهٗ-[2]))

(عمریٰ سے متعلق نبی ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ وہ اسی کا ہے جس کو ہبہ کیا گیا ہو-)

اور انہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مسلم میں روایت ہے وہ بھی واضح ہے اور وہ یہ ہے-

((مَنْ اَعْمَرَ عُمْرٰى فَهِيَ لِلَّذِيْ اُعْمِرَ حَيًّا وَمَيِّتًا وِلعَقِبِهٖ-[3]))

(جس نے کسی کو عمریٰ دیا تو وہ اسی کے لیے ہے جسے دیا گیا ہے زندگی میں بھی موت کی حالت میں بھی اور اس کے بعد اس کی اولاد کے لیے ہے-)

عمریٰ کے مسئلہ کو اس واقعہ سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے جو انہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مسلم میں مذکور ہے-

مدینہ میں ایک عورت کا باغ تھا- جو اس نے اپنے بیٹے کو عمریٰ کے طور پر دیا- اتفاق کی بات کہ بیٹا پہلے مر گیا- اور وہ باغ اس عورت کے قبضہ میں آ گیا- جب اس عورت نے انتقال کیا- تو ایک طرف تو اس عورت کی باقی اولاد اور بھائی دعوے دار تھے اور دوسری طرف اس بیٹے کی اولاد جو پہلے مر چکا تھا- یہ مقدمہ حضرت طارق رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوا- جو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے مولیٰ تھے- انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو بلایا- جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان پر گواہی دی کہ عمریٰ اسی کا ہے جسے دیا جائے- چنانچہ حضرت طارق رضی اللہ عنہ نے بیٹے کی اولاد کے حق میں فیصلہ کیا اور ساتھ ہی عبدالملک بن مروان کو یہ صورت حال لکھ بھیجی- عبدالملک نے کہا جابر رضی اللہ عنہ سچ کہتے ہیں- چنانچہ طارق نے وہ حکم نافذ کر دیا اور وہ باغ آج تک اس لڑکے کی اولاد کے پاس ہے-[4]

---

1. ابوداؤد- کتاب البیوع- باب فی العمریٰ اور باب فی الرقبیٰ (۳۵۵۶) نسائی کتاب العمریٰ (۳۷۳۴) مسند الحمیدی
2. بخاری- کتاب الھبۃ العمریٰ و الرقبیٰ
3. مسلم کتاب السیات- باب العمریٰ
4. مسلم- کتاب الھبات- باب العمری- ۱۲۹۹' اس کی سند صحیح ہے-

آج کل کسی کو عمریٰ یا رقبیٰ دینے کا رواج ہی نہیں رہا- بلکہ اکثر لوگ ان ناموں سے آشنا تک نہیں- رسول اللہ ﷺ نے تو رقبیٰ اور عمریٰ سے اس لیے منع کیا تھا- کہ آپ عمریٰ اور رقبی کی شرط سے بھی زیادہ ایثار چاہتے تھے- لیکن ہمارے چھوڑنے کی وجہ اس کے بالکل برعکس ہے- ہم میں خود غرضی اس قدر آ گئی ہے کہ ہم اپنے کسی بھائی پر عمریٰ یا رقبیٰ جتنی مروت بھی برداشت نہیں کر سکتے -

۸-شفعہ

شفعہ دراصل کسی جائیداد میں شراکت یا ہمسائیگی کے تعلق کو کہتے ہیں- اور شفعہ اسی جائیداد میں ہوتا ہے جس کی تقسیم نہ ہوئی ہو- اور جب حد بندی ہو جائے تو پھر شفعہ نہ ہوگا- چنانچہ آپ ﷺ نے شفعہ کے متعلق یہ فرمایا کہ

((الشُّفْعَةِ فِیْ کُلِّ شَیْ ءٍ مَالَمْ یُقْسَمْ فَاِذَا وَقَعَتِ الْحُدُوْدُ وَصُرِّفَتِ الطُّرُقُ فَلَا شُفْعَةَ-[1]))

(ہر اس چیز میں شفعہ ہے جو تقسیم نہ ہوئی ہو پھر جب حد بندی ہو جائے اور راہیں الگ الگ ہو جائیں تو شفعہ نہ رہے گا-)

حق شفعہ کے احکام حسب ذیل ہیں-

(۱) فرض کیجئے (الف) اور (ب) دو آدمی ایک جائیداد کے مشترکہ مالک ہیں- (الف) اپنا حصہ فروخت کرنا چاہتا ہے- تو (الف) کی یہ ذمہ واری ہے کہ وہ سب سے پہلے (ب) سے پوچھے کہ وہ (الف) کا حصہ خریدنے کو تیار ہے- اگر وہ تیار ہو جائے تو (الف) کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہیں کر سکتا- اور اگر (ب) خریدنے پر آمادہ نہ ہو تو پھر (الف) کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے-

(۲) اگر (الف)' (ب) کو پوچھے بغیر اپنا حصہ کسی دوسرے کے پاس فروخت کر دیتا ہے تو (ب) اس بیع کے وقت موجود ہے اور اس نے اس بیع پر اعتراض نہیں کیا تو بیع درست ہے اور (ب) کا حق شفعہ جاتا رہے گا-[2]

(۳) اور اگر (الف) نے (ب) سے چوری چھپے جائیداد فروخت کر دی - خواہ وہ جائیداد مشترکہ تھی یا پڑوس میں تھی- تو (الف) عدالت کی طرف رجوع کر کے وہ سودا خود لے سکتا ہے-

(۴) اگر (الف) کو (ب) سے مارکیٹ سے کچھ کم قیمت ملے تو بھی (الف) کو تھوڑی بہت

---

[1] بخاری- کتاب الشفعۃ- باب الشفعة مالم يقسم

[2] بخاری کتاب الشفعۃ- باب الشفعة مالم يقسم

کسر کھا کر بھی (ب ؓ) کو دینا چاہیے۔

ابو رافع جو رسول اللہ ﷺ کے غلام تھے۔ انہوں نے سعد بن ابی وقاص سے کہا۔ "سعد تمہاری حویلی میں میرے دو مکان ہیں۔ وہ میں بیچنا چاہتا ہوں وہ تم لے لو۔" سعد کہنے لگا۔ واللہ! میں تو نہیں لینے کا۔ حضرت سعد بن مخرمہ رضی اللہ عنہ پاس کھڑے تھے وہ بھی سعد سے کہنے لگے واللہ! یہ مکان تمہیں خریدنا ہوں گے۔ تب سعد کہنے لگے۔ اچھا میں ان کے چار ہزار درہم دیتا ہوں اس سے زیادہ نہیں دے سکتا اور وہ بھی بالاقساط دے سکتا ہوں۔

ابو رافع رضی اللہ عنہ کہنے لگے۔ دیکھ مجھے ان مکانوں کے پانچ سو دینار (یعنی پانچ ہزار درہم) مل رہے ہیں۔ اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ نہ سنا ہوتا کہ ہمسایہ اپنی نزدیکی کی وجہ سے زیادہ حقدار ہوتا ہے تو میں تمہیں یہ مکان چار ہزار درہم کے عوض کبھی نہ دیتا۔ خصوصاً جبکہ مجھے ان کے پانچ سو دینار مل رہے ہیں آخر ابو رافع نے وہ مکان سعد رضی اللہ عنہ کو دے دیئے۔[1]

(۵) ہمسائیگی کے حقوق میں سے ایک حق یہ بھی ہے جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ

((لَا یَمْنَعُ جَارٌ جَارَهُ اَنْ یَّغْرِزَ خَشَبَةً فِي جِدَارِهِ۔[2])) (ایک ہمسایہ دوسرے ہمسائے کی دیوار میں لکڑی گاڑنے (شہتیر کڑیاں وغیرہ رکھنے) سے نہ روکے)

یہ تو تھا باہمی مواسات کا سبق مگر آج معاملہ اس کے بالکل برعکس ہو چکا ہے۔ آج جس مکان کی دیوار ہمسایہ سے مشترک ہو۔ یا اس کی دیوار پر کڑیاں ہوں اس مکان کی قیمت ہی کم ہو جاتی ہے اور ہر کوئی یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنی دیوار بالکل الگ رکھے۔ جس کا ہمسایہ سے کچھ تعلق نہ رہے۔

(۶) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ پڑوسی اپنے شفعہ کا زیادہ حقدار ہے۔ لہٰذا اگر وہ غائب ہے تو اس کا انتظار کیا جائے۔[3]

---

[1] بخاری کتاب الشفعہ۔ باب الشفعة مالم يقسم

[2] بخاری۔ ابواب المظالم والقصاص۔ عنوان باب

[3] موطا۔ کتاب الشفعة۔ باب ما يقع فيه الشفعة

باب: ۱۳

زکوٰۃ وصدقات

زکوٰۃ کی اہمیت اور فوائد

زکوٰۃ اسلام کا بنیادی رکن اور اہم مالی عبادت ہے- جس مال سے زکوٰۃ ادا نہ کی جائے وہ حلال ذرائع سے کمانے کے باوجود طیب نہ رہے گا- بلکہ ناپاک ہوگا- ملاحظہ ہو- ارشاد ربانی ہے-

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا-﴾ (۹:۱۰۳) ((اے رسول) ان کے اموال سے زکوٰۃ وصول کر کے انہیں پاک کیجئے- اور اس (زکوٰۃ کی وصولی کے عمل سے) انہیں پاکیزہ بنائیے-)

اس آیت میں زکوٰۃ کے بجائے صدقہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو ہر طرح کے فرضی واجبی اورنفلی صدقات کے لیے لازمی ہے- فرضی صدقہ کو شرعی اصطلاح میں زکوٰۃ کہا جاتا ہے- اس آیت میں خُذْ کا لفظ جس سے رسول اللہ ﷺ کو بحیثیت حکمران مخاطب فرمایا گیا ہے- صدقہ کے مفہوم کو زکوٰۃ سے مختص کر دیتا ہے-

دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے-

اس آیت میں زکوٰۃ وصدقات کے دو فائدے بیان ہوئے ہیں-

اوّل یہ کہ دِل روحانی بیماریوں مثلاً بخل' خود غرضی' لالچ' شقاوت سے پاک ہو جاتا ہے- اور اس کے بجائے اس میں اوصاف جمیلہ' ایثار' ہمدردی' مروت' موانست وغیرہ جگہ لے لیتے ہیں شرعی اصطلاح میں اسے تزکیہ نفس کہتے ہیں- آپ کے فرائض میں سے ایک فریضہ یہ بھی تھا کہ آپ صحابہ کرام کا تزکیہ یا تربیت فرمائیں-

دوسرے یہ کہ مال آلائشوں سے پاکیزہ ہو جاتا ہے- اور وہ خزانہ کے حکم میں نہیں

رہتا۔ وہ خزانہ جو نہ صرف انسان کو جہنم میں لے جائے گا۔ بلکہ اس کے لیے سخت اذیت کا باعث ہوگا۔ ارشاد خداوندی ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ٥ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ٥﴾ (۹:۳۴:۳۵)

(اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں۔ اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں (اے رسول) دردناک عذاب کی خوشخبری دے دیں۔ جس دن یہ (سونا چاندی) جہنم کی آگ میں تپائے جائیں گے پھر ان سے ان کی پیشانیوں' پہلوؤں اور پشتوں کو داغ دیا جائے گا۔ (اور کہا جائے گا) یہ کچھ تھا۔ جو تم اپنے لیے خزانہ جمع کرتے رہے ہو۔ اب اس کا مزہ چکھو۔)

علاوہ ازیں بے شمار احادیث میں مانعین زکوٰۃ کے لیے سخت وعید آئی ہے۔ جن کو بوجہ طوالت چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ زکوٰۃ کی عدم ادائیگی کفر ہے اسی بنا پر مانعین زکوٰۃ کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جہاد کیا تھا۔ لہٰذا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ زکوٰۃ کے معاملہ میں پوری احتیاط سے کام لے۔

فریضہ زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے۔ کہ اس کی ادائیگی میں عاقل یا غیر عاقل' بالغ یا نابالغ' عورت یا مرد کی کوئی تمیز نہیں۔ سب پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہے۔ جبکہ نماز غیر عاقل اور نابالغ پر فرض نہیں۔ حتیٰ کہ زکوٰۃ سے یتیم بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ طبرانی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور موطا میں یہ روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب سے موقوفاً ہے۔

((اِتَّجِرُوْا فِىْ اَمْوَالِ الْيَتٰمٰى لَاتَاْكُلُهَا الزَّكٰوةُ۔ [1]))

(یتیموں کے اموال سے تجارت کرو کہ کہیں زکوٰۃ ہی اسے نہ کھا جائے۔)

حرام مال کی زکوٰۃ:

یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ زکوٰۃ وصدقات حرام مال کو پاک نہیں کر سکتے اور نہ ہی ایسا صدقہ قبول ہوتا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

---

[1] موطا کتاب الزکوٰۃ۔ باب زکوٰۃ اموال الیتامیٰ

((لَایَکْسِبُ عَبْدٌ مَّالَ حَرَامٍ فَیَتَصَدَّقُ مِنْهُ فَیُقْبَلُ مِنْهُ-[1])) (کوئی بندہ حرام مال کماتا پھر اس کے ساتھ صدقہ کرتا ہے- اس کا وہ صدقہ قبول نہیں کیا جاتا-)

زکوٰۃ وصدقات اور طبقاتی تقسیم:

آیات بالا میں زکوٰۃ وصدقات کے دو فائدے بیان ہوئے ہیں وہ خرچ کرنے والے کی اپنی ذات تک ہیں معاشرتی سطح پر زکوٰۃ وصدقات کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے امیر وغریب کے درمیان تفاوت کم ہو جاتا ہے- اور معاشی لحاظ سے طبقاتی تقسیم کا خاتمہ ہو جاتا ہے- کیونکہ زکوٰۃ وصدقات اغنیاء کی جیب سے نکل کر فقراء کی جیب میں جاتے ہیں- امراء کے مال میں یہ غرباء کا حق ہوتا ہے- ارشاد باری ہے-

﴿وَالَّذِیْنَ فِیْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ-﴾ (۷۰:۲۴:۲۵) (اور ان کے اموال میں مانگنے اور نہ مانگنے والوں کا ایک جانا پہچانا حق ہے-)

اور رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا اور لوگوں سے زکوٰۃ کی وصولی کا حکم دیا تو اس کا طریق کار یہ بیان فرمایا-

((تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَآئِهِمْ وَتُرَدُّ اِلٰی فُقَرَائِهِمْ-[2])) (ان لوگوں کے اغنیاء سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی اور انہیں کے فقراء میں تقسیم کی جائے گی-)

فرضی صدقہ یعنی زکوٰۃ کے علاوہ نفلی صدقات کا میدان بھی نفلی نمازوں کی طرح بہت وسیع ہے اور ان کی بھی کئی اقسام ہیں- مثلاً

واجبی صدقات:

واجبی صدقات بھی دو قسم کے ہیں- ایک تو وہ ہیں جو مختلف گناہوں کے کفارے ہیں- مثلاً

(۱) جو شخص احرام کی حالت میں شکار کرے اس پر اس شکار کی مثل جانور یا اس کا عوض

---

[1] مسند احمد ۶/۱۸۹ (۳۶۷۲) شرح السنۃ کتاب البیوع باب الکسب و طلب الحلال (۲۰۳۰) حلیۃ الاولیاء ۴/۱۶۶ مسند بزار (۳۵۶۲ کشف الاستار) تاریخ کبیر للبخاری ۴/۳۱۳ حاکم ۲/۴۴۷ شعب الایمان بیہقی (۵۵۲۴) طبرانی کبیر (۸۹۹۰) اس کی سند صباح بن محمد البجلی کی وجہ سے ضعیف ہے-

[2] بخاری- کتاب المغازی- باب بعث ابی موسیٰ و معاذ الی الیمن-

(نقدی وغیرہ کی صورت میں) صدقہ کرنا واجب ہو جاتا ہے- یا اس عوض کے برابر مسکینوں کو کھانا کھلانا ضروری ہے-[1]

(۲) فرضی روزہ توڑنے کا کفارہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا بھی ہے اور غلام آزاد کرنا بھی-[2]

(۳) احرام کی حالت میں شکار کرنے والے کے کفارہ کی ایک شکل ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے-[3]

(۴) قسم توڑنے کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا انہیں پوشاک مہیا کرنا یا غلام آزاد کرنا ہے-[4]

(۵) جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں اس کا فدیہ بھی ایک مسکین کا دو وقت کا کھانا ہے-[5]

یاد رہے ان تمام قسم کے کفاروں اور صدقات کا فائدہ معاشی لحاظ سے کمزور طبقہ کو پہنچتا ہے اور دوسری قسم کے واجبی صدقات ایسے ہیں جن کے ذریعے اسلامی تہواروں یا عیدین کے موقعہ پر غریبوں کو عید کی خوشی میں شریک بنایا جاتا ہے- عید الفطر کے موقعہ پر صدقہ فطر یا فطرانہ واجب ہے اور عید الاضحیٰ کے موقعہ پر قربانی کو ہر صاحب استطاعت کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے- قربانی کے گوشت کا زیادہ سے زیادہ تہائی حصہ گھر میں رکھا جاتا ہے باقی گوشت اقرباء کے لیے اور مسکینوں کے لیے اور کھال بھی صدقہ کے طور پر دینا ضروری ہے-

اختیاری صدقات:

اختیاری صدقہ کو نفلی صدقہ بھی کہا جاتا ہے- ایسے صدقات اختیاری صرف اس لحاظ سے ہوتے ہیں کہ ان میں صدقہ کی مقدار یا کوئی خاص وقت متعین نہیں ہوتا- یعنی کوئی شخص جب چاہے اور جتنا چاہے اور جسے چاہے دے سکتا ہے- ایسے صدقات کی ادائیگی کے بھی وہی فوائد ہیں جو نماز کے نوافل کے ہوتے ہیں- یعنی اگر فرائض میں کمی رہ گئی تو ایسے صدقات سے پوری کر دی جاتی ہے اور دوسرے یہ کہ یہی صدقات تقرب الٰہی کا ذریعہ بنتے ہیں- لہٰذا ایسے صدقات کی ادائیگی صرف اہل ثروت کے لیے ہی ضروری نہیں بلکہ تنگدست حضرات کو بھی ان کے لیے بہت ترغیب دی گئی ہے- لہٰذا تنگدست حضرات کو بھی اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نہ کچھ دینا ضرور چاہیے ان کے لیے بھی بخل کے مرض سے نجات اور نفس کا تزکیہ ایسے ہی ضروری ہے جیسے صاحب حیثیت لوگوں کے لیے ضروری ہے-

---

۱ سورہ مائدہ-۹۵ ۲ بخاری کتاب العلوم- باب اذا جامع-
۳ سورۃ مائدہ ۹۵ ۴ مجادلہ:۴ ۵ بقرہ-۱۸۴

صدقہ امیر غریب سب کے لیے ضروری ہے:

رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مبارک ہے۔

((اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ۔[1])) (دوزخ سے بچو خواہ یہ کھجور کا ٹکڑا صدقہ کرنے سے ہی ہو۔)

نیز آپ ﷺ نے فرمایا

((الصَّدَقَةُ فَرِيضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ۔[2])) (صدقہ ہر مسلمان پر فرض ہے۔)

نفلی صدقات کا مصرف بھی بہت وسیع ہے غریبوں کو قرض حسنہ دینا' قرض حسنہ معاف کر دینا۔ کسی قرض تلے دبے ہوئے کا قرض اتار کر اسے اس بوجھ سے نجات دلانا۔ بیواؤں' یتیموں کا خیال رکھنا اپنے قریبی رشتہ داروں اور ہمسایوں سے غریب اور محتاج لوگوں کی دست گیری کرنا۔ دینی اداروں سے تعاون اور مساجد کی آبادی وتعمیر میں حصہ لینا۔ خیراتی اور باہمی تعاون کے اداروں میں شریک ہونا۔ غرضیکہ ان صدقات کا میدان فرضی صدقات کے میدان سے بہت زیادہ وسیع ہے اور ایسے صدقات کی حد جو قرآن نے بتائی ہے وہ یہ ہے۔

صدقات کا بلند ترین درجہ:

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲:۲۱۹)

اے پیغمبر! آپ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں ان سے کہہ دیجئے جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو۔

اس چیز کی وضاحت رسول اللہ ﷺ نے یوں بیان فرمائی ہے۔

((مَنْ كَانَ لَهٗ فضل من ظهر فَلْيَعُدْ به على من لا ظهر له ومن كان لَهٗ فَضْلٌ مِنْ زَادٍ فَلْيَعُدْ مَنْ لَا زاد لَهٗ فَذَكَرَ مِنْ اَصْنَافِ الْمَالِ مَاذَكَرَ حَتّٰى رَاَيْنَا اَنَّهٗ لَاحَقَّ لِاَحَدٍ مِنَّا مِنْ فَضْلٍ۔[3])) (جس کے پاس فالتو سواری ہے وہ اسے لوٹا دے جس کے پاس سواری نہیں اور جس کے پاس ضرورت سے زائد زادراہ ہے وہ اسے لوٹا دے جس کے پاس زادراہ نہیں راوی ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ آپ نے مال کی ایک ایک

---

[1] بخاری۔ کتاب الزکوۃ۔ باب اتقوا النار ولو بشق تمرة [2] بخاری۔ کتاب الزکوۃ۔ عنوان باب
[3] مسلم۔ کتاب اللقطہ۔ باب استحباب المواساات بفضول المال۔

قسم کا ایسے ہی جدا جدا ذکر کیا یہاں تک کہ ہم یہ سمجھنے لگے کہ ہم میں سے کسی کا بھی اپنے زائد مال میں کوئی حق نہیں ہے۔)

گویا شریعت نے انفاق فی سبیل اللہ کا کم سے کم درجہ بھی بتا دیا ہے اور وہ ہے فرضی زکوٰۃ کی ادائیگی جو کفر اور اسلام کی حد پر واقع ہے اور زیادہ سے زیادہ درجہ بھی بتا دیا اور وہ یہ ہے کہ ایک مسلمان اپنی ضرورت سے زائد سب کچھ اللہ کی راہ میں دے دے ان دونوں درجوں کے درمیان بہت وسیع میدان ہے۔ جس میں ہر مسلمان اپنی ہمت اور کوشش کے مطابق خرچ کر کے اسی مناسبت سے تقرب الٰہی اور بلند درجات حاصل کرتا ہے۔

صدقہ کے فضائل

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ۔﴾ (۲:۲۷۶) (اللہ تعالیٰ سود کو بے برکت بناتا ہے اور صدقات کو پالتا پوستا ہے۔)

سودی کاروبار کے معاشرہ پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان کا ہم سود کے ابواب میں جائزہ لے چکے ہیں اور صدقات وخیرات کے خوشگوار اثرات کا بھی اسی باب کے ذیلی عنوان ''بچت اور سرمایہ کاری کا اسلامی نظریہ'' میں تفصیلی بیان گزر چکا ہے۔ صدقات کے یہ اثرات تو دنیا میں معاشرہ پر مرتب ہوتے ہیں اخروی جزاء کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ صدقات کو کیسے پالتا ہے۔ یہ بات درج ذیل حدیث میں ملاحظہ فرمائیے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص حلال کی کمائی سے ایک کھجور کے برابر صدقہ کرے۔ اور اللہ حلال کمائی کو ہی قبول کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے داہنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ پھر صدقہ دینے والے کے فائدہ کے لیے اس کو یوں پالتا ہے جیسے کوئی تم میں سے اپنا بچھڑا پالتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔[1]

دوسری بات جو اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ صدقہ کرنے سے گو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مال کم ہو گیا ہے۔ مگر حقیقتاً وہ گھٹتا نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

---

[1] بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب الصدقۃ من کسب طیب

﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْ ءٍ فَھُوَ یُخْلِفُهٗ وَھُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ﴾ (۳۹:۳۴) (اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا عوض دے گا- اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے-)

اللہ تعالیٰ انفاق فی سبیل اللہ کا عوض کس طرح دیتے ہیں ایسے چند مستند واقعات ہم اس کتاب کے پہلے باب میں پیش کر چکے ہیں- یہاں ہم صرف اس ضمن میں چند احادیث نقل کریں گے-

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں (گویا یہ حدیث قدسی ہے)

﴿یَا بَنِیْ اٰدَمَ اَنْفِقْ اُنْفِقْ عَلَیْکَ-﴾[1] (اے آدم کے بیٹے تو (لوگوں پر) خرچ کر میں تجھ پر خرچ کروں گا-)

آپ ﷺ نے حضرت اسماء بنت ابی بکر (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی بہن) حضرت زبیر بن عوام کی زوجہ کو مخاطب کر کے فرمایا-

(۳) سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا-

((لَا تُوْعِیْ فَیُوْعِیَ اللّٰهُ عَلَیْکِ وَارْضَخِیْ مَا اسْتَطَعْتِ-)) (روپیہ پیسہ تھیلی میں بند کر کے نہ رکھ ورنہ اللہ تیرا رزق بند کر کے رکھ دے گا- جہاں تک ہو سکے خیرات کرتی رہ-)

اسی مضمون کی دوسری روایت میں لَا تُحْصِیْ فَیُحْصِیَ اللّٰهُ عَلَیْکِ -(گن گن کر نہ رکھ ورنہ اللہ بھی تجھے گن گن کر ہی دے گا) کے الفاظ ہیں اور تیسری میں لَا تُوْکِیْ فَیُوْکِیْ عَلَیْکِ (خیرات مت روک ورنہ تیرا رزق بھی روکا جائے گا) کے الفاظ ہیں-[2]

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ-

((تَابِعُوْا بَیْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ فَاِنَّھُمَا ینفِیَانِ الْفَقْرَ وَالذُّنُوْبَ-[3])) (حج کے بعد عمرہ اور عمرہ کے بعد حج کرو کیونکہ یہ دونوں محتاجی اور گناہوں کو دور کرتے ہیں-)

(۵) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا-

((مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یُّبْسَطَ لَهٗ رِزْقُهٗ اَوْیُنْسَاَ لَهٗ فِیْ اَثَرِهٖ فَلْیَصِلْ رَحِمَهٗ-[4])) (جس شخص کو یہ بات اچھی لگے کہ اس کا رزق کشادہ اور اس کی عمر دراز ہو وہ اپنے رشتہ داروں

---

[1] بخاری- کتاب الزکوٰۃ- باب الصدقة فیما استطاع
[2] بخاری- کتاب الزکوٰۃ- باب الصدقة فیما استطاع
[3] صحیح البخاری کتاب الادب- باب من بسط له فی الرزق لصلة الرحم (۹۵۸۶،۹۵۸۵)
[4] بخاری- کتاب البیوع- باب من احبّ البسط فی الرزق

سے سلوک کرے۔)

غور فرمایئے کہ صلہ رحمی کا رزق کی کشادگی اور عمر کی درازی سے کیا تعلق ہے؟ کیا ان کا باہمی ربط کچھ عقل میں آ سکتا ہے؟ بظاہر یہ باتیں خلاف عقل معلوم ہونے کے باوجود احادیث صحیحہ سے ثابت اور شک وشبہ سے بالاتر ہیں اور جن مرئی یا غیر مرئی اسباب وذرائع سے انسان کو یہ نعمتیں ملتی ہیں۔ ان کا اسے وہم وگمان تک نہیں ہوتا۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور کرتے رہنے سے دل سے بخل دور ہوتا ہے اور ایک فراخی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ جسے عربی زبان میں سماحت کہتے ہیں۔ یہ سماحت بڑا قیمتی جوہر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے اور لین دین کے معاملات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ خواہ یہ لین دین تجارتی قسم کا ہو یا ذاتی اغراض سے تعلق رکھتا ہو۔ جس شخص میں یہ صفت پیدا ہو جائے وہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ کی اس پر رحمت ہو گئی اور انشاء اللہ اس کی بخشش بھی ہو جائے گی۔ اب اس کے متعلق چند ارشادات ملاحظہ فرمایئے۔

((رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلاً سَمَحًا اِذَا بَاعَ وَاِذَا اشْتَرٰی وَاِذَا اقْتَضٰی۔[1]))

(اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو بیچتے وقت خریدتے وقت اور بصورت ادھار تقاضا کرتے وقت نرمی اور فیاضی سے کام لیتا ہے۔)

(۴) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

((كَانَ رَجُلٌ يُدَايِنُ النَّاسَ فَكَانَ يَقُوْلُ لِفَتَاهُ اِذَا اَتَيْتَ مُعْسِرًا تَجَاوَزْ عَنْهُ لَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يَّتَجَاوَزَ عَنَّا قَالَ فَلَقِيَ اللّٰهَ فَتَجَاوَزَ عَنْهُ۔[2]))

(ایک شخص لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا اور وصولی کے وقت وہ اپنے کارندے (جواں بیٹے) سے کہتا۔ دیکھو جب تم کسی تنگ دست کے ہاں جاؤ تو اس سے درگزر کرنا شاید اللہ تعالیٰ ہم سے درگزر کرے۔ آپ نے فرمایا کہ جب وہ شخص اللہ سے ملا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس سے درگزر فرما دیا۔)

(۵) سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

((اِنَّ رَجُلاً كَانَ فِيْمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ اَتَاهُ

(تم سے پہلے لوگوں میں سے ایک آدمی کے

---

[1] بخاری۔ کتاب البیوع۔ باب الصدقة والسماحة فی الشراء والبیع

[2] مسلم کتاب المساقات والمزارعت۔ باب فضل انظار المعسر

الْمَلِکُ لِیَقْبِضَ رُوْحَهُ فَقِیْلَ لَهُ هَلْ عَلِمْتَ مِنْ خَیْرٍ قَالَ مَا اَعْلَمُ قِیْلَ لَهُ اُنْظُرْ قَالَ مَا اَعْلَمُ شَیْئًا غَیْرَ اَنِّیْ کُنْتُ اُبَایِعُ النَّاسَ فِی الدُّنْیَا فَاُجَازِیْهِمْ فَاُنْظِرُ الْمُوْسِرَ وَاَتَجَاوَزُ عَنِ الْمُعْسِرِ فَاَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ۔[1]))

پاس جب ملک الموت اس کی روح قبض کرنے آیا۔ تو اس سے پوچھا گیا کہ تم نے کوئی نیک کام بھی کیا ہے؟ وہ کہنے لگا مجھے کچھ معلوم نہیں فرشتہ نے کہا سوچ لو وہ کہنے لگا میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ میں لوگوں کے پاس مال بیچتا تھا تو میں درگزر کرتا تھا۔ اور تنگ دست کو معاف کر دیتا تھا۔ (اس کے اس عمل کے بدلے) اللہ تعالیٰ نے اسے جنت میں داخل کر دیا۔)

زکوۃ کی ادائیگی

زکوۃ کی ادائیگی میں مندرجہ ذیل امور کو بالخصوص ملحوظ رکھا جائے۔

(۱) اجتماعیت:

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے زکوۃ کی تحصیل و مصارف دراصل ایک اسلامی حکومت کا کام ہوتا ہے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے خود اسے رائج فرمایا تھا۔ ہمارے ہاں اسلامی نظام موجود نہیں ہے۔ ضیاء الحق مرحوم نے جو نظام زکوۃ وعشر رائج کیا تھا۔ وہ کئی لحاظ سے محل نظر ہے۔ جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں لہٰذا ہر مسلمان کو بذات خود اس طرف متوجہ ہونا ضروری ہے اگر اپنی برادری کے امیر یا معتبر آدمی کو زکوۃ کی تحصیل کے اختیارات دے دیئے جائیں۔ یا اہل محلہ کی باہمی کوششوں سے کوئی ایسا ادارہ بنا لیا جائے۔ جو یہ فرائض انجام دے تو انفرادیت سے یہ طریقہ کار بہتر ہے کیونکہ اسلام ہمیں ہر معاملہ میں اتفاق اور اجتماعیت ہی سکھاتا ہے۔ اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو پھر انفرادی طور پر ہی ادا کر دی جائے۔

(۲) حیلہ سازی سے اجتناب:

زکوۃ نکالتے وقت ایسی حیلہ سازیوں سے کام نہ لینا چاہیے جن سے وہ کلی یا جزوی طور پر زکوۃ سے بچ سکیں ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

---

[1] مسلم کتاب المساقات والمزارعت۔باب فضل انظار المعسر

((وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ اَبَابَكْرِ الصِّدِّيْقَ كَتَبَ لَهٗ هٰذِهِ الْفَرِيْضَةَ الصَّدَقَةَ الَّتِيْ فَرَضَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ وَالَّتِيْ اَمَرَ اللّٰهُ بِهَا وَلَا يَجْمَعُ بَيْنَ مُتَفَرِّقٍ وَلَا يُفَرَّقُ بَيْنَ مُجْتَمِعٍ۔ [1]))

(حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو یہ تحریر لکھ کر دی تھی۔ یہ زکوٰۃ وہ فریضہ ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں پر فرض کیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا زکوٰۃ کے خوف سے متفرق جانوروں کو جمع نہ کیا جائے اور مجتمع کو متفرق نہ کیا جائے۔)

یہ دونوں باتیں زکوٰۃ سے بچنے یا اس میں کمی کی حیلہ سازیاں ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ بھیڑ بکری کے ریوڑ میں زکوٰۃ ۴۰ سے کم پر کچھ نہیں۔ اور ۴۰ سے ۱۲۰ تک ایک بکری ہے۔ زید اور بکر دونوں کے پاس ریوڑ ہے۔ اور اندازاً ہر ایک کے پاس پچاس پچاس بکریاں ہیں۔ وصولی زکوٰۃ کے وقت جب عامل کی اطلاع ہو تو دونوں اپنے آپ کو (خلیط [2]) (شریک کار) ظاہر کر کے ریوڑ اکٹھا کر لیں۔ اور اس طرح نصف زکوٰۃ سے بچ جائیں۔ یہ ناجائز ہے۔

اسی طرح مثلاً زید کے پاس پچاس بکریاں ہیں۔ اور بکر کے پاس بیس اور وہ دونوں آپس میں خلیط ہیں۔ زکوٰۃ وصولی کے وقت وہ دونوں اپنا مال الگ کر لیں تو بکر زکوٰۃ سے بچ جائے گا۔ یا زید اپنی بکریوں میں سے پندرہ بکریاں بکر کی بکریوں میں شامل کرے۔ اور اس طرح دونوں زکوٰۃ سے بچ جاتے ہیں۔ ایسی ہی صورتوں سے حضور ﷺ نے منع فرمایا۔

اسی طرح حیلہ سازی کی ایک عام اور معروف شکل یہ ہے کہ وصولی زکوٰۃ کے وقت سے پہلے مرد اپنا مال بیوی کے نام ہبہ کر دیتا ہے اور زکوٰۃ کے مال پر سال گزرنے کی شرط پوری نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ سے اپنے آپ کو بچا لیتا ہے۔ یا عورت اپنا زیور مرد کے نام ہبہ کر دیتی ہے تو ایسی ہیرا پھیری خود فریبی کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ کیونکہ اس طرح عاملین زکوٰۃ کو یا اپنے نفس کو تو دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔

ذاتی استعمال میں آنے والے چیزیں خواہ وہ محل زکوٰۃ ہوں۔ خزانہ کے حکم میں نہیں آتیں۔ لہٰذا وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دی جاتی ہیں۔ بعض لوگ اس بات کا سہارا لے کر پہننے کے زیور

---

[1] بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب لایجمع بین متفرق خشیة الصدقة۔

[2] ایسے شرکاء جنہوں نے اپنے مویشی کی نگہداشت اور رہائش کا انتظام تو مشترکہ طور پر رکھا ہو مگر مال سب کا الگ الگ ہو انہیں خلیط کہا جاتا ہے ان کے اموال میں مشترکہ طور پر زکوٰۃ عاید ہوتی ہے۔

کی زکوٰۃ نکالنے کے قائل نہیں- اگرچہ وہ حد نصاب سے زائد ہو اور اس کے مقابلہ میں رسول اکرم ﷺ کے مستعمل زیور کے متعلق واضح حکم کی بھی پرواہ نہیں کرتے- تو یہ ان لوگوں کی صریح زیادتی ہے-

ارشاد نبوی ﷺ ہے-

((وَعَنْ عَمْرِو ابْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ امْرَأَةً اَتَتِ النَّبِیَّ ﷺ وَمَعَهَا ابْنَةٌ وَفِیْ يَدِهَا مَسْكَتَانِ مِنْ ذَهَبٍ فَقَالَ لَهَا- اَتُعْطِيْنَ زَكٰوةَ هٰذَا- ؟قَالَتْ "لَا" قَالَ اَيَسُرُّكِ اَنْ يُّسَوِّرَكِ اللّٰهُ بِهِمَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ سِوَارَيْنِ مِنْ نَارٍ قَالَ فَخَلَعَتْهُمَا فَاَلْقَتْهُمَا اِلَى النَّبِیِّ ﷺ وَقَالَتْ هُمَا لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ- [1]))

(حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور اور پھر اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اس کے ہمراہ اس کی بچی تھی- جس کے ہاتھ میں سونے کے کڑے تھے- حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کیا اس کی زکوٰۃ دیتی ہو؟ کہنے لگی "نہیں" آپ ﷺ نے فرمایا تو کیا یہ تمہیں اچھا معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے آگ کے کنگن پہنائے یہ سن کر اس نے انہیں اتار دیا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے ڈال دیا اور کہا کہ یہ دونوں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے ہیں-)

دوسرا ارشاد یوں ہے-

((وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ: قَالَتْ كنت ألبس اَوْضَاحًا مِنْ ذَهَبٍ فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اَكَنْزٌ هُوَ؟ فقال مابلغ ان تؤدی زكاته فزكی فَلَيْسَ بِكَنْزٍ- [2]))

(حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سونے کا بنا ہوا زیور استعمال کرتی تھیں انہوں نے آنحضور ﷺ سے پوچھا- یارسول اللہ ﷺ کیا یہ کنز ہے (دولت جمع کرنے کے حکم میں ہے) فرمایا جب تم اس کی زکوٰۃ ادا کر دو تو یہ کنز نہیں ہے-)

ایسی گریز کی راہوں اور حیلہ سازیوں سے اجتناب کرنا چاہیے شرح زکوٰۃ خدا تعالیٰ کے انعامات کے مقابلہ میں بالکل معمولی ہے- لہٰذا ہر مسلمان کو زکوٰۃ بطیب خاطر ادا کرنا چاہیے-

---

[1] ابوداؤد- کتاب الزکوٰۃ- باب الکنز ماھو و زکوٰۃ الحلی - (۱۵۶۳) نسائی کتاب الزکاۃ- باب زکوٰۃ الحلی (۲۴۷۸) بیہقی ۴/۱۴۰ یہ حدیث حسن ہے نصب الرایہ ۲/۳۷۰

[2] ابوداؤد کتاب الزکاۃ- باب الکنز ماھو (۱۵۶۴) حاکم ۱/۳۹۰ بیہقی ۴/۱۴۰ اس کی سند ضعیف ہے عطاء بن ابی رباح کا سماع ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ثابت نہیں-

(۳) بخل سے اجتناب:

بخل انسانی فطرت میں داخل ہے اگر اس نے فی الواقع کسی کا کوئی حق دینا ہو اور دینے کو تیار بھی ہو تو پھر بھی طبیعت میں کچھ بوجھ محسوس کرتا ہے (الا ماشاء اللہ) انسان کی اس فطری کمزوری کو شارع علیہ السلام نے بڑے خوبصورت انداز میں بیان فرمایا ہے اور ساتھ ہی ادائیگی زکوٰۃ کے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔ارشاد ہے۔

((سَیَاْتِیکُمْ رُکَیْبٌ مُبْغَضُوْنَ فَاِذَا جَاءُوْکُمْ فَرَحِّبُوْا بِھِمْ۔)) ((۱) تمہارے پاس (عاملین زکوٰۃ) کے چھوٹے چھوٹے قافلے آئیں گے جو تمہیں ناگوار محسوس ہوں گے جب وہ آئیں تو انہیں خوش آمدید کہو۔)

((وَخَلُّوْا بَیْنَھُمْ وَبَیْنَ مَا یَبْتَغُوْنَ فَاِنْ عَدَلُوْا فَلِاَنْفُسِھِمْ وَاِنْ ظَلَمُوْا فَعَلَیْھِمْ۔)) ((۲) اور تشخیص مال وزکوٰۃ کے معاملہ میں انہیں اپنی مرضی کرنے دو۔ اور پھر اگر وہ انصاف سے کام لیں تو انہیں اجر ملے گا۔ اور اگر زیادتی کریں تو اس کا بار ان کی گردن پر ہے۔)

((وَارْضُوْھُمْ فَاِنَّ تَمَامَ زَکٰوتِکُمْ رِضَاھُمْ وَلِیَدْعُوْا لَکُمْ۔[۱])) ((۳) تم انہیں خوش رکھو کیونکہ تمہاری زکوٰۃ کی تکمیل کا انحصار ان کی رضا پر ہے۔ پھر وصولی زکوٰۃ کے بعد عاملین کو چاہیے کہ تمہارے حق میں دعا بھی کریں۔)

چنانچہ جو لوگ خود آپ ﷺ کے پاس زکوٰۃ لے کر آتے۔آپ ﷺ ان کے حق میں یوں دعا فرماتے یا اللہ فلاں کی آل پر رحم فرما۔عبداللہ بن ابی اوفیٰ جو اس حدیث کے راوی ہیں کہتے ہیں کہ جب میرا باپ آپ ﷺ کے پاس زکوٰۃ لے کر آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔اَلّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی آلِ اَبِی اَوْفٰی۔[۲]

حدیث بالا میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے متعلق کس قدر جامع ہدایات دی گئی ہیں۔

ایک دفعہ لوگوں نے حضور اکرم ﷺ سے شکایت کی کہ آپ ﷺ کے عاملین ہم پر

---

[۱] ابوداؤد۔کتاب الزکوٰۃ۔باب رضا المتصدق۔(۱۵۸۸) بیہقی ۴/۱۱۴ اس کی سند میں صخر بن اسحاق کمزور راوی ہے اور اس کا استاد مجہول ہے لیکن اس حدیث کا صحیح شاہد ہے جو اگلی حدیث میں آ رہا ہے۔

[۲] بخاری کتاب الزکوٰۃ۔باب صلوٰۃ الامام و دعاءہ لصاحب الصدقۃ

زیادتی کرتے ہیں- آپ نے فرمایا ”انہیں راضی کرو اور جو کرتے ہیں کرنے دو-“[1]

ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ عاملین ہم پر زیادتی کرتے ہیں- تو کیا ہم اتنا مال چھپا لیا کریں کہ حساب برابر رہے- آپ نے فرمایا- ”ایسا مت کرو-“[2]

ان احکامات سے حضور اکرم ﷺ نے بہت بڑے فتنہ کا سد باب فرما دیا- ورنہ زکوٰۃ کا سارا نظام انسان کے طبعی بخل کی نذر ہو کر درہم برہم ہو جاتا- کیونکہ حضور اکرم ﷺ کے مقرر کردہ عامل (مصدق) بڑے منصف مزاج ہوتے تھے- اور انہیں تشخیص مال اور زکوٰۃ کے بارے میں پوری ہدایات اور احکام دے کر روانہ کیا جاتا تھا- اب اگر زکوٰۃ دہندہ فطری بخل کی بنا پر انصاف کو بھی زیادتی تصور کرنے لگے- تو اس میں عامل کا کیا قصور ہے؟

(۴) زکوٰۃ سال گزرنے سے پہلے بھی دی جاسکتی ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ آیا زکوٰۃ سال گزرنے سے پہلے ادا کی جاسکتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے اس کی اجازت دیدی-[3]

زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو ہدایات

(۱) مال زکوٰۃ کی تشخیص کے لیے محصلین خود اس جگہ پر پہنچیں جہاں مال زکوٰۃ موجود ہو ارشاد نبوی ﷺ ہے-

((تُوْخَذُ صَدَقَاتُ الْمُسْلِمِيْنَ عَلٰی مِيَاهِهِمْ-))[4] (مسلمانوں سے زکوٰۃ ان کے آب پاشی کے مقاموں پر ہی وصول کی جائے-)

---

[1] مسلم کتاب الزکوٰۃ- باب ارضاء السعاۃ العاصی مالم یطلب حراماً

[2] ابوداؤد- کتاب الزکوٰۃ- باب رضاء المتصدق (۱۵۸۹) صحیح مسلم کتاب الزکاۃ باب ارضاء السعاۃ ۲۹/۹۸۹

[3] ترمذی- ابواب الزکوٰۃ- باب فی تعجیل الزکوٰۃ (۶۷۸) ابوداؤد باب فی تعجیل الزکاۃ (۱۶۲۴) ابن ماجہ کتاب الزکاۃ باب تعجیل الزکاۃ قبل محلھا (۱۷۹۵) صحیح ابن خزیمہ ۴/۴۹، ۵۰ دارمی کتاب الزکاۃ باب تعجیل الزکاۃ (۱۶۴۳) دارقطنی ۲/۱۲۳ حاکم ۳/۳۳۲ بیہقی ۴/۱۱۱ شرح السنۃ (۱۵۷۷) المسند الجامع ۱۳/۲۳۲ مسند احمد ۱/۱۰۴ط- قدیم اس حدیث کو امام حاکم و امام ذھبی نے صحیح کہا ہے-

[4] ابن ماجہ کتاب الزکاۃ باب صدقۃ الغنم (۱۸۰۶) مسند طیالسی (۲۲۶۴) مسند احمد ۲/۱۸۴ط- قدیم المسند الجامع ۱۰/۲۴۲ سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ (۱۷۷۹)

یہ حدیث زرعی پیداوار سے متعلق ہے دوسری حدیث مویشی جانوروں کے متعلق ہے۔

((عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ لَا جَلَبَ وَلَا جَنَبَ وَلَا تُوْخَذُ صَدَقَاتُهُمْ اِلَّا فِیْ دُوْرِهِمْ۔[1])) (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عامل ایک جگہ بیٹھ کر علاقے کے مال اپنے پاس نہ منگوائے اور نہ صاحب مال اپنا مال دور لے جائیں۔ بلکہ جہاں کوئی رہتا ہے زکوٰۃ وہیں جا کر لی جائے۔)

موقع پر مال کی تشخیص کا فائدہ یہ بھی ہے کہ مال کی تشخیص اور زکوٰۃ کے تعین میں فریقین میں سے کسی کو شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے۔ فصل کی تشخیص کھیتوں میں' مویشی کی چراگاہوں میں دکانوں کی دکانوں پر اور فیکٹریوں کی فیکٹری پر ہونی چاہیے۔

(۲) مال کی زکوٰۃ اسی مال سے لی جائے۔ ارشاد نبویؐ ہے۔

((خُذِ الْحَبَّ مِنَ الْحَبِّ وَالشَّاةَ مِنَ الْغَنَمِ وَالْبَعِيْرَ مِنَ الْاِبِلِ وَالْبَقَرَةَ مِنَ الْبَقَرَةِ۔[2])) (غلہ سے غلہ' بکریوں سے بکری' اونٹوں سے اونٹ اور گایوں سے گائے (بطور زکوٰۃ وصول کرو۔))

اس ارشاد میں زکوٰۃ دینے والے کی سہولت کو زیادہ مدنظر رکھا گیا ہے۔ تاہم وصول کنندہ کے لیے بھی اس میں سہولت ہے۔ اگر صاحبِ مال نقدی کی صورت میں زکوٰۃ ادا کرنا چاہے تو اسے اختیار ہے۔ مگر قیمت کے تعین میں دل کی فراخی کا ثبوت دینا چاہیے۔ اور رجحان کم قیمت لگانے کی طرف نہ ہو۔

(۳) زکوٰۃ میں عمدہ عمدہ مال لینے سے پرہیز کی جائے:

رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو زکوٰۃ کی وصولی کے متعلق جو ہدایات دیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اِیَّاكَ وَكَرَائِمَ اَمْوَالِ النَّاسِ[3]

---

[1] ابوداؤد۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب أین تصدق الاموال (۱۵۹۱) نسائی کتاب الخیل باب الجنب (۳۵۹۱) مسند احمد ۲/۲۱۶ ط۔ قدیم اس کی سند حسن ہے۔

[2] ابوداؤد۔ باب صدقة الزرع (۱۵۹۹) ابن ماجہ کتاب الزکاۃ باب ما تجب فیه الزکاة من الاحوال (۱۸۱۴) المسند الجامع ۵/۲۲۹ حاکم ۱/۳۸۸ یہ روایت مرسل ہے عطاء بن یسار کی معاذ بن جبلؓ سے ملاقات ثابت نہیں بلکہ عطاء معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد پیدا ہوئے جیسا کہ عون المعبود وغیرہ میں ہے۔

[3] بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب محاسبة المصدقین

لوگوں کے عمدہ عمدہ مال لینے سے پرہیز کرنا- مثلاً اگر کتابوں کی دکان سے زکوٰۃ وصول کرنا ہو تو زکوٰۃ میں کتابیں ہی لی جائیں اور یہ نہ کیا جائے کہ کسی بہترین مصنف کی کتب منتخب کر لی جائیں- جن کی مارکیٹ میں مانگ زیادہ ہو- بلکہ زکوٰۃ میں ملا جلا مال لینا چاہیے- اگر بکریوں کی زکوٰۃ لینا ہے اور زکوٰۃ میں چار بکریاں آتی ہیں- تو اچھی اور عمدہ قسم کی بکریاں منتخب کر لی جائیں- یہ بات زکوٰۃ ادا کرنے والے پر زیادتی ہوگی-

(۴) عامل پیداوار زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں:

ارشاد نبوی ﷺ ہے-

((لَيْسَ فِي الْإِبِلِ الْعَوَامِلِ صَدَقَةٌ-[1])) (پیداوار کا ذریعہ بننے والے اونٹوں پر زکوٰۃ نہیں-)

اس ارشاد میں اگرچہ اونٹ کا نام آیا ہے تاہم یہ ایک عام اصول ہے- مثلاً دکان کا بار دانہ یا فرنیچر زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوں گے- اسی طرح فیکٹریوں میں نصب شدہ مشینیں جو پیداوار کا ذریعہ بنتی ہیں خود بکاؤ مال نہیں ہوتیں وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوں گی-

(۵) پھلوں کا اندازہ:

سہل بن ابی حثمہ کہتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

((اِذَا خَرَصْتُمْ فَخُذُوْا وَدَعُوا الثُّلُثَ فَاِنْ لَمْ تَدَعُوْا اَوْ تَجِدُوْا الثُّلُثَ فَدَعُوْا الرُّبُعَ-[2])) (جب تم زکوٰۃ کے لیے پھلوں کا اندازہ کرو اور فیصلہ کرنے لگو تو ایک تہائی چھوڑ دو- اور اگر سمجھو کہ تہائی زیادہ ہے تو چوتھا حصہ چھوڑ دو-)

یہ ہدایت ایسی کھجوروں اور پھلوں کے بارے میں ہے- جو ابھی درختوں پر ہوتے تھے آپ ﷺ یہ ہدایت اس لیے دیا کرتے تھے کہ کہیں زکوٰۃ دینے والے پر زیادتی نہ ہو- جیسا کہ عاملین کو یہ ہدایت تھی کہ زکوٰۃ میں عمدہ مال نہ لیا کریں-

---

[1] ابوداوٗد- کتاب الزکوٰۃ- باب فی زکوٰۃ السائمۃ (۱۵۷۲) بیہقی ۴/۹۳' ۱۹۴ ابن خزیمہ (۲۲۶۲) (۲۲۹۷) اس حدیث کو ابن القطان' ابن خزیمہ اور نووی وغیرہم نے صحیح کہا ہے-

[2] ابوداوٗد- کتاب الزکوٰۃ- باب فی الخرص (۱۶۰۵) ترمذی کتاب الزکاۃ باب ماجاء فی الخرص (۶۴۳) نسائی کتاب الزکاۃ باب کم یترك الخارص (۲۴۹۰) بیہقی ۴/۱۲۳ ابن خزیمہ (۲۳۱۹) ابن حبان (۷۹۸) حاکم ۱/۴۰۲ اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن مسعود جمہور ائمہ کے نزدیک ثقہ ہے جسکی وجہ سے یہ حدیث حسن ہے-

اور آج کل جبکہ عاملین ہمارے پاس نہیں آتے یا جہاں کہیں اسلامی نظام نہیں ہے اور ہمیں خود اموال کی تشخیص کا اندازہ کرنا پڑتا ہے تو ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم اندازہ سے کچھ زائد شمار کریں۔ بالخصوص جہاں نقصان کا احتمال بھی نہ ہو جیسا کہ پھلوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ کا حق ہم پر باقی نہ رہ جائے۔

عامل زکوٰۃ وصول کرنے پر زکوٰۃ ادا کرنے والے کا شکریہ ادا کرے اور اسے دعا دے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

احتساب

(۱) محصلین سے پورا حساب لینا چاہیے:

رسول اللہ ﷺ نے بنی سلیم کی زکوٰۃ کی وصولی کے لیے اسد قبیلے کے ایک شخص کو مقرر کیا۔ جس کو عبداللہ ابن الاتیہ کہتے تھے۔ جب وہ آیا تو آپ نے اس سے حساب لیا۔[1]

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ محصل اپنے ہی قبیلہ یا علاقہ کا آدمی نہ ہونا چاہیے تاکہ لحاظ ملاحظہ کا رجحان ختم ہو۔ اور دوسرے یہ کہ محصل سے بھی ہر چیز کا پورا حساب لینا چاہیے۔

(۲) وصول شدہ صدقات کی نگرانی:

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ ایک دفعہ میں آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ کے ہاتھ میں داغ دینے والا آلہ تھا۔ جس سے آپ صدقہ کے اونٹوں کو داغ رہے تھے۔[2]

آپ یہ داغ اس لیے دے رہے تھے کہ وہ دوسرے اونٹوں سے بالکل الگ رہیں اور پہچانے جاسکیں۔ اور انہیں مصارف میں استعمال ہوں جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیئے ہیں۔

(۳) زکوٰۃ اور تحائف:

ایک دفعہ ایک صاحب مال نے عامل کو زکوٰۃ کے علاوہ کچھ ہدیہ بھی دیا۔ عاملین بڑے راست باز لوگ ہوتے تھے۔ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر بالکل سچ سچ بتا

---

[1] بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب محاسبة المتصدقین

[2] بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب رسم الامام اهل الصدقة بیده.

دیا- کہ یہ مال زکوٰۃ کا ہے- اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے تو حضور اکرم ﷺ طیش میں آ گئے اور منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا- کہ کچھ لوگوں کو میں عامل بنا کر بھیجتا ہوں (آپ ﷺ نے اس عامل کا نام ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا) اور وہ آ کر یوں اور یوں کہتے ہیں- بھلا اگر وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں بیٹھے رہتے- تو ان کو ایسے ہدیے مل سکتے تھے- اس پروردگار کی قسم! جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ جو کوئی تم سے زکوٰۃ کے مال میں کچھ چرائے گا تو قیامت کے دن اس کو اپنی گردن پر لادے ہوئے آئے گا-[1]

ظاہر ہے کہ ہدیہ دینے سے صاحب مال کا مقصد تشخیص مال یا زکوٰۃ میں نرمی کا برتاؤ تھا- گویا اس ہدیہ سے رشوت کا کام لینا مقصود تھا- جس سے بیت المال کی حق تلفی ہوتی تھی- اسی لیے اس بات پر آپ ﷺ کو اس قدر طیش آ گیا-

(۴) زکوٰۃ کا اصل الاصول یہ ہے کہ زکوٰۃ جس مقام پر اغنیاء سے وصول کی جائے وہیں کے فقراء میں تقسیم کی جائے- لہٰذا عامل کو یہ اختیار ہوتا تھا کہ وہ دور دراز کے علاقہ میں زکوٰۃ کی وصولی کے لیے گیا ہے اور وہاں فقراء و مساکین موجود ہیں تو وصول شدہ زکوٰۃ کا کچھ حصہ' یا اگر ضروری سمجھے تو ساری زکوٰۃ وہیں تقسیم کر دے- تاہم اس کا حساب کتاب رکھنا ضروری ہے- چنانچہ حضرت ابراہیم بن عطاء جو حضرت عمران کے آزاد کردہ غلام تھے- اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمران بن الحصین کو زکوٰۃ کی وصولی پر روانہ کیا گیا- جب وہ خالی ہاتھ واپس آئے تو ان سے کہا گیا کہ زکوٰۃ کا مال کہاں ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا مجھے مال کی وصولی اور تقسیم کے واسطے روانہ کیا گیا- میں نے جن لوگوں سے لینا چاہیے تھا لیا اور جہاں دینا چاہیے تھا دے دیا-[2]

(۵) جس طرح زکوٰۃ دینے والے کو یہ ہدایت تھی کہ وہ عاملین کو خوش کر کے بھیجیں کیونکہ ان کی رضا میں ہی اللہ کی رضا ہے- اسی طرح عاملین کو یہ ہدایت تھی کہ زکوٰۃ دینے والوں پر کسی طرح کی زیادتی نہ کریں ورنہ وہ ایسے ہی مجرم ہیں- جیسے زکوٰۃ نہ دینے والے- رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد مبارک کے اصل الفاظ یہ ہیں-

((اَلْمُعْتَدِیْ فِی الصَّدَقَةِ كَمَانِعِهَا-[3])) (زکوٰۃ میں زیادتی کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے زکوٰۃ نہ دینے والا-)

---

[1] بخاری- کتاب الایمان- باب کیف کان یمین النبیؐ- مسلم- کتاب الایمان

[2] ابن ماجہ زکاۃ باب ماجاء فی عمال الصدقة (۱۸۱۱) ابوداود (۱۶۲۵) المسند الجامع ۱۴/۲۲۳ اس حدیث کی سند حسن ہے-

[3] ترمذی- ابواب الزکوٰۃ- باب فی المعتدی فی الصدقة (۶۴۶) ابوداود کتاب الزکاۃ- باب فی

مصارفِ زکوٰۃ وصدقات

زکوٰۃ کے مصارف اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کریم میں بتا دیئے ہیں ارشاد باری ہے۔

﴿اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۹:۶۰)

(صدقات تو فقراء' مساکین اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور تالیف قلوب کے لیے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور مقروضوں کا قرض اتارنے میں اور اللہ کی راہ میں مسافروں پر خرچ کرنا چاہیے یہ تقسیم اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔)

آیت مندرجہ بالا کہ آخر میں فریضۃ کا لفظ صدقات کو فرضی صدقات یا زکوٰۃ سے مختص کر دیتا ہے۔ آیت میں مذکور آٹھ مدات کے بارے میں درج ذیل امور قابل ذکر ہیں۔

(۱) ان آٹھ مدات میں سے تین کا تعلق براہ راست غریب طبقہ سے ہے۔ فقراء مساکین اور مقروض۔ ایک مد غلام کو آزاد کرانا موجودہ دور میں ختم ہو چکی ہے۔ تالیف قلوب کی مد کبھی ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے دور فاروقی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود فرمایا تھا۔ کہ اب کسی کا مسلمان ہونا تو باعث عزت وافتخار ہے۔ لہٰذا اب اس مد پر خرچ کرنے کی ضرورت نہیں رہی اور کبھی بحال ہو جاتی ہے۔ مسافر امیر ہو یا غریب' بوقت ضرورت اس پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ فی سبیل اللہ کی مد بہت وسیع ہے۔ جس میں جہاد بھی شامل ہے۔ دینی مدارس بھی اور غریب طبقہ بھی۔ نیز بعض ایسے رفاہ عامہ کے کام بھی ہیں جن کا تعلق غرباء سے ہو اور عاملین کا حصہ تو کچھ نہ کچھ ہر دور میں نکالنا ہی پڑتا ہے۔ خواہ وہ امیر ہوں یا غریب۔

(۲) مندرجہ بالا تصریحات کی رو سے یہ ضروری نہیں کہ صدقات یا ان کی رقم آٹھ حصوں میں یا برابر برابر حصوں میں تقسیم کی جائے۔ بلکہ جتنے حصوں کا میدان ہے انہیں میں یہ رقم خرچ کی جانی چاہیے اور ان مدات میں حسب ضرورت خرچ کرنی چاہیے۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) زکاۃ السائمۃ (۱۵۸۵) ابن ماجہ کتاب الزکاۃ باب ماجاء فی عمالۃ الصدقۃ (۱۸۰۸) ابن خزیمہ ۴/۵۱ (۲۳۳۵) الجامع ۱/۴۳۰ اس کی سند میں سعد بن سنان الکندی مختلف فیہ ہے لیکن اس حدیث کا ایک شاہد طبرانی کبیر ۲/۳۰۶ میں موجود ہے جد کے رجال ثقہ ہیں جیسا کہ علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد ۳/۸۳ میں کہا ہے اس کے اور بھی شواہد ہیں جن کی بنیاد پر یہ حدیث حسن ہے۔

(۳) فقراء ومساکین کی تعریف کے بارے اکثر مفسرین کا اختلاف رہا ہے۔ اس بارے میں فیصلہ کن بات یہ ہے کہ جب خود رسول اللہ ﷺ نے اس فرق کو واضح کر دیا تو دوسروں کے اختلافی اقوال کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''مسکین وہ نہیں جو لوگوں کے پاس گھومتا پھرتا ہے۔ ایک لقمہ یا دو لقمہ یا ایک کھجور اور دو کھجور کی طلب اس کو در در پھراتی ہے۔ بلکہ مسکین وہ ہے جس کو اتنی دولت نہیں ملتی کہ وہ بے نیاز ہو جائے اور نہ کوئی اس کا حال جانتا ہو کہ اس کو خیرات دے۔ اور نہ ہی وہ اٹھ کر سوال کرتا ہے۔''[1]

گویا مسکین وہ ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ ''ناواقف لوگ اسے صرف اس لیے غنی سمجھتے ہیں کہ وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔''[2] اور دوسرے مقام پر اسے ''محروم'' کہا گیا ہے محروم کا بھی یہی مطلب ہے۔

(۴) عامل زکوٰۃ کا ہو یا کسی بھی دوسرے دینی کام کا۔ اگر اسے اس کام کی اجرت بن مانگے ملتی ہے تو اسے لے لینی چاہیے۔ خواہ وہ محتاج نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کسی علاقے کا زکوٰۃ کا محصل بنایا۔ تو اس محنت کے صلہ کے طور پر آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کچھ رقم دینا چاہی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے یا رسول اللہ! میں نے یہ کام اس خیال سے نہیں کیا تھا۔ علاوہ ازیں میں محتاج بھی نہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ یہ رقم کسی ضرورت مند کو دے دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''جب تمہیں بن مانگے دنیا کا مال ملتا ہو جس کی تم نے آس بھی نہ لگا رکھی ہو۔ تو اسے لے لو۔ اور نہ ملے تو اس کی پرواہ نہ کرو۔[3] '' اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ تم لے لو اور پھر خود چاہو تو ضرورت مند کو دے دو۔ اور چاہو تو اسے کھاؤ۔[4]

اور اگر عامل بذات خود اس کام یا ادارے کا سربراہ ہو۔ تو وہ معروف کے مطابق اس فنڈ سے لے سکتا ہے۔ معروف کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ اس کی اوسط درجہ کی گزران کتنی رقم سے ہو سکتی ہے اور دوسرا یہ کہ اگر وہ اس کے بجائے اور کام کرتا ہے۔ جس کا وہ اہل ہے تو اسے کیا کچھ مل سکتا تھا۔ بہر حال یہ معاملہ تقویٰ سے تعلق رکھتا ہے۔ تقویٰ کا تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ قرآن کے اس ارشاد ﴿وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ﴾ پر عمل پیرا ہو۔ یعنی اگر وہ محتاج نہیں تو کچھ نہ لے۔ اور یہی بات زیادہ بہتر ہے۔

---

[1] بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ۔ [2] سورہ بقرہ:۲:۳
[3] بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب من اعطاه الله شيئامن غير مسئلة
[4] نسائی۔ کتاب الزکوٰۃ۔ من اتاه الله مالاًمن غير مسالة (۲۶۰۳)

مستحقین زکوٰۃ وصدقات

(۱) زکوٰۃ اغنیاء سے وصول کر کے فقراء کو دی جاتی ہے- اس لحاظ سے معاشرہ دو طبقوں میں بٹ جاتا ایک وہ جو زکوٰۃ دینے والے ہوں اور دوسرے وہ جو لینے والے ہوں- لہٰذا جو شخص بھی زکوٰۃ دیتا ہے وہ لے نہیں سکتا- اور جس کسی کے پاس محل زکوٰۃ اشیاء میں سے کوئی چیز بھی حد نصاب کو نہ پہنچتی ہو وہ فقیر اور مستحق صدقات وزکوٰۃ ہے-

ان دونوں طبقوں کے درمیان ایک تیسرا طبقہ بھی موجود ہوتا ہے- جس پر نہ زکوٰۃ لاگو ہوتی ہے نہ ہی وہ فقراء کی تعریف میں آتا ہے- ایسے لوگوں پر اگرچہ زکوٰۃ فرض نہیں- تاہم دوسرے نفلی قسم کے صدقات دیتے رہنا ضروری ہے- بلکہ ایسے صدقات تو ان لوگوں کے لیے بھی ضروری ہیں جو زکوٰۃ لینے والے اور تنگدست ہوں- انہیں بھی بخل اور حرص جیسے اخلاق رذیلہ سے پاکیزگی کی ضرورت ہوتی ہے- اسی لیے آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ "عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ صَدَقَةٌ-[۱]" یعنی ہر مسلمان کو صدقہ دینا ضروری ہے لوگوں نے کہا- یا رسول اللہ ﷺ! جس کے پاس مال نہ ہو- آپ ﷺ نے فرمایا وہ اپنے ہاتھ سے محنت کرے- خود بھی فائدہ اٹھائے اور خیرات بھی کرے لوگوں نے کہا- اگر یہ بھی نہ ہو سکے- آپ ﷺ نے فرمایا تو اچھی بات پر عمل کرے اور بری سے پرہیز کرے- اس کے لیے یہ صدقہ ہے-[۲] نیز آپ نے فرمایا اتقوا النار ولو بشق تمرة- آگ سے بچو خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے سے ہی ہو-[۳]

(۲) کوئی شخص اپنی بیوی یا اپنی اولاد کو خواہ وہ اس کے زیر کفالت ہوں یا شادی شدہ ہوں اور الگ- کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا البتہ انہیں صدقہ دیا جا سکتا ہے- اور اس کا دوہرا ثواب ہوگا ایک صدقہ کا دوسرے قرابت کا-

(۳) اسی طرح اگر خاوند تنگدست ہے تو بیوی خاوند کو زکوٰۃ وصدقات دے سکتی ہے- کیونکہ وہ خاوند کی کفیل نہیں ہوتی- اور ایسے صدقہ کا اسے دوہرا اجر ملے گا- چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے جب رسول اللہ ﷺ سے اپنے خاوند کو زکوٰۃ دینے کا مسئلہ پوچھا تو آپ نے اسے یہی جواب دیا تھا-[۴]

---

۱ تا ۲ بخاری- کتاب الزکوٰۃ- باب علی کل مسلم صدقة ۳ ایضاً- عنوان

۴ بخاری- کتاب الزکوٰۃ- باب الزکوٰۃ علی الاقارب

اور نفلی صدقات میں تو بہرحال اقارب کو ترجیح دینا ضروری ہے۔ حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ نازل ہوئی۔ تو میں نے ارادہ کیا میرے نزدیک بیرحا والا باغ ہی میری سب سے قیمتی اور پسندیدہ جائیداد ہے۔ میں اسے صدقہ کر دوں۔ چنانچہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے اپنے قرابتداروں میں بانٹ دو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔[1]

ام المومنین سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میری ایک لونڈی تھی۔ جسے میں نے آزاد کر دیا۔ جب رسول اللہ ﷺ گھر تشریف لائے تو میں نے انہیں بتایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تجھے اس کا اجر عطا فرمائے البتہ اگر لونڈی اپنے ماموں کو دے دیتی تو تجھے بہت زیادہ اجر ملتا۔[2]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے صدقہ کا حکم دیا۔ تو ایک شخص کہنے لگا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے پاس ایک دینار ہے۔ کس پر صدقہ کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا! اپنی ذات پر۔ وہ کہنے لگا! میرے پاس ایک اور ہو تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا اپنی اولاد پر خرچ کر۔ وہ کہنے لگا۔ اور اگر ایک اور ہو تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا اپنی بیوی پر خرچ کر۔ وہ کہنے لگا! اگر ایک اور ہو تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا اپنے خادم پر خرچ کر۔ وہ کہنے لگا! اگر ایک اور ہو تو؟ اب آگے جو تو خود بہتر سمجھے۔[3]

(۴) والدین کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ ان کی کفالت اولاد پر فرض ہے۔ چنانچہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ کہ میں صاحب مال ہوں اور میرا والد محتاج ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔

((اَنْتَ وَمَالُكَ لِوَالِدِكَ اِنَّ اَوْلَادَكُمْ مِنْ اَطْيَبِ كَسْبِكُمْ كُلُوْا مِنْ كَسْبِ	(تو اور تیرا مال سب کچھ تمہارے باپ کا ہے تمہاری اولاد تمہارا پاکیزہ مال ہے۔ اپنی

---

[1] ابوداؤد' کتاب الزکوۃ۔ باب فی صلة الرحم (۱۶۸۹) صحیح البخاری کتاب التفسیر باب لن تنالوا البر (۴۵۵۵)

[2] ابوداؤد' کتاب الزکوۃ۔ باب فی صلة الرحم (۱۶۹۰) یہ حدیث بخاری ومسلم میں اس معنی میں موجود ہے۔

[3] ابوداؤد' کتاب الزکوۃ۔ باب فی صلة الرحم (۱۶۹۱) نسائی کتاب الزکاۃ باب تفسیر ذلك (۲۵۳۴) شعب الایمان بیہقی (۳۴۲۱) ابن حبان (۸۲۸) حاکم ۱/ ۴۱۵ اسے امام حاکم نے مسلم کی شرط پر صحیح کہا اور امام ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے محمد بن عجلان کی تصریح بالسماع مسند احمد ۲/ ۲۵۱، ۴۷۱ ط۔ قدیم میں موجود ہے اور اس حدیث کے شواہد بھی ہیں دیکھیں الادب المفرد (۴۵۰) وغیرہ

اَوْلَادِکُمْ۔[1])) اولاد کی کمائی سے کھاؤ۔)

(۵) البتہ جو یتیم کسی کی کفالت میں ہوں انہیں وہ زکوٰۃ دے سکتا ہے۔ یہی صورت بیواؤں کی ہے۔

(۶) قرآن کریم میں ایک مد غارمین ہیں۔ غارمین سے مراد ایک تو وہ شخص ہیں جو قرض میں ڈوبے ہوئے ہوں اور اتارنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ دوسرے وہ لوگ جو کسی کی ضمانت دیں۔ اور وہ ضمانت ان پر پڑ جائے۔

(۷) غیر مسلم کو' صاحب نصاب آدمی کو' تندرست اور کمانے کے قابل آدمی کو اور بنوہاشم (سادات) کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔

سوالی اور گداگر

اسلامی نقطہ نظر سے سوال کرنا بہت مذموم چیز ہے۔ سوال کرنے سے متعلق درج ذیل ارشادات نبوی ﷺ نہایت واضح ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا

((۱) مَنْ یَسْتَعِفَّ یُعِفَّهُ اللّٰهُ وَمَنْ یَّسْتَغْنِ یُغْنِهِ اللّٰهُ وَمَنْ یَتَصَبَّرْ یُصَبِّرْهُ اللّٰهُ وَمَا اُعْطِیَ اَحَدٌ عَطَاءً خَیْرٌ وَّ اَوْسَعُ مِنَ الصَّبْرِ۔[2]))

(جو شخص سوال سے بچے اللہ اسے سوال سے بچائے گا اور جو دنیا کے مال سے بے پروائی کرے گا اللہ اسے بے پرواہ کردے گا اور جو اپنے اوپر زور دے کر صبر کرے اللہ اسے صبر دے گا۔ اور کسی کو کوئی نعمت صبر سے بہتر اور کشادہ تر نہیں ملی (یعنی سب سے بہتر اور کشادہ تر نعمت صبر ہے۔))

اور ایک دفعہ قسم اٹھا کر فرمایا۔

((۲) وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَاَنْ یَّاْخُذَ اَحَدُکُمْ حَبْلَهٗ فَیَحْتَطِبَ عَلٰی ظَهْرِهٖ خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ یَّاْتِیَ رَجُلًا فَیَسْئَلَهٗ اَعْطَاهُ اَوْ

(اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اگر کوئی اپنی رسی اٹھائے اور لکڑی کا گٹھا اپنی پیٹھ پر لاد کر لائے (اور اس طرح

[1] ابوداؤد کتاب البیوع۔ باب فی الرجل یاکل من مال ولدہ (۳۵۳۰) ابن ماجہ کتاب التجارات۔ باب ماللرجل من مال ولدہ (۲۲۹۲) المنتقی لابن الجارود (۹۹۵) تاریخ بغداد ۱۲/۹۴/ مسند احمد ۲/۱۷۹' ۲۰۴' ۲۱۴ط۔ قدیم۔ المسند الجامع ۱۱/۱۲۲ اس کی سند جید ہے۔

[2] بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب الاستعفاف من المسئلة

یَمْنَعَهُ۔[1])) روزی کمائے) تو یہ بات اس سے بہتر ہے کہ وہ جا کر کسی سے سوال کرے اور وہ اسے کچھ دے یا نہ دے۔)

(۳) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

((مَایَزَالُ الرَّجُلُ یَسْاَلُ النَّاسَ حَتّٰی یَاْتِیَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ لَیْسَ فِیْ وَجْهِهٖ مُضْغَةُ لَحْمٍ۔[2])) (آدمی لوگوں سے ہمیشہ سوال کرتا رہتا ہے (یعنی عادی) یہاں تک کہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کے منہ پر بوٹی نہ ہوگی۔)

(۴) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ آپ ﷺ منبر پر خطبہ دیتے ہوئے لوگوں کو صدقہ اور سوال سے بچنے کا ذکر کر رہے تھے اور فرمایا۔

((اَلْیَدُ الْعُلْیا خَیْرٌ مِنْ یَدِالسُّفْلٰی وَالْیَدُ الْعُلْیَاھِیَ الْمُنْفِقَةَ وَالْیَدِ السُّفْلٰی ھِیَ السَّائِلَةَ۔[3])) (اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اوپر والے ہاتھ سے مراد خرچ کرنے والا ہے اور نچلا ہاتھ مانگنے والا ہے۔)

(۵) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک انصاری نے آپ ﷺ کے پاس آکر سوال کیا۔ آپ نے اسے پوچھا "تمہارے گھر میں کوئی چیز ہے؟" وہ کہنے لگا۔ ہاں! "ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ۔" آپ ﷺ نے فرمایا! "یہ دونوں چیزیں میرے پاس لے آؤ۔" وہ لے آیا تو آپ ﷺ نے ان کو ہاتھ میں لے کر فرمایا۔ "کون ان دونوں چیزوں کو خریدتا ہے؟" ایک آدمی نے کہا! "میں ایک درہم میں گاہک ہوں۔" آپ ﷺ نے فرمایا! "ایک درہم سے زیادہ کون دیتا ہے؟" اور آپ ﷺ نے یہ بات دو تین بار دہرائی تو ایک آدمی کہنے لگا! میں انہیں دو درہم میں خریدتا ہوں۔" آپ ﷺ نے دو درہم لے کر وہ چیزیں اس آدمی کو دے دیں۔

اب آپ ﷺ نے اس انصاری کو ایک درہم دے کر فرمایا۔ "اس کا تو گھر والوں کے لیے کھانا خرید لو۔ اور دوسرے درہم کا تیشہ خرید کر میرے پاس لاؤ۔ جب وہ تیشہ لے آیا تو آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اس میں لکڑی ٹھونک دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ جاؤ اور جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر یہاں لا کر بیچا کرو اور آج سے پندرہ دن بعد میرے پاس آنا۔

---

[1] بخاری۔ کتاب الزکوۃ۔ باب الاستعفاف من المسئلة

[2] مسلم۔ کتاب الزکوۃ۔ باب النھی عن المسئلة

[3] ابوداؤد۔ کتاب الزکوۃ۔ باب فی الاستعفاف (۱۶۴۸) بخاری کتاب الزکوۃ (۱۴۲۹) مسلم ۹۴/۱۰۳۳

پندرہ دن میں اس شخص نے دس درہم کمائے چند درہموں کا کپڑا خریدا اور چند کا کھانا- اور آسودہ حال ہو کر پندرہ دن بعد آپ ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا- یہ تیرے لیے اس چیز سے بہتر ہے کہ قیامت کے دن سوال کرنے کی وجہ سے تیرے چہرے پر برا نشان ہو-[1]

اب دیکھئے جس شخص کے گھر کا کل اثاثہ ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہو- وہ ایسا محتاج ہوتا ہے جسے سوال کرنا جائز ہے- لیکن چونکہ وہ قوی تھا- لہٰذا آپ ﷺ نے اسے کچھ دینے کے بجائے دوسری راہ تجویز فرمائی ایک تو اس سے یہ خیر خواہی فرمائی کہ مسجد نبوی میں خود بولی کے ذریعے اس کی اشیاء کی زیادہ سے زیادہ قیمت دلوائی- پھر اسے عزت نفس کا سبق دے کر کسبِ حلال اور محنت کی عظمت واہمیت بتائی- جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چند دنوں میں خوشحال ہو گیا- یہ تھا آپ ﷺ کا انداز تربیت-

(۶) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا- "کون ہے جو مجھے یہ ضمانت دے کہ کبھی کسی سے کوئی سوال نہ کرے گا- تو میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں- ثوبان کہتے ہیں کہ میں نے کہا! اس بات کی میں ضمانت دیتا ہوں-" چنانچہ اس کے بعد انہوں نے کبھی کسی سے سوال نہ کیا-[2]

(۷) عرفہ کے دن ایک شخص لوگوں سے سوال کر رہا تھا- حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سنا تو اس سے کہنے لگے- آج کے دن اور اس جگہ تو اللہ کے سوا دوسروں سے مانگتا پھرتا ہے- پھر اسے درے سے پیٹا-[3]

کس کو سوال کرنا جائز ہے اور کس کو نہیں؟

(۱) حجۃ الوداع کے موقعہ پر رسول اللہ ﷺ لوگوں میں صدقہ کا مال تقسیم فرما رہے تھے- دو آدمی آپ ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ سے صدقہ کا سوال کیا وہ دونوں خود راوی ہیں کہ

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکاۃ- باب ما تجوز فیہ المسئلۃ (۱۶۴۱) ترمذی ابواب البیوع باب ماجاء فی بیع من یزید (۱۲۱۸) نسائی کتاب البیوع باب البیع فیمن یزید المزایدہ (۲۱۹۸) یہ حدیث صحیح ہے-

[2] نسائی- کتاب الزکوٰۃ- باب من لا یسئل الناس شیئًا- (۲۵۸۹) ابن ماجہ کتاب الزکاۃ باب کراھیتہ المسئالۃ (۱۸۳۷) مسند احمد ۵/ ۲۷۷، ۲۷۹، ۲۸۱ط- قدیم تھذیب الکمال ۱۸/ ۱۶ المسند الجامع ۴/ ۳۲۶ اس کی سند صحیح ہے- ثوبانؓ سواری پر ہوتے اور ان کا کوڑا گر جاتا تو کسی سے نہیں کہتے تھے کہ مجھے یہ کوڑا پکڑاؤ وہ خود سواری سے اتر کر اسے پکڑتے تھے-

[3] مشکوٰۃ کتاب الزکاۃ باب من لا تحل لہ المسئلۃ - فصل ثالث- (۱۸۵۵) اس اثر کی سند مجھے نہیں ملی-

آپ ﷺ نے ہمیں نظر اٹھا کر دیکھا پھر نگاہ نیچی کر لی۔ ہمیں آپ ﷺ نے قوی اور طاقتور دیکھ کر فرمایا۔

((اِنْ شِئْتُمَا اَعْطَيْتُكُمَا وَلَا حَظَّ فِيهَا لِغَنِيٍّ وَلَا قَوِيٍّ مُكْتَسِبٍ۔[1])) (اگر تم چاہتے ہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں۔ لیکن صدقہ میں مال دار اور قوی آدمی کا کوئی حصہ نہیں۔ جو کما سکتا ہو۔)

غنی کون؟

مندرجہ بالا حدیث میں غنی کو مانگنے سے منع کیا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر غنی کون ہو سکتا ہو اور غنا کی حد کیا ہے؟ اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا تو اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا۔

((خَمْسُوْنَ دِرْهَمًا اَوْ حِسَابُهَا مِنَ الذَّهَبِ۔[2])) (پچاس درہم یا اس کے برابر مالیت کا سونا یا نقدی))

اب دیکھئے زکوٰۃ کا نصاب ۲۰۰ درہم یا ساڑھے باون تولے چاندی ہے۔ گویا جس شخص کے پاس ۱۳ تولے چاندی یا اس کی قیمت کے برابر سونا یا نقدی وغیرہ ہو۔ وہ غنی ہے ایسے شخص کو نہ زکوٰۃ لینا درست ہے اور نہ ہی سوال کرنا جائز ہے۔

اور ابوداؤد کی روایت میں یہ حد اور بھی کم ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جس نے مانگا اور اس کے پاس ایک اوقیہ چاندی کے برابر کوئی چیز ہو تو اس نے لپٹ کر مانگا میں نے (دل میں) کہا۔ میری اونٹنی یاقوتہ ایک اوقیہ چاندی سے بہتر ہے اور ہشام (ایک راوی) نے کہا۔ کہ چالیس درہم سے بہتر ہے۔ لہٰذا میں واپس چلا آیا اور آپ ﷺ سے کچھ سوال نہ کیا۔ ہشام نے اپنی حدیث میں کہا کہ عہد نبویؐ میں اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا تھا۔[3]

---

[1] نسائی کتاب الزکوٰۃ باب مسئلہ القوی المکتسب۔(۲۵۹۷) ابوداؤد کتاب الزکاۃ باب من یعطی من الصدقۃ و حد الغنی (۱۶۳۳) بیہقی ۷/۱۴ یہ حدیث صحیح ہے۔

[2] نسائی۔ کتاب الزکوٰۃ۔ حد الغنی (۲۵۹۱) ابوداؤد کتاب الزکاۃ۔ باب من یعطی من الصدقۃ و حد الغنی (۱۶۲۶) ترمذی کتاب الزکاۃ۔ باب ماجاء من تحل لہ الزکاۃ (۶۵۰، ۶۵۱) ابن ماجہ کتاب الزکاۃ۔ باب من سئال عن ظہر غنی (۱۸۴۰) مسند احمد ۱/۳۸۸، ۴۴۱ط۔ قدیم دارمی (۱۶۴۷، ۱۶۴۸) المسند الجامع ۱۱/۵۸۶، ۵۸۷ اس کی سند میں حکیم بن جبیر ضعیف راوی ہے۔

[3] ابوداؤد۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب من یعطی الصدقۃ و حد الغنی۔(۱۶۲۸) نسائی کتاب الزکاۃ باب الملحف (۲۰۹۴) ابن حبان (۸۴۶) ابن خزیمہ (۲۴۴۷) اس کی سند حسن ہے۔

اس حدیث کے مطابق حد غنیٰ ۱۴ تولے کے بجائے ساڑھے دس تولے چاندی بنتی ہے یعنی جس کے پاس نقدی یا کوئی اور چیز ساڑھے دس تولے چاندی کی قیمت کے برابر ہو- وہ غنی ہے اور اسے سوال کرنا جائز نہیں-

(۲) ایک دفعہ آپ ﷺ صدقہ تقسیم فرما رہے تھے- ایک شخص نے آپ کے پاس آ کر کہا کہ مجھے بھی صدقہ سے کچھ دیجئے- آپ ﷺ نے اسے یہ جواب دیا کہ-

((اِنَّ اللّٰہَ لَمْ یَرْضَ بِحُکْمِ نَبِيٍّ وَّلَا غَیْرِہٖ فِي الصَّدَقَاتِ حَتّٰی حَکَمَ فِیْھَا فَجَزَّاھَا ثَمَانِیَةَ اَجْزَاءٍ فَاِنْ کُنْتَ مِنْ تِلْکَ الْاَجْزَاءِ اَعْطَیْتُکَ- [۱]))

(صدقات کی تقسیم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کسی نبی اور نہ ہی کسی دوسرے کے فیصلے پر راضی ہوا- اس نے خود ہی اس بارے میں فیصلہ فرما دیا- اور اس کو آٹھ اجزاء میں تقسیم کر دیا ہے اگر تو بھی ان کے ذیل میں آتا ہے تو میں تمہیں دے دیتا ہوں-)

وہ شخص ان مدات میں سے کسی کے ذیل میں نہ آتا تھا- تبھی تو آپ ﷺ نے اسے ایسا جواب دیا-

(۳) حضرت قبیصہ بن مخارق کہتے ہیں کہ میں ایک شخص کا ضامن ہوا- پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آ کر اس بارے میں سوال کیا- آپ ﷺ نے فرمایا- یہاں ٹھہرو تا آنکہ ہمارے پاس صدقہ آئے ہم پھر تیرے لیے کچھ حکم کریں گے- پھر مجھے مخاطب کر کے فرمایا- قبیصہ! تین شخصوں کے علاوہ کسی کو سوال کرنا جائز نہیں- ایک وہ جو ضامن ہو اور ضمانت اس پر پڑ جائے جس کا وہ اہل نہ ہو وہ اپنی ضمانت کی حد تک مانگ سکتا ہے- پھر رک جائے دوسرے وہ جسے ایسی آفت پہنچے کہ اس کا سارا مال تباہ کر دے کہ وہ اس حد تک مانگ سکتا ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی قابل ہو جائے اور تیسرے وہ شخص جس کو فاقہ کی نوبت آ گئی ہو- یہاں تک کہ اس کی قوم کے تین معتبر شخص اس بات کی گواہی دیں کہ فلاں کو فاقہ پہنچا ہے اسے سوال کرنا جائز ہے تا آنکہ اس کی محتاجی دور ہو جائے- پھر فرمایا

﴿فَمَا سِوَاھُنَّ مِنَ الْمَسْئَلَةِ یَا قَبِیْصَةُ

(اے قبیصہ ان تین قسم کے آدمیوں کے سوا کسی اور کو سوال کرنا حرام ہے اور ان کے سوا جو شخص

---

[۱] ابوداؤد کتاب الزکاۃ باب من یعطی من الصدقة و حد الغنی (۱۶۳۰) اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن زیاد الافریقی ضعیف راوی ہے-

سُحتٌ یَاْکُلُھَا صَاحِبُھَا سُحتًا۔[1] ﷺ سوال کر کے کھاتا ہے وہ حرام ہے۔)

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔

((مَنْ سَالَ النَّاسَ اَمْوَالَھُمْ تَکَثُّرًا فَاِنَّمَا یَسْئَلُ جَمْرًا فَلْیَسْتَقِلَّ اَوْلِیَسْتَکْثِرْ۔[2] ﷺ)) (جو شخص اپنا مال بڑھانے کے لیے لوگوں سے سوال کرتا ہے۔ وہ آگ کے انگارے مانگ رہا ہے۔ اب وہ چاہے تو کم کرے یا زیادہ اکٹھا کر لے۔)

(۵) حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ مانگا اور آپ ﷺ نے دیا پھر ایک دفعہ مانگا تو آپ ﷺ نے دیا۔ پھر فرمایا حکیم! یہ دنیا کا روپیہ پیسہ دیکھنے میں خوشنما اور مزے میں شیریں ہے لیکن جو اس کو سیر چشمی سے لے' اس کو تو برکت ہوتی ہے۔ اور جو اس کو جان لڑا کر حرص کے ساتھ لے اس میں برکت نہ ہوگی۔ اس کی مثال ایسی ہے جو کھاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا۔ اور اوپر والا (دینے والا) ہاتھ نچلے (لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔ حکیم کہنے لگے۔ اے اللہ کے رسول! اس خدا کی قسم جس نے آپ ﷺ کو سچا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ میں آج کے بعد مرتے دم تک کسی سے کبھی کچھ نہ مانگوں گا۔ (پھر آپ کا حال یہ رہا کہ) کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ..... کو سالانہ وظیفہ دینے کے لیے بلاتے تو وہ لینے سے انکار کر دیتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے دورِ خلافت میں ان کو ان کا وظیفہ دینے کے لیے بلایا۔ تو بھی انہوں نے انکار کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاضرین سے کہنے لگے۔ ''لوگو! تم گواہ رہنا! میں حکیم کو اس کا حق جو لوٹ کے مال میں اللہ نے رکھا ہے دیتا ہوں اور وہ نہیں لیتا۔'' غرض رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کا اتنا پاس تھا کہ انہوں نے تاحینِ حیات سوال تو درکنار کسی سے کوئی بھی چیز قبول نہیں کی۔[3]

(۶) عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم سات آٹھ آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ آپ لوگ اللہ کے رسول سے بیعت نہیں کرتے؟ جبکہ ہم بیعت کر چکے تھے۔ ہم نے کہا ہم تو بیعت کر چکے ہیں۔ اب کس بات کی بیعت کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا! اللہ کی عبادت کرو۔ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ پانچ نمازیں ادا کرو اور اللہ کی فرمانبرداری کرو۔ اور ایک بات چپکے سے کہی کہ ''لوگوں سے کچھ نہ مانگنا۔'' پھر میں نے ان میں سے بعض

---

[1] تا [2] مسلم۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب من یحل له المسالة

[3] بخاری۔ کتاب الوصایا۔ باب تاویل قول اللہ تعالیٰ من بعد وصیة توصون بھا او دین

افراد کو دیکھا کہ اگر اونٹ سے ان کا کوڑا گر پڑتا تو کسی سے سوال نہ کرتے کہ وہ انہیں پکڑا دے۔[1]

گداگری کا انسداد

مندرجہ بالا احکام وارشادات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے اگر چہ بعض حالات میں سوال کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر مانگنے کو ایک مستقل پیشہ بنالینا قطعاً جائز نہیں۔ مگر آج کل گداگری کی اتنی اقسام منظر عام پر آ چکی ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا بھی مشکل ہے۔ کچھ لوگ ریلوں اور بسوں وغیرہ میں مانگتے ہیں۔ کچھ در بدر پھر کر گھروں میں اور حد یہ ہے کہ کچھ مولوی قسم کے لوگوں نے مساجد کا اس کام کے لئے انتخاب کر رکھا ہے۔ پھر ان کے مانگنے کے انداز بھی جدا جدا ہیں۔ مسجدوں میں مانگنے والے عموماً نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد فوراً خطبہ دینا شروع کر دیتے ہیں اور انفاق فی سبیل اللہ کے فضائل بیان کرنے کے بعد لوگوں سے مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور بعض لوگ مصنوعی طور پر اندھے یا معذور بنے ہوتے ہیں۔ بعض نے کوئی دردناک قسم کا افسانہ گھڑ رکھا ہوتا ہے۔ تاکہ سننے والے متاثر ہو کر انہیں زیادہ سے زیادہ دیں۔ ان میں اکثر لوگوں کا یہ شغل بطور پیشہ ہوتا ہے۔ اور محنت کر کے کمانے والوں سے دولت جمع کرنے کے لحاظ سے یہ لوگ بہت فائدہ میں رہتے ہیں۔

مساجد میں گداگری:

اگر چہ گداگری کی سب شکلیں ہی مذموم ہیں۔ مگر میرے خیال میں ان سب سے بدتر وہ گداگر ہیں جنہوں نے اس کام کے لئے مساجد کو آماج گاہ بنا رکھا ہے۔ وہ لوگوں کو یہ تو بتاتے ہیں کہ لوگوں کے اموال میں ہمارا حق ہے۔ سائل اگر گھوڑے پر سوار ہو کر آئے تو اسے بھی دینا[2] چاہیے۔ اسے کبھی جھڑکنا نہ چاہیے۔ اور صدقہ کرنے کا اتنا اتنا ثواب ملتا ہے۔ مگر یہ کبھی نہ بتائیں گے۔ کہ دولت کی خاطر سوال کرنا ایسے ہے۔ جیسے دوزخ کے انگارے اکٹھے کرنا اور سوالی

[1] مسلم۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب النهى عن المسئلة

[2] یہ ایک ضعیف سی حدیث ہے۔ جس کے مقابل ایسی ہی یہ حدیث ہے کہ ایک سوالی گھوڑے پر سوال کر رہا تھا تو حضرت عمرؓ نے اس سے گھوڑا چھین لیا اور فرمایا جاؤ! اب تم مانگ سکتے ہو۔ اس کا حوالہ اگرچہ اس وقت مستحضر نہیں تاہم یہ بات ابوداؤد میں ابوسعید خدری کی روایت کے مطابق ہے۔ جس میں انہیں خیال آیا تھا کہ میری اونٹنی یاقوتہ کی مالیت ایک اوقیہ چاندی (چالیس درہم) سے زائد ہے۔ لہٰذا میں کیسے سوال کر سکتا ہوں۔ واضح رہے کہ عرب میں اونٹ کی نسبت گھوڑا بہت قیمتی متاع سمجھی جاتی ہے۔

کے چہرے پر قیامت کے دن زخم ہی زخم ہوں گے۔ یا یہ ان کے چہرے کا سارا گوشت نوچ لیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ ان لوگوں کا دراصل علاج وہی ہے۔ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ عرفہ کے دن کوئی شخص مانگ رہا تھا تو آپ نے اسے درے سے پیٹا اور فرمایا کہ آج کے دن بھی تو اللہ کے سوا دوسروں سے مانگتا ہے۔ مساجد بھی صرف اللہ سے سوال کرنے کے مخصوص مقامات ہیں۔ دوسروں سے مانگنا مذموم بات ہے۔

مساجد میں صرف اجتماعی مقاصد کے لئے چندہ کی اپیل کی جا سکتی ہے۔ اور یہ ایک نیک مقصد ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کئی بار مسجد میں جہاد کے اخراجات کے لئے اپیل کی۔ لہٰذا مدارس ومساجد کے لئے چندہ اکٹھا کرنے والے سفیروں کے سوال کی تو گنجائش ہے وہ بھی اس صورت میں کہ یہ تحقیق کر لی جائے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں درست ہے۔ ورنہ ان میں سے بھی کئی تو فراڈی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور بعض اپنی کمیشن کی خاطر یہ دھندا کرتے ہیں۔ پھر اس میں بھی بے ایمانی کر جاتے ہیں۔ اور اپنی کمیشن بھی معروف سے بہت زیادہ طے کر لیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں معروف صرف آٹھواں حصہ یا اس کے لگ بھگ ہے جیسا کہ قرآن کے الفاظ عاملین علیہا سے معلوم ہوتا ہے۔

گداگری کا تجزیہ:

جب آپ کسی گداگر کو دیکھیں تو سب سے پہلے یہ معلوم کریں کہ وہ کس عمر کا ہے۔ اگر وہ جوان، طاقتور اور کمانے کے قابل ہے۔ تو اس کو مانگنا جائز ہی نہیں۔ ایسے ہی آدمی کو رسول اللہ ﷺ نے جنگل کی راہ دکھائی تھی۔ اور وہ محنت کر کے دو ہی ہفتوں میں خوشحال ہو گیا تھا۔

اور اگر سائل نابالغ ہے تو اس کی کفالت اس کے والد کے ذمہ ہے اور اسے مانگنے کا کوئی جواز نہیں۔ اور اگر وہ یتیم ہے تو اس کی کفالت اس کے سرپرست پر ہے۔ اور اگر وہ سرپرست اس طرف توجہ نہیں دیتا تو وہ گنہگار ہے۔

اور اگر بوڑھا ہے تو اس کی کفالت اس کی اولاد پر ہے۔ اور اگر اولاد اس کی طرف توجہ کرے تو وہ شرعاً ان کا مال لے سکتا ہے۔ ایسا ہی ایک مقدمہ آپ ﷺ کے پاس آیا۔ والد نے شکایت کی تو آپ ﷺ نے بیٹے کو بلا کر یہ فرمایا۔

((اَنْتَ وَ مَالُکَ لِاَبِیْکَ ۔[1])) (تم خود بھی اور تمہارا مال بھی سب کچھ تمہارے باپ کا ہے۔)

یہ تو خیر ایک مقدمہ کا فیصلہ تھا۔ عام حالات میں بھی شریعت کا حکم یہی کچھ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

((اِنَّ اَطْیَبَ مَآ اَکَلْتُمْ مِنْ کَسْبِکُمْ وَ اِنَّ اَوْلَادَ کُمْ مِنْ کَسْبِکُمْ ۔[2])) (پاکیزہ تر چیز جو کوئی تم کھاتے ہو وہ ہے جو تمہاری اپنی کمائی سے ہو اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہے۔)

اور ابوداؤد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

((اِنَّ مِنْ اَطْیَبِ مَآ اَکَلَ الرَّجُلُ مِنْ کَسْبِہٖ وَ وَلَدُہٗ مِنْ کَسْبِہٖ ۔[3])) (پاکیزہ تر چیز جو کوئی شخص کھاتا ہے وہ اس کی اپنی کمائی ہے اور اس کی اولاد بھی اس کی کمائی ہے۔)

گویا اگر بیٹا بوڑھے یا معذور باپ کی طرف توجہ نہیں دیتا تو شرعاً باپ کو یہ حق حاصل ہے۔ کہ جس طرح چاہے اور جتنا چاہے بیٹے کا مال لے لے۔ مگر مانگنے سے پرہیز کرے۔

ایک صورت یہ ہے کہ باپ بوڑھا' معذور اور اس کی اولاد مر چکی ہے۔ ایسی صورت میں قریبی رشتہ داروں پر اس کی کفالت کی ذمہ داری ہے۔ اور اس کا ان کو دوگنا اجر ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو درجہ بدرجہ سب گنہگار ہیں۔

اس کے بعد پڑوسیوں اور محلہ داروں کی باری آتی ہے۔ آپ کا ارشاد مبارک ہے کہ وہ شخص مسلمان نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر کھاتا ہے۔ اس حال میں اس کا ہمسایہ بھوکا رہے۔[4]

---

1. ابن ماجہ۔ ابواب التجارات۔ باب للرجل من مال والدہ (۲۲۹۱) شرح معانی الاثار ۴/ ۱۵۸' موضح اوھام الجمع والتفریق ۲/ ۱۴۰ المسند الجامع ۴/ ۲۸۱ اس کی سند صحیح ہے۔
2. ترمذی کتاب الاحکام باب ماجاء فی ان الوالد یاخذ من مال ولدہ (۱۳۵۸) نسائی کتاب البیوع باب الحث علی الکسب (۴۴۶۱) ابن ماجہ کتاب التجارات باب ماللرجل من مال ولدہ (۲۲۹۰) ابوداؤد کتاب الاجارہ باب فی الرجل یاکل من مال ولدہ (۳۵۲۸) دارمی کتاب البیوع باب فی الکسب و عمل الرجل بیدہ (۲۵۴۰) طیالسی (۱۵۸۰) مسند حمیدی (۲۴۶) مسند احمد ۶/ ۳۱' ۴۱' ۱۲۸۔ قدیم ابن حبان (۴۲۵۹) حاکم ۲/ ۴۶ بیہقی ۷/ ۴۷۹' ۴۸۰ یہ حدیث صحیح ہے۔
3. اس کی تخریج کے لئے اوپر والی حدیث ملاحظہ ہو۔
4. شعب الایمان للبیہقی۔ باب فی اکرام الجار (۹۵۳۶) طبرانی کبیر ۱۲/ ۱۵۴ مجمع الزوائد ۸/ ۱۶۷ سلسلہ صحیحہ (۱۴۹) یہ حدیث صحیح ہے۔

اس کے بعد حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی مملکت میں یتیموں' بیواؤں' اور معذوروں کی ایسی فہرست تیار کرے۔ جن کا کوئی پرسان حال نہ ہو اور بروقت بیت المال سے ان کی امداد کرے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ذاتی عمل سے حکومت کی اس ذمہ داری کا ثبوت فراہم کیا تھا۔

اسلام کا نظام کفالت:

اسلام کا نظام کفالت تو یہ ہے جس میں کسی کے گداگر بننے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ حتیٰ کہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی گداگری بھی مذموم ہے۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ نماز جمعہ کے بعد ایک یہودی مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا لوگوں سے سوال کر رہا ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا تو کیوں مانگ رہا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ جزیہ ادا کرنے کی خاطر جب میں جوان تھا تو محنت کرتا تھا اور کمائی سے جزیہ ادا کر دیتا تھا۔ مگر اب اس قابل نہیں رہا۔ آپ نے عمال سے فرمایا کہ اب اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے (کیونکہ بوڑھوں بچوں اور عورتوں پر جزیہ عاید نہیں ہوتا) اور مزید یہ کہ بیت المال سے اس کی گزارن کے مطابق اس کی اعانت کی جائے۔ کیونکہ جو شخص اپنی جوانی میں بیت المال کی اعانت کرتا رہا ہے۔ اب اگر وہ معذور ہو چکا ہے تو بیت المال کا حق ہے کہ اس کی اعانت کرے۔ [1]

غور فرمایئے ایسے نظام میں گداگری کی کہیں گنجائش نظر آتی ہے۔ مگر مشکل تو یہ ہے آج کل آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے اسلامی اخلاق واقدار پامال ہو رہی ہیں۔ کسی کو اپنی ذمہ داریوں کا خیال نہیں رہا۔ الا ماشاء اللہ۔ ایسی صورت میں گداگری کو فروغ نہ ہو تو کیا ہو؟

گداگری کی انوکھی قسم:

جو آج رواج پا چکی ہے۔ وہ ہے عورتوں کی گداگری جن پر اسلام نے کسی کی کفالت تو درکنار' اپنی کفالت کا بھی بار نہیں ڈالا۔ ایسی عورتیں بلا جھجک گھروں میں داخل ہو جاتی ہیں۔ نہ انہیں گھروں میں داخل ہونے کے لئے صاحب خانہ سے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ انہیں کسی سے پردہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ گھر کی عورتوں سے بھی آزادانہ ہمکلام ہوتی ہیں اور مردوں سے بھی۔ وہ کوئی دردناک سا افسانہ گھڑ لیتی ہیں۔ مثلاً خاوند فوت ہو گیا ہے۔ نرینہ اولاد کوئی نہیں یا تھی

[1] الفاروق۔ شبلی نعمانی۔ ص ۲۸۶

تو مر چکی ہے۔ چار بیٹیاں ہیں۔ ان کی پرورش کرنا ہے اور شادی بھی کرنا ہے۔ جہیز کے لئے پاس کچھ نہیں' فلاں بیٹی کو ٹی بی ہوئی ہے اور اسے ہسپتال میں داخل کیا ہوا ہے' اس کے علاج کے لئے کوئی پیسہ نہیں' گھر میں آٹا تک نہیں وغیرہ وغیرہ' مسکین اور مغموم صورت بنائے جب وہ یہ دردناک حالات بیان کرتی ہیں۔ تو عورتیں بالخصوص اس سے بہت متاثر ہو جاتی ہیں حالانکہ ان میں سے اکثر جھوٹی اور پیشہ ور ہوتی ہیں اور مردوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ان کا آزادانہ اختلاط اور آزادانہ گفتگو ہی کافی ہوتی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بالفرض ان کی باتوں کو سو فیصد درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو کیا اس عورت کے فوت شدہ خاوند کے سارے بھائی یا باپ بھی مر چکے ہیں۔ جو اس عورت اور اس کی اولاد کے سرپرست اور کفیل ہیں؟ آج کے گئے گزرے دور میں بھی معاشرہ کے لوگ اتنے سنگدل تو واقع نہیں ہوئے کہ وہ ایسی بیوہ عورت کی سرپرستی سے انکار کر دیں۔ پھر آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ یا یہ عورت اتنی سرکش ہو گئی ہے جو ان کی سرپرستی کو بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ اور نکاح ثانی پر بھی آمادہ نہیں جسے اسلام نے ایسی حالات میں ضروری قرار دیا ہے؟ بات دراصل وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ جیسے دوسرے فنون ترقی کر رہے ہیں۔ گداگری کا فن بھی نئے نئے روپ بدل کر ترقی کر رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے۔ کہ سائل کو جھڑکا نہ جائے۔ لیکن تحقیق کرنے کا بھی ہمیں حق دیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز تربیت:

صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس نہ موڑا۔ تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ ﷺ کسی مستحق کو خالی نہ موڑتے تھے۔ اور ہر سائل کے لئے آپ کا انداز تربیت جداگانہ تھا۔ مثلاً ایک سائل آیا تو آپ نے دیکھا کہ یہ محنت کر سکتا ہے۔ آپ نے اسے دیا کچھ نہیں بلکہ فرمایا کہ گھر میں کوئی چیز ہے؟ وہ کہنے لگا ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے۔ اب یہ تو واضح ہے کہ جس کے گھر کی کل کائنات ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہوا اور وہ بولی میں صرف دو درہم میں فروخت ہو رہی ہو۔ وہ ایسا محتاج ہے جسے مانگنا جائز ہے مگر آپ نے اسے محنت کی راہ پر ڈال دیا۔ اور اسے مانگنے سے عار دلائی جس سے وہ چند ہی دنوں میں خوشحال ہو گیا۔

حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے سوال کیا۔ اور آپ نے دیا۔ پھر جب دوسری

دفعہ انہوں نے مانگا تو اس انداز میں نصیحت فرمائی کہ انہوں نے تاحین حیات کسی سے کچھ نہ مانگا بلکہ اپنا حق لینا بھی چھوڑ دیا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

قبیصہ بن مخارق نے آ کر سوال کیا۔ اور وہ سوال کے مستحق تھے۔ کیونکہ بارضمانت ان پر پڑ چکا تھا۔ لیکن کچھ دینے سے قبل آپ ﷺ نے ان پر وضاحت کر دی کہ صرف تین قسم کے لوگوں کو سوال کرنا جائز ہے جن میں پہلی قسم یہی بارضمانت کی تھی جس میں خود قبیصہ بن مخارق مبتلا تھے اور ساتھ ہی یہ بتا دیا۔ کہ ان تین قسم کے لوگوں کے علاوہ اگر کوئی سوال کر کے کھاتا ہے۔ تو حرام کھاتا ہے۔

ایک اور شخص مانگنے آیا۔ آپ ﷺ نے دیکھا وہ مستحق نہیں تو اسے آپ ﷺ نے یہ جواب دیا کہ صدقات کو تقسیم کرنے کا اختیار تو اللہ نے کسی نبی کو بھی نہیں دیا نہ ہی کس دوسرے کو دیا ہے۔ وہ تو خود اس نے آٹھ قسم کے لوگوں کی نشان دہی کر دی ہے۔ اب تم خود دیکھ لو کہ تم ان آٹھ قسم میں سے کسی قسم میں شمار ہو سکتے ہو؟

تو یہ تھا آپ ﷺ کا انداز تربیت اور انداز تحقیق ہمیں بھی اسی اسوہ پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اگر سائل مستحق ہو تو فی الواقع اس کی حتی الامکان مدد بھی کرنا چاہئے۔ مگر مشکل یہ پیش آتی ہے کہ آج کل جھوٹ، مکر، فریب اور خود غرضی اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ تحقیق کرنے کی محنت بذات خود ایک مشکل سا مسئلہ بن جاتا ہے۔

ہمارے خیال میں آج کے دور میں گداگری کو ختم کرنے کی یہ صورت کافی حد تک کامیاب ہو سکتی ہے کہ برادری کا کوئی معتبر اور مخیر آدمی یا چند آدمی مل کر یہ عہد کر لیں کہ وہ اپنے خاندان کے غرباء و مساکین یعنی یتیموں، بیواؤں اور معذوروں کا خیال رکھیں گے اور ایسے لوگوں کو سوال کرنے سے منع کریں گے اور بچائیں گے۔ تو اس طرح ایک تو انہیں دوہرا ثواب ملے گا۔ دوسرے گداگری اور سوال کرنے کی حوصلہ شکنی ہو جائے گی۔ پھر ایسے نوجوانوں کو جو محنت کر سکتے ہوں انہیں کام سکھانے اور کام پر لگانے میں وہی حکمت اختیار کی جائے۔ جو آپ کا اسوہ ہے تو اس سے اور بھی بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

آخری چارہ کار یہ ہے کہ بیت المال یا محکمہ زکوٰۃ وعشر کی طرف رجوع کیا جائے۔ کیونکہ اسلام کے نظام کفالت مین حکومت بھی حصہ دار ہے اور اس ذمہ داری کا احساس جس قدر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں کیا تھا وہ اس کی واضح دلیل ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم

اپنی ذمہ داریوں کا مطلق احساس نہ کرتے ہوئے ساری ذمہ داریاں حکومت پر ڈال دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جہاں مختلف افراد اور طبقات کی ذمہ داریوں کا ذکر فرمایا تو آخر میں یہ الفاظ فرمائے۔

((الا کُلُّکُم رَاعٍ وَ کُلُّکُم مَسئُولٌ عَن رَعِیَّتِه۔ [1])) (سن لو تم میں سے ہر شخص راعی (ذمہ دار) ہے جس کے لئے اللہ کے ہاں اسکی باز پرس ہوگی۔)

صدقات وخیرات دینے والوں کو ہدایات

اسلامی احکام کی حکمت یہ ہے کہ وہ باہمی معاملات میں فریقین کے لئے الگ الگ ہوتے ہیں تا کہ آپس میں تنازعات پیدا ہونے کی بجائے اخوت کی فضا برقرار رہے۔ مثلاً اسلام قرض لینے والے کو یہ کہتا ہے کہ قرض سے حتی الامکان بچنا چاہئے۔ قرض سر پر لئے آدمی مرجائے تو اس کی بخشش بھی نہیں ہوتی ایسے مقروض کی نماز جنازہ ادا کرنے سے رسول اللہ ﷺ انکار کر دیتے تھے۔ اور اگر قرض لیا ہے تو بروقت ادائیگی کرنا چاہئے۔ نیز یہ کہ اگر اس تقاضا میں قرض خواہ سے کوئی سخت سست بات ہو جائے تو اسے برداشت کرنا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ اور دوسری طرف قرض خواہ کو ہدایات ہیں۔ کہ اگر کوئی مصیبت کا مارا قرض لینے آتا ہے تو اسے قرض دے دو۔ یہ بڑا نیکی کا کام ہے۔ اگر وہ بروقت ادا نہیں کر سکا۔ تو اسے اس کی گنجائش تک مہلت دو۔ اور یہ بھی تمہاری طرف سے صدقہ ہوگا اور اگر معاف کر دو تو کیا ہی اچھی بات ہے۔ تمہاری بھی بخشش ہو جائے گی۔ جو شخص اس معاملہ میں لوگوں سے نرمی اختیار کرے گا۔ اللہ بھی قیامت کے دن اس سے نرمی اختیار کرے گا اور معاف فرمادے گا وغیرہ وغیرہ۔

صدقات وخیرات مانگنے والوں اور دینے والوں کے لئے بھی اسی طرح الگ الگ احکام وہدایات دی گئی ہیں۔ مانگنے والوں کو یوں عار دلائی اور عزت نفس کو یوں ابھارا۔ کہ اس سے تو پیٹھ پر لکڑیاں لاد اور بیچ کر گزارہ کر لینا بہتر ہے کہ سوال کرنے والا دینے والے کی طرف دیکھتا رہے کہ وہ اسے کچھ دیتا ہے یا جواب دے دیتا ہے نیز یہ کہ بلاوجہ مانگنا اپنے چہرہ پر زخم لگانے کی طرح ہے اور جو شخص محض دولت کمانے کی خاطر گداگری کرتا ہے۔ وہ اپنے لیے جہنم کے انگارے اکٹھے کر رہا ہے۔ نیز یہ کہ کوئی بلا جواز مانگ کر کھاتا ہے۔ وہ حرام کھا رہا ہے۔ ایسی کمائی حلال نہیں ہوسکتی۔

[1] بخاری۔ کتاب النکاح۔ باب قوا انفسکم و اھلیکم ناراً

اس کے برعکس دینے والوں کے لئے ہدایات اس سے بالکل جداگانہ ہیں۔ انہیں قرآن نے یہ بتایا۔ کہ ان کے اموال میں مانگنے والوں اور نہ مانگنے والے نادار' دونوں کا حق ہے۔[1] اب اگر کوئی سائل اپنا حق لینے آتا ہے تو اسے وہ بخوشی ادا کر دینا چاہئے اور چیں بہ چیں نہ ہونا چاہئے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ (۱۰:۹۳) (اور سائل کے متعلق یہ حکم ہے کہ اسے جھڑکو نہیں)

اور ایک مقام پر فرمایا کہ ''جب تم قربانی کرو تو اس میں سے اسے بھی کھانے کو دو جو مانگتا نہیں اور قناعت کیے بیٹھا ہے اور اسے بھی جو تقاضا کے ساتھ مانگ رہا ہے''۔[2]

غرض قرآن کریم میں جا بجا ایسے ارشادات موجود ہیں۔ کہ صدقات وخیرات میں سائلین کو بھی حصہ دینا چاہیے۔ جہاں یہ بات بڑے ثواب کا کام ہے۔ وہاں اس سے دینے والے کے مال میں بھی اللہ تعالیٰ بہت برکت ڈال دیتا ہے۔

صدقات وخیرات دینے ولوں کو دوسری ہدایات یہ دی گئی کہ:

﴿لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى﴾ (۲۶۴:۲) (اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور دکھ پہنچا کر باطل نہ بنا دو''۔)

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو کچھ دے کر اس کے بعد اسے یہ احسان جتلاتا ہے یا اس کا طعنہ دیتا ہے یا اس سے بیگار یا اور کسی طرح کی خدمت لے کر اس کی عزت نفس کو مجروح کرتا یا عار دلاتا اور دکھ پہنچاتا ہے تو اس کا یہ صدقہ ضائع ہو گیا۔ اس کا اسے کچھ اجر وثواب نہ ملے گا۔

اور تیسری ہدایت یہ ہے کہ ریاکاری سے بہرحال بچنا چاہئے۔ اور اگر لینے والے کی عزت نفس کو ملحوظ رکھتے ہوئے چوری چھپے صدقہ دیا جائے تو یہ اور بھی بہتر بات ہے۔ ارشاد باری ہے۔

﴿اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (۲۷۱:۲) (اگر تم اپنے صدقات ظاہر کر کے دو تو یہ بھی اچھا ہے اور اگر چوری چھپے دو اور محتاجوں کو دو تو تمہارے حق میں بہتر یہی بات ہے۔)

اور مفسرین یہ کہتے ہیں کہ فرضی صدقہ یعنی زکوٰۃ تو علانیہ دینی چاہئے اور نفلی صدقات خفیہ طور پر دینا چاہیے۔

---

[1] سورہ معارج:۲۵ [2] سورہ حج:۳۶

ان ارشادات الٰہیہ کے بعد اب ارشادات نبوی ملاحظہ فرمائیے:-

آپ ﷺ کا اپنا عمل یہ تھا کہ آپ ﷺ کسی سائل کو خالی نہ جانے دیتے تھے۔ اور اگر اپنے پاس کچھ موجود نہ ہوتا تو دوسروں کو اس کی ترغیب دیتے۔ کہ وہ سائل کے لیے سفارش کریں۔ چنانچہ ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب کوئی سائل آتا یا کوئی شخص آپ کے پاس اپنی حاجت بیان کرتا تو آپ ﷺ دوسرے لوگوں سے فرماتے تم بھی سفارش کرو۔ تمہیں اجر ملے گا اور اللہ اپنے پیغمبر کی زبان سے جو چاہے گا حکم دے گا۔[1]

ایک دفعہ ایک عورت نے ایک حاشیہ دار چادر آپ ﷺ کی خدمت میں تحفتاً پیش کی اور کہنے لگی یا رسول اللہ ﷺ! میں نے اسے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ آپ ﷺ نے وہ چادر قبول فرمالی۔ اور اتفاق سے اس وقت آپ ﷺ کو چادر کی ضرورت بھی تھی۔ آپ ﷺ یہ چادر پہن کر باہر نکلے ہی تھے کہ ایک صحابی (عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ) کی اس چادر پر نظر پڑی۔ اس کو چھوا اور کہنے لگے کیا عمدہ چادر ہے یا رسول اللہ ﷺ یہ مجھے عنایت فرمائیے آپ ﷺ نے فرمایا۔ اچھا دے دوں گا۔ پھر جب آپ ﷺ گھر گئے۔ تو اس چادر کو تہ کر کے اس کے گھر بھیج دیا۔ لوگ اس سے کہنے لگے یہ تم نے اچھا نہیں کیا جو آپ ﷺ سے یہ چادر مانگ لی اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ آپ کسی کا سوال رد نہیں کرتے۔ وہ صحابی کہنے لگے۔ میں نے یہ چادر پہننے کے لئے نہیں بلکہ اپنے کفن کے لیے مانگی ہے۔ چنانچہ اس صحابی کے کفن میں یہ چادر لگائی گئی۔[2]

عبدالرحمٰن بن بجید اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ بعض دفعہ کوئی فقیر میرے دروازے پر آن کھڑا ہوتا ہے جسے دینے کو میرے پاس کچھ نہیں ہوتا تو کیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔

((اِنْ لَّمْ تَجِدِیْ لَهُ شَیْئاً تُعْطِیْهِ اِیَّاهُ اِلَّا ظُلْفاً مُحَرَّقاً فَادْفَعِیْهِ اِلَیْهِ فِیْ یَدِهٖ۔[3])) (اگر تم فقیر کو دینے کے لئے بکری کے ایک جلے ہوئے کھر کے سوا کچھ نہ پاؤ تو وہی اس کے ہاتھ میں رکھ دو۔)

---

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ - باب التحریض علی الصدقة و الشفاعة فیها
[2] بخاری - کتاب اللباس - باب البرد و الحبرة و الشملة
[3] ترمذی ابواب الزکاۃ باب ما جاء فی حق السائل (٦٦٥) ابوداؤد کتاب الزکاۃ باب حق السائل (١٦٦٧) نسائی کتاب الزکاۃ باب تفسیر المسکین (٢٥٧٤) ابن خزیمہ (٢٤٧٣) ابن حبان (٨٢٤) حاکم ١/ ١٧ ۱۴ یہ حدیث صحیح ہے۔

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا۔ کیا میں تمہیں ایسے آدمی کی خبر نہ دوں جو سب سے بدتر ہے؟ صحابہ نے کہا! بتائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔

((اَلَّذِی یُسْاَلُ بِاللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَلَا یُعْطِی بِه[1])) (جس سے اللہ کے نام پر مانگا جائے اور وہ کچھ نہ دے۔)

بعض دفعہ کوئی ایسا سائل آ جاتا جو مستحق نہ ہونے کے باوجود آپ ﷺ سے چمٹ کر سوال کرتا۔ یہ لمحہ آپ ﷺ کے لئے سخت مشکل ہوتا تھا۔ پھر چونکہ فیاضی آپ ﷺ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس لئے آپ ﷺ انکار بھی نہ کر سکتے تھے اور کچھ نہ کچھ دے ہی دیتے تھے۔ ایسی صورت حال کا اظہار آپ ﷺ نے ان الفاظ میں کیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔

((لَا تُلْحِفُوْا فِی الْمَسْئَلَةِ فَوَاللّٰهِ لَا یَسْاَلُنِی اَحَدٌ مِنْکُمْ شَیْأً فَتُخْرِجَ لَهُ مَسْاَلَتُهُ مِنِّی شَیْأً وَ اَنَا لَهُ کَارِهٌ فَیُبَارَکَ لَهُ فِیْمَا اَعْطَیْتُهُ۔[2])) مجھ سے چمٹ کر سوال نہ کیا کرو۔ جو شخص بھی تم میں سے مجھ سے کوئی سوال کرتا ہے تو میں اسے کچھ نہ کچھ دے دیتا ہوں حالانکہ میں اس کو مکروہ سمجھتا ہوں۔ اس طرح اس چیز میں برکت نہیں رہتی جو میں اسے دیتا ہوں۔

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) آپ ﷺ کسی بھی سائل کو خالی نہ جانے دیتے۔ کچھ نہ کچھ ضرور دے دیا کرتے تھے۔

(۲) چمٹ کر سوال کرنے سے دینے والے کی طبیعت گرانبار ہو جاتی ہے اور اس طرح دی ہوئی چیز میں برکت نہیں رہتی۔

اسی مضمون کی ایک اور حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے صدقہ کا کچھ مال تقسیم فرمایا۔ تو میں نے عرض کی۔ ''یارسول اللہ ﷺ! اللہ کی قسم اس کے مستحق تو اور لوگ تھے۔ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا۔

((اِنَّهُمْ عَیَّرُوْا فِی اثْنَیْنِ اَنْ یَسْئَلُوْنِی بِالْفُحْشِ اَوْ یُبَخِّلُوْنِی فَلَسْتُ (ان لوگوں نے مجھے دو باتوں میں مجبور کر دیا کہ یا تو بے حیائی اور ڈھٹائی سے مجھ سے

---

[1] نسائی کتاب الزکاۃ باب من یسال باللہ عزوّ جل ولا یعطی بہ (۲۵۶۸) ترمذی فضائل الجہاد باب ماجاء ای الناس خیر (۱۶۵۲) یہ حدیث صحیح ہے۔

[2] مسلم۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب النهی عن المسئلة

بِبَاخِلٍ -[1])) مانگیں یا میں ان کے آگے بخیل ٹھہروں سو میں بخل کرنے والا نہیں ہوں۔)

کونسا صدقہ بہتر ہے اور کب؟

(۱) ایک آدمی نے آپ ﷺ سے پوچھا؟ یارسول اللہ ﷺ! ''اجر کے لحاظ سے کونسا صدقہ بڑا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو تندرستی کی حالت میں کرے' حرص رکھتا ہو۔ فقر سے ڈرتا ہو اور دولت کی امید رکھتا ہو۔ لہٰذا صدقہ کرنے میں جلدی کرو۔ ایسا نہ ہو کہ جان لبوں پر آ جائے تو کہنے لگے کہ اتنا فلاں کو دے دو اور اتنا فلاں کو۔ حالانکہ اس وقت یہ مال اس کا نہیں بلکہ اس کے وارثوں کا ہوتا ہے۔[2]

(۲) صدقہ چھپا کر دینا زیادہ بہتر ہے (اس مضمون کی پہلے ایک آیت بھی گزر چکی ہے) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سات (قسم کے) آدمیوں کو اپنے سایہ میں جگہ دے گا۔ جبکہ اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ ان سات آدمیوں سے چھٹا اسے شمار فرمایا۔ جو اپنے دائیں ہاتھ سے صدقہ کرتا ہے تو بائیں ہاتھ کو خبر تک نہیں ہوتی۔[3]

(۳) تنگ دست آدمی کا صدقہ بہت قدر و قیمت رکھتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((جُهْدُ الْمُقِلِّ وَ ابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ -[4])) (تنگ دست کی محنت سے صدقہ اور ان سے ابتدا کر جو تیرے زیر کفالت ہیں۔)

رمضان میں صدقہ نکالنا بہتر ہے:

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ کسی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کونسا صدقہ افضل ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ جو رمضان میں دیا جائے۔[5]

---

1. مسلم-کتاب الزکوٰۃ-باب اعطاء المولفة.........
2. مسلم-کتاب الزکوٰۃ-باب ان افضل الصدقة
3. مسلم-کتاب الزکوٰۃ-باب الحث علی الصدقة
4. ابوداود-کتاب الزکوٰۃ-باب الرجل یخرج من ماله (۱۶۷۳) بیہقی ۴/۱۵۴ ابن خزیمہ (۲۴۴۱) حاکم (۴۱۳/۱) اس حدیث کو امام حاکم اور امام ذہبی نے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے جبکہ اس سند میں ابن اسحاق کی تدلیس ہے۔
5. ترمذی-کتاب الزکوٰۃ-باب ماجاء فی فضل الصدقة (۶۶۳) اسکی سند صحیح ہے

(۵) صدقہ اتنا کیا جائے کہ اس کے بعد خود انسان محتاج نہ ہو جائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى وَ ابْدَاء بِمَنْ تَعُوْلُ۔ [1])) بہترین صدقہ وہ ہے جس کے بعد آدمی محتاج نہ ہو جائے اور ان لوگوں سے ابتدا کر جو تیرے زیر کفالت ہیں۔

ان تمام شقوں میں صدقہ کے عام اصول بیان ہوئے ہیں۔ جو عوام کی اکثریت کے لئے ہیں اور ان کے مطابق ہیں اور انسان کے توکل اور ظرف کے مطابق مستثنیات ان میں موجود ہیں۔ چنانچہ جنگ تبوک کے موقعہ پر حضرت ابوبکر صدیق اپنے گھر کا پورے کا پورا اثاثہ لے آئے اور خدمت نبوی میں پیش کر دیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا۔ کہ اب گھر میں اللہ اور اس کے رسول کے سوا کوئی چیز نہیں۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سارا صدقہ قبول فرمالیا۔ کیونکہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اللہ پر توکل بے مثال تھا جسے آپ پوری طرح سمجھتے تھے۔

اس کے برعکس ایک شخص ایک انڈا بھر سونا لایا اور کہنے لگا۔ یا رسول اللہ ﷺ مجھے یہ کان سے ملا ہے اور یہ صدقہ ہے اور اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں۔ آپ ﷺ نے اس سے اعراض کیا۔ پھر اس شخص نے دائیں طرف ہو کر یہی بات دہرائی۔ تو بھی آپ ﷺ نے اعراض کیا۔ پھر بائیں جانب پھر پیچھے سے ہو کر یہی بات دہراتا رہا۔ آخر آپ ﷺ نے وہ سونا پکڑا پھر اسے دے دیا اور فرمایا یہ تمہارے لیے ہے۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ وہ چلا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ تم میں سے ایک شخص آ کر کہتا ہے کہ صدقہ ہے۔ پھر لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے لگتا ہے۔ اس موقعہ پر بھی آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

((خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى [2])) (بہترین صدقہ وہ ہے جس کے بعد آدمی محتاج نہ ہو۔)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ کہ ایک شخص مسجد میں آیا وہ بیچارہ ننگا تھا۔ صرف ایک لنگوٹ پہنے ہوئے تھا۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو کپڑے صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ جب کچھ کپڑے اکٹھے ہو گئے تو آپ ﷺ نے دو کپڑے اس آدمی کو دیئے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے

---

[1] بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب لاصدقة الا عن ظهر غنى

[2] ابوداؤد۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب الرجل يخرج من ماله (۱۶۷۳) اسکی تخریج پیچھے گزر چکی ہے۔

پھر صدقہ کی ترغیب دلائی تو اس شخص نے بھی ان دو کپڑوں میں سے ایک صدقہ ڈھیر میں پھینک دیا۔ آپ اسے ناراض ہوئے اور فرمایا اپنا کپڑا اٹھالے۔[1]

---

[1] ابوداؤد- کتاب الزکوٰۃ- باب الرجل یخرج من مالہ (۱۶۷۳) اسکی تخریج پیچھے گزر چکی ہے۔

باب:۱۴

محل زکوٰۃ اشیاء اور شرح زکوٰۃ

جس طرح صدقات کی عمومیت میں زکوٰۃ داخل ہے اسی طرح انفاق یا انفاق فی سبیل اللہ کی عمومیت میں زکوٰۃ داخل ہے۔ صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ میں فرضی صدقہ یعنی صدقہ زکوٰۃ تو ضرور شامل ہوتی ہے اور اس کے علاوہ دوسرے نفلی صدقات بھی شامل ہوتے ہیں۔ سورہ بقرہ کی ابتدا میں ہی اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی نہایت اہم خصوصیات کا ذکر فرمایا تو اقامت صلوٰۃ کے ساتھ زکوٰۃ کے بجائے انفاق کا لفظ استعمال فرمایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ﴾ (۲:۳) (جو غیب پر ایمان لاتے' نماز قائم کرتے اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے۔ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔)

اس آیت کی رو سے ہر قسم کی پیداوار اور آمدنی سے انفاق اور بالخصوص زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَ مِمَّا اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ (۲:۲۶۷) (اے ایمان والو! جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کھاتے ہو اور جو چیزیں ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالی ہیں ان میں سے خرچ کرو۔)

ان دونوں اور اس قسم کی اور بھی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کی کمائی جیسی اور جتنی بھی ہو اس میں سے خرچ کرنا ضروری ہے۔ تاہم سنت کی رو سے محل زکوٰۃ صرف چار قسم کی چیزیں ہیں (۱) سونا چاندی اور نقدی وغیرہ (۲) مویشی (۳) زرعی پیداوار اور (۴) اموال تجارت وصنعت۔

ا۔ سونا چاندی اور نقدی وغیرہ:

اس کے احکام درج ذیل ہیں۔

(۱) سونے کا نصاب ساڑھے سات تولے یا 85 گرام ہے۔ اس سے کم پر زکوٰۃ نہیں

(۲) چاندی کا نصاب ۵ اوقیہ = $52\frac{1}{2}$ تولے = 595 گرام ہے۔ اس سے کم پر زکوٰۃ نہیں۔

(۳) دور نبوی ﷺ میں سونے کا سکہ دینار اور چاندی کا سکہ درہم رائج تھا۔ 20 دینار سونا اور 200 درہم چاندی سے کم پر زکوٰۃ نہیں۔

(۴) زکوٰۃ اس مال پر اور اتنے مال پر نکالنا پڑتی ہے۔ جس پر ایک سال قمری گزر چکا ہو۔ گویا زکوٰۃ بچت پر ہوتی ہے۔ ایسی بچت جس پر سال گزر چکا ہو۔

(۵) شرح زکوٰۃ ربع عشر یا 1/4 یا $2\frac{1}{2}$% ہے یعنی ایک ہزار مالیت میں سے 25 روپے زکوٰۃ نکالنا ہوگی۔ اور اس نقدی سے جو حد نصاب سے زائد ہو اور اس پر سال گزر چکا ہو۔ پوری رقم پر زکوٰۃ ہوگی۔

دور نبویؐ میں سونا چاندی دونوں زر مبادلہ کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ اور ان کی قیمتوں میں صرف ایک اور سات کی نسبت تھی۔ یعنی $7\frac{1}{2}$ تولے سونا یا $52\frac{1}{2}$ تولے چاندی دوسرے لفظوں میں سونے کا بھاؤ چاندی سے صرف سات گنا ہوتا تھا۔ بعد کے ادوار میں سونے کی قیمت تو چڑھتی گئی۔ اور چاندی کی قیمت گرتی گئی اور اس کی غالباً دو وجوہ ہیں۔

اولاً چاندی کی بجائے صرف سونا ہی زر مبادلہ قرار پایا۔

ثانیاً- چاندی کے زیورات آہستہ آہستہ متروک ہو گئے۔

1937ء کی جنگ عظیم سے پہلے چاندی اور سونے کی مالیت میں تقریباً ایک اور تیس کی نسبت ہو چکی تھی۔ اور اب تو یہ نسبت اور بھی بہت زیادہ بڑھ چکی ہے اور آئندہ بھی یہ تفاوت بڑھنے کا امکان ہے۔

سونے اور چاندی کا حد نصاب جو شارع علیہ السلام نے مقرر فرما دیا۔ اس میں ردوبدل کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں خواہ یہ باہمی تفاوت اور بھی زیادہ ہو جائے مگر نقدی کے متعلق ہمیں ضرور کچھ فیصلہ کرنا ہوگا۔ کہ نقدی کا حد نصاب طے کرنے کے لیے چاندی کو بنیاد قرار دیا جائے یا سونے کو۔

اکثر علماء کا خیال ہے۔ کہ ہمارے ہاں نوٹوں کے اجراء سے پہلے چونکہ چاندی کا روپیہ رائج تھا لہٰذا چاندی کو بنیاد قرار دے کر چاندی کی موجودہ قیمت کے حساب سے $52\frac{1}{2}$ تولے چاندی کی قیمت نکال لی جائے۔ یہ حد نصاب ہوگا۔ اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سعودی عرب میں آج کل بھی کاغذی زر (نوٹوں) کو ورقہ کہتے ہیں۔ اور یہی لفظ چاندی کے لئے

استعمال ہوتا ہے۔ نیز چاندی کو ہی نقد روپیہ کے لئے نصاب قرار دینا اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ کہیں اللہ کا حق ہمارے ذمہ نہ رہ جائے لہٰذا اس اہم دینی فریضہ میں ہر ممکن احتیاط لازم ہے۔

آج کل مثلاً چاندی کا بھاؤ 60 روپے تولہ ہے تو $52\frac{1}{2}$ تولے چاندی کی قیمت -/3150 روپے بنتی ہے۔ اس سے کم نقد رقم پر کچھ زکوٰۃ نہ ہوگی۔ اور یہ تشخیص ہر مقام پر اور ہر دفعہ خود کرنا ہوگی۔

نیز دورِ نبوی ﷺ میں اپنی بچت کو محفوظ کرنے کا طریقہ درہم و دینار یا سونے چاندی کی شکل میں ہوتا تھا۔ لیکن آج کے دور میں بیسیوں شکلیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جیسے بنک سیونگ' فکسڈ ڈیپازٹ' پوسٹل سیونگ سرٹیفکیٹ' مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کے حصے' سرکاری تمسکات' انعامی بانڈ' بیمہ پالیسیوں میں اداشدہ رقوم اور پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ وغیرہ۔ زکوٰۃ نکالتے وقت ہر طرح کی بچتوں کو شمار کیا جائے گا۔

اب مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ مندرجہ بالا اقسام میں سے اکثر ناجائز ذرائع آمدنی ہیں۔ اور زکوٰۃ حرام مال کو حلال نہیں بنا سکتی۔ لہٰذا مندرجہ بالا ذرائع میں سے جن ذرائع میں سود یا سود کی آمیزش پائی جاتی ہے ان سے اجتناب کیا جائے۔

دوسرے لوگوں کو دیئے گئے ایسے قرضے جن کے وصول ہونے کی توقع ہو' بچت میں شمار ہوں گے اور ان کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔ خواہ یہ ہر سال ادا کر دی جائے اور خواہ قرضہ وصول ہونے پر یکمشت ادا کر دی جائے ہاں ڈوبے ہوئے قرضے جن کے ملنے کی توقع ہی نہیں ہوتی ان پر زکوٰۃ نہیں۔ ہاں اگر ایسا ڈوبا ہوا قرضہ مل جائے۔ تو صرف ایک سال کی زکوٰۃ ادا کر دینا چاہیے۔[1]

بعض لوگ پلاٹوں کا کاروبار کرتے ہیں پلاٹ اگر ذاتی ضرورت یعنی اپنا مکان بنانے کے لئے خریدا جائے تو اس پر زکوٰۃ نہیں۔ اگر اپنے مکان کے علاوہ ہو تو اس پر زکوٰۃ بہ حساب قیمت موجودہ لگے گی اور جو لوگ یہ کاروبار کرتے ہوں ان کے لئے زکوٰۃ کی ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جب کوئی پلاٹ بکے اس کی زکوٰۃ بحساب $2\frac{1}{2}$ فیصد نکال دیں۔ خواہ سال سے کم ہی عرصہ گزرا ہو۔ اور دوسرا یہ کہ سال بعد سب مالیت کا حساب کر کے $2\frac{1}{2}$ فیصد زکوٰۃ نکالیں۔ کیونکہ تجارتی مال ہے اور سب کی سب بچت ہے۔

---

[1] موطا۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب زکوٰۃ فی الدّین

۲۔ مویشی

احادیث میں صرف تین قسم کے جانوروں پر زکوۃ کا ذکر آتا ہے۔ اس لئے کہ اس دور میں عرب میں صرف یہی تین اقسام تھیں۔ جنہیں نسل کشی اور خرید و فروخت کے لئے پالا جاتا تھا۔ اور وہ ہیں۔ بکری گائے اور اونٹ۔

بکری کے نصاب اور شرح میں بکری۔ بکرا بھیڑ اور بھیڈ ؤ دنبہ نر و مادہ اور اس قبیل کے سب جانور شامل ہیں۔ اسی طرح گائے کی جنس میں گائے، بیل، بھینس اور بھینسا وغیرہ سب شامل ہیں اور اونٹ کی نوع میں اس کی جملہ اقسام شامل ہیں۔

چالیس بکریوں، تیس گایوں اور ۵ اونٹ سے کم پر کوئی زکوۃ نہیں جیسا کہ آئندہ نصاب سے واضح ہو جائے گا۔

مویشیوں کی زکوۃ میں بھی سال پورا ہونے کی شرط ہے اور جو جانور پورے سال کا نہ ہو۔ وہ بھی اموال زکوۃ میں تابع کی حیثیت سے شمار ہو گا۔ یہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس پر ابھی سال پورا نہیں ہوا۔

بھیڑ بکری:

بھیڑ بکری کا نصاب اور شرح زکوۃ درج ذیل ہے۔

(۱) ۴۰ تا ۱۱۹	ایک بکری	(۴) ۳۰۰ تا ۳۹۹	چار بکریاں
(۲) ۱۲۰ تا ۱۹۹	دو بکریاں	(۵) ۴۰۰ تا ۴۹۹	پانچ بکریاں
(۳) ۲۰۰ تا ۲۹۹	تین بکریاں	(۶) ۵۰۰ تا ۵۹۹	چھ بکریاں

علی ہذا القیاس ہر سو کے اضافہ پر ایک بکری زائد ہو گی۔ اور بھیڑ، بکری، دنبہ وغیرہ سب اکٹھے گنے جائیں گا۔

گائے بھینس وغیرہ:

گائے بھینس کا نصاب اور شرح درج ذیل ہے۔

(۱) ۳۰	تا	۳۹	ایک سال کا بچھڑا (نر ہو یا مادہ)
(۲) ۴۰	تا	۵۹	دو سال کا بچھڑا (نر ہو یا مادہ)

(۳) ۶۰	تا	۶۹	ایک سال کے دو بچھڑے (نر ہو یا مادہ)
(۴) ۷۰	تا	۷۹	ایک دو سالہ اور ایک ایک سالہ بچھڑے (نر ہوں یا مادہ)
(۵) ۸۰	تا	۸۹	دو دو سالہ نر یا مادہ بچھڑے
(۶) ۹۰	تا	۹۹	تین ایک سالہ نر یا مادہ بچھڑے۔
(۷) ۱۰۰	تا	۱۰۹	ایک دو سالہ اور ایک یکسالہ بچھڑے
(۸) ۱۱۰	تا	۱۱۹	دو دو سالہ اور ایک یکسالہ بچھڑے
(۹) ۱۲۰	تا	۱۲۹	تین دو سالہ یا چار یک سالہ بچھڑے۔ علیٰ ہذا القیاس

آخری شق کے مطابق ۳ دو سالہ بچھڑے اور ۴ یک سالہ بچھڑے قیمت کے لحاظ سے برابر ہیں۔ یعنی اگر ہم دو سالہ بچھڑے کی قیمت ۴۰ درہم فرض کریں تو ایک سالہ کی قیمت ۳۰ درہم ہوگی۔ اس فرضی قیمت کے لحاظ سے پہلی شق میں زکوٰۃ 30 درہم' دوسری میں 40' تیسری میں 60 چوتھی میں 70' پانچویں میں 80' چھٹی میں 90' ساتویں میں 100' آٹھویں میں 110 اور نویں میں 120 درہم بنتی ہے۔

زکوٰۃ کے وقت گائے بھینس سب کا اکٹھا شمار ہوگا۔ اور جو نوع زیادہ ہوگی۔ زکوٰۃ اس سے لی جائے گی۔

اونٹ:

عرب میں سب سے زیادہ اونٹ ہی پالے جاتے تھے۔ اس لیے ان کی تفصیل بھی لمبی چوڑی ہے جو درج ذیل ہے۔

(۱) ۵	تا	۹	ایک بکری جو ایک سال سے کم عمر کی نہ ہو
(۲) ۱۰	تا	۱۴	دو بکریاں جو ایک سال سے کم عمر کی نہ ہو
(۳) ۱۵	تا	۱۹	تین بکریاں جو ایک سال سے کم عمر کی نہ ہو
(۴) ۲۰	تا	۲۴	چار بکریاں جو ایک سال سے کم عمر کی نہ ہو
(۵) ۲۵	تا	۳۵	بنت مخاض یعنی مادہ (بوتی) جو دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہو۔
(۶) ۳۶	تا	۴۴	بنت لبون یعنی مادہ (بوتی) جو تیسرے سال میں داخل ہو چکی ہو۔
(۷) ۴۵	تا	۵۹	حِقة اونٹنی جو چوتھے سال میں داخل ہو چکی ہو۔

(۸) ۶۰	تا	۷۴	جذعة	اونٹنی جو پانچویں سال میں داخل ہو چکی ہو۔
(۹) ۷۵	تا	۸۹	بنت لبون	
(۱۰) ۹۰	تا	۱۱۹	دوحقة	
(۱۱) ۱۲۰	تا	۱۴۴	۱۲۰ پر دوحقة اور آگے ہر پانچ میں ایک بکری مثلاً ۱۲۴ میں دوحقہ اور ایک بکری اور ۱۳۲ میں دوحقہ اور تین بکریاں ہوں گی۔ علیٰ ہذالقیاس	
(۱۲) ۱۴۵	تا	۱۴۹	دوحقہ اور ایک بنت مخاض۔	
(۱۳) ۱۵۰	تا	۱۷۴	۱۵۰ پر تین حقہ اور آگے ہر ۵ پر ایک بکری۔	
(۱۴) ۱۷۵	تا	۱۹۴	تین حقہ اور ایک بنت لبون	
(۱۵) ۱۹۵	تا	۲۰۴	چار حقہ یا پانچ بنت لبون	
(۱۶) ۲۰۵	تا	۲۴۴	۲۰۵ پر چار حقہ اور آگے ہر پانچ پر ایک بکری	
(۱۷) ۲۴۵	تا	---	۲۴۵ پر پانچ حقہ اور آگے قیمتوں کے مذکورہ تناسب سے[۱]	

مویشیوں کے نصاب اور شرح زکوٰۃ کی تفصیل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں اس دور میں اونٹ ہی سب سے زیادہ پالا جاتا تھا۔

مویشیوں سے متعلق دیگر مسائل:

عرب میں گھوڑا ایک کمیاب جنس تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ جنگ بدر میں مسلمانوں کے پاس اونٹ تو 70 تھے مگر گھوڑے صرف 2 تھے۔ بقول حفیظ جالندھری۔

یہ ستر اونٹ دو گھوڑے یہاں سیراب ہو جاتے
مجاہد بھی وضو کرتے' نہاتے' غسل فرماتے !!!

لہٰذا رسول ﷺ نے گھوڑے کی جنس کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ لیکن دور فاروقی میں جب ایران فتح ہوا۔ اور وہاں یہ جنس کثیر تعداد میں تھی تو آپ نے گھوڑوں پر زکوٰۃ عاید کردی۔ اور یہ زکوٰۃ تجارتی زکوٰۃ یا بچت والی زکوٰۃ یعنی ہر چالیس گھوڑوں میں سے ایک گھوڑا ہوگی۔

البتہ اس بات پر اجماع ہے کہ ذاتی استعمال میں آنے والے یا جہاد کے لیے رکھے

---

[۱] بخاری۔ کتاب زکوٰۃ الغنم

ہوئے گھوڑے یا گھوڑوں پر زکوٰۃ لاگو نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں یہ عوامل میں شمار ہوں گے۔ اور اس کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔ **لیس فی الابل العوامل صدقة**[1] اس لحاظ سے کھیتی باڑی یا ہل چلانے کے بیل جو پیداوار کا ذریعہ ہیں وہ اموال زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوں گے یا ایسے گھوڑے بھی جو چارہ ڈھونے یا بار برداری کے لئے ہوں اور فروختنی مال نہ ہوں۔

آج جانوروں کی کئی ایسی صورتیں پیدا ہو چکی ہیں' جو دور نبوی میں نہ تھیں' مثلاً پولٹری فارم میں مرغیاں ڈیری فارم میں گائے بھینس اور مچھلی فارم وغیرہ۔ ان سب پر تجارتی زکوٰۃ عائد ہو گی۔ مچھلی اور ڈیری فارم سے دودھ' مکھن' دہی' بالائی وغیرہ حاصل ہوتے ہیں ان سب صورتوں میں سال بھر کے منافع پر چالیسواں حصہ زکوٰۃ عاید ہوگی۔

۳۔ زرعی پیداوار

(۱) زرعی پیداوار میں سال گزرنے کی شرط نہیں بلکہ جب فصل کاٹی جائے یا پھل توڑا جائے اسی وقت زکوٰۃ واجب ہوگی۔ ارشاد باری ہے۔

﴿وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ (۶/۱۴۲) (کھیتی کاٹنے کے دن ہی اللہ کا حق ادا کرو)

(۲) کھیتی اگر چشمہ یا بارانی پانی سے سیراب ہو تو اس میں عشر یعنی دسواں حصہ زکوٰۃ ہے اور اگر پانی مصنوعی طریقوں (کنواں' ٹیوب ویل وغیرہ) سے سیراب ہو جس پر محنت اور خرچ ہو تو اس میں نصف عشر یا بیسواں حصہ زکوٰۃ ہے۔[2]

(۳) اگر غلہ کی پیداوار ۵ وسق یا ۲۵ من یا ۹۴۸ کلوگرام سے کم ہو تو اس پر زکوٰۃ عاید نہ ہوگی۔[3]

(۴) رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں گندم' جو' منقہ (خشک انگور) اور کھجور سے زکوٰۃ لی جاتی تھی۔[3] مگر ہمارے ہاں اور بھی کئی اجناس بکثرت پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً چاول' چنے جوار' باجرہ' مکئی وغیرہ وغیرہ۔ ان سب اجناس پر زکوٰۃ واجب ہو گی۔ اور نصاب او رشرح زکوٰۃ وہی ہوگی جو اوپر مذکور ہوئی۔

(۵) عرب میں خشک پھلوں میں سے صرف منقہ اور کھجور کا ذکر آیا ہے جبکہ ہمارے ہاں اور بھی بہت سے خشک پھل کثیر مقدار میں پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے اخروٹ' بادام' خوبانی' مونگ پھلی' کشمش وغیرہ۔ یہ سب چیزیں جب حد نصاب کو پہنچ جائیں تو زکوٰۃ واجب

[1] بخاری- کتاب الزکوٰۃ- باب محاسبة المصدقین
[2] تا [3] بخاری- کتاب الزکوٰۃ- باب العشر فیما یسقی من الماء السماء

ہوگی۔

(۶) ایسی سبزیاں اور ترکاریاں جو جلد خراب نہیں ہوتیں۔ مثلاً آلو‘ پیاز‘ لہسن‘ ادرک‘ پیٹھا وغیرہ ان پر بھی زرعی زکوٰۃ واجب ہے۔ اور جو جلد خراب ہو جائیں مثلاً کدو‘ ٹینڈا‘ کریلے‘ توریاں وغیرہ ان پر زرعی زکوٰۃ عاید نہیں ہوتی بلکہ سال بعد ان کے منافع پر تجارتی زکوٰۃ عاید ہوگی۔

یہی صورت حال آج کل پھلوں کی ہے۔ کئی پھل ایسے ہیں جنہیں کئی ماہ تک کے لیے سٹور کیا جاسکتا ہے مثلاً آم‘ سنگترہ‘ مالٹا‘ سیب‘ انار وغیرہ وغیرہ یہ زرعی زکوٰۃ کے حکم میں ہیں اور جو پھل کم قیمت ہونے کی وجہ سے سٹور نہیں کیے جاتے اور جلد خراب ہو جاتے ہیں ان پر زرعی زکوٰۃ نہیں بلکہ تجارتی ہوگی۔

(۷) حد نصاب ۵ وسق کا اطلاق صرف اس غلہ پر ہوگا۔ جو عموماً اس ملک میں روزمرہ خوراک کا حصہ ہو اور کثیر مقدار میں پیدا ہوتا یا کیا جاتا ہو۔ مثلاً چاول گندم اور چنے وغیرہ اور جو کبھی کبھار استعمال ہوتے ہوں۔ مثلاً جوار‘ جو‘ مکئی وغیرہ ان میں حد نصاب کی شرط نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کھجور اور منقہ بطور خوراک استعمال ہوتے تھے جبکہ ہمارے یہاں کوئی پھل بطور خوراک استعمال نہیں ہوتا۔ خواہ وہ کتنی ہی کثیر مقدار میں پیدا ہوتے ہوں۔ لہٰذا ان میں حد نصاب کی شرط نہ ہوگی۔

(۸) بعض چیزیں ایسی ہیں جو پکنے سے پیشتر ہی استعمال ہونے لگتی ہیں مثلاً کچے یا ہرے چنے بطور سبزی کچے آم اچار کے لیے‘ مکئی کے دودھیا سٹے۔ ایسی چیزوں کی زکوٰۃ زرعی ہوگی اور اس دن عائد ہو جائے گی۔ جب وہ کاٹی گئیں۔

۴۔ دفینے اور معدنیات

خزانہ یا زمین سے کوئی دوسری مدفون چیز کسی کے ہاتھ لگ جائے تو اس میں زکوٰۃ ۵/۱ یا خمس یا 20% ہے۔ زکوٰۃ کے سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ اگر انسان کی محنت زیادہ ہو تو شرح زکوٰۃ کم ہوگی۔ اور جوں جوں انسانی محنت کم ہوتی جائے گی شرح زکوٰۃ بڑھتی جائے گی۔ سب سے کم شرح زکوٰۃ بچتوں یا نقدی یا اموال تجارت کی زکوٰۃ ہے جو چالیسواں حصہ ہے۔

مویشیوں کی زکوٰۃ کی بھی تقریباً یہی نسبت بنتی ہے۔ اوران پر انسان کو کافی محنت کرنا پڑتی ہے۔ دوسرے نمبر پر زرعی پیداوار ہے۔ جو انسانی محنت سے زیادہ قدرتی عوامل (زمین' پانی' سورج' چاند' ہوا وغیرہ) کی مرہون منت ہے اور اخراجات اور محنت کے مقابلہ میں بہت زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا اس پر زکوٰۃ دسواں حصہ یا عشر ہے۔ اس میں بھی یہ بات ملحوظ رکھی گئی کہ اگر کھیت یا باغ کی سیرابی انسانی محنت اور لاگت کا نتیجہ ہو تو زکوٰۃ نصف ہو جائے گی۔ اور رکاز (مدفون خزانہ) میں انسان کو مال مفت میں ہاتھ آ جاتا ہے جو اس قطعہ زمین کا مالک ہو جس سے یہ دفینہ نکلا ہے یہ دفینہ اسی کا ہوگا البتہ پانچواں حصہ زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔[1]

جو معدنیات یا سیال خزانے زمین سے برآمد ہوں مثلاً سونے چاندی یا دیگر دھاتوں اور نمک کوئلہ وغیرہ کی کان یا مٹی کا تیل یا سوئی گیس کا ذخیرہ وغیرہ وغیرہ وہ بیت المال کی یعنی حکومت کی ملکیت ہوتے ہیں ان سے کسی فرد کا اکیلے استفادہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ نیز اگر ایسی چیزوں کو افراد کی ملکیت میں دیا جائے تو بے شمار مفاسد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں لہٰذا عقلی لحاظ سے بھی یہ چیزیں قومی ملکیت میں چلی جانا چاہئیں۔ لہٰذا ان پر زکوٰۃ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۵۔ اموال تجارت اور صنعت پر زکوٰۃ

دور نبوی ﷺ میں اور خصوصاً عرب میں گو تجارت وسیع پیمانہ پر ہوتی تھی۔ لیکن اس کا انداز بالکل الگ تھا جس کا ذکر ہم تجارتی سود کے ضمن میں کر آئے ہیں۔ سال بھر میں دو دفعہ تجارتی قافلے سامان لے کر شام کی طرف نکل جاتے ادھر سے سامان لا کر فروخت کرتے پھر دوسرے سفر کی تیاری شروع کر دیتے لہٰذا مستقل دکانوں کا وجود کم ہی نظر آتا تھا۔ اسی طرح صنعت کا کام بھی صرف نجی طور پر پیشہ ورانہ اور نہایت محدود پیمانہ پر ہوتا تھا۔ لہٰذا اموال تجارت وصنعت کی زکوٰۃ کے احکام اس طرح تفصیل سے احادیث میں مذکور نہیں جس طرح دوسری محل زکوٰۃ اشیاء کی تفصیل مذکور ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ لوگ اکثر اموال تجارت وصنعت کی زکوٰۃ ادا کرنے سے قاصر ہی رہتے ہیں۔ اور ہو سکتا اس قسم کی زکوٰۃ کے وجوب کو جانتے ہی نہ ہوں۔ لہٰذا موضوع کی مناسبت سے اس موضوع پر ذرا تفصیل سے بحث کریں گے۔

عقلی طور پر یہ بات تعجب انگیز ہے کہ ایک غریب کسان تو اپنی آمدنی کا دسواں یا

---

[1] بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب فی الرکاز خمس

بیسواں حصہ ادا کرے اور وہ سیٹھ (تاجر یا صنعت کار) جو کسان سے کم محنت کر کے کروڑوں روپے کما رہا ہے اس پر زکوٰۃ عائد ہی نہ ہو۔ اور یہ حد درجہ کی ناانصافی بھی ہے۔ کتاب و سنت میں ایسے واضح احکام مذکور ہیں جن سے اموال تجارت و صنعت تو درکنار آمدنی کے کسی بھی نئے پیدا ہونے والے کاروبار پر زکوٰۃ کا وجوب ثابت ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

((یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ)) (۲:۲۶۷) (اے ایمان والو! جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کماتے ہو اور جو چیزیں ہم تمہارے لئے زمین سے نکالتے ہیں ان میں سے راہ خدا میں خرچ کرو۔)

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین[1] لکھتے ہیں کہ مِنْ طیبتِ ما کسبتم سے مراد

((زَکُّوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ بِتَصَرُّفِکُمْ اِمَّاا التِّجَارَةَ وَ اِمَّا الصِّنَاعَةَ)) (جو کچھ تم نے اپنے تصرف (محنت) سے خواہ تجارت کے ذریعہ یا صنعت کے ذریعہ کمایا ہے اس مال سے زکوٰۃ ادا کر کے اسے پاک کرو۔)

گویا اس آیت کی عمومیت ہر دور' ہر نسل اور ہر طرح کے اموال پر سب پر منطبق ہوتی ہے۔ خواہ یہ اموال کسی بھی جائز ذریعہ سے کمائے گئے ہوں۔

اب ارشاد نبوی ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت سمرہ بن جندب فرماتے ہیں:

((کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَاْمُرُنَا اَنْ نُخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِمَّا نَعُدُّهُ لِلْبَیْعِ۔[2])) (رسول اللہ ﷺ ہمیں ان تمام اشیاء سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم فرمایا کرتے تھے۔ جو بغرض فروخت ہمارے پاس ہوتیں۔)

اس ارشاد نبوی ﷺ سے دو اصولی باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) اموال صنعت پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ کیونکہ صنعتی پیداوار فروخت کے لئے ہی تیار کی جاتی ہے۔

(۲) زکوٰۃ صرف اس مال پر ہوگی جو فروختنی ہو۔ اس لحاظ سے کسی دکان کا فرنیچر اور باردانہ'

---

[1] تفسیر طبری ج ۲ ص ۸۰ طبع ۱۹۵۴ء/۱۳۷۲ھ' تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۴۰۔ تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۳۲۰ طبع ۱۹۳۶۔ تفسیر قاسمی ج ۲ ص ۶۸۳ طبع ۱۹۵۷/۱۳۷۶ھ

[2] ابوداؤد' کتاب الزکاۃ - باب العروض اذا کانت للتجارۃ (۱۵۶۲) بیہقی ۴/ ۱۴۶' ۱۴۷' تمہید ۱۷/ ۱۳۰' ۱۳۱ اس کی سند میں حبیب مجہول اور جعفر بن سعد ضعیف ہے۔ امام خطابی فرماتے ہیں: اموال تجارت پر زکوٰۃ واجب ہے اس پر علماء کا اجماع ہے (عون المعبود ۳/ ۲۴۷)

فیکٹری کی مشینری آلات اور ہل چلانے والے بیل وغیرہ وغیرہ سب اموال زکوٰۃ میں شمار نہ ہوں گے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((فِي الْإِبِلِ صَدَقَتُهَا وَفِي الْغَنَمِ صَدَقَتُهَا وَ فِي الْبَقَرِ صَدَقَتُهَا وَ فِي الْبَزِّ صَدَقَتُهَا [1])) (اونٹوں پر زکوٰۃ ہے، بکریوں پر زکوٰۃ ہے گائے پر زکوٰۃ ہے اور تجارت کے کپڑے پر زکوٰۃ ہے۔)

بَز، فروختنی کپڑے کو بزاز کپڑا فروش کو کہتے ہیں۔ اس حدیث سے باقی تجارتی اموال پر بھی زکوٰۃ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں تاجروں کا مال اکٹھا کرتے پھر ان اموال موجود اور غیر موجود سب کا حساب لگاتے پھر اس تمام مال پر زکوٰۃ وصول کیا کرتے تھے۔[2] ابوعمرو بن حماس چمڑے کے ترکش اور تیر بنایا کرتے تھے۔ یعنی یہ ان کا پیشہ تھا۔ حضرت عمرؓ ان کے پاس سے گزرے تو فرمایا۔ ان کی زکوٰۃ ادا کرو۔ ابوعمرو کہنے لگے۔ میرے پاس ان تیروں اور چمڑے کے ترکشوں کے سوا ہے کیا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے۔

((قَوِّمْهَا ثُمَّ اَدِّ زَكٰوتَهَا - [3])) (انہیں کا حساب لگاؤ اور ان کی زکوٰۃ ادا کرو۔)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس حکم سے صنعتی پیداوار پر زکوٰۃ کا وجوب ثابت ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی سال کے آخر میں زکوٰۃ موجودہ مالیت پر عاید ہوگی۔

تجارتی اموال کی زکوٰۃ کی تشخیص کے اصول

(۱) مال زکوٰۃ کی تشخیص موقع پر ہوگی یعنی اسی جگہ جہاں یہ مال موجود ہو۔

(۲) زکوٰۃ اسی مال سے لینا بہتر ہے جس کی زکوٰۃ ادا کرنا مقصود ہے اس میں زکوٰۃ ادا کرنے والے کی سہولت ہے تاہم اگر وہ اس کی قیمت نقدی کی صورت میں دینا چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔

---

[1] دارقطنی - باب ليس في الخضروات صدقة (۱۹۱۵، ۱۹۱۶) بیہقی ۴/ ۱۴۷ اس کی سند میں موسیٰ بن عبیدہ ربذی ضعیف ہے۔

[2] المحلی ج ۶ ص ۳۴ - مطبعه المنيريه - قاہرہ

[3] الام للشافعی ج ۲ ص ۳۸ مطبعہ الامیریہ قاہرہ - اسے احمد - ابن ابی شیبہ - عبدالرزاق اور دارقطنی نے بھی روایت کیا ہے۔

(۳) جو مال فروختنی نہ ہو یا عامل پیداوار ہو اس پر زکوٰۃ عاید نہیں ہوتی۔

مندرجہ بالا تینوں امور کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔

(۴) مال مستفاد کی آمیزش:

مال مستفاد وہ مال ہے جو دوران سال کسی وقت بھی کاروبار میں لایا جائے۔ مثلاً کاروبار شروع ہوئے چھ ماہ گزر گئے۔ تو مالک کو مزید کچھ رقم ہاتھ آ گئی۔ وہ رقم بھی اب اس نے کاروبار میں شامل کر دی۔ اب زکوٰۃ کی تعین کے وقت اس مال پر پورا سال نہیں گزرا۔ اگر صاحب مال چاہے تو اس مال کو مال زکوٰۃ سے الگ کر سکتا ہے اور اس مال کی زکوٰۃ کا حساب مزید چھ ماہ گزرنے پر کر کے زکوٰۃ نکال لے۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ ساتھ ہی ساتھ اس مال کی بھی زکوٰۃ نکال دی جائے۔ تا کہ آئندہ حساب کتاب کی پیچیدگیوں سے نجات حاصل ہو جائے۔ پھر اگر مال زکوٰۃ کچھ زیادہ بھی نکل گیا تو اللہ تعالیٰ اس کا بہت بہتر اجر دینے والا ہے۔

(۵) زکوٰۃ چالو کاروبار کی کل موجودہ مالیت پر عائد ہوگی:

زکوٰۃ موجودہ مالیت پر شمار ہوگی' نہ کہ اصل سرمایہ پر جو سال پہلے تھا۔ کیونکہ پورا سال گزرنے کی شرط راس المال کے لئے ہے دوران سال حاصل ہونیوالے منافع کے لئے نہیں۔ کیونکہ منافع اصل مال کے تابع ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی نے دس ہزار سے ایک کاروبار شروع کیا۔ پھر اس میں ماہ بماہ منافع کی رقم بھی شامل ہوتی رہی اور مالیت بڑھتی گئی۔ اور سال کے اختتام پر یہ رقم دس ہزار کی بجائے پندرہ ہزار ہو گئی۔ اب زکوٰۃ پندرہ ہزار پر لگے گی۔ نہ کہ دس ہزار پر۔ اسی طرح اگر کاروبار میں نقصان ہو جاتا ہے۔ اور سال کے آخر میں رقم دس ہزار کی بجائے سات ہزار رہ جاتی ہے تو زکوٰۃ سات ہزار پر لگے گی نہ کہ دس ہزار پر پردہ ختم کر دیں۔ اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو گئی۔ کہ زکوٰۃ کا تعلق نہ تو اصل سرمایہ سے ہے نہ نفع اور نقصان سے بلکہ اس کا تعلق موجود مالیت پر ہے۔

تشخیص زکوٰۃ:

مندرجہ بالا ہدایات اور احکامات کی روشنی میں ایک دکان کی مالیت یوں مشخص ہوگی۔

(ا) سب سے پہلے فروخت شدہ مال کی نقد رقم خواہ وہ پاس موجود ہے یا کچھ حصہ بنک میں بطور امانت ہے۔

(ب) موجودہ مال کی قیمت بحساب قیمت خرید بمعہ متفرق اخراجات بار برداری تا دکان مذکور۔

(ج) ادھار جو مال کی فروخت کے عوض گاہکوں کی طرف رہ گیا ہے اس میں ایسے ادھار کی رقوم جن کی وصولی کی توقع ہی نہ ہو وضع کی جا سکتی ہیں۔ ان تینوں رقوم کو جمع کر کے اسکا $2\frac{1}{2}$ فی صد نکال لیجئے۔ یہ اس دکان کی زکوۃ ہوگی۔

نوٹ: دوسروں سے قرض لے کر دکان میں لگایا گیا ہو تو وہ دکان کا سرمایہ ہی شمار ہوگا۔ تعیین زکوۃ کے وقت وضع نہ ہوگا۔

بعض دکانیں ایسی ہیں جن کا اچھا خاصا کاروبار ہوتا ہے لیکن ایسی دکانوں میں مال برائے نام ہوتا ہے۔ مثلاً سبزی فروش' پھل فروش' شیر فروش' قصاب' ہوٹل والے اور اخبارات وغیرہ کے دفاتر۔ ان کی دکانوں میں موجود مال تو حد نصاب کو پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے سالانہ منافع جات پر تجارتی زکوۃ عاید ہوگی۔

گوالے یا گوجر حضرات کی دکان سرے سے ہوتی ہی نہیں اگر ہوتی ہے تو برائے نام۔ بس ایک لکڑی کا تختہ ہی ان کی دکان ہے۔ یہ لوگ کافی تعداد میں گائے بھینسیں رکھتے ہیں۔ ان پر مویشی کی زکوۃ عائد نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ ان کے پاس بطور عامل پیداوار ہیں۔ ان کے سالانہ منافع جات پر تجارتی زکوۃ ہوگی۔ یہی صورت حال ڈیری فارم' پولٹری فارم اور مچھلی وغیرہ کی بھی ہے۔

نوٹ: گائے بھینس اگر افزائش نسل کی خاطر رکھی جائیں۔ تو ان پر زکوۃ گائے پر زکوۃ کی صورت میں ادا ہوگی۔ اگر کوئی صاحب مویشیوں کی خرید و فروخت کرتے ہوں تو تجارتی زکوۃ ہو گی۔ اگر ڈیری فارم میں یا گوالوں کے پاس ہوں تو یہ عوامل ہوں گے تو ان پر زکوۃ عائد نہ ہوگی۔ اور زکوۃ پیداوار پر ہوگی۔

جائیداد کی خرید و فروخت کرنے والے

جو لوگ اپنے زائد سرمایہ سے زمینوں کے پلاٹ اور مکان تجارتی نظریہ سے خریدتے اور فروخت کرتے رہتے ہیں۔ ان پر تجارتی زکوۃ عائد ہوگی۔ کیونکہ ان کی فروخت کے متعلق کچھ علم نہیں ہوتا کہ کب فروخت ہوں گے خواہ تین ماہ بعد بک جائیں خواہ تین سال تک بھی نہ بکیں۔ ایسے لوگ جب کوئی چیز بک جائے اس کی قیمت فروخت کے حساب سے زکوۃ نکال دیا کریں جب بھی بکے۔

(۲) یہی صورت مکان تعمیر کر کے بیچنے کا کاروبار کرنے والوں کے لیے ہوگی۔

(۳) جو لوگ مکان یا دکانیں تعمیر کر کے انہیں کرایہ پر چڑھا دیتے ہیں۔تو زکوٰۃ دکانوں اور مکانوں کی مالیت پر نہ ہوگی۔ بلکہ وصول شدہ کرائے کی کل رقم پر ہوگی۔اور سال بعد یہ حساب ہوگا۔

البتہ جو لوگ اپنی ذاتی ضرورت کے لیے کوئی پلاٹ یا مکان یا دکان خرید تے ہیں۔ان پر کچھ زکوٰۃ نہیں۔

مشترکہ کاروبار کی زکوٰۃ اور مثالیں

(۱) مضاربت اور زکوٰۃ:

جب کہ سرمایہ ایک کا ہو اور محنت دوسرے کی۔

زید اور بکر ایک کاروبار میں شریک ہوئے۔زید نے دس ہزار روپے سرمایہ لگایا۔بکر نے محنت کی۔نفع برابر طے ہوا۔سال کے آخر میں چار ہزار روپے منافع ہوا۔اب زکوٰۃ ۱۴ ہزار روپے پر ڈھائی فیصد کے حساب سے 350 روپے ہونی چاہئے۔جس میں سے ۱۲ ہزار روپے (اصل + منافع) پر زکوٰۃ تو زید (صاحب سرمایہ) ادا کرے گا۔جو -/300 روپے بنتی ہے اور بکر صرف دو ہزار منافع پر -/50 روپے بشرطیکہ یہ دو ہزار روپے اس وقت اور مقام کے لحاظ سے حد نصاب کو پہنچ جائیں ورنہ بکر پر زکوٰۃ نہیں لگے گی۔

(۲) بصورت نقصان زکوٰۃ:

مندرجہ بالا مثال میں اگر نفع کے بجائے دو ہزار روپے نقصان ہو جاتا ہے اور سرمایہ آٹھ ہزار رہ جاتا ہے۔تو آٹھ ہزار (موجودہ مالیت) پر زکوٰۃ لگے گی۔اور یہ زید ہی ادا کرے گا۔

(۳) شراکت

جب کہ ہر شریک سرمایہ بھی لگائے اور محنت بھی کرے۔

زید نے ایک کام میں دس ہزار روپے لگائے۔۲ ماہ بعد بکر 2000 روپے شامل کر کے شریک ہوگیا۔مزید ۵ ماہ گزرنے پر عمرو نے 6000 روپے شامل کر دیئے۔سال کے اختتام پر زکوٰۃ کا حساب کیسے ہوگا جب کہ سال کے آخر میں کاروبار کی مجموعی مالیت -/26,500 روپے ہوئی۔

حل: اس سوال میں بکر اور عمر مختار ہیں۔ اگر چاہیں تو زکوٰۃ ادا کریں۔ چاہے تو سال گزرنے پر زکوٰۃ ادا کریں۔ تاہم اگر وہ بھی زید کے ساتھ ادا کرنے پر رضامند ہو جائیں تو ہر ایک کے ذمہ زکوٰۃ اس طرح نکالی جائے گی۔

پہلے شراکت کے سوالوں کی طرح ہر ایک کا منافع اس کے سرمایہ میں شامل کیا جائے گا۔ سرمایہ کی اکائیوں کو مدت سے ضرب دے کر ہر ایک کا منافع الگ الگ معلوم کیا جا سکتا ہے۔

زید کے سرمایہ کی اکائیاں: 120=12x10

بکر کے سرمایہ کی اکائیاں: 20 = 10x2

عمر کے سرمایہ کی اکائیاں: 30 = 5x6

نسبتی مجموعہ: 30+20+120=170 یا 3+2+12=17

منافع: (کل مالیت - اصل سرمایہ): 8500=(6000+2000+1000-26,500)

زید کی مالیت: 16000 روپے $\frac{8500}{1} = \frac{12}{17}$

بکر کی کل مالیت: 3000 روپے $\frac{8500}{1} = \frac{2}{17}$

بکر کی کل مالیت: 7,500 روپے $\frac{8500}{1} = \frac{3}{17}$

کل مالیت: 26,500 روپے پر زکوٰۃ بحساب ڈھائی فیصد۔

زید کی زکوٰۃ 400 روپے' بکر کی زکوٰۃ: 75 اور عمر کی زکوٰۃ 1/2 182 روپے ہوگی۔

زید پر زکوٰۃ نکالنا فرض ہے۔ باقی دونوں مختار ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ابھی ادا کر دیں اور پھر سال بھر بعد دیں۔ ورنہ اپنی سال سال بھر کی مدت کے بعد انہیں اسی طرح نئے سرے حساب کر کے زکوٰۃ نکالنا ہوگی۔ حساب کرتے وقت یہ بات خاص طور پر ملحوظ رہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا حق بندہ کی طرف نہ رہ جائے۔

(۴) کمپنیوں کے حصص اور زکوٰۃ:

آج کل بے شمار کمپنیاں جن میں سے اکثر لمیٹڈ ہوتی ہیں۔ لوگوں کے سرمایہ سے کاروبار کرتی ہیں۔ ان کا طریق مشہور و معروف ہے۔ مثلاً ایک کمپنی اپنا کاروبار چلانے کے لیے

ایک لاکھ روپے کی رقم متشخص کرتی ہے۔ وہ اس کے 100 حصے مقرر کر کے عوام کو دعوت دیتی ہے کہ -/100 روپے فی حصہ کے حساب سے جو شخص چاہے اور جتنے حصے چاہے خرید سکتا ہے۔ بعض کمپنیاں تو مضاربت کی شکل میں کام کرتی ہیں اور اکثر ترجیحی حصص یا Debentures کے ذریعہ سرمایہ حاصل کرتی ہیں۔ یہ ترجیحی حصص عندالطلب قابل واپسی بھی ہوتے ہیں۔ اور ان پر ایک مقرر شرح سے منافع بھی ملتا رہتا ہے۔ یہ تو خالص سودی کاروبار ہے۔ یہ حرام ہے۔ لہٰذا ان حصص پر زکوٰۃ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا زکوٰۃ حرام مال کو حلال نہیں بنا سکتی۔ رہے مضاربت کے حصص۔ تو ایسی صورت میں زکوٰۃ مخلوط مال کی صورت میں ادا ہوگی۔ ہاں اگر کمپنی یہ اہتمام نہ کرے تو ہر حصہ دار صاحب نصاب خود اپنی زکوٰۃ ادا کرے۔ اور اگر صاحب نصاب نہیں ہے تو نہ کرے۔

کمپنیوں کے حصص کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ایک سال بعد -/100 روپے کے حصہ کی قیمت منافع کی شکل میں۔ -/150 روپے بھی ہو سکتی ہے اور نقصان کی صورت میں 60 روپے بھی۔ اگر کمپنی سودی کاروبار میں ملوث ہو تو ان کے حصص کی خرید و فروخت حرام ہے اور اگر مضاربت کی صورت میں کام کر رہی ہو تو جائز ہے۔ ان کی خرید و فروخت آج کل سٹاک ایکس چینج کے ذریعہ ہوتی ہے جو اس کام کی برائے نام کمیشن لے لیتے ہیں۔ اور کمپنی کے ریکارڈ میں بائع کے بجائے مشتری کا نام آ جاتا ہے۔ ایسے حصوں پر زکوٰۃ صاحب نصاب پر موجودہ قیمت کے لحاظ سے عائد ہوگی نہ کہ ابتدا میں لگائے ہوئے سرمایہ کے حساب سے۔

یہ ہیں زکوٰۃ کی تشخیص کے بنیادی اصول جن کی مدد سے ہر آدمی اگر نیک نیتی سے اپنی زکوٰۃ خود متشخص کرنا چاہتے تو کر سکتا ہے اور اگر گنجائش نکالنا چاہے تو یہ اس کی اپنی گردن پر ہے۔

صنعتی پیداوار کی زکوٰۃ

صنعتی پیداوار کی زکوٰۃ کی شرح میں علماء میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ صنعتی زکوٰۃ کو دکانوں کے کرایہ جات پر قیاس کر کے سالانہ منافع پر تجارتی زکوٰۃ ادا کرنا چاہیے۔

یہ قیاس قیاس مع الفارق معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ دکانوں کے کرائے کی صورت میں صرف دو چیزیں قابل ذکر ہیں۔ دکانیں (اصول ثابتہ یا عوامل پیداوار) اور ان کے کرایہ جات (جو ان کے منافع ہیں) جبکہ صنعت میں ان دو چیزوں کے علاوہ ایک تیسری چیز فیکٹری کی پیداوار بھی ہے جو کہ زرعی زکوٰۃ سے مماثلت رکھتی ہے۔

متقدمین کی مختلف آراء کو ملحوظ رکھتے ہوئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے بھی یہی رائے پیش کی ہے۔ کہ صنعتی پیداوار کی زکوٰۃ پیداوار پر ہونی چاہیے نہ کہ خالص منافع جات پر۔[1]

صنعتی پیداوار اور زرعی پیداوار میں مماثلت کی کئی صورتیں ہیں اور وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) جس طرح زمین کی پیداوار اصول ثابتہ (زمین آلات کشاورزی' ہل' بیل' ٹریکٹر' تھریشر' ٹیوب ویل وغیرہ) کی قیمت کے مقابلہ میں بہت قلیل ہوتی ہے۔ بعینہ یہی صورت حال صنعتی پیداوار کی ہے۔ ایک فیکٹری کی پیداوار کی قیمت بھی اس کی عمارت' مشینری' فرنیچر اور دیگر لوازمات کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی ہے اس کی مثال یوں سمجھیے کہ اگر ایک صنعت کار ایک کروڑ روپے سے کام شروع کرنا چاہتا ہے تو اسے کم از کم ۸۰ لاکھ روپے اس کی عمارت' مشینری کی خرید اور اسے نصب کرنے پر خرچ کرنا پڑیں گے۔ باقی بیس لاکھ سے وہ خام مال بھی خریدے گا۔ اور ملازمین کی تنخواہیں اور دیگر اخراجات کا کام بھی چلائے گا۔

اس تصریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صنعتی زکوٰۃ کو تجارتی زکوٰۃ کی طرح سمجھنا مناسب نہیں۔ کیونکہ تجارت کی صورت اصول ثابتہ (فرنیچر' اسٹیشنری' باردانہ وغیرہ) پر جو رقم خرچ کی جاتی ہے۔ وہ اس سرمایہ کا ایک قلیل حصہ ہوتا ہے۔ جو کاروبار میں مشغول کیا جا رہا ہے اور فروختنی مال کی قیمت اصول ثابتہ سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن فیکٹری' مل یا کارخانہ کی صورت میں موجود مال کی قیمت اصول ثابتہ کی نسبت بہت کم ہوتی ہے۔

(۲) بعض زمینیں سال میں ایک فصل دیتی ہیں بعض دو اور بعض متعدد بار دیتی رہتی ہیں۔ اور یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ ایسی سبزیاں یا ترکاریاں جو دو چار دن تک خراب نہیں ہوتیں۔ مثلاً آلو' پیاز' لہسن' ادرک وغیرہ۔ اگر فروخت کرنے پر ان کی قیمت حد نصاب کو پہنچ جائے تو ان پر زکوٰۃ عائد ہوگی اور یہ زرعی زکوٰۃ (دسواں یا بیسواں حصہ) ہوگی۔ نہ کہ تجارتی یا بچت کی زکوٰۃ بعینہ یہی صورت حال کارخانوں کی ہے۔ بعض فیکٹریوں کا سال بھر میں صرف ایک سیزن ہوتا ہے۔ جیسے برقی پنکھے کا کارخانہ' شوگر ملز' برف خانہ وغیرہ۔ اور بعض سال میں دو بار فصل دیتے ہیں۔ جیسے اینٹوں کے بھٹے اور بعض سارا سال پیداوار تیار کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ لہٰذا صنعتی پیداوار کی زکوٰۃ کی طرح ﴿وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ (۶/۱۴۱) کے مطابق سیزن ختم ہونے پر ادا کر دینا چاہیے اور جو کارخانہ سال بھر کام کرتے ہیں۔ ان پر زکوٰۃ سال کے بعد جملہ پیداوار کا حساب

---

[1] قرآن کی معاشی تعلیمات ص ۵۱

کرنے کے بعد عائد ہو گی۔

(۳) جس طرح زرعی پیداوار برائے فروخت منڈی بھیجی جاتی ہے۔اس طرح صنعتی پیداوار بھی منڈی میں فروخت کی جاتی ہے۔

ان تینوں وجوہ مماثلت کی بنا پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ زکوٰۃ زرعی پیداوار کی طرح ہونا چاہیے۔اس کی شرح بیسواں حصہ یا پانچ فیصد ہونا چاہیے۔

لیکن مندرجہ بالا تین وجوہ مماثلت کے باوجود ایک پہلو ایسا بھی ہے کہ جو ایک دوسرے سے متضاد اور متناقض ہے اور وہ یہ ہے کہ زرعی پیداوار پر پیداوار کی قیمت کے لحاظ سے لاگت بہت کم آتی ہے لاگت سے ہماری مراد بیج کی قیمت' کھاد وغیرہ کی قیمت اور سیرابی کا معاوضہ ہے۔خواہ یہ نہری پانی کا سرکاری معاملہ ہو۔یا ٹیوب ویل سے معاوضہ پر لیا گیا ہو۔زرعی پیداوار کا تو یہ حال ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک دانہ سے سات سو دانے پیدا کر دیتے ہیں۔اور بعض دفعہ اس سے بڑھا بھی دیتے ہیں جبکہ صنعتی پیداوار میں لاگت بہر حال منافع سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔

ان سب باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمارے خیال میں زکوٰۃ ادا تو ﴿اٰتُوا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ کے اصول کے مطابق کرنی چاہئے اور شرح زکوٰۃ 5% ہونا چاہئے اور یہ پیداوار پر نہیں بلکہ منافع پر ہونی چاہیے اگر یہ زکوٰۃ مجموعی پیدوار پر 5% کے حساب سے لگائی جائے۔تو ممکن ہے کہ صنعت کار کو منافع کی بعض حالات میں توقع ہی نہ رہے۔

زکوٰۃ اور ٹیکس

بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہو چکا ہے۔جو یہ کہتا ہے کہ زکوٰۃ کا جو نصاب اور جو شرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی تھی۔وہ ان کے اپنے دور کے لیے اور اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق تھی۔ایک اسلامی حکومت آج جو بھی ٹیکس اس دور کے تقاضوں کے مطابق وصول کرتی ہے۔وہی زکوٰۃ ہے۔اسلامی حکومت اگر چاہے تو وہ شرح زکوٰۃ میں کمی بیشی بھی کرنے کی مجاز ہے اور نئے ٹیکس لگانے کی بھی۔اور جو کچھ بھی وہ کرے وہ زکوٰۃ ہی متصور ہو گی۔اس لئے ایک اسلامی حکومت میں وہ زکوٰۃ' جس کی تفاصیل کتب احادیث میں ملتی ہیں نکالنے کی ضرورت نہیں۔

ان حضرات نے چونکہ اسلام کے ایک نہایت اہم اور بنیادی رکن کو مشکوک بنانے کی

کوشش فرمائی ہے۔ لہٰذا ہم ان باتوں کا جواب ذرا تفصیل سے دینا چاہتے ہیں۔ اس بحث کو ہم دو حصوں میں تقسیم کریں گے۔ ایک یہ کہ زکوٰۃ اور ٹیکس کے درمیان کیا فرق ہے؟ اور دوسرے یہ کہ آیا زکوٰۃ کی موجودگی میں مسلمانوں پر اسلامی حکومت کوئی اور ٹیکس لگانے کی مجاز ہے یا نہیں۔

ا۔ زکوٰۃ اور ٹیکس میں فرق

اگر تھوڑا سا بھی غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ زکوٰۃ اور ٹیکس میں ہر ایک کی حقیقت، مقاصد، محاصل، مصارف، نتائج اور مزاج کسی ایک چیز میں بھی مماثلت نہیں ہے۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) بنیادی فرق:

عہد نبوی اور خلفائے راشدین کے دور میں مسلمانوں سے تو زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی اور غیر مسلموں سے خراج اور جزیہ، عرب کا ہمسایہ ملک ایران ایک متمدن حکومت تھی ایران میں زمینداروں سے جو مالیہ وصول کیا جاتا۔ اسے "خراگ" کہتے تھے۔ خراج کا لفظ اسی سے معرب ہے اور خراگ کے علاوہ دوسرے ٹیکسوں کو "گزیت" کہتے تھے۔ جزیہ کا لفظ اسی سے معرب ہے۔ گویا غیر مسلموں پر وہی ٹیکس بحال رکھے گئے جو زمانہ کے دستور کے مطابق تھے مگر مسلمانوں سے یہ عام ٹیکس ساقط کر دیئے گئے اور اس کے بجائے زکوٰۃ عائد کی گئی۔

ان ٹیکسوں اور زکوٰۃ میں دوسرا فرق یہ تھا کہ زکوٰۃ کا نصاب اور شرح ہمیشہ غیر متبدل رہی جبکہ جزیہ اور خراج کی شرح میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جزیہ کی شرح ایک دینار فی کس سالانہ تھی۔ اور یہ رقم ہر بوڑھے، بچے، عورت، معذور سب سے بحساب مشترک وصول کی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس میں اصلاح کی، بوڑھے، بچوں، عورتوں اور معذوروں سے جزیہ ساقط کر دیا۔ باقی غیر مسلم معاشرہ کے مالی لحاظ سے تین طبقے مقرر کیے جن سے علی الترتیب ۴ دینار دو دینار اور ایک دینار سالانہ کے حساب سے وصول کیا جاتا تھا۔ اسی طرح قبیلہ بنی تغلب کے عیسائیوں نے مسلمانوں سے یہ درخواست کی کہ ان سے خراج کا دوگنا عشر لے لیا جائے تو مسلمانوں نے ان کی یہ تجویز منظور کر لی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس دور میں زکوٰۃ کو دین کا رکن سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے احکامات غیر متبدل تھے جبکہ جزیہ اور خراج کی

شرح میں تغیر و تبدل کر لیا جاتا تھا۔

تیسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ مسلمانوں سے زکوۃ کے علاوہ جو کچھ بھی وصول کیا جاتے اسے مکس کہا جاتا ہے۔ مکس کے معنی المنجد (عربی' اردو) نے محصول ٹیکس اور چونگی لکھے ہیں اور ماکس کے معنی ٹیکس وصول کرنے والا منتہی الارب (عربی' فارسی) نے اس کے معنی ''باج' خراج'' گرفتن اور مقائیس اللغہ (عربی) میں اس کے معنی كَلِمَةٌ تَدُلُّ عَلٰى جَبِى مَالٍ اور جباۃ کا لفظ محصول اکٹھا کرنے کے لئے محاورتاً استعمال ہوتا ہے۔

مکس کی شرعی حیثیت یہ ہے کہ دور نبوی میں جب قبیلہ غامدیہ کی عورت کو زنا کے جرم میں سنگ سار کیا گیا تو حضرت خالد بن ولید نے اسے ایک پتھر مارا جس کی وجہ سے خون کے چند چھینٹے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے منہ پر بھی پڑے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو گالی دی۔ تو حضور اکرم ﷺ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

((فَهَلًا يَا خَالِدُ ! فَوَالَّذِي نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً لَوْ تَابَهَا صَاحِبُ مَكْسٍ لَغُفِرَ لَهٗ[1])) (اے خالد یہ کیا بات ہوئی اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر کوئی ٹیکس وصول کرنے والا بھی ایسی توبہ کرے تو معاف کر دیا جائے۔)

گویا مکس کا جرم کسی صورت میں زنا سے کم نہیں ہے۔ دوسرے مقام پر آپ نے ارشاد فرمایا۔

((لَا يَدْخُلُ صَاحِبُ مَكْسٍ فِي الْجَنَّةِ)) (ٹیکس وصول کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔)

اور مشکوۃ میں صاحب مکس کا معنی اَیْ مَنْ يَأْخُذُ الْعُشْرَ وَ يَزِيْدُ عَلَيْهِ شَيْئًا۔ یعنی وہ شخص جو عشر وصول کرتا ہے اور اس سے کچھ زیادہ بھی لیتا ہے۔ ان الفاظ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ عامل یا زکوۃ وصول کنندہ زکوۃ وصول کرنے کے بعد جو کچھ بطور رشوت لے وہ مکس ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وصول کنندہ حکومت عشر کی شرح میں اضافہ کر دے (مثلاً 10% کی بجائی 15% اور 5% چاہی یا نہری کی زکوۃ کے بجائے 7% وصول کرے) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکومت عشر کے

[1] مسلم- کتاب الحدود- باب حد الزنا

علاوہ کوئی دوسرا ٹیکس بھی عائد کرے۔ تاہم لغت اس تیسرے مفہوم کی تائید کرتی ہے۔ اور یہ بات بھی قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ مکس کا لفظ ہی دوسری زبان میں جا کر ٹیکس بن گیا ہو۔

ان تصریحات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مکس زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے ٹیکس کا نام ہے جو مسلمانوں پر عائد کیا جائے یا پھر اس اضافہ کا نام ہے جو شرح زکوٰۃ میں کیا جائے اور یہ ایک کبیرہ گناہ ہے۔

مقصد کے لحاظ سے فرق:

ٹیکس کا مقصد عوام کی آمدنی کا ایک حصہ لے کر اس سے نظام حکومت چلانا۔ رفاہ عامہ کے کام کرنا۔ اور اس سے ملکی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے جبکہ زکوٰۃ کا بنیادی مقصد تطہیر مال اور تزکیہ نفس ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

((خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا)) (۹: ۱۰۳)

(اے پیغمبر! آپ ان (مسمانوں کے) اموال سے زکوٰۃ وصول کر کے ان اموال کو پاک کیجئے اور ان کا تزکیہ نفس کیجئے۔)

اس آیت میں زکوٰۃ کے دو مقصد بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ کمائی میں جو کوتاہیاں اور لغزشیں دانستہ طور پر ہو جاتی ہیں۔ صدقہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ یہ کوتاہیاں معاف کر دیتے ہیں اور یہ کمائی پاک وطیب ہو جاتی ہے۔

اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ صدقہ کی ادائیگی کی وجہ سے مال کی محبت سے پیدا ہونے والی اخلاقی بیماریوں کے جراثیم سے انسان کا دل پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

زکوٰۃ پہلی امتوں پر بھی فرض کی گئی تھی۔ ان لوگوں کے اموال زکوٰۃ وخیرات اور نذر نیاز ایک جگہ جمع کر دیئے جاتے رات کو آسمان سے آگ آتی جو اس مال کو بھسم کر دیتی تھی جو اس بات کی دلیل ہوتی کہ ان کی قربانی قبول ہو گئی۔

زکوٰۃ کے ذریعہ غریب عنصر کی پرورش زکوٰۃ کا ضمنی فائدہ ہے۔ مقاصد وہی دو ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے امت محمدیہ کو غنیمت اور زکوٰۃ کے اموال کو معاشی بہبود کے طور پر استعمال کی اجازت دی ہے۔

(۳) محاصل کے لحاظ سے فرق:

اسلامی نقطہ نظر سے معاشرہ کو معاشی لحاظ سے صرف تین طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایک وہ جن سے زکوٰۃ وصول کی جائے یہ لوگ اہل نصاب یا غنی ہیں۔

(۲) دوسرے وہ جن میں زکوٰۃ تقسیم ہوگی۔ یہ لوگ فقراء و مساکین ہیں۔

(۳) متوسط طبقہ جو زکوٰۃ دینے کا اہل ہوتا ہے نہ لینے کا۔ مثلاً ابوداؤد کی ایک حدیث کے مطابق جس کے پاس ایک اوقیہ چاندی کی مالیت کے برابر کوئی بھی چیز ہو وہ زکوٰۃ لینے کا مستحق نہیں۔ جبکہ زکوٰۃ کا حد نصاب ۵ اوقیہ چاندی ہے۔

اصول یہ ہے کہ تیسرے طبقہ کا زکوٰۃ سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ زکوٰۃ نمبر۱ سے لے کر نمبر۲ میں تقسیم کی جاتی ہے۔ گویا زکوٰۃ کا مال امراء کی جیب سے نکلتا ہے۔ اور غریبوں پر صرف ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ٹیکس کی رقوم کا بیشتر حصہ غریبوں کی جیب سے نکلتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ 77-1976ء کے گوشوارہ کے مطابق ہماری حکومت کی مجموعی آمدنی کا 75% حصہ صرف ٹیکسوں سے وصول ہوا تھا اور باقی 25 فیصد دوسرے ذرائع آمدنی سے' اب یہ ٹیکس دو طرح کے ہوتے ہیں۔

(ا) بلاواسطہ یا براہ راست ٹیکس جیسے انکم ٹیکس' پراپرٹی' دولت ٹیکس وغیرہ۔ یہ امراء پر لگائے جاتے ہیں۔ 77-1976 کے بجٹ کے مطابق ان ٹیکسوں سے ٹیکس کی مجموعی آمدنی کا صرف 12.3% آمدنی ہوئی۔

(ب) بالواسطہ ٹیکس۔ یہ وہ ٹیکس ہیں جو اداتو صنعت کار اور تاجر کرتے ہیں۔ لیکن یہ ٹیکس قیمت فروخت میں شامل کر کے ان کا بوجھ صارفین پر ڈال دیتے ہیں۔ جیسے سیلز ٹیکس' ایکسائز ڈیوٹی وغیرہ' جو چینی سریا' سیمنٹ' سوتی کپڑا اور دیگر بے شمار اشیاء پر لگائے جاتے ہیں۔ ان ٹیکسوں سے ٹیکس کی کل آمدنی کا 87.7% آمدنی ہوئی۔

ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں صارفین کا بیشتر حصہ غریب طبقہ ہی ہے۔ لہٰذا ٹیکسوں کا زیادہ تر بوجھ یہی طبقہ برداشت کرتا ہے۔

(۴) مصارف میں فرق:

زکوٰۃ کا سب سے بڑا اور اہم مصرف غریب طبقہ کی بنیادی ضروریات کی کفالت ہے۔ جبکہ ٹیکس ملکی ضروریات کو پورا کرنے اور رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ ہوتے ہیں۔ گو یہ چیزیں سب کے لئے مشترکہ ہوتی ہیں۔ لیکن عملاً امیر طبقہ ہی ان سے زیادہ مفاد حاصل کر پاتا ہے۔ مثلاً اعلیٰ

تعلیم کا حصول یا حصول انصاف جو کسی غریب کے بس کا روگ نہیں۔اسی طرح اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ امیر طبقہ اپنے اثر اور وسائل کی بنا پر ہر چیز سے زیادہ فائدہ اٹھا جاتا ہے۔گویا ٹیکس کی رقم جس کا زیادہ حصہ غریب کی جیب سے نکلا تھا۔اس سے امیر زیادہ فائدہ اٹھا گیا۔

زکوٰۃ دین اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن ہے اور اس کے ذریعہ طبقاتی تقسیم میں بہت حد تک کمی واقع ہو جاتی ہے۔جبکہ ٹیکس سرمایہ داری نظام کے دو اہم ارکان سود اور ٹیکس میں سے ایک رکن ہے جس طرح سے سود سے بالآخر سرمایہ دار ہی کو فائدہ پہنچتا ہے۔اسی طرح ٹیکس کا بار تو غرباء پر زیادہ ہوتا ہے۔اور فائدہ امیر زیادہ حاصل کرتا ہے۔

(۵) مزاج اور نتائج کے لحاظ سے فرق:

(۱) عام ٹیکس عموماً آمدنی پر لگتے ہیں جس سے دولت جمع کرنے کی ہوس بڑھتی ہے۔جبکہ زکوٰۃ عموماً بچت پر لگتی ہے جس سے اندوختہ کاری کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔اور سرمایہ حرکت میں رہتا ہے جس سے معیشت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔

(۲) زکوٰۃ بچت پر لگنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں فرد کی ضرورتوں اور اخراجات کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔جبکہ عام ٹیکس آمدنی پر لگتے ہیں اور فرد کے اخراجات یا کمی بیشی کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ فرض کیجئے زید اور بکر دونوں ایک ایک ہزار روپے تنخواہ لیتے ہیں۔زید ابھی غیر شادی شدہ ہے اور وہ باآسانی چھ سات سو روپے ماہوار پس انداز کرتا ہے جبکہ بکر کے پانچ چھ بچے بھی ہیں۔اور بمشکل گزر بسر کرتا ہے۔تو ٹیکس ان کے اس امتیاز میں کوئی فرق نہیں کرے گا۔

(۳) عام ٹیکس محض حکومت کے نظم ونسق اور ترقیاتی منصوبوں پر خرچ کیے جاتے ہیں۔جبکہ زکوٰۃ کا بیشتر حصہ ضرورت مند افراد پر خرچ کیا جاتا ہے جس سے ان میں قوت خرید بڑھتی ہے اور اس طرح ملک کی پیداوار اور روزگار میں ترقی ہوتی ہے۔

(۴) ٹیکس کو ایک بوجھ تصور کیا جاتا ہے۔ٹیکس دہندہ کبھی پوری مالیت ظاہر نہیں ہونے دیتے اور ٹیکس وصول کرنے والے بھی رشوت لے کر خود ٹیکس چوری کی راہیں پیدا کر دیتے ہیں اس ملی بھگت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت کو متوقع رقم کا نصف بھی حاصل نہیں ہوتا اور وہ ٹیکس بڑھانے اور مزید ٹیکس عائد کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔جبکہ زکوٰۃ ایک دینی فریضہ اور مالی عبادت ہے جسے بیشتر مسلمان بخوشی ادا کر دینے میں ہی سعادت سمجھتے ہیں۔اسی طرح اس میں رشوت کا بھی امکان

بہت کم ہوتا ہے۔

۲۔ زکوٰۃ کی شرح میں تبدیلی اور دوسرے ٹیکس

ان حضرات کا دعویٰ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو چیزیں محل نصاب قرار دی ہیں اور جو شرح زکوٰۃ مقرر فرمائی ہے تو یہ تعیین فقط عہد نبوی کے لیے تھی۔ جبکہ ملکی اور قومی ضروریات محدود تھیں آج حکومتیں بہت سی ذمہ داریاں اپنے سر لیتی ہیں جن پر کثیر مصارف اٹھتے ہیں۔ لٰہذا عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق ایک اسلامی حکومت اس معینہ شرح میں اضافہ کا حق رکھتی ہے نیز نئے ٹیکس بھی عائد کر سکتی ہے اور سنت نبوی یہی ہے کہ جس طرح آپ نے بحیثیت حکمران زمانہ کے تقاضوں کے مطابق محل زکوٰۃ اشیاء اور ان کی شرح مقرر کی تھی اسی طرح ایک اسلامی حکومت اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق محل زکوٰۃ اشیاء اور ان کی شرح (یعنی ٹیکسوں اور ان کی شرح) کی تعیین کرے۔

شرح زکوٰۃ میں تبدیلی:

ان حضرات کا یہ دعویٰ ایسا ہے جس پر وہ کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے۔ ان حضرات کے خیال میں محل زکوٰۃ اشیاء کی تعیین اور شرح زکوٰۃ ایک تدبیری امر تھا' الہامی نہ تھا۔ اور تدبیری امور میں آپ کو قرآن کریم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کا حکم دیا گیا ہے۔ اور آپ کا بہت سے تدبیری امور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرنا احادیث سے ثابت بھی ہوتا ہے۔ بایں ہمہ یہ حضرات کسی ضعیف سے ضعیف حدیث حتیٰ کہ تاریخ کی کسی کتاب سے بھی ثابت نہیں کر سکتے کہ آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں صحابہ کرام سے مشورہ لیا ہو۔

اس کے برعکس ہم قرآن سے یہ ثابت کریں گے کہ شرح زکوٰۃ اور محل نصاب اشیاء کی تعیین یہ سب کچھ منزل من اللہ تھا جس میں آپ کی رائے یا مرضی کو کچھ عمل دخل نہ تھا۔ ارشاد باری ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾ (۷۰:۲۴'۲۵) (اور ان (مومنوں) کے اموال میں مانگنے اور نہ مانگنے والوں کا حصہ مقرر ہے۔)

یہاں معلوم کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مادہ علم ہے۔ گویا آپ ﷺ کو اس حق کا علم دیا گیا تھا۔ لٰہذا آپ ﷺ نے اس حق معلوم کی جو تشریح فرمائی وہ اپنی مرضی سے نہیں فرمائی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے قرآن میں محض نماز کی ادائیگی کا حکم ہے۔ نماز کے اوقات' رکعات کی تعداد اور

ترکیب وغیرہ سب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی۔ اور یہ سب کچھ آپ ﷺ کی مرضی سے نہ تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی منشاء اور ہدایات کے مطابق تھا۔ اور ان امور کے متعلق بھی آپ ﷺ نے کبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ نہیں فرمایا۔ نیز شریعت کے دوسرے احکام کے متعلق آپ ﷺ نے اتنی احتیاط کبھی نہ فرمائی جتنی زکوٰۃ کی شرح کے متعلق فرمائی۔ یہ شرح تحریراً صوبوں کے گورنروں کو بجھواتے تھے اور اس شرح زکوٰۃ کی تفصیل کتب احادیث میں موجود ہے جو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔

اب رہی محل نصاب اشیاء کی بات تو یہ درج ذیل آیات سے ثابت ہیں۔

(۱) نقدی اور سونا چاندی وغیرہ کے لیے۔

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ .... فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (۹:۳۴) (اور جو لوگ سونے چاندی وغیرہ کا ذخیرہ کرتے ہیں...... تا...... انہیں آپ دردناک عذاب کی خوشخبری دیجیے۔)

(۲) زرعی پیداوار کے لئے یعنی غلہ اور پھلوں پر زکوٰۃ کے لیے

﴿كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ اِذَا اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ (۶:۱۴۲) (جب پھل پک چکے تو اس میں سے خود بھی کھاؤ اور جب فصل کاٹو تو اس میں سے اللہ کا حق بھی ادا کرو۔)

(۳) باقی ذرائع آمدنی کے لیے جس میں مویشیوں کی زکوٰۃ اموال تجارت وصنعت کی زکوٰۃ سب کچھ شامل ہے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ﴾ (۲:۲۶۷) (اے ایمان والو! جو بھی پاکیزہ مال تم کماتے ہو۔ اس میں سے خرچ کرو۔)

(۴) زمینوں اور معدنیات کے لئے اسی آیت کا اگلا حصہ یوں ہے۔

﴿وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ (اور ان چیزوں سے بھی خرچ کرو جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی ہیں۔)

یہ آیت جیسے دفینوں، معدنیات اور زمین کے خزانوں کے لئے عام ہے ویسے ہی زرعی اور نباتاتی پیداوار کے لیے بھی عام ہے۔

ان تصریحات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت، محل زکوٰۃ اشیاء اور شرح زکوٰۃ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا۔ اور اس میں ردوبدل کا خود آپ ﷺ کو بھی اختیار نہ تھا تو

اب یہ اختیار کسی دوسرے کو کیونکر دیا جا سکتا ہے؟

علاوہ ازیں شرح زکوٰۃ کا ابتدائے اسلام سے آج تک غیر متبدل رہنا ہی اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی اور اگر اس میں کچھ بھی کمی بیشی کی گنجائش ہوتی تو صورت حال یوں نہ ہوتی۔

زکوٰۃ کی موجودگی میں دوسرے ٹیکس:

لوگوں کی آمدنی میں غریب طبقہ کا جو حق ہے جس سے نظم ونسق حکومت چلایا جا سکتا ہے۔ وہ حصہ اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرما دیا ہے۔ دوسرے ٹیکس غیر مسلم رعایا پر تو لگائے جا سکتے ہیں اور ان کی شرح میں تبدیلی کی بھی گنجائش ہے۔ لیکن مسلمانوں پر دوسرے ٹیکس نہیں لگائے جا سکتے جیسا کہ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

اسلام نے جس طرح بغیر حق کے مسلمانوں کا خون حرام قرار دیا ہے۔ بالکل اسی طرح اس کے مال اور عزت کو حرام قرار دیا ہے۔ کیا حکومت کو بغیر حق کے اپنی رعایا کے کسی فرد کا خون بہانے کا حق ہے؟ تو جس طرح یہ خون بہانا حرام ہے۔ اسی طرح اس کے مال میں تصرف کرنا اور اس کی آبروریزی بھی حرام ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں آپ نے نہایت اہم امور کے متعلق نصیحتیں فرمائیں۔ کیونکہ آپ کو قرآن سے معلوم ہو چکا تھا۔ کہ آپ اب عنقریب اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں۔ لہٰذا ان نصیحتوں کی حیثیت دراصل وصیتوں کی تھی ان میں سب سے پہلے آپ نے جو وصیت فرمائی وہ تھی کہ: لوگو! تمہارے خون تمہارے اموال اور تمہاری عزت و آبرو ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح آج (عرفہ) کے دن میں اور اس مہینہ (ذوالحجہ) میں اور اس شہر (مکہ) میں تہری حرمت ہے''۔[1]

ایسے صریح احکام کی موجودگی میں حکومت کے پاس وہ کونسا حق ہے جس کی بنا پر وہ مسلمانوں سے زکوٰۃ کے علاوہ کسی اور طریقے سے جبراً کچھ وصول کرے۔ اب اگر ایک شخص اپنی ذاتی ضرورت کے لئے مکان بنا لیتا ہے۔ تو اس پر پراپرٹی ٹیکس کیونکر عائد کیا جا سکتا ہے؟

اس سلسلہ میں فقہائے امت نے کچھ لچک پیدا کی ہے تو وہ صرف یہ ہے۔ کہ اگر قحط کا زمانہ ہو' غریب لوگ' بھوکوں مر رہے ہوں۔ بیت المال میں اتنی رقم موجود نہ ہو۔ جس سے غرباء

---

[1] مسلم۔ کتاب الحج۔ باب حجۃ النبی ﷺ

پروری کی جا سکے۔ اور اغنیاء خود غریبوں کا احساس نہ کر رہے ہوں تو ان حالات میں حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ امراء پر ہنگامی ٹیکس لگا کر غرباء کی ضروریات کو پورا کرے۔ اب اس ہنگامی ٹیکس کی شرائط پر بھی غور فرما لیجئے۔

(۱) غیر معمولی حالات درپیش ہوں مثلاً قحط اور جنگ وغیرہ۔

(۲) بیت المال سے یہ اخراجات پورے نہ ہو رہے ہوں

(۳) چندہ کی اپیل اور ترغیب کے باوجود امراء اس طرف توجہ نہ دے رہے ہوں۔

(۴) حکومت اور مجلس شوریٰ کے اراکین کا اس بات پر اتفاق ہو کہ اب ایسا ٹیکس لگائے بغیر چارہ نہیں۔

ان حالات میں یعنی اضطراری صورت حال میں حکومت مسلمانوں پر زکوٰۃ کے علاوہ ٹیکس لگانے کی مجاز ہے لیکن یہ ٹیکس بھی ہنگامی اور عارضی ہوگا' دوامی نہ ہوگا۔ اور امراء سے ٹیکس وصول کرنے میں بھی عدل سے کام لیا جائے گا۔ یعنی صرف اس قدر مال لیا جائے گا جس سے ضرورت پوری ہو سکے۔ اس سے زائد نہیں لیا جائے گا۔

رہے ایسے ٹیکس جن کا مقصد ہی اہل اقتدار کی عیاشیوں اور ہوس پرستیوں کو پورا کرنا ہو' ان کی ایک اسلامی حکومت میں کوئی گنجائش نہیں۔

ٹیکس اور حکومت کی ضروریات:

نئے ٹیکس عائد کرنے کے جواز میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ آج کل حکومت کے اخراجات بہت بڑھ چکے ہیں۔ لہٰذا نئے ٹیکس لگانا ضروری ہو گیا ہے۔ ہم یہ عرض کریں گے۔

(۱) اگر حکومت کے اخراجات بڑھ چکے ہیں تو آمدنی کی مدات بھی بڑھ چکی ہیں کئی محکمے کاروباری طریق پر چل رہے ہیں جن سے معقول آمدنی متوقع ہوتی ہے جیسے محکمہ ڈاک و تار' ٹیلیفون' واپڈا' ریلوے اور انہار وغیرہ۔

(۲) کئی ایسے محکمے ہیں جن کی اسلامی نظام میں سرے سے گنجائش ہی نہیں۔ مثلاً خاندانی منصوبہ بندی' فحاشی پھیلانے والے ثقافتی مراکز اور ثقافتی وفود کی بین المملکتی نقل و حرکت پر اٹھنے والے اخراجات۔

(۳) حکومت کے انتظامی اخراجات توجہ طلب ہیں۔ لاتعداد محکمے وزیروں اور مشیروں کی فوج ظفر موج جن کی تعداد' الاؤنسز اور سفری اخراجات کم کرنے سے کافی بچت کی جا سکتی ہے۔

(۴) اہل اقتدار کی عیاشیوں اور ہوس پر جو بے پناہ اخراجات اٹھتے ہیں۔ اور ان کا بار قومی خزانہ پر ڈال دیا جاتا ہے اس کی اسلامی نظام میں کوئی گنجائش نہیں۔

(۵) سرکاری افسران کے لئے سرکاری املاک پر قانونی پابندیاں عائد کرنے سے بھی اخراجات میں کافی کمی ہو سکتی ہے۔

(۶) بڑھتے ہوئے اخراجات کی ایک بڑی وجہ ہمارا موجودہ نظام ہے مثلاً عدلیہ کو لیجئے۔ جہاں فوجداری مقدمات بھی سالہا سال تک چلتے ہیں دیوانی مقدمات کا تو اور بھی برا حال ہے۔ اسلامی نظام میں قتل جیسے مقدمہ میں ایک ماہ کا عرصہ درکار ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں 100 جج کام کر رہے وہاں ۵ جج کافی ہوں گے عدلیہ کے اخراجات کئی گنا کم ہو جائیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ پولیس کے اخراجات از خود کم ہو جائیں گے مدعی اور مدعا علیہ کے جہاں اخراجات کم ہوں گے وہاں ٹریفک کا دباؤ بھی خود بخود کم ہو جائے گا۔ اور سڑکوں کی تعمیر و مرمت کے اخراجات کم ہو جائیں گے صرف عدلیہ کے نظام عدل میں تبدیلی سے ہی اتنے اخراجات کم ہو جائیں گے تو اگر کہیں اسلامی نظام رائج ہو تو وہاں اخراجات میں حیرت انگیز حد تک کمی از خود واقع ہو جائے گی۔

(۷) اخراجات میں اضافہ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ کہ کسی بھی محکمہ میں کوئی نیا ملازم بھرتی کرتے وقت' صرف اس کی سند' ڈگری اور نمبروں کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ دینی تعلیم' تقویٰ اور دیانتداری وغیرہ کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ کام چوری اور رشوت کی گرم بازاری کی صورتوں میں سامنے آتا ہے۔ جہاں 10 ملازموں کی ضرورت ہو وہاں 20 ملازم بھرتی کر لیے جاتے ہیں جن میں سے بیشتر اپنی سیٹ سے غیر حاضر ہوتے ہیں۔ اور بسا اوقات باہر نکل کر اپنے ''گاہکوں'' سے سودا بازی اور لین دین کر رہے ہوتے ہیں اور اس دفتر والوں کی باہمی ملی بھگت سے وہ کسی گرفت میں بھی نہیں آتے۔ مزید ستم یہ کہ انہیں قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ جب تک کوئی ملازم کسی سنگین بدعنوانی کا مرتکب نہ ہو اسے نہ معطل کیا جا سکتا ہے اور نہ برطرف کیا جا سکتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر دفتری کاموں کی رفتار چوتھا حصہ رہ جاتی ہے۔ مگر اخراجات چار گنا کام کے دینا پڑتے ہیں۔

(۸) ہمارے خیال میں بڑھتے ہوئے اخراجات کی سب سے بڑی وجہ یہی حکومت کا ٹیکس بڑھانے اور نئے ٹیکس لگائے جانے کا حق ہے۔ اسی بنا پر حکومت کئی غیر دانشمندانہ اور غیر ترقیاتی منصوبے شروع کر دیتی ہے اور اگر اس کا بار ٹیکسوں سے پورا ہوتا نظر نہ آتا ہو تو حکومت نئے نوٹ

چھاپ کر اپنے اخراجات پورے کر لیتی ہے۔ یہ گویا ایک جبری ٹیکس ہوتا ہے جسے خفیہ ٹیکس (Hidden Tex) بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا بار عوام پر اس طرح پڑتا ہے کہ اشیاء کی قیمتیں چڑھ جاتی ہیں۔ اور یہ ایسا بار ہے جس کا عوام کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ حکومت کے پاس یہی وہ حربہ ہے جسکی بنا پر حکومتیں اپنے اخراجات کم کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں دیتیں اور اخراجات بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔

ان وجوہ کی بنا پر ہم دعوے سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ بیت المال کی آمدنی سے حکومت کے جائز اخراجات بطریق احسن پورے ہو سکتے ہیں۔ جس کے لئے ہم تاریخ سے شواہد پیش کر سکتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اسلامی مملکت عہد نبوی سے کئی گنا زیادہ پھیل چکی تھی۔ کئی نئے محکمے بھی وجود میں آ چکے تھے مثلاً محکمہ مال گزاری، فوج، پولیس، جیل اور ڈاک وغیرہ، جو آپ ہی کے عہد میں قائم ہوئے۔ زمانہ کے تقاضے بدل چکے تھے۔ مثلاً دور نبوی ﷺ میں مسجد نبوی ﷺ ہی عدلیہ کی صدر دفتر تھی۔ جبکہ عہد فاروقی میں عدلیہ کے لئے الگ عمارات اور عملہ کا بندوبست ہوا۔ علی ہذا القیاس ضروریات اور اخراجات بڑھ چکے تھے۔ لیکن اسی بیت المال کی آمدنی سے حکومت کا نظم ونسق چلتا رہا اور تمام تر اخراجات پورے ہوتے رہے۔

کہا جاتا ہے کہ دور فاروقی میں بے شمار فتوحات ہوئیں جہاں سے کافی مال ودولت ہاتھ لگ گیا تھا لہٰذا آپ کو کوئی نیا ٹیکس لگانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

یہ اعتراض اس لحاظ سے غلط ہے کہ جن مفتوحہ علاقوں سے مال ودولت آتا تھا اسی نسبت سے انہیں علاقوں کے انتظام وانصرام پر خرچ بھی ہو جاتا تھا اور یہ ایک ایسی ذمہ داری تھی جسے حکومت اپنا فرض سمجھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر اپنے سپہ سالاروں کو مزید علاقہ فتح کرنے سے روکتے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں نے تقریباً چھ سو سال بڑی شان وشوکت سے حکومت کی، مملکت اسلامیہ متمدن ترین سلطنت شمار ہوتی تھی۔ زمانہ کے تقاضے بدل چکے تھے۔ ضروریات اور اخراجات میں لگاتار اضافہ ہو رہا تھا۔ نئے علاقے فتح کرنے کی رفتار بھی وہ نہ رہی تھی جو عہد فاروقی میں تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود کسی حکومت کو شرح زکوٰۃ میں اضافہ یا نئے ٹیکس عائد کرنے کی ضرورت اور جرأت نہ ہوئی اور تمام تر اخراجات بیت المال سے پورے ہوتے رہے۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ ہے کہ بڑھتے ہوئے اخراجات کے مرض کے اسباب تلاش کر کے ان کو دور کیا جائے۔

باب: ۱۵

احکام وراثت

اس کتاب کا موضوع دراصل بیوع یا لین دین کے معاملات ہیں اور بظاہر وراثت کا اس موضوع سے کچھ تعلق معلوم نہیں ہوتا- لیکن چونکہ یہ بھی انتقال ملکیت کا ایک ذریعہ ہے- اگرچہ غیر اختیاری ہے اور متوفی کی وفات کے بعد از خود اس کا ترکہ اس کے جانشینوں کو منتقل ہو جاتا ہے- لہٰذا اس کا ذکر بھی یہاں مناسب سمجھا گیا اور غالباً اسی خیال سے صاحب مشکوٰۃ المصابیح نے بھی اسے کتاب البیوع کے تحت ہی ذکر کیا ہے-

علم وراثت کو شرعی اصطلاح میں علم الفرائض کہا جاتا ہے- یہ علم کچھ مشکل بھی ہے- اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بعض دفعہ اس میں دقیق تقسیم کی شکلیں اور ان کا حساب سامنے آ جاتا ہے- جو ہر کسی کے بس کا روگ نہیں- دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ روزمرہ کے معمولات میں سے نہیں لہٰذا کم ہی یاد رہتا ہے- میں کوشش کروں گا کہ اسے آسان الفاظ اور آسان انداز میں پیش کروں- وما توفیقی الا باالله-

موضوع کی اہمیت اور فضیلت:

جتنا یہ علم مشکل ہے اسی قدر اسے سیکھنے اور یاد رکھنے کی ترغیب بھی احادیث میں مذکور ہے- چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا-

((تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَالْقُرْاٰنَ وَعَلِّمُوا النَّاسَ فَإِنِّي مَقْبُوْضٌ-[1])) (فرائض اور قرآن خود سیکھو پھر لوگوں کو سکھلاؤ اس لیے کہ میں وفات پانے والا ہوں-)

نیز فرمایا-

((اَلْعِلْمُ ثَلٰثَةٌ وَمَاسِوٰى ذٰلِكَ فَهُوَ فَضْلٌ اٰيَةٌ مُحْكَمَاتٌ اَوْسُنَّةٌ قَائِمَةٌ (علم تین ہیں اور ان کے سوا جو کچھ ہے وہ زائد ہے اول آیات محکمات کا علم دوسرے سنت

---

[1] ترمذی- ابواب الفرائض- باب في تعليم الفرائض (۲۰۱۹) اس کی سند میں محمد بن القاسم اور الفضل ضعیف راوی ہیں-

اَوْ فَرِيضَةٌ عَادِلَةٌ - [1])) قائمہ اور تیسرے انصاف کے ساتھ وراثت کی تقسیم۔)

نیز دار قطنی اور ابن ماجہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "علم فرائض سیکھو کہ وہ نصف علم ہے اور بھلایا جاتا ہے اور میری امت سے پہلے وہی چھینا جائے گا[2]۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو علم فرائض سیکھنے کی بہت تاکید فرماتے اور کہتے۔ "علم الفرائض سیکھو یہ تمہارے دین کا ایک حصہ ہے۔" نیز آپ رضی اللہ عنہ نے ۱۸ھ میں شام کا جو سفر کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ طاعون عمواس میں جو لوگ وفات پا گئے تھے۔ ان کے ترکہ کو حسب قواعد شرعی تقسیم کیا جا سکے۔[3]

ابتدائی ہدایات

(۱) تجہیز و تکفین:

تجہیز و تکفین کے اخراجات کا بندوبست میت کے ترکہ سے کیا جائے گا۔[4]

(۲) میت کے ذمہ قرض کی ادائیگی:

اس کے بعد میت کے ذمہ اگر کچھ قرض ہے تو وہ ادا کیا جائے گا۔ کیونکہ جب تک میت کے سر پر قرضہ ہو اس کی بخشش نہیں ہوتی۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ ایسی میت کا جنازہ ہی نہیں پڑھاتے تھے۔ جب تک کہ حاضرین میں سے کوئی اس کی ذمہ داری نہ لے لیتا۔[5]

اگرچہ قرآن کریم میں قرضہ سے پہلے وصیت کا ذکر آتا ہے۔ تاہم قرض کے اسی بوجھ کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے وصیت سے پہلے قرضہ ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔[6]

---

[1] ابوداؤد۔ کتاب الفرائض۔ باب فی تعلیم الفرائض (۲۸۸۵) ابن ماجہ المقدمہ باب اجتناب الرائ و القیاس (۵۴) اس کی سند میں عبدالرحمٰن الافریقی ضعیف ہے۔

[2] حاشیہ حدیث ترمذی مذکورہ بالا

[3] دائرہ معارف الاسلامیہ اردو ج ۴ ص ۲۲ بحوالہ الکامل ج ۲ ص ۵۶۱

[4] ابوداؤد۔ کتاب الوصایا۔ باب ماجاء فی الدلیل ان الکفن مع جمیع المال۔

[5] بخاری۔ کتاب النفقات۔ باب قول النبیؐ مَنْ تَرَكَ كَلًّا اَوْ ضِيَاعًا فَعَلَيَّ۔

[6] باب يُبْدَأُ بِالدَّيْنِ قَبْلَ الْوَصِيَّة۔

(۳) وصیت:

قرضہ کی ادائیگی کے بعد میت اگر کوئی وصیت کر گیا ہو تو اسے پورا کیا جائے گا۔ وصیت سے متعلقہ احکام درج ذیل ہیں۔

(۱) اگر کوئی شخص وصیت کرنا چاہتا ہو تو اسے دو راتیں بھی اس حال میں نہ گزارنا چاہئیں کہ اس کے پاس وصیت لکھی ہوئی موجود نہ ہو۔[۱]

(۲) وصیت کی حد: وصیت زیادہ سے زیادہ تہائی مال میں ہو سکتی ہے۔ اور یہ بھی بہت ہے۔ وصیت کی حد سے متعلق دو طرح کی روایات آتی ہیں۔ اور یہ دونوں حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ سے متعلق ہیں۔ وہ مکہ میں آکر بیمار ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لیے آئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے سارے مال کی وصیت کر جاوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کہنے لگے: دو تہائی مال کی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں۔ پھر وہ کہنے لگے۔ ''آدھے مال کی''؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نہیں۔ پھر وہ کہنے لگے۔ ''ایک تہائی مال کی۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں۔ تہائی اور تہائی بھی بہت ہے۔[۲]''

اور دوسری روایت یوں ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے پوچھا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ دسواں حصہ وصیت کرو۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ زیادہ حصے کی وصیت پر اصرار کرتے رہے۔ بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک تہائی کی وصیت کرو اور یہ بھی بہت ہے۔[۳]

اسی لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے۔'' کاش لوگ ثلث سے کم کر کے چوتھائی کی وصیت کریں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تہائی بہت ہے اور وکیع کی حدیث میں کثیر او کبیر کے الفاظ ہیں۔[۴]''

وصیت مال کے علاوہ دوسری باتوں سے بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص اپنے لین دین کا حساب لکھ کر پاس رکھے تاکہ بعد میں کسی قسم کا جھگڑا نہ پیدا ہو۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو وصیت فرمائی وہ یہ تھی۔ **الصلوٰة وما ملكت ايمانكم** (نماز کا خیال رکھنا اور ان کا بھی جو تمہارے

۱۔ مسلم۔ کتاب الوصیة۔
۲۔ مسلم۔ کتاب الوصیة۔ بخاری کتاب الوصایا۔ باب الوصیة بالثلث
۳۔ ترمذی کتاب الجنائز باب ماجاء فی الوصیة بالثلث و الربع (۹۷۵) یہ روایت صحیح ہے۔
۴۔ مسلم۔ کتاب الوصیة

زبردست ہیں۔) یا آپ ﷺ نے کتاب وسنت پر جمے رہنے کی وصیت فرمائی۔

(۳) میت کے ذمہ اگر کوئی اللہ کا حق رہ گیا ہو۔ مثلاً حج' کفارہ' منت اور نذر وغیرہ اور وہ اپنی بیماری یا کسی دوسری وجہ سے وہ کام نہ کر سکا یا وصیت نہ کر سکا ہو تو اسے بھی پورا کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ بھی بندے پر اللہ کا قرض ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی میری ماں نے حج کی منت مانی تھی۔ لیکن وہ حج کرنے سے پہلے مر گئی۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کر آؤں؟" آپ ﷺ نے فرمایا۔ "ہاں اس کی طرف سے حج کر۔" بھلا بتاؤ۔ اگر تیری ماں پر کسی کا قرضہ ہو تو تو اسے ادا کرے گی؟" اس نے کہا۔ "ضرور" آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تو پھر اللہ اس بات کا بہت حقدار ہے کہ اس کا قرض ادا کیا جائے۔[1]

ایک دفعہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ! میری ماں اچانک مر گئی اور وصیت نہ کر سکی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ بات کرتی تو ضرور صدقہ کرتی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو اسے ثواب ملے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "ہاں[2]۔"

(۴) وصیت شرعی وارث کے حق میں نہیں جا سکتی۔ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا۔ اللہ بزرگ و برتر نے ہر صاحب حق کا حق مقرر کر دیا۔ لہٰذا اب وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں۔[3]

کیونکہ اس طرح باقی سب وارثوں کے حصے متاثر ہوتے ہیں اور ان میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ جو تنازعہ کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ ہاں اگر حالات کا تقاضا ایسا ہی ہو تو دوسرے وارثوں کی رضامندی سے ایسا کر سکتے ہیں کیونکہ ہر شخص اپنا حق چھوڑنے یا کم کرنے کا حق رکھتا ہے۔

(۵) وصیت کسی بھی غیر وارث' رشتہ دار' دوست' یتیم' پوتے یا کسی بھی یتیم' مسکین دینی ادارے وغیرہ سب کے حق میں کی جا سکتی ہے۔

(۶) اگر مال تھوڑا ہو تو وصیت نہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔

(۷) ایسی وصیت کرنا جس سے کسی دوسرے کو تکلیف یا نقصان پہنچتا ہو' حرام ہے۔

(۸) اگر ترکہ سے قرضے بھی پورے نہ ہوں یا بمشکل پورے ہو سکیں تو پھر نہ موصی کو کچھ ملے گا

---

[1] بخاری۔ کتاب المناسک باب الحج و النذور عن المیت۔
[2] مسلم۔ کتاب الوصیۃ۔
[3] ترمذی۔ ابواب الوصایا۔ بـاب لا وصیۃ لـوارث (۲۱۲۱) مسند احمد ۴/۱۸۶ ط۔ قدیم ابن ماجہ (۲۷۱۳' ۲۷۱۴) المسند الجامع ۲/۵۶' ۵۷ اس کی سند صحیح ہے۔

اور نہ وارثوں کو۔

(۹) اگر میت جنون یا بے ہوشی میں وصیت کرے اور اسی حالت پر وہ مر جائے۔ تو ایسی وصیت معتبر نہ ہوگی۔

(۴) صدقہ: ان باتوں کو پورا کرنے کے بعد تقسیم ترکہ کے وقت اگر کوئی غیر وارث' رشتہ دار' یا یتیم' یا نادار و محتاج آ جائے تو اسے کچھ نہ کچھ دے دینا چاہیے۔[1] (سورۃ النساء)

موانع میراث: یعنی ایسے اسباب جن کی بناء پر کوئی حقدار وارث غیر مستحق ہو جاتا ہے۔

(۱) قاتل مقتول کا وارث نہیں بن سکتا۔[2]

اس حکم میں غالباً حکمت یہ ہے کہ کوئی وارث ورثہ کے لالچ میں آ کر وارث کو قتل نہ کر ڈالے۔ تاکہ جلد از جلد اس کا وارث بن سکے۔

(۲) کافر یا مرتد کسی مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کوئی مسلمان کسی کافر کا وارث نہیں بن سکتا۔ گویا دین کا اختلاف بذات خود مانع میراث ہے۔[3]

تقسیم وراثت کے اصول:

(۱) صرف وہ وارث ترکہ کے حقدار ہوں گے۔ جو میت کی وفات کے وقت زندہ ہوں۔ فوت شدہ وارث ترکہ سے محروم ہوتے ہیں۔

(۲) تقسیم وراثت کا سب سے اہم اصول ''الاقرب فالاقرب'' ہے اور یہ اصول قرآن ہی سے ماخوذ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کا رشتہ دار محروم ہوتا ہے۔ مثلاً بیٹا موجود ہو تو پوتا محروم ہے۔ باپ موجود ہو تو دادا محروم ہوتا ہے۔

(۳) میت کی بیویاں اگر ایک سے زیادہ ہوں تو وہ اپنے مقررہ حصہ (بصورت اولاد ۱/۸ اور بغیر اولاد ۱/۴) میں برابر کی شریک ہوں گی۔

(۴) اگر متوفی کی بیوی حاملہ ہو تو پیدا ہونے والا بچہ وراثت کا حقدار ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یا تو تقسیم کو وضع حمل تک روک دیا جائے۔ یا کوئی ایسی صورت پیدا کر لی جائے کہ نومولود (خواہ بیٹا ہو یا بیٹی) کو اس کا حق پورا پورا مل سکے۔ یا جو بھی صورت ہو۔[4]

---

[1] سورہ نساء۔ [2] ترمذی۔ ابواب الفرائض۔ باب فی ابطال میراث القاتل۔ (۲۱۰۹) صحیح ہے۔
[3] بخاری۔ کتاب الفرائض۔ باب لا یرث المسلم الکافر
[4] فقہ السنہ ج ۳ ص ۴۵۰

(۵) اس طرح اگر کوئی وارث مفقود الخبر ہو تو اس کا انتظار کیا جائے گا- بصورت دیگر ایسا بندوبست کر لیا جائے کہ جب وہ آئے تو اسے اس کا حق مل جائے [1]

وارثوں کی اقسام:

وارث تین قسم کے ہوتے ہیں-

(۱) ذوی الفروض (۲) عصبات (۳) ذوی الارحام

(۱) ذوی الفروض: وہ رشتہ دار ہیں- جن کا حصہ وراثت کتاب وسنت اور اجماع صحابہ کی رو سے طے شدہ ہے ان کی دو قسم ہیں ایک سببی دوسرے نسبی-

سببی رشتہ دار وہ ہیں جن کا تعلق نکاح کے سبب ہو- اور یہ دو ہیں- خاوند اور بیوی-

نسبی رشتہ دار ذوی الفروض دس ہیں جن میں سے تین مرد ہیں- باپ دادا اور ماں جائے (مادری یا اخیافی) بھائی اور باقی سات عورتیں ہیں- (۱) ماں (۲) دادی (۳) بیٹی (۴) پوتی (۵) (حقیقی یا عینی یا سگی) بہن (۶) پدری (علاتی یا سوتیلی) بہن (۷) مادری (اخیافی یا ماں جائی) بہن ان کی تفصیل آگے آ رہی ہے-

(۲) عصبات: عصبہ کی جمع ہے- یعنی میت کے باپ کے جانب سے رشتہ دار- عصبہ دراصل میت کا سب سے قریبی رشتہ دار مرد ہوتا ہے- (بخاری کتاب الفرائض باب میراث الولد......) ذوی الفروض کو ان کے مقررہ حصے ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچے وہ عصبہ کا ہوتا ہے اور عام طور پر یہ میت کا بیٹا ہی ہوتا ہے- جو اپنی بہنوں کو بھی (جو اس کی عدم موجودگی میں ذوالفروض ہوتی ہیں) عصبہ بنا دیتا ہے- پھر انہیں (یعنی میت کی بیٹیوں کو) مقررہ حصہ نہیں ملتا- بلکہ بقایا ترکہ بیٹے بیٹیوں میں للذکر مثل حظ الانثیین کے اصول کے مطابق ۱:۲ کی نسبت سے ان میں تقسیم ہوتا ہے-

میراث کی کوئی شکل ایسی نہیں- جس میں ذوی الفروض کی ادائیگی کے بعد بیٹے کو کچھ نہ ملتا ہو- البتہ یہ ممکن ہے کہ سارا ترکہ ہی اسے مل جائے- مثلاً میت کے والدین اور بیوی پہلے ہی فوت ہو چکے ہوں اور اولاد صرف ایک بیٹا ہو تو یہ پورے ترکہ کا وارث ہو گا-

(۳) ذوی الارحام: ذوی الارحام کا لغوی معنی تو رحم سے تعلق رکھنے والے رشتہ دار ہیں- یعنی (قریبی رشتہ دار) مگر علم الفرائض کی اصطلاح میں صرف ان رشتہ داروں کو کہا جاتا ہے جن سے

---

[1] فقہ السنہ ج ۳ ص ۴۵۰

رشتہ بذریعہ رحم تو ہو مگر ان کا شمار ذوی الفروض اور عصبات میں نہ ہو- مثلاً ماموں' خالہ' نانا' بھانجا' بھانجی' نواسہ' نواسی' پھوپھی اور پھر ان کی اولادیں وغیرہ-

ذوی الفروض اور عصبہ کے بعد تیسرے نمبر پر ان میں تقسیم ترکہ کی باری آتی ہے- لیکن عملاً شاذونادر ہی ان کے حصہ میں کچھ آتا ہے- تاہم یہ ناممکن بھی نہیں-

اس اجمالی تعارف کے بعد اب ان وارثوں کا تفصیل سے ذکر کریں گے-

ذوی الفروض اور ان کے حصے

ذوی الفروض کے حصے چونکہ سب سے زیادہ قرآن میں ہی سورۃ نساء کی آیت نمبر ۱۱' ۱۲' اور ۱۷۶ میں مذکور ہیں- لہٰذا پہلے ہم انہیں آیات کو بنیاد بنا کر ان کے حصوں کا ذکر کریں گے-

آیت نمبر ۱۱: (ابنائی جانب) (۱) اگر اولاد میں بیٹے اور بیٹیاں ملے جلے ہوں- تو مرد کو دوگنا اور عورت کو ایک حصہ ملے گا (یہ عصبات کی صورت بن جائے گی ذوی الفروض کی نہ رہے گی)

(۲) اگر صرف ایک ہی بیٹی ہو تو اس کا ۱/۲ حصہ ہے-

(۳) اگر صرف دو سے زیادہ بیٹیاں ہی ہوں تو ان کا ۲/۳ حصہ ہے اور سنت سے یہ ثابت ہے کہ دو ہی بیٹیاں ہوں تو بھی ۲/۳ حصہ ہے-[1]

آبائی جانب: (۴) اگر میت کے والدین زندہ ہیں تو ان میں سے ہر ایک کو ۱/۶ حصہ ملے گا- (اس صورت میں مرد اور عورت کا حصہ برابر ہے)-

(۵) اور اگر میت کی اولاد نہ ہو تو ماں کو ۱/۳ حصہ ملے گا-

(۶) اور اگر میت کے بہن بھائی بھی ہوں تو پھر ماں کو ۱/۶ ہی ملے گا-

(۷) اور سنت سے یہ ثابت ہے کہ اگر ایک بیٹی ہو تو اسے ۱/۲ اور ایک پوتی ہو تو اسے ۱/۶ حصہ ملے گا-[2]

(۸) ماں فوت ہو چکی ہو تو اس کا حصہ نانی کو ۱/۶ ملے گا-[3]

(۹) اگر باپ فوت ہو چکا ہے تو اس کا حصہ ۱/۶ دادا کو ملے گا-[4]

---

[1] بخاری کتاب الفرائض- باب میراث الولد من ابیہ و امہ-
[2] موطا- کتاب الفرائض- باب میراث الانصاب
[3] موطا- کتاب الفرائض باب میراث الجد
[4] ترمذی- ابواب الفرائض- باب فی میراث الجد

(۱۰)　دادی کا ۱/۶ حصہ بھی اجماع سے ثابت ہے (تفصیل ''دادا کا حصہ'' میں دیکھئے)۔[۱]

(۱۱)　اگر نانی اور دادی دونوں موجود ہوں تو ۱/۶ ان میں برابر تقسیم ہوگا۔[۲]

آیت نمبر۱۲: (سلبی جانب) (۱۲) میت اگر عورت بے اولاد ہے تو اس کے شوہر کو اس کے ترکہ کا ۱/۲ حصہ ملے گا۔

(۱۳)　اگر میت اولاد والی تھی تو شوہر کو ۱/۴ حصہ ملے گا۔

(۱۴)　میت اگر بے اولاد ہے تو اس کی بیوی کو ۱/۴ حصہ ملے گا۔

(۱۵)　اور اگر صاحب اولاد ہے تو بیوی کا ۱/۸ حصہ ہے۔

اخوی جانب (۱۶) اگر میت (عورت یا مرد) کلالہ ہے یعنی نہ اس کی اولاد ہے نہ والدین اور اس کے صرف اخیافی، ماں جائے یا مادری بہن بھائی ہوں۔ تو اگر ایک بہن ہے تو اسے ۱/۶ اور اگر ایک بھائی بھی ہے تو اسے بھی ۱/۶ اور اگر دو سے زیادہ بھائی بہنیں ہو تو ان کو کل کا ۱/۳ ہی ملے گا۔ اور یہ ان میں ۱:۲ کی نسبت سے نہیں بلکہ برابر تقسیم ہوگا۔

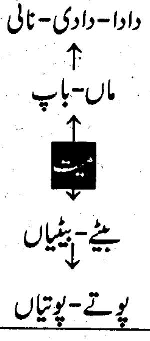
آیت نمبر ۱۷۶: (اخوی جانب) میت اگر کلالہ ہے اور اس کے (حقیقی، عینی یا سگے) بہن بھائی موجود ہوں تو کلالہ کی میراث ان میں ایسے ہی تقسیم ہوگی۔ جیسے اولاد میں ہوتی ہے۔ یعنی:

(۱۷)　اگر صرف ایک بہن ہے تو ۱/۲ حصہ، دو یا دو سے زیادہ بہنیں ہوں تو ۲/۳ اور اگر بہن بھائی ملے جلے ہوں تو ۱:۲ کی نسبت سے تقسیم ہوگا۔

(۱۸)　کلالہ اگر عورت ہے تو اس کا بھائی اس کے پورے ترکہ کا وارث ہے۔ (بشرطیکہ اکیلا ہو)۔

(۱۹)　اور اگر بہن بھائی ملے جلے ہوں تو پھر ۱:۲ کی نسبت سے ترکہ تقسیم ہو جائے گا۔

نتائج:　مندرجہ بالا احکام سے درج ذیل امور سامنے آتے ہیں۔



(۱)　کتاب و سنت میں مذکور وارثوں (ذوی الفروض) کا دائرہ پانچ پشتوں کو محیط ہے۔ جیسا کہ سامنے کے نقشہ سے ظاہر ہے۔ اب ابنائی جانب کو مزید کئی پشتوں تک نیچے لے جانا یا آبائی جانب کو مزید کئی پشتوں تک اوپر لے جانا۔ یا اخوی اور اموی جانب کی انتہاؤں سے عصبہ اور دوسرے ورثاء کو تلاش کرنا فقہاء کا اپنا استنباط ہے۔ تاہم اس کے اصول موجود ہیں۔

---

[۱] موطا۔ کتاب الفرائض۔ باب میراث الجد۔　[۲] ایضاً

(۲) ذوی الفروض میں پانچ وارث ایسے ہیں جن کا حصہ ہر حال میں قائم رہتا ہے- اور کسی بھی رشتہ دار کی موجودگی ان کے مقررہ حصے سے محروم نہیں کرتی - اور وہ یہ ہیں- شوہر یا بیوی - باپ' ماں' بیٹے' بیٹیاں' باقی ذوی الفروض کے حصے مشروط ہیں-

(ا) بیٹے بیٹیوں کی موجودگی میں پوتے پوتیوں کا کوئی حصہ نہیں-

(ب) اولاد کی موجودگی میں سب بہن بھائی محروم ہوتے ہیں-

(ج) ماں باپ کی موجودگی میں دادا' دادی' نانی سب محروم ہوتے ہیں-

(۳) بہن بھائی تین قسم کے ہوتے ہیں- ترکہ کی تقسیم کے لحاظ سے ان کی ترتیب یہ ہے-

(۱) حقیقی (عینی یا سگے) بہن بھائی علاتی (پدری یا سوتیلے) بہن بھائی اور (۳) اخیافی (مادری یا ماں جائے) بہن بھائی

اخیافی بہن بھائی صرف کلالہ کے ترکہ ۱/۳ کے وارث ہوتے ہیں- اگر عینی بھائی موجود ہوں تو وہ بھی اسی ۱/۳ میں برابر کے شریک ہو جاتے ہیں-

نوٹ: جد دو قسم کا ہے- جد صحیح اور جد فاسد- جد صحیح وہ ہے جس میں عورت کا واسطہ نہ ہو جیسے دادا' پڑدادا وغیرہ اور جد فاسد وہ ہے جس میں عورت کا واسطہ ہو- جیسے نانا' پڑنانا وغیرہ- جد صحیح ذوی الفروض سے ہے اور جد فاسد ذوی الارحام سے-

اور جدہ صحیحہ وہ ہے- جس میں جد فاسد کا واسطہ نہ ہو- جیسے دادی' پڑدادی اور نانی' پڑنانی وغیرہ اور جدہ فاسدہ کی مثال جیسے نانا کی ماں یا نانا کے باپ کی ماں- جد صحیح کی طرح جدہ صحیحہ بھی ذوی الفروض سے ہے اور جدہ فاسدہ ذوی الارحام سے-

مقررہ حصوں کی وراثت

اب ہم ذوی الفروض کی ایک اور طریق سے وضاحت کرتے ہیں تاکہ انہیں ذہن نشین کرنے میں آسانی ہو جائے- کتاب و سنت میں سات قسم کے حصوں کا ذکر آیا ہے- جو یہ ہیں- ۱/۸' ۱/۶' ۱/۴' ۱/۳' ۱/۲' ۲/۳ اور پورا ترکہ' اب ہم دیکھیں گے کہ کس حصہ کا کون کون رشتہ دار وارث ہوتا ہے-؟

حصہ	وارث کون کون؟
۱/۸	(۱) بیوی جبکہ میت صاحب اولاد ہو- ایک سے زیادہ بیویاں ہونے کی صورت میں یہ

حصہ	وارث کون کون؟
	۸/ ۱ان پر برابر برابر تقسیم ہوگا۔
	(۲) اور اس میں یہ تخصیص نہ ہوگی کہ فلاں بیوی کی اولاد نہیں (اولاد میں بیٹے' بیٹیوں کے علاوہ پوتے پوتیاں وغیرہ بھی شامل ہیں)
۱/۶	(۳) میت صاحب اولاد ہے تو ماں باپ میں سے ہر ایک کو ۶/ ۱حصہ ملے گا۔ (مرد اور عورت کا حصہ برابر برابر)
	(۴) میت بے اولاد ہو مگر بہن بھائی موجود ہوں تو بھی ماں کو ۶/ ۱ ملے گا۔
۱/۴	(۵) کلالہ کے اخیافی (مادری' ماں جائے) بہن بھائی میں سے ہر ایک کو ۶/ ۱ ملے گا (اور اگر بہن بھائی زیادہ ہوں تو ۳/ ۱ان میں برابر تقسیم ہوگا۔)
	(۶) میت کی صرف ایک بیٹی اور ایک پوتی ہو تو پوتی کو ۶/ ۱ ملے گا اور بیٹی کو ۲/ ۱۔
۱/۳	(۷) خاوند کو جبکہ مرنے والی بیوی سے اولاد ہو۔ اولاد میں بیٹے بیٹیوں کے علاوہ پوتے پوتیاں وغیرہ بھی شامل ہیں۔
	(۸) بیوی کو جبکہ مرنے والے خاوند کی اولاد نہ ہو۔
۱/۲	(۹) میت بے اولاد ہو اور بہن بھائی بھی نہ ہوں تو ماں کو ۳/ ۱ ملے گا۔
	(۱۰) کلالہ کے ماں جائے بہن بھائیوں کو ۳/ ۱ ملے گا اور ان میں برابر تقسیم ہوگا' ۱:۲ کی نسبت سے نہیں۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔
	(۱۱) میت عورت بے اولاد ہو تو خاوند کو ۲/ ۱ ملے گا۔
	(۱۲) کلالہ کی حقیقی بہن کو ۲/ ۱ ملے گا۔
۲/۳	(۱۳) کلالہ کی ایک ہی بیٹی ہو تو اسے ۲/ ۱ ملے گا۔ (اور اگر میت کی صرف پوتی ہی ہو تو ۲/ ۱اسے مل جائے گا۔
	(۱۴) میت کی صرف ایک ہی بیٹی اور ایک بہن ہو تو ہر ایک کو آدھا ملے گا۔[1]
	(۱۵) میت کی دو یا دو سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو ان کو ۳/ ۲ ملے گا۔ (اگر بیٹیوں کی بجائے صرف پوتیاں ہوں تو یہ حصہ انہیں مل جائے گا)

[1] بخاری۔ کتاب الفرائض۔ باب میراث البنات۔

(۱۶) کلالہ کی حقیقی بہنیں دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ۲/۳ ملے گا۔

پورا ترکہ

(۱۷) اگر میت کا صرف ایک ہی بیٹا ہو۔ بیوی اور ماں باپ کوئی نہ ہو تو بیٹے کو پورا ترکہ ملے گا۔

(۱۸) کلالہ میت اگر عورت اور اس کا ایک ہی بھائی ہو تو وہ پورے ترکہ کا وارث ہے۔

(۱۹) میت کا اگر صرف والد ہو' نہ بیوی بچے ہوں اور نہ ماں ہو تو والد کو پورا ترکہ ملے گا۔

ذوی الفروض کے حصوں کی تفصیل

میت کی چار جوانب ہوتی ہیں سب سے مقدم ابنائی جانب ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے احکام میراث کی ابتدا ﴿یوصیکم اللہ فی اولادکم﴾ سے فرمائی ہے۔ یہ جزء میت سے دوسری آبائی جانب (اصل میت) ہے۔ ماں' باپ' دادا وغیرہ۔ تیسری سببی جانب ہے) (یعنی زوجین) اور چوتھی اخوی جانب (جزء اصل میت) ہے عموی جانب جزء جدّ میت کا بھی اسی میں شمار ہوگا۔

سببی جانب یعنی زوجین چونکہ ایک دوسرے کے عصبہ نسبی بن سکتے ہیں۔ لہٰذا فقہاء عصبہ کی تعیین کے سلسلہ میں اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور چار جوانب یوں شمار کرتے ہیں۔
(۱) ابنائی جانب (۲) آبائی جانب (۳) اخوی جانب (۴) عموی جانب۔

اولاد کی میراث:

اولاد کی میراث کے بارے میں درج ذیل مسائل قابل ذکر ہیں۔

(۱) میت کی اولاد صرف ایک بیٹی ہو تو اس کا ۱/۲ حصہ۔ دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ۲/۳ حصہ ہے اور اگر اولاد نرینہ بھی ہو۔ تو پھر بیٹیاں ذوی الفروض نہ رہیں گی۔ باقی ذوی الفروض کے حصے کرنے کے بعد باقی جو ترکہ بچے گا۔ اس میں سب بیٹے بیٹیاں دوہرے اور اکہرے حصے کی نسبت سے شریک ہوں گے۔ اور پوتے پوتیاں محروم ہوں گے۔

(۲) اگر میت کی صرف ایک بیٹی اور ایک پوتی ہو۔ تو پوتی کو ۱/۶ ملے گا۔ اور بیٹی کو ۱/۲ یہ کل ۲/۳ اور عورتوں کے حصے کی آخری حد ہے۔ اور اگر میت کی لڑکیاں ہی دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ان

کو۲/۳مل جائے گا اور پوتی محروم ہوگی۔

(۳) اگر ایک بیٹی اور پوتیاں ایک سے زیادہ ہوں تو ۱/۶ حصہ ہی ان پوتیوں میں برابر' برابر تقسیم ہوگا۔

(۴) اور اگر پوتا موجود ہے تو وہ عصبہ ہے۔ ذوی الفروض کا حصہ نکالنے کے بعد باقی ترکہ اسے ملے گا۔ اب پوتی یا پوتیاں ذوی الفروض نہ رہیں گی۔ بلکہ اس کے ساتھ عصبہ بن جائیں گی اور ان میں ۱:۲ کی نسبت سے بقایا ترکہ تقسیم ہوگا۔

(۵) میت کی اولاد (بیٹے بیٹیوں) میں سے کوئی زندہ نہ رہا ہو۔ البتہ پوتے پوتیاں موجود ہوں تو ان میں میراث اسی طرح تقسیم ہوگی۔ جس طرح سلبی اولاد ہیں۔ یعنی اگر صرف ایک پوتی ہے تو ۱/۲ دو یا دو سے زیادہ ہیں تو ۲/۳ اور اگر پوتا یا پوتے موجود ہیں تو باقی ترکہ ان میں ۱:۲ کی نسبت سے تقسیم ہوگا۔

اسی ترتیب سے یہ سلسلہ اگلی پشت یعنی پڑپوتے پڑپوتیوں تک ہی چلے گا۔ اسے درج ذیل مثال سے سمجھئے کہ مثلاً زید (میت) ایک بیوی دو بیٹیاں دو پوتیاں ایک پڑوتا ایک پڑوتی اور دو پڑپوتیاں چھوڑ گیا تو اس کی میراث کیسے تقسیم ہوگی؟

حل: (۱) اس مثال میں تیسری پشت پر پڑوتا مل گیا ہے اور وہ عصبہ ہے لہٰذا چوتھی قسم کی پڑپوتیاں محروم ہیں۔

(۲) زوجہ کا حصہ ۱/۸ ہے اور پہلی پشت میں دو بیٹیوں کا حصہ ۲/۳ ہے اور دوسری پشت میں محروم تھیں۔ کیونکہ طبقہ اناث کا زیادہ سے زیادہ حصہ دو تہائی ہے۔ اور یہ بیٹیوں کو مل چکا ہے۔ مگر اب چونکہ تیسری پشت میں پڑوتا آ گیا ہے جو کہ عصبہ ہے تو اس ذریعہ سے پوتیوں کو بھی حصہ مل جائے گا۔ (یعنی درجہ سافل کے عصبہ نے اوپر کی اناث کو بھی عصبہ بنا دیا)

بیوی کا ۱/۸ + بیٹیوں کا ۲/۳ یہ کل ۱۹/۲۴ ہوا۔ باقی رہے چوبیں میں سے ۵ حصے۔ ان حصوں کو پڑوتے پڑوتی اور پوتیوں میں ۱:۲ کی نسبت سے تقسیم کریں گے یعنی پڑوتے کے ۲ حصے پڑوتی اور پوتیوں کا ایک ایک حصہ[1]۔

مندرجہ بالا مثال میں اگر زید کی ایک بیٹی ہوتی تو اس کا حل یہ ہوتا۔

بیوی کا حصہ ۱/۸ بیٹی کا حصہ ۱/۲' بیٹی کے ساتھ دو پوتیوں کا حصہ ۱/۶ یہ کل ۱۹/۲۴ گویا ۲۴

[1] موطا۔ کتاب الفرائض۔ باب میراث الولد

میں سے پانچ بچ رہے۔ یہ پانچ حصے اب ایک پڑوتا اور ایک پڑوتی میں ۲:۱ کی نسبت سے تقسیم کرنے کے لیے پانچ کے اب ۱۵ حصے بنا کر ۱۰ حصے پڑوتا کو دیں گے اور ۵ پڑوتی کو۔

والد کا حصہ: والد ذوی الفروض ہے جس کا ۱/۶ حصہ مقرر ہے۔ لیکن اگر میت شادی شدہ نہ ہو۔ یا شادی شدہ ہو مگر اس کی اولاد (بیٹا' پوتا وغیرہ) نہ ہو تو یہ اپنا مقررہ حصہ پانے کے علاوہ بقایا ترکہ بھی پائے گا۔ مثلاً میت کی صرف والدہ اور والد ہی ہیں تو والدہ کو ۱/۳' والد کو ۱/۶ اور باقی ۱/۲ بھی والد کو بطور عصبہ مل جائے گا۔ اور اس کا حصہ ۲/۳ ہو جائے گا۔

اور اگر ذوی الفروض کے حصے پورے کرنے کے بعد والد کے لیے ۱/۶ بھی نہ بچے تو اسے بہر حال ۱/۶ دیا جائے گا۔ مثلاً میت کی بیوی بھی ہے ماں بھی اور دو بیٹیاں بھی تو ان کے حصے یعنی صرف ۱/۲۴ حصہ بچا۔ اب والد کا حصہ پورا کرنے کے لیے یا سب حصوں میں درست نسبت قائم رکھنے کے لیے عول کا قاعدہ استعمال کریں گے۔ جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ اس مسئلہ کو مسئلہ منبریہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ ایسا ہی سوال حضرت علیؓ سے بر سر منبر ہوا تو آپؓ نے عول کے قاعدہ کے مطابق ہی جواب دیا تھا۔

اولاد نرینہ اور والد کی موجودگی میں بہن بھائی محروم ہوتے ہیں۔

گویا والد تین طرح حصہ پاتا ہے (۱) بصورت فروض ۱/۶ (۲) بصورت عصبہ اور فرض جیسا کہ مثال میں مذکور ہے (۳) بصورت عصبہ۔ اگر میت کا صرف والد ہی موجود ہو تو اسے پورا ترکہ ملے گا۔

ماں کا حصہ: (۱) اولاد (بیٹے' بیٹیاں یا پوتے پوتیاں) کی موجودگی میں ماں کا چھٹا حصہ ہے۔

(۲) اگر اولاد تو نہیں مگر دو بھائی یا زیادہ اور دو بہنیں یا زیادہ ہوں (خواہ یہ سگے ہوں یا سوتیلے یا ماں جائے) تو بھی ماں کا چھٹا حصہ ہے۔

(۳) اگر اولاد نہ ہو مگر بہن یا بھائی صرف ایک ایک ہو تو ماں کا ۱/۳ حصہ ہے۔

(۴) اگر نہ اولاد ہو نہ بھائی بہن تو اس کا ۱/۳ ہے مگر اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً میت زوجہ اور ماں باپ چھوڑ جائے تو زوجہ کا حصہ کا ۱/۴ حصہ نکال کر باقی کا ۱/۳ (۱/۳×۳/۴=۱/۴) یعنی کل کا ۱/۴ ملے گا۔ باقی ۱/۲ باپ کو مل جائے گا۔ (عصبہ) اور اگر والد کے بجائے دادا ہو تو ماں کو کل ۱/۳ حصے ملے گا۔[۱]

---

[۱] یہ مسئلہ عمریہ کہلاتا ہے۔ کیونکہ یہ فیصلہ حضرت عمرؓ نے کیا تھا اور مسئلہ غرائیہ بھی کیونکہ یہ روشن ستارے کی طرح مشہور ہے۔

(۵) اگر میت عورت ہے اور وہ خاوند اور ماں باپ چھوڑ جاتی ہے تو پہلے خاوند کو ۲/۱ ملے گا۔ باقی ۲/۱ کا ۳/۱ (یعنی کل کا ۶/۱) ماں کو ملے گا (اور باقی ۳/۱ باپ کو)

ماں جائے بہن بھائیوں کا حصہ:

صرف کلالہ کے وارث ہوتے ہیں۔ وہ یوں کہ اگر ایک بھائی ہے تو ۶/۱ اور اگر ایک بہن بھی ہے تو اسے بھی ۶/۱ اور اگر بہن بھائی زیادہ ہوں تو یہ سب ۳/۱ میں ہی برابر کے شریک ہوں گے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

سگے بہن بھائیوں کا حصہ:

(۱) سگے بہن بھائی اس وقت وارث ہوں گے۔ جب میت کی نہ اولاد نرینہ ہو اور نہ باپ۔ یہ بیٹیوں یا پوتیوں کے ساتھ وارث ہوتے ہیں۔ مثلاً میت کی صرف ایک بیٹی ہے تو اسے ۲/۱ ملے گا۔ پھر اگر سگی بہن بھی ہے تو اسے ۲/۱ ملے گا۔ اور اگر بیٹی کے ساتھ پوتی بھی ہو تو بیٹی ۲/۱ اور پوتی کا ۶/۱ باقی ۳/۱ بہن کو ملے گا۔[۱]

(۲) میت کی اولاد نرینہ نہ ہو نہ باپ ہو مگر دادا زندہ ہو تو دادا کی موجودگی میں بہن بھائیوں کی وراثت اور حصہ میں اختلاف ہے۔ جس کا ذکر دادا کے حصہ میں ہوگا۔

(۳) اور اگر دادا بھی زندہ نہ ہو تو سگے بہن بھائیوں کی حیثیت ملی جلی اولاد کی سی ہوتی ہے۔ یعنی ذوی الفروض کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی ترکہ ان میں ۱:۲ کی نسبت سے تقسیم ہوگا۔ اور اگر ذوی الفروض سے کچھ نہ بچے تو کچھ نہ پائیں گے۔

(۴) میت بے اولاد ہے۔ باپ یا دادا بھی نہیں مگر سگی بہن ہے تو اس کا ۲/۱ حصہ ہے۔ دو ہوں یا زیادہ ہوں تو ان کو ۳/۲ حصہ ہے۔ اور اگر کوئی بھائی بھی ہے۔ تو پھر وہ عصبہ ہیں۔ باقی کا ترکہ ان میں ۱:۲ کی نسبت سے تقسیم ہوگا۔ گویا اس صورت میں بہن بھائی اولاد کے قائم مقام ہوں گے۔

(۵) درج ذیل صورت میں سگے بہن بھائیوں کے لیے کچھ نہیں بچتا۔ مثلاً میت عورت ہے اور اس کے وارث خاوند، ماں، سگے بہن بھائی اور ماں جائے بہن بھائی ہیں۔ اب خاوند کو ۲/۱، ماں کو ۶/۱ مادری بہن بھائیوں کو ۳/۱ ملا۔ تو سگے بہن بھائی کے لیے کچھ نہ بچا۔ اس صورت میں سگے بھی ماں جائے بہن بھائیوں کے ۳/۱ حصہ میں شریک ہو جائیں گے۔ اور مرد، عورت سب کا برابر

---

[۱] بخاری۔ کتاب الفرائض۔ باب میراث ابنة ابن مع ابنة

برابر حصہ ہوگا-البتہ سوتیلوں کو کچھ نہ ملے گا-

سوتیلے بہن بھائیوں کا حصہ:

(۱) اگر سگے بہن بھائی نہ ہوں تو سوتیلے بہن بھائی ان کے قائم مقام ہوتے ہیں- مثلاً میت کا صرف ایک ہی سوتیلا بھائی ہے تو وہ کل ترکہ کا وارث ہے اور اگر ایک بہن ہے تو ۱/۲، زیادہ ہوں تو ۲/۳ اور اگر ملے جلے ہوں تو ان میں بقایا ترکہ ۱:۲ کی نسبت سے تقسیم ہوگا-

(۲) اگر حقیقی اور سوتیلی بہنیں ملی جلی ہوں تو ان کی حیثیت بیٹی اور پوتی کی ہوتی ہے جس طرح بیٹی کا ۱/۲ اور پوتی کا ۱/۶ ہوتا ہے- اسی طرح سگی بہن کا ۱/۲ اور سوتیلی بہن کا ۱/۶ ہوگا- اور اگر سوتیلی بہنیں ایک سے زیادہ ہوں تو یہی ۱/۶ ان میں برابر تقسیم ہوگا- اور اگر سوتیلی بہنوں کے ساتھ کوئی سوتیلا بھائی ہو تو پھر وہ عصبہ ہیں ذوی الفروض کی ادائیگی کے بعد اگر کچھ حصہ بچ جائے تو ۱:۲ کی نسبت سے تقسیم ہوگا-

(۳) پھر جس طرح دو یا زیادہ بیٹیاں ہوں تو پوتی کو کچھ نہیں ملتا- اسی طرح اگر دو سگی بہنیں ہوں تو سوتیلی بہنوں کو کچھ نہیں ملے گا-

مثال: میت کی بیوی ایک بیٹی، ایک سوتیلا بھائی، دو سوتیلی بہنیں اور تین مادری بہنیں موجود ہیں- ان میں ترکہ کیسے تقسیم ہوگا؟

حل: مادری بہنیں صرف کلالہ سے حصہ پاتی ہیں- لہٰذا وہ محروم ہیں- لہٰذا بیوی اور بیٹی کا حصہ نکالنے کے بعد باقی سوتیلے بہن بھائیوں میں ۱:۲ کی نسبت سے تقسیم ہوگا-

بیوی ۱/۸، بیٹی ۱/۲ یہ کل ۵/۸ ہوئے باقی ۸ حصوں میں ۳ بچ رہے ان کے پھر ۱۲ حصے بنائیں گے جن میں سے ۶ بھائی کے اور ہر بہن کے ۳، ۳ ہوں گے (مادری بہن بھائی کلالہ میت عورت سے کل ۱/۳ حصہ پاتے ہیں- اس صورت میں سوتیلے محروم اور اگر عینی ہوں تو مادری بہن بھائیوں سے مل کر برابر برابر حصہ پائیں گے)-

مثال نمبر۲: میت نے دو حقیقی بہنیں، ایک علاتی بہن اور ایک بھتیجا چھوڑا ہے- ان میں ترکہ کیسے تقسیم ہوگا؟

حل: دو حقیقی بہنوں کا ۲/۳ ہے اور یہ اناث کے معین حصہ کی آخری حد ہے- لہٰذا علاتی بہن محروم اور باقی ۱/۳ بھتیجا بطور عصبہ لے جائے گا-

دادا کا حصہ:

(۱) باپ نہ ہونے کی صورت میں دادا ۶/۱ حصہ پائے گا۔

(۲) اگر اولاد نرینہ نہ ہو اور باپ بھی نہ ہو۔ البتہ حقیقی بہن بھائی موجود ہوں تو کیا دادا عصبہ بن سکتا ہے؟ یہ مسئلہ اختلافی ہے اور اس کے حصہ میں بھی اختلاف ہے۔ علم الفرائض میں یہ مسئلہ **مقاسمۃ الجد** کی اصطلاح سے مشہور ہے۔ اگر بہن بھائی نہ ہوں پھر تو اس کے عصبہ ہونے پر کوئی شک نہیں۔ چنانچہ ترمذی اور ابوداؤد میں مذکور ہے۔ کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا میرا پوتا مر گیا ہے۔ اس میں میرا حصہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ چھٹا۔ وہ چلا گیا تو آپ ﷺ نے اسے بلا کر کہا۔ ''تیرے لیے ایک چھٹا حصہ اور ہے۔'' پھر دوبارہ اسے بلا کر وضاحت کی۔ کہ یہ دوسرا چھٹا تمہارے لیے خوراک (ابوداؤد) اور ترمذی میں **لَکَ عَصَبَۃً** (یعنی بطور عصبہ) ہے (ترمذی، ابواب الفرائض، باب فی میراث الجد)

اس حدیث کی تشریح لمعات میں یوں مذکور ہے۔ کہ میت کے وارث تھے ہی دو بیٹیاں اور ایک دادا۔ اور کوئی نہ تھا۔ ۳/۲ بیٹیوں کو اور ۶/۱ دادا کو۔ باقی کا ۶/۱ آپ نے اسے بطور عصبہ دے دیا۔ اور اس کی وضاحت بھی فرما دی۔

اور ''**مقاسمۃ الجد**'' کی تین صورتیں ۲:۱ کی نسبت سے ہیں (۱) ذوی الفروض کے بعد اسے باقی مال کا ۳/۱ دے دیا جائے اور باقی ۳/۲ بہن بھائیوں میں تقسیم ہو۔

(۲) اسے بھی ایک بھائی تصور کر کے باقی مال دادا اور بہن بھائیوں میں ۲:۱ کی نسبت سے تقسیم کیا جائے۔

(۳) اسے کل مال کا ۶/۱ دے دیا جائے۔ (فرض) (ان میں سے جو صورت دادا کے حق میں بہتر ہو گی وہی اختیار کی جائے گی۔)

اور موطا میں سلیمان بن یسار سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے دادا کو بھائی بہنوں کے ساتھ ایک ثلث دلایا۔ (موطا باب میراث الجد)

مندرجہ بالا تینوں صورتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دادا کی موجودگی میں بہن بھائی بطور عصبہ حصہ پاتے ہیں۔ خواہ یہ عصبہ مکمل ہو یا مشترکہ ہو۔ امام مالک و امام شافعی اور امام احمد کا یہی مذہب ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک دادا کی موجودگی میں بہن بھائی محروم ہوتے ہیں۔

گویا راجح مذہب یہی ہے کہ دادا کی موجودگی میں بہن بھائی وارث ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا بھائیوں کے حصہ میں ہر طرح کے بہن بھائی (سگے' سوتیلے اور ماں جائے) شریک ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ماں جائے تو بہر حال محروم ہوتے ہیں۔ رہے سوتیلے تو ان کے ترکہ پانے کی صرف یہ صورت ہوگی کہ سگے بھائی نہ ہوں اور صرف بہن یا بہنیں ہی ہوں اس صورت میں باقی ترکہ اکائی مان کر سگی بہنوں کو ۱/۲ یا ۲/۳ دے دیا جائے۔ باقی کا سوتیلے بہن بھائیوں میں ۲:۱ کی نسبت سے تقسیم ہو۔

جدّہ صحیحہ کا حصہ:

جدہ صحیحہ صرف نانی اور پڑنانی (ماں کی ماں کی ماں) یا پھر دادی اور پڑدادی (باپ کی ماں کی ماں) ہیں۔ باقی سب قسم کی نانیاں دادیاں محروم ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اور پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ماں کی غیر موجودگی میں نانی کو ۱/۶ حصہ دلایا۔ دادی کا حصہ ماں یا باپ کسی بھی ایک کے ہونے کی صورت میں ہوسکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دادی کو ۱/۶ حصہ دلایا۔ اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر نانی اور دادی دونوں موجود ہوں تو وہ اسی ۱/۶ میں برابر کی شریک ہوں گی (موطا' کتاب الفرائض' باب میراث الجدۃ) (یعنی ماں کی جگہ نانی اور اگر نانی نہ ہو تو دادی کو اور اگر دونوں ہیں تو شریک ہوں گی (اگر ماں باپ دونوں' بہنیں اور دادا بھی نہیں تو دادی کو باپ کی جگہ ۱/۶ ملے گا اور نانی ہے تو محروم ہوگی۔ گویا نانی صرف ماں کی طرف سے حصہ لے سکتی ہے اور دادی ماں باپ دونوں کی جگہ۔

عول اور ردّ

عول: بعض دفعہ ذوی الفروض کے حصوں کا نسبتی مجموعہ ایک سے بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً میت کے وارث بیوی' ماں باپ اور تین بیٹیاں ہیں۔ ان کے ترکہ کی نسبت یہ ہوگی۔

بیوی ۱/۸ + ماں ۱/۶ + باپ ۱/۶ + بیٹیاں ۲/۳ = ۳/۲۴ + ۴ + ۴ + ۱۶ = ۲۷/۲۴ (یا ۹/۸)

یہاں نسبتی مجموعہ ایک سے بڑھ گیا تو اب جائیداد کے ۲۴ کے بجائے' ۲۷ حصے بنا دیئے جائیں گے۔ پھر بیوی کو ۳' ماں کو ۴' باپ کو ۴' بیٹیوں کو ۱۶ حصے مل جائیں گے۔ اور ہر حصہ میں آٹھواں حصہ کمی واقع ہو جائے گی۔

یہ مثال پہلے والد کے حصہ میں گزر چکی ہے- نیز یہ کہ اس سوال کا جواب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے برسر منبر دیا تھا- جس کی وجہ سے اس کا نام ہی مسئلہ منبریہ پڑ گیا-

دوسری مثال (جو مسئلہ اکدریہ کہلاتی ہے) یہ ہے کہ مثلاً میت عورت ہے- جو خاوند، ماں، سگی بہن اور دادا چھوڑ جاتی ہے-اب:

خاوند کو ۱/۲ ماں کو ۱/۳ دادا کو ۱/۶ اور سگی بہن کو ۱/۲ ملے گا یعنی ۱/۲+ ۱/۳+ ۱/۶ + ۱/۲= ۳/۶+۲+۱+۳=۹/۶

یہاں بھی ترکہ کو ۹ حصوں میں تقسیم کر کے خاوند کو ۳، ماں کو ۲، دادا کو ۱ اور بہن کو ۳ حصے دیئے جائیں-اور ہر حصے میں تیسرا حصہ کمی ہو جائے گی-

عول صرف ایسے مسائل میں پیش آتا ہے- جبکہ اضعاف اقل ۶ ہو تو وہ ۷ یا ۹ یا ۱۰ حصوں میں بدلتا ہے- اور اگر ۱۲ ہو تو وہ ۱۳، ۱۵ اور ۱۷ حصوں میں اور اگر ذو اضعاف اقل ۲۴ ہو تو وہ صرف ۲۷ میں بدلتا ہے-

ردّ: اور بعض دفعہ یوں ہوتا ہے- کہ ذوی الفروض میں حصے تقسیم کرنے پر کچھ ترکہ بچ جاتا ہے-مگر کوئی عصبہ بھی زندہ نہیں ہوتا- اور قاعدہ یہ ہے کہ ذوی الفروض یا عصبہ کی موجودگی میں ذوی الارحام حصہ نہیں پاتے- لہٰذا بقایا ترکہ بھی ذو الفروض کو ان کے حصوں کی نسبت سے بانٹ دیا جاتا ہے-علم الفرائض کی اصطلاح میں یہ قاعدہ ''الرد'' کہلاتا ہے- مثلاً میت کی بیوی، ماں اور ایک لڑکی زندہ ہیں تو ان کے حصے یوں ہوں گے- بیوی ۱/۸+ ماں ۱/۶+ بیٹی ۱/۲=۳/۲۴+۴+۱۲=۱۹/۲۴ باقی ۵/۲۴

اب قاعدہ یہ ہے کہ رد کی صورت میں خاوند یا بیوی کو مزید کچھ نہیں ملتا- لہٰذا یہ بقایا ۵ حصے ماں بیٹی میں ان کے مقررہ حصوں یعنی ۱:۳ کی نسبت سے تقسیم ہو جائیں گے- یعنی ان پانچ حصوں کے ۲۰ حصے بنا کر ۵ ماں کو اور ۱۵ بیٹی کو دے دیئے جائیں گے-

ردّ کے مسئلہ میں بھی کئی طرح کے اختلاف ہیں- مثلاً (۱) بعض تو سرے سے رد کے قائل ہی نہیں وہ کہتے ہیں کہ عصبہ نہ ہونے کی صورت میں بقایا بیت المال میں جانا چاہیے-

(۲) بعض کہتے ہیں کہ زوجین کو ذوی الفروض سے خارج کر دینا چاہیے- کیونکہ وہ رحم کا رشتہ نہیں اور (۳) بعض باپ دادا کو بھی خارج کر دیتے ہیں کیونکہ وہ عصبہ بن سکتے ہیں اور (۴) بعض کہتے ہیں کہ کسی کو بھی خارج نہ کرنا چاہیے- حتّٰی کہ زوجین کو بھی خارج نہ کرنا چاہیے-

اور راجح مذہب یہ ہے۔ جو حضرت عمرؓ حضرت علیؓ جمہور صحابہؓ تابعین' امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا ہے اور اسی پر شافعیہ نے اعتماد کیا ہے اور بعض مالکیوں نے بھی کہ جب بیت المال موجود نہ ہو تو بقایا ترکہ درج ذیل آٹھ ذوی الفروض میں سے جو موجود ہوں۔ ان پر لوٹا دیا جائے۔ اس میں زوجین اور ماں باپ دونوں کو خارج کرایا گیا ہے (۱) بیٹی (۲) پوتی (۳) سگی بہن (۴) سوتیلی بہن (۵) ماں (۶) نانی' دادی (۷) مادری بھائی (۸) مادری بہن (فقہ السنہ۔ ج ۳ ص ۴۴۴)

عصبات

ذوی الفروض کی بحث میں عصبہ کی تعریف اور تقسیم بہت حد تک مذکور ہو چکی۔ مختصراً عصبہ نسبی کی چار جانبیں ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(الف) بیٹا' پوتا' نیچے تک (جزء میت)۔ (ب) باپ' دادا (اصل میت)۔ (ج) بھائی اور ان کی نرینہ اولاد۔ (جزء اصل میت)۔ (د) چچے اور ان کی نرینہ اولاد (جزء جدّ میت)۔

مزید وضاحت یہ ہے کہ عصبہ کی تعیین کے سلسلہ میں دو باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے ایک میت سے بلحاظ رشتہ قرب اور بعد اور دوسرے یہ کہ سگے رشتہ دار سوتیلے پر اور سوتیلے ماں جائے رشتہ دار پر مقدم ہوتے ہیں۔ مثلاً سگا بھائی سوتیلے بھائی پر تو مقدم ہوگا۔ لیکن سگے بھائی کا بیٹا سوتیلے بھائی پر مقدم نہ ہوگا۔ اسی طرح سوتیلا چچا سگے چچا کے بیٹوں پر مقدم ہوگا۔ اور سوتیلے بھائی کا بیٹا سگے بھائی کے پوتے پر مقدم ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس۔

عصبہ کی اقسام:

ایک دوسرے پہلو سے عصبہ کی تین اقسام ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(۱) عصبہ بنفسہ: مندرجہ بالا چاروں جوانب میں جو رشتے مذکور ہوئے۔ یہ عصبہ بنفسہ ہیں۔ یعنی عصبہ ہونے میں کسی دوسرے کے محتاج نہیں۔

(۲) عصبہ بالغیر یا بغیرہ: میت کی بیٹی یا بیٹیاں ذوی الفروض سے ہیں۔ لیکن جب ان کا کوئی بھائی بھی ہوگا۔ (جو میت کا بیٹا اور عصبہ بنفسہ ہے) وہ اپنی بہنوں کو بھی عصبہ بنا دے گا۔ اور وہ ذوی الفروض سے نہ رہیں گی۔ پہلی صورت میں ان کا ۱/۲ یا ۲/۳ حصہ مقرر تھا۔ اب وہ نہ رہا۔ اب وہ اپنے بھائی کے ساتھ بقایا ترکہ میں سے دوہرے اور اکہرے حصہ کی نسبت سے حصہ پائیں گی۔ گویا بیٹے کے ساتھ بیٹیاں عصبہ بالغیر یا بغیرہ بن گئیں۔ عصبہ بالغیر بیٹیاں' پوتیاں' حقیقی بہنیں

اور سوتیلی بہنیں ہیں۔

(۳) عصبہ مع الغیر : بعض دفعہ کسی ذی الفرض رشتہ دار کی موجودگی دوسرے ذی الفرض رشتہ دار کو عصبہ بنا دیتی ہے۔ مثلاً میت کی ایک بیٹی اور ایک بہن ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا حصہ ۲/۱ ہے[1]۔ اب اگر ایک پوتی بھی ہو۔ جو بیٹی کے ساتھ ۶/۱ حصہ پاتی ہے تو یہ پوتی بہن کو "عصبہ" بنا دے گی۔ بیٹی بھی ذی الفرض اور پوتی بھی ذی الفرض۔ ان دونوں نے مل کر ایک تیسری ذی الفرض بہن کو عصبہ بنا دیا۔ اب بہن کو بیٹی اور پوتی کا حصہ ۲/۱ اور ۶/۱ نکالنے کے بعد جو بچے گا وہ ملے گا۔ یعنی ۳/۱۔[2]

گویا عصبہ بالغیر میں کوئی عصبہ ذوی الفروض کو عصبہ بناتا ہے۔ جبکہ عصبہ مع الغیر میں ذی الفرض ہی دوسرے ذی الفرض کو عصبہ بنا دیتا ہے اور یہ حقیقی یا پدری بہنیں ہی ہوتی ہیں۔

ابنائی جانب میں عصبہ عموماً حصہ کم کر دیتا ہے۔ مثلاً بیٹی کا حصہ ۲/۱ ہے۔ جب بیٹا ساتھ مل جائے گا۔ تو بیٹی کا حصہ ۳/۱ ہو جائے گا۔ مگر آبائی جانب میں یہ حصہ بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً میت کے ماں، باپ اور بھائی بہنیں ہیں۔ باپ کی موجودگی میں بھائی بہنیں محروم اور حصہ صرف ماں اور باپ کو ۶/۱ اور ۶/۱ اکل ۳/۱ ملے گا۔ باقی ۳/۲ بھی باپ کو عصبہ کی حیثیت سے مل جائے گا۔

خاوند بیوی کا عصبہ نہیں بن سکتا۔ وہ ۲/۱ کا ہی حقدار ہے۔ اور ہمارے ہاں جو یہ دستور چل نکلا ہے کہ بے اولاد عورت مر جائے تو اس کے رشتہ دار اس کا سب کچھ لے جاتے ہیں۔ یہ شریعت کے خلاف ہے۔

ذوی الارحام

ذوی الفروض اور عصبات میں ترکہ کی تقسیم کے بعد ہی ذوی الارحام کی باری آتی ہے اور یہ باری شاذ و نادر ہی آ سکتی ہے۔ جس کی وجوہ درج ذیل ہیں۔

(۱) ایسی مثال ملنا ہی شاذ ہے کہ میت کی نہ تو اولاد ہو۔ اور آبائی۔ اخوی اور عموی جانب میں کوئی عصبہ نہ ملتا ہو۔ اور جب تک ذوی الفروض اور عصبات مل سکتے ہوں تو ذوی الارحام کو کچھ نہیں ملتا۔

---

[1] بخاری۔ کتاب الفرائض۔ باب میراث البنات (۶۷۳۴) ابوداؤد کتاب الفرائض باب ماجاء فی میراث الصلب (۲۸۹۳)

[2] بخاری۔ کتاب الفرائض۔ باب میراث ابنة ابن مع ابنة (۶۷۳۶)

(۲) اور اگر عصبات نہ ملتے ہوں اور ذوی الفروض موجود ہوں تو اگر ذوی الفروض سے کچھ ترکہ بچ بھی جائے۔ تو وہ پھر انہیں میں قاعدہ ردّ کے ذریعے تقسیم ہو جاتا ہے۔

(۳) علماء کا اس بات میں ہی سرے سے اختلاف ہے کہ آیا ذوی الارحام وارث ہوتے بھی ہیں یا نہیں کتاب وسنت میں ذوی الارحام کا تقسیم ترکہ کے سلسلہ میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔ رسول اللہ ﷺ سے پھوپھی اور خالہ کی میراث کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ ان کے لیے کچھ نہیں[1]۔ حضرت عمر..... فرمایا کرتے تھے۔ کہ بھتیجا تو پھوپھی کا وارث ہے۔ مگر وہ بھتیجے کی وارث نہیں۔[2]

نیز ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ جس کا کوئی نہیں اس کا میں وارث ہوں۔ ابوداؤ، کتاب الفرائض باب میراث ذوی الارحام۔ گویا وہ ترکہ بیت المال میں جائے گا۔ چنانچہ بعض صحابہ مثلاً زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ نیز امام شافعیؒ اور امام مالکؒ بھی اسی بات کے قائل ہیں۔

دوسری طرف ترمذی میں ایک مرسل حدیث یہ بھی ہے۔ الخَالُ مَنْ لَاوَارِثَ لَهُ (جس کا کوئی وارث نہ ہو تو ماموں اس کا وارث ہوتا ہے۔) پھر اس کے قائلین یہ بھی کہتے ہیں کہ گو کتاب وسنت میں تقسیم میراث کے بارے میں ذوی الارحام کا ذکر نہیں ملتا۔ تاہم اولوا الارحام کا لفظ تو موجود ہے جو سب مطالب کے لیے عام ہے۔ چنانچہ کچھ صحابہ، تابعین اور حنفیہ اس بات کے حق میں ہیں کہ ذوی الفروض اور عصبہ کی عدم موجودگی میں ترکہ ذوی الارحام میں تقسیم ہونا چاہیے۔ قائلین نے ایسے رشتہ داروں کی طول طویل تفصیلات پیش کی ہیں اور ان میں تقدم وتاخر کے اصول اور ترتیب وہی ہے جو عصبات کی ہے۔ مثلاً

(۱) جز میت (جو رشتہ دار میت کی طرف ہوں) جیسے بیٹی کی اولاد، نواسے نواسیاں نیچے تک اسی طرح پوتیاں اور ان کی اولاد نیچے تک۔

(۲) اصل میت (جن کی طرف میت منسوب ہو) جیسے جد فاسد یعنی نانا، پڑنانا اور دادی کا باپ وغیرہ۔ اور جدہ فاسدہ جیسے نانا کی ماں، دادی کے باپ کی ماں وغیرہ۔

(۳) جزء ابوین میت (جو میت کے ماں باپ کی طرف منسوب ہو) جیسے بہن کی اولاد

---

[1] اسلامی وراثت۔ حافظ عبداللہ روپڑی حصہ دوم ص ۲

[2] موطا۔ کتاب الفرائض باب فی ماجاء فی العمة (۹)

بھانجے بھانجیاں اور بھتیجے بھتیجیاں نیچے تک۔

(۴) جزءجدین میت (جو میت کے نانے دادے کی طرف منسوب ہوں) جیسے پھوپھی اور اس کی اولاد نیچے تک۔ خالہ اور اس کی اولاد نیچے تک۔[1] ماموں اور اس کی اولاد نیچے تک۔ چچازاد بہن اور اس کی اولاد نیچے تک۔

گویا تفصیلاً یہ مندرجہ ذیل گیارہ اقسام بن جاتی ہیں۔

(۱) نواسے نواسیاں (۲) بھانجے بھانجیاں (۳) بھتیجے بھتیجیاں (۴) مادری بہنوں کی اولاد (۵) پھوپھیاں اور ان کی اولاد (۶) چچا جو میت کے باپ کا مادری بھائی ہو (۷) ماموں (۸) خالہ (۹) چچازاد بہنیں (۱۰) جد فاسد اور (۱۱) جدہ فاسدہ۔

اور یہ ایسی تفصیلات ہیں جن کی شائد ہی کبھی ضرورت پیش آئی ہو یا آئندہ کبھی پیش آئے۔

پھر ان رشتہ داروں میں طریقہ تقسیم ترکہ میں بھی بے شمار اختلافات ہیں۔ اور چونکہ کتاب وسنت میں ان کے متعلق کوئی نص نہیں ملتی لہٰذا اس میدان میں فقہاء نے خوب جولانیاں دکھائی ہیں اور موشگافیاں کی ہیں۔ ایک ہی مسئلہ کے تین تین مختلف حل پیش کئے ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ کوئی ایسا مسئلہ نہ ہوگا۔ جس میں اختلاف نہ پایا جاتا ہو تو یہ زیادہ موزوں بات ہے۔ اس طول طویل بحث کا نہ یہاں حصر ممکن ہے۔ اور نہ ہی ہم اس کا کچھ فائدہ سمجھتے ہیں۔

ہمارے خیال میں بہتر صورت یہ ہے کہ مرنے والا جن ذوی الارحام یا محروم رشتہ داروں میں کسی کی مدد کرنا چاہتا ہے اس کے حق میں وصیت کر جائے۔ بصورت دیگر ورثاء کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایسے ذوی الارحام یا محروم رشتہ داروں میں سے جسے مستحق سمجھیں اسے کچھ نہ کچھ دے دیں۔ بموجب ارشاد باری تعالیٰ۔

﴿وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ﴾۔ (۴:۸)	(اور جب تقسیم میراث کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار اور یتیم اور مسکین آ جائیں تو ان کو اس میں سے کچھ دے دیا کرو۔)

[1] تعجب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ذوی الارحام میں سے صرف ماموں کا نام لیا لیکن اس ترتیب میں یہ سب سے آخری درجہ میں آتا ہے۔

اسلامی قانون وراثت کی امتیازی خصوصیات

(۱) میراث میں عورت کا حصہ:

اسلام آنے سے پیشتر اس وقت کے مہذب ممالک ہندوستان' چین اور مغربی ممالک میں عورت کو وراثت سے محروم رکھا جاتا تھا اور عرب میں تو اس کا اور بھی برا حال تھا- عورت کا وارث ہونا تو درکنار' وہ ترکہ کا مال بنی ہوئی تھی- حتیٰ کہ باپ کی منکوحہ بیٹے کے حصہ میں آتی تو وہ اس سے نکاح کر لیتا- اس ظلم کا خاتمہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد مبارک سے ہوا-

﴿وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَاقَدْ سَلَفَ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا وَسَآءَ سَبِيْلاً -﴾ (۴:۲۴)

(اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو ان سے نکاح نہ کرنا (دور جاہلیت میں) جو ہو چکا سو ہو چکا- یہ نہایت بےحیائی اور (اللہ کی) ناخوشی کی بات تھی اور بہت برا دستور تھا-)

عورتوں سے ترکہ چھین لینا بھی ایسا ہی برا دستور تھا- جنگ احد کے دن حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ربیع شہید ہو گئے اور دو لڑکیاں اور ایک بیوی چھوڑ گئے- حضرت سعد رضی اللہ عنہ شہید کا بھائی زندہ تھا- اس نے عرب کے دستور کے موافق پورے ترکہ پر قبضہ جما لیا- یتیم لڑکیاں اور بے کس بیوی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے- حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور صورت حال سے مطلع کرتے ہوئے کہا- "کہ ابھی تو ان لڑکیوں کی شادی بھی کرنی ہے اور اور ترکہ سارا ان لڑکیوں کا چچا لے گیا ہے"- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا کہ "اللہ کے حکم کا انتظار کرو-" اسی پس منظر میں آیات میراث نازل ہوئیں- جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے-

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بھائی کو بلا کر فرمایا کہ "ترکہ کا دو تہائی تو ان بیٹیوں کو دو اور ۸/۱ ان کی ماں کو- باقی جو کچھ بچے وہ تمہارا ہے- گویا چچا کو بطور عصبہ صرف ۲۴/۵ حصہ ملا- یہ پہلی میراث تھی جو اسلام کے مطابق تقسیم ہوئی اور عورتوں کو میراث میں حصہ دار بنایا گیا-

عورتوں کے حصہ معینہ کی حکمت:

اس قانون کی دوسری خوبی یہ ہے کہ عورتوں کو حسب ضرورت و حالات حصہ دیا گیا

ہے- مثلاً اوپر کی مثال میں لڑکیاں یتیم اور شادی کے قابل تھیں تو انہیں کل ترکہ کا ۲/۳ دیا گیا- اور اگر ان کے ساتھ ان کی کفالت کرنے والا کوئی بھائی بھی ہوتا یا زیادہ بھائی ہوتے تو بار کفالت بھائیوں پر تھا- لہٰذا انہیں عورت سے دگنا حصہ دیا گیا اور لڑکیوں کو ان سے آدھا حصہ دینے پر اکتفا کیا گیا-

اسی طرح بوڑھے ماں باپ دونوں کا حصہ برابر (یعنی ہر ایک کا ۱/۶) رکھا گیا- اس لیے کہ زندگی کے اس دور میں دونوں پیسہ کے لیے ایک جیسے محتاج ہوتے ہیں-

(۳) غیر مستحقین کے حقوق کا خاتمہ:

عرب میں یہ دستور تھا کہ کوئی شخص مثلاً زید اپنے کسی دوست بکر سے ولایت وحمایت کا عہد و پیمان کر لیتا- اس عہد میں یہ بات بھی شامل ہوتی کہ زید کے ترکہ کا بکر اور بکر کے ترکہ کا زید وارث بنے گا- اس طرح اصل ورثاء محروم رہ جاتے-

علاوہ ازیں ایک دستور یہ بھی تھا کہ جس کے اولاد نہ ہوتی تو وہ کسی کو متبنیٰ بنا لیتا- اب یہ متبنیٰ ہی وارث ہوتا اور اصل مستحقین محروم رہ جاتے تھے قرآن کریم کی ان آیات کی رو سے ان لوگوں کے ایسے حق کو جس سے حقداروں کا حق سلب ہو رہا تھا- ختم کر دیا گیا- چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے-

﴿وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ﴾ (۴:۳۳)

(اور ہم نے ہر اس ترکہ کے حقدار مقرر کر دیئے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں- اب رہے وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں تو انہیں ان کا حصہ (اپنی زندگی میں ہی جو چاہو) دے دو-)

ہجرت نبوی ﷺ کے بعد آپ ﷺ نے انصار اور مہاجرین میں سلسلہ مؤاخات (یعنی بھائی بھائی بنانا) قائم کیا- جس میں یہ بھائی ایک دوسرے کے وارث قرار پائے اور یہ خالصتاً دینی مقصد تھا- جس کے ذریعہ مہاجرین کی آبادکاری اور مسلمانوں کا معاشی مسئلہ حل کیا گیا تھا- مگر جب مسلمانوں کی معاشی حالت کچھ سنبھل گئی تو اس حکم کو بھی درج ذیل آیت سے منسوخ کر دیا گیا-

﴿وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَاءِ

(کتاب اللہ کی رو سے عام مسلمانوں اور مہاجروں کی نسبت رشتہ دار ہی ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں الا یہ کہ تم اپنے دوستوں کے لیے اگر کوئی بھلائی کرنا

کُم مَعْرُوْفًا﴾ (۶:۳۳) چاہو تو کر سکتے ہو۔)

(۴) حق وصیّت:

ان احکام میراث میں میت کو بالکل بے بس نہیں چھوڑا گیا۔ بلکہ اپنے مال سے ۱/۳ تک وصیت کا حق دیا گیا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں ہدیہ تحائف اور ہبہ کے ذریعہ اور بوقت وفات وصیت کے ذریعہ ایسے دوستوں کو' رشتہ داروں کو' متبنٰی کو غرض جسے بھی چاہے اپنے مال میں سے حصہ دے کر ان کے عہد و پیمان اور اپنی خواہشات کو پورا کر سکتا ہے۔

(۵) صغر و کبر کے تفاوت کا خاتمہ:

کئی ممالک میں یہ رواج تھا کہ ترکہ کا اصل وارث خلف اکبر یعنی بڑا بیٹا ہی قرار دیا گیا تھا۔ پھر جسے وہ چاہتا کچھ دے دیتا۔ یہ اس کی اپنی صوابدید پر منحصر تھا۔ اور عرب میں یہ دستور تھا کہ ترکہ صرف ان بیٹوں کو ملتا جو جنگ کرنے کے اہل ہوتے۔ چھوٹے بیٹے ورثہ سے محروم کر دیئے جاتے۔ اسلام نے اس طرح کے ہر قسم کے تفاوت کو ختم کر کے چھوٹے بڑے سب کا حصہ برابر دیا۔ حتی کہ پیٹ کے جنین کو بھی وراثت میں حصہ دار بنایا گیا ہے۔

اولاد میں سے کسی کا اپنے والد کا فرمانبردار ہونا نہ ہونا اس کے حصہ وراثت کو متاثر نہیں کر سکتا۔ ہمارے ہاں جو یہ رواج چل نکلا ہے کہ ادھر والد اپنے کسی بیٹے سے ناراض ہوا' ادھر اس نے اخبار میں ''عاق نامہ'' شائع کرا کر اسے محروم الارث قرار دے دیا۔ ایسے عاق ناموں کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں۔ والد کا نافرمان ہونا گناہ کبیرہ ہے۔ جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں لیکن یہ گناہ بیٹے کے حق وراثت کو ساقط نہیں کر سکتا حق وراثت صرف قتل سے ساقط ہوتا ہے۔

(۶) ہر ایک وارث کے حصہ کی تعین:

اللہ تعالےٰ نے ہر وارث کے حصے خود ہی مقرر فرما دیئے ہیں ہر ایک کو یہ پہلے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ترکہ میں اس کا حصہ کیا ہے اس طرح باہمی لڑائی جھگڑے اور تنازعات کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔

(۷) عدل وانصاف پر مبنی قانون:

ہر انسان (بلکہ ہر جاندار کہیں تو زیادہ مناسب ہے) کی توجہ اپنی اولاد کی طرف ہوتی

ہے- اور اپنی اصل یعنی والدین کی طرف سے وہ لاپرواہ ہوتا جاتا ہے- اس فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلام نے دوسرے ورثاء کے مقابلے میں اولاد کو مقدم کیا ہے- اور آیات میراث کو شروع ہی ﴿یوصیکم اللہ فی اولادکم﴾ سے کیا ہے- مگر ساتھ ہی ساتھ دوسرے نمبر پر والدین کا حصہ مقرر کر دیا ہے ہے کہ جن ہستیوں نے محنت و مشقت سے اسے پروان چڑھایا ہے انہیں وہ یکسر فراموش ہی نہ کر دے- شوہر' بیوی' بیٹا' بیٹی' ماں' باپ یہ سب لازمی ورثاء ہیں- جو کسی صورت میں بھی محروم نہیں ہوتے-

(۸) خاندانی نظام کا استحکام:

معاشرہ کے استحکام کا انحصار خاندان کے استحکام پر ہوتا ہے کیونکہ خاندان ہی معاشرہ کی ابتدائی منزل ہے- اسلام کا نظام وراثت اس سلسلہ میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے-

معاشی اہمیّت

مندرجہ بالا امتیازی خصوصیات کے علاوہ اسلامی قانون وراثت کے چند در چند معاشی فوائد بھی ہیں جو یہ ہیں-

(۱) ارتکاز دولت اور جاگیرداروں کا خاتمہ:

دولت کا چند ہاتھوں یا چند خاندانوں میں سمٹ جانا معاشرہ میں طبقاتی تقسیم کا موجب بنتا ہے جو اپنے ساتھ بے شمار خرابیاں لاتا ہے- ارتکاز دولت سرمایہ دارانہ نظام کا خاصا ہے- انہی خرابیوں کی وجہ سے اس نظام کی کوکھ سے اس کی دوسری انتہا اشتراکیت نے جنم لیا جو بنی نوع انسان کے لیے سرمایہ دارانہ نظام سے زیادہ مہلک ثابت ہوئی- اسلامی نظام وراثت کی خوبی یہ ہے کہ وہ دولت کے خزانوں کو ایک ہی پشت میں کم وبیش آٹھ دس حصوں میں بانٹ دیتا ہے- اور یہ سلسلہ ہر پشت' بلکہ ہر وقت آگے بڑھتا رہتا ہے- جس سے سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں از خود ختم ہونے لگتی ہیں-

یہی صورت حال جاگیرداروں کی ہے- موجودہ زمانے کی جاگیریں اگر اسلام کے قانون وراثت کے مطابق ورثاء میں تقسیم ہوتی رہتیں تو آج ملکی دولت پر چند خاندانوں کا قبضہ نہ ہوتا- اور حکومتوں کو آئے دن جوزرعی اصلاحات کی ضرورت پیش آتی ہے یہ نوبت ہی نہ آتی-

(۲) پیداوار میں اضافہ:

جاگیرداری کا سب سے بڑا نقصان ملکی سطح پر ہوتا ہے مثلاً ایک شخص کے پاس ہزاروں ایکڑ رقبہ موجود ہے۔ اور ایسے اشخاص پاکستان میں اگر سینکڑوں نہیں تو بیسیوں کی تعداد میں ضرور موجود ہیں اب یہ تو ظاہر ہے کہ اس قدر وسیع رقبے کا ایک مالک اس رقبے پر وہ توجہ صرف نہیں کر سکتا۔ جو دس' بیس یا اس سے بھی زیادہ مالک کر سکتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمین سے اتنی پیداوار حاصل نہیں ہو سکتی جتنی کہ ہونا چاہیے تھی۔ اگر یہ زمینیں متعدد افراد کی ملکیت میں ہوتیں تو یقیناً ان سے دگنی سے بھی زیادہ پیداوار حاصل کی جا سکتی تھی۔

(۳) خاندانی کفالت:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر مکہ میں آ کر سخت بیمار پڑ گئے اور انہیں اپنے جانبر ہونے کی بھی امید نہ رہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے پاس عیادت کو آئے اور بہت تسلی دی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی ساری جائیداد کی وصیت کر جاؤں۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت نہ دی۔ پھر حضرت سعد ..... نے دو تہائی وصیت کی بات کی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی تسلیم نہ کی پھر انہوں نے آدھے ترکہ کی بات کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی تسلیم نہ کی۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ایک تہائی کی اجازت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تہائی کی اجازت دے تو دی مگر ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ ایک تہائی بھی بہت ہے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر تو اپنی اولاد کو مالدار چھوڑ جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ انہیں تو محتاج چھوڑ جائے اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔[1]

(۴) گردش دولت اور غربت کا علاج:

ترکہ پانے والے وارثوں میں غریب بھی موجود ہوتے ہیں۔ وصیت میں صدقہ و خیرات سب غریب طبقہ کا حصہ ہوتا ہے۔ پھر قرآن کریم کی ہدایت بھی موجود ہے کہ میراث کی تقسیم کے وقت محتاج و نادار حاضرین کو کچھ دے دیا کرو۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکہ میں غرباء کا ایک معتدبہ حصہ ہوتا ہے۔ معاشیات کا ایک قاعدہ تو یہ ہے کہ دولت کی گردش سے

---

[1] بخاری۔ کتاب الفرائض۔ باب میراث البنات (۶۷۳۳) مسلم کتاب الوصیۃ باب الوصیۃ بالثلث حدیث نمبر ۴۲۰۹

خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ اگر دولت غریب طبقہ میں آئے تو گردش کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ طبقہ اپنی ضروریات پہلے سے ہی روکے ہوئے ہوتا ہے۔ کہ کہیں سے پیسہ ملے تو اسے خرچ کر کے اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ہر ہر مقام پر غریب طبقہ کا خیال رکھا ہے۔ بلکہ ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ

﴿كَيْلَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ۔﴾ (۵۹:۷) (ایسا نہ ہو کہ دولت تمہارے اغنیاء میں ہی گردش کرتی رہے۔)

اس لحاظ سے اسلامی قانون وراثت جہاں غریبوں کا سہارا بنتا ہے وہاں ملک کی خوشحالی کا بھی مؤثر سبب بن جاتا ہے۔

ختم شد

ضمیمہ

یہ دو فتوے مولانا مبشر احمد ربانی صاحب کے تحریر شدہ ہیں قارئین کے افادہ کے لیے یہاں درج کیے جا رہے ہیں- یہ بھی کتاب کے موضوع سے متعلق ہیں- (ناشر)

گروی اشیاء کا حکم

س: ایک شخص نے اپنا مکان دوسرے کے پاس گروی یا رہن رکھ کر کچھ رقم حاصل کی گروی رکھنے والا مکان اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا ہے اور دوسرا آدمی اس سے کرایہ وصول کرنا چاہتا ہے کیا شریعت کی رو سے ایسا کرنا درست ہے؟

ج: صورت مذکورہ سود کی قسم سے ہونے کی وجہ سے حرام ہے- ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یا یھا الذین آمنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل﴾

(النساء ۴:۲۹)

''اے ایمان والو! اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ-''

رسولِ کریم نے بھی فرمایا: ''ان دماؤکم واموالکم حرام علیکم''

(صحیح مسلم کتاب الحج باب حجۃ النبی (۱۲۱۸) من حدیث جابر رضی اللہ عنہ)

بلاشبہ تمہارے خون اور اموال تم پر حرام ہے-

ان نصوص صریحہ سے معلوم ہوا کہ مسلمان کا مال دوسرے مسلمان پر اصلاً حرام ہے- جواز تصرف کے لیے کسی شرعی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے جو یہاں مفقود ہے- گروی رکھنے والا شخص اپنی گروی شدہ چیز کا مالک ہے اور اس کا اپنی چیز سے فائدہ اٹھانا تو معقول

ہے جبکہ جس کے پاس گروی رکھی گئی ہے۔ اس کی حیثیت امین کی ہے اور اس کے پاس پڑی ہوئی چیز امانت ہے جو کہ رقم کے تحفظ کے لیے ہے۔ کسی کی امانت میں تصرف کرنا خیانت اور ناجائز ہے۔

حدیث میں جو خرچ کے عوض جانور کے دودھ اور سواری کرنے کی اجازت موجود ہے' اس سے استدلال کرنا درست نہیں کیونکہ یہ حدیث عمومی شرعی اصول کے منافی ہے یہ صرف سواری کے ساتھ خاص ہے۔ اس پر عام قیاس کرنا درست نہیں۔ صحیح بخاری میں امام بخاری کا فہم یہی ہے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں:

ایک گروہ نے کہا کہ جس کے پاس گروی رکھی گئی ہے' وہ خرچ کے عوض گروی جانور پر سواری کر سکتا ہے اور دودھ دوہ سکتا ہے۔ اس حدیث کی وجہ سے دو فائدوں کے علاوہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ (فتح الباری ۵/۱۴۴) پھر فرماتے ہیں۔ جمہور اہل علم کا یہی مسلک ہے کہ جس کے پاس گروی رکھی گئی ہے' وہ گروی اشیاء سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ سلف صالحین سے کچھ ایسے صریح آثار بھی مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مقروض آدمی کے مال سے فائدہ اٹھانا درست نہیں۔

ابو بردہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں' میں مدینہ طیبہ آیا تو میری ملاقات عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ہوئی۔ انہوں نے کہا آپ میرے گھر آئیں تو میں آپ کو ستو اور کھجور کھلاؤں گا اور آپ ایک عظیم گھر میں آئیں گے۔ پھر فرمایا: تم ایک ایسی زمین پر ہو جس میں سود عام ہے۔ جب تمہارا کسی شخص پر حق ہو اور وہ تمہیں بھس' اور چارہ کا گٹھا بطور تحفہ دے تو اسے قبول نہ کرنا کیونکہ یہ سود ہے۔ (صحیح البخاری کتاب مناقب الانصار باب مناقب عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ) (۳۸۱۴)

سالم بن ابی الجعد فرماتے ہیں' ہمارا ایک پڑوسی مچھلی فروش تھا۔ اس کے ذمے کسی آدمی کے پچاس درہم تھے اور وہ قرض دینے والے کو مچھلی ہدیہ بھیجتا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ

عنہ آئے تو اس نے ان سے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا- جو وہ تجھے تحفے میں دیتا رہا اسے حساب میں شمار کرو-

(بیہقی باب کل قرض جر منفعة فھو ربا ۵/۳۵۰)

ان آثار صحیحہ اور صریحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرض لینے والے شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مقروض کی کسی چیز سے فائدہ اٹھائے لہٰذا اگر کسی شخص کے پاس کوئی چیز گروی رکھی گئی ہو تو وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور اگر وہ فائدہ اٹھائے تو اصل رقم سے حساب کر کے اتنی رقم منہا کر دی جائے گی اور اگر حق سے زائد فائدہ اٹھایا تو واپس کرنا ہو گا ورنہ سود ہو گا- واللہ اعلم

حرام جانوروں کے اعضاء سے پیوندکاری کا حکم

س: کیا حرام جانوروں کے اجسام کے اعضاء انسانی بدن میں لگائے جا سکتے ہیں؟

ج: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے استعمال کے لیے جو اشیاء بنائی ہیں وہ حلال اور طیب ہیں- حرام اور خبیث اشیاء ہمارے لیے ناجائز ہیں- رسولِ کریم ﷺ کی صفات حمیدہ ذکر کرتے ہوئے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ ویحل لهم الطیبات ویحرم علیهم الخبائث ﴾ (الاعراف ۷:۱۵۷)

اور آپ ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتے اور ناپاک چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں- امام ابن کثیر فرماتے ہیں بعض علماء نے کہا ہے کہ

"فکل ما احل الله تعالیٰ من المآکل فهو طیب نافع فی البدن والدین وکل ما حرمه فهو خبیث ضار فی البدن والدین" (تفسیر ابن کثیر ۳/۲۴۰ مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت) کھانے والی اشیاء میں سے جو چیز بھی اللہ نے حلال کی ہے' وہ پاک اور جسم و دین میں نفع بخش ہے اور ہر وہ چیز جسے اللہ نے حرام کیا ہے' وہ ناپاک اور جسم و دین میں نقصان دہ ہے- اللہ تعالیٰ کی

حلال کردہ اشیاء میں نفع اور پاکیزگی ہے جبکہ حرام کردہ اشیاء میں ضرر و نقصان ہے۔ رسول کریم ﷺ نے بھی حرام اشیاء کو دوا کے لیے استعمال کرنے سے منع فرمایا۔

ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے "**نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الدواء الخبيث**" (ابوداؤد کتاب الطب **باب في الادوية المكروهة** (۳۸۷۰) ترمذی کتاب الطب **باب ماجاء فيمن قتل نفسه بسمّ او غيره** (۲۰۴۵) ابن ماجہ کتاب الطب **باب النهي عن الدواء الخبيث** (۳۴۵۹) بیہقی ۱۰/ ۵ المستدرک للحاکم ۴/ ۴۱۰ مسند احمد ۱۳/ ۴۱۶ (۸۰۴۸) ۱۵/ ۴۷۰، ۱۶/ ۱۵۲، ابن ابی شیبہ ۸/ ۵ حلیۃ الاولیاء ۸/ ۴/ ۳۷، شعب الایمان بیہقی (۵۶۲۲)

رسول کریم نے خبیث دوا سے منع کیا ہے۔

بعض روایات میں اس کی تفسیر زہر اور خمر سے کی گئی ہے لیکن یہ حدیث عام ہے۔ زہر، شراب اور ہر حرام و خبیث چیز کو شامل ہے۔

نافع بیان کرتے ہیں کہ "**كان ابن عمر اذا دعا طبيبا يعالج بعض اهله اشترط عليه ان لايداوى بشئي مماحرم الله عزوجل**" (بیہقی ۱۰/ ۲۵) ابن عمر رضی اللہ عنہ جب کسی طبیب کو بلاتے جو ان کے گھر میں سے کسی کا علاج کرتے تو اس پر شرط لگاتے کہ وہ کسی ایسی چیز سے علاج نہیں کرے گا جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ اس اثر کی سند صحیح ہے۔ ابوداؤد رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "**ان الله انزل الداء والدواء وجعل لكل داء دواء فتداووا ولاتتداووا بحرام**" (ابوداؤد: ۳۸۷۴) بیہقی ۱۰/ ۵ شرح السنۃ ۱۲/ ۱۳۹)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے بیماری اور دوا نازل کی اور ہر بیماری کے لیے دوا بنائی پس تم دوا کرو اور حرام سے دوا نہ کرو۔ اس کی سند میں گو اسماعیل بن عیاش مدلس اور اس کا استاد ثعلبہ

بن مسلم مستور ہے۔لیکن حدیث ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ اس کا قوی شاہد ہے اور اس کے پہلے حصے کا شاہد ابوداؤد کتاب الطب باب فی الرجل یتداوی (۳۸۵۵) حدیث اسامہ ہے۔

مندرجہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ حرام اشیاء سے علاج کرنا منع ہے لہٰذا حرام جانوروں کے اعضاء کی پیوند کاری جسم انسانی میں درست نہیں۔واللہ اعلم

مراجع ومصادر

(۱)	قرآن کریم		
(۲)	کتب صحاح	موطا امام مالکؒ	
(۳)	مشکوٰۃ المصابیح		
(۴)	منتقی الاخبار	امام ابن تیمیہ	دارالدعوۃ شیش محل روڈ لاہور
(۵)	نیل الاوطار	امام شوکانی	ریاسۃ ادارات البحوث (مکہ مکرمہ)
(۶)	فقہ السنۃ	السید سابق	دارالاحیاء التراث الاسلامی (بیروت)
(۷)	تفسیر ابن کثیر	حافظ ابن کثیر	نور محمد کارخانہ تجارت کتب (کراچی)
(۸)	مقدمہ ابن خلدون	ابن خلدون	نور محمد کارخانہ تجارت کتب (کراچی)
(۹)	سود	ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامک پبلیکیشنز' چوک رنگ محل (لاہور)
(۱۰)	اسلام کی معاشی تعلیمات	ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامک پبلیکیشنز' چوک رنگ محل (لاہور)
(۱۱)	اسلام میں عدل اجتماعی	سید قطب شہید ترجمہ نجات اللہ صدیقی	اسلامک پبلیکیشنز' چوک رنگ محل (لاہور)
(۱۲)	مسئلہ ملکیت زمین	ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامک پبلیکیشنز' چوک رنگ محل (لاہور)
(۱۳)	اصول معاشیات	پروفیسر منظور علی شیخ	علمی کتب خانہ' اردو بازار لاہور
(۱۴)	الفاروق	شبلی نعمانی	سنگ میل پبلی کیشنز (لاہور)
(۱۵)	اشتراکیت اسلام کی نظر میں	چوہدری افضل حق	کلاسیک۔ مال روڈ۔ لاہور
(۱۶)	اسلام اور جدید اقتصادی نظریات	پروفیسر منور حسین چیمہ	اسلامک اکیڈمی گکھڑ
(۱۷)	انسائیکلو پیڈیا	پروفیسر منور حسین چیمہ	فیروز سنز لمیٹڈ۔ دی مال۔ لاہور